دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

مئی 2016

مدیر اعلیٰ
معراج رسول

MAY-2016 PRICE RS. 60/=

REGD. NO. MC-13

Monthly JASOOSI DIGEST

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد46 • شمارہ05 • مئی 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون35895313 (021) فیکس35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزان من... السلام علیکم!

مئی کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ اسی کے ساتھ موسم گرما کی آمد آمد ہے۔ گرم ترین دنوں کی آمد سے پہلے اپریل میں ہی سورج نے ملک بھر میں اپنی تابانیاں بکھیر دی ہیں۔ کراچی میں پچھلے دنوں ہیٹ اسٹروک نے بہت سی انسانی جانیں لے لی تھیں۔ کہا گیا کہ کراچی میں سبزہ کم ہے، درخت بے رحمی سے کاٹے گئے ہیں اس لیے یہاں کا موسمی توازن متاثر ہوا ہے لیکن لاہور میں سبزہ اتنی کثرت سے ہے کہ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ اس سبزے اور طراوت کے باوجود شہر لاہور بھی شدید گرمی کی زد پر ہے۔ یہی حال پورے ملک کا ہے۔ گرمی، بارشوں، سیلاب اور لینڈ سلائڈنگز نے ہر طرف لوگوں کو جانی و مالی نقصان سے دوچار کیا ہے۔ یہ مجموعی صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ان ماحولیاتی اسباب کی بہتری پر فوری توجہ دی جائے۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ بہتر منصوبہ بندی نہیں کی گئی تو آنے والے سالوں میں یہ مسائل بہت سنگین ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان گزارشات کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں آپ کے رنگین و سنگین محبت نامے سب کے منتظر ہیں۔

واہ کینٹ سے **بلقیس خان** کی کامیاب بجھ بوجھ ''اپریل 2016ء کا جاسوسی ہمیں 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق ہمارے فنکار کی اس لحاظ سے بے چارگی کا مظہر تھا کہ اب حسن یوسف ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ ایسے میں ذاکر جی کیا کریں؟ کہاں سے لائیں حسن یوسف، کہاں سے لائیں ہمارے جیسا گل چہرہ۔ اداریہ یا ابتدائیہ میں کبھی کبھی خوشی کی خبر بھی دے دیا کریں یا آپ نے آف شور کمپنیوں والے چوروں کی طرح بس ہمارا دل جلانے کی ٹھان رکھی ہے۔ محفل دوستاں میں سویٹ چھوٹے برادر نادر سیال کو سرفہرست دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی۔ صبر رنگ لے ہی آیا، مبارک ہو۔ شعر بھی خوب تھا، مشق جاری رکھو۔ کراچی کا عالمگیر جتنا بے لوث ہے، انگارے کا عالمگیر اتنا ہی کمینہ ہے۔ زویا اعجاز کا دماغ اور وہ ابھی تک ٹھکانے پر ہے۔ نادر! آپ نے سنا نہیں وڈے سائیں نے فرمایا ہے کہ زویا لکھنے لکھانے کی مشق میں مصروف ہیں یہ جو ہمارے قیمتی لوگ (نواب صاحب اور کاشف زبیر) اپنی جگہیں خالی کر گئے ہیں اس پر کسی نے آنا تو ہے نا۔ عمران جونانی توصیفی تبصرے کے ساتھ دوسرے نمبر پر جبکہ ہزارہ سے ہونہار سپوت معراج محبوب عباسی تیسری پوزیشن لے اڑے۔ آج یہ راز بتا ہی دیں کہ عمر کے کس حصے میں ہیں جہاں دانت اور ہڈی ٹوٹے تو نہ جڑے۔ سید محی الدین اشفاق اور سید عبادت کاظمی، آپ کے نام بھی پاکیزہ ہیں اور کام بھی۔ اللہ تعالیٰ اس تسلسل کو قائم رکھے۔ انور یوسف زئی، قاسم رحمان، میں دوستوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔ محمد یوسف، محمد صفدر معاویہ، محمد انعام، ادریس خان اور ہارٹ کیچر نے کاشف زبیر اور نواب صاحب کے لیے جو تعزیتی جملے لکھے تمام محفل کے ترجمان تھے۔ خدا ان پیارے لوگوں پر اپنا خاص فضل و کرم فرمائے۔ طاہرہ گلزار نے شکیل کاظمی کو مبارک باد دے کر ثابت کیا کہ صنف نازک غیر معمولی قوت برداشت کی مالک ہیں۔ چوہدری محمد سرفراز، خط تو آپ کا آپ ہی کی طرح خوب تر تھا مگر کسی خاتون کو منہ دینے کی سمجھ نہیں آئی ذرا وضاحت کریں گے؟ عابدی لغاری کی خواہش اور سیف رؤف کی بانگ بھی غضب کی تھی۔ عبدالجبار رومی کی قصیدہ نگاری ایک دم فرسٹ کلاس رہی، ہماری تعریف جو تھی۔ ہارٹ کیچر، آپ کا تبصرہ اس ماہ کا بہترین تبصرہ تھا۔ رہی بات شکیل کاظمی کی تو ان کا دل تو پڑوسنوں کی گھات میں ہے جبکہ دماغ پر ان کے ان دوستوں کا قبضہ ہے جن کی علمی سطح ضرورت سے زیادہ بلند ہے جبھی تو شاہ صاحب سوچتے کچھ اور بولتے کچھ اور ہیں۔ رضوان تنولی، عید کا چاند مت بنو۔ مظہر سلیم، پری زے خان، جویریہ علی کہاں ہو؟ حاضری لگاؤ۔ سید اکبر زندہ ہو تو حاضر ہو جاؤ۔ حسب عادت انگارے سے آغاز کیا۔ تاجور لائق نکلی۔ ہمیں تو لفظ رُسام ہی کی سمجھ نہیں آئی سارے جملے کی کیا خاک آتی۔ سردارے (اعظم) کو اپنی بیٹی کے کالے کرتوت نظر آتے تو کچھ شرم محسوس کرتا۔ آوارہ گرد کا شہزی کُٹ کھا رہا ہے ڈاکٹر صاحب، ہم پر رحم کریں اور کوئی راستہ نکال ہی لیں جوابی وار کے لیے۔ منظر امام کی متوالا اچھے برے ہر دو فطرت لوگوں کی عکاس عمدہ تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی تحریر ظلم اور امن، محبت اور فرض کے درمیان لکیر کھینچتی ولولہ انگیز کہانی ہے۔ مریم کے خان، عرصے بعد برا وقت لے کر آئیں۔ بے چارے جونی کے ساتھ پوری ہمدردی تھی۔ آخری سطروں نے محظوظ کیا، ڈونی دی ڈوگ لڑکی نکلی، ڈیل کی پابند تھی۔ گویا جونی اپنی موت کا خود ذمے دار تھا۔ سیرینا راض کی رقابت میں مالک مکان جس کھدی قبر سے خزانے کی توقع کر رہا تھا وہ چالیس سال پہلے تازہ مٹی کے ڈھیر کی صورت میں اس کو کیوں نہیں نظر آیا۔ اولیور ایک فرض شناس اور وفا شعار شخص تھا۔ موزے کی گواہی میں کوئی کیبن کا شوہر انتہائی بدفطرت اور حریص شخص تھا جو اپنی بیوی کا اخلاقی مجرم تھا اور دولت ہتھیانے کے چکر میں اس کو قتل کر بیٹھا۔ اب جیل میں لگے گا پتا۔ علی اسد کا انوکھا منصوبہ انوکھا ہی رہا۔ کمال ہے آرٹ کے شیدائی ارب پتیوں میں کسی کو نقل کا پتا نہ چلا، کیوں؟ بھینٹ، جمال دستی کی واما شو کیسا شخص تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اولاد پر اس طرح کا ظلم کرتے ہیں۔ سلیم انور کی شاطر ثابت کرتی ہے کہ دنیا میں چالباز لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔''

لاہور سے **عبدالجبار رومی انصاری** کی قلم نگاری ''یقیناً دونوں ملے ہوئے ہیں...... ایسا لگتا ہے جیسے صنف نازک کسی سے کوئی بدلہ لینا چاہتی ہے تبھی تو اس نے اپنا کندھا پیش کر دیا اور مرد کی ہنسی سے لگ رہا تھا اسے صرف اپنے مطلب سے غرض ہے۔ چلتے ہیں جاسوسی کی محفل میں۔ رونمائی کرواتے ڈیئر نادر سیال، خوشیوں کو بھی آجائے گا تیرا خیال۔ اچھی لگی جونانی آپ کی تعریف و توصیف، کرتے رہنا چاہیے کچھ نہ کچھ بریف،

نور پور سے محمد یوسف بھی چھا گئے، ہارٹ کیچر تنقید میں۔ جبکہ محبوب عباسی اپنی محبت سے دل کو بھا گئے۔ طاہرہ گلزار صنفِ کرخت بھی تو دل رکھتے ہیں، تبھی صنفِ نازک کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں۔ سید عبادت کاظمی کا تبصرہ بھی عمدہ رہا اور عابد حسین لغاری کی خواہش بھی در آئی۔ مرحا گل، بلقیس خان، ناصر علی، احسان سحر کا تعاون بھی اچھا لگا۔ وحشت گرد میں دانیال نے خفیہ اداروں کی مدد سے دہشت گردی کو ناکام بنا دیا لیکن حیرت ہے تیس سال سے وہ اپنی ٹکر وہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور کسی نے ان پہ ہاتھ نہیں ڈالا، اردو، پنجابی کا ملاپ، اور پہلوان جی کی تھاپ، ہنستے ہنسانے کو وہ بولتے رہتے ہیں اناپ شناپ، بہر حال خط کی الٹی تحریر سمجھ آئی، تو شاہ زیب کی جان میں جان آئی، انگارے اپنی سرشت میں خوب دہک رہی ہے۔ شہزی بھی عجیب لوگوں میں پھنس گیا ہے وہ بھی سمندر میں بلیو ٹکسی ایجنٹوں کے درمیان، دیکھو اب آوارہ گرد کیسے نکلتا ہے وہاں سے۔ منظر امام کی ہر تحریر کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔ فرحت نے ناسمجھی میں سعد کو تنگ کیا تھا لیکن جب خود اس کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا تو وہ دل و جان سے اس محافظ کی معترف ہوگئی۔ کہانی زبردست رہی۔ خوابیدہ عذاب مختصر مگر بہترین۔ کترنوں میں افشین بلال، احمد پرویز، جاوید اختر اور شہلا رضا کا تعاون زبردست رہا، خوش رہیں۔“

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی روداد ”نگارشات میں اولین ترجیح میانوالی سے نادر سیال کے نامے کو حاصل ہوئی۔ جناب یہ صدمہ صرف اکیلی زویا نے نہیں مجھ سمیت ہر کرکٹ فین نے لیا ہے۔ وہ شاعر نے کہا ہے نا کہ مل کر کریں آہ وزاریاں۔ عمران جونانی نے کہانیوں سے اسٹارٹ لیا اور دوستوں پہ اینڈ کیا۔ اچھا لکھا۔ اشفاق صاحب! پاکستان کی سیاست میں بھلا شرافت کا کیا کام۔ ہاں نام نہاد شریف چل سکتا ہے۔ ہارٹ کیچر برادر کہانیاں اکثر اتفاقات پر ہی آگے بڑھتی ہیں اور ان میں وہ ہوسکتا ہے جو عام زندگی میں ممکن بھی نہ ہو۔ محمد انعام کی محبت قابلِ ستائش کہ امتحان کی مصروفیت کے باوجود وقت نکالا۔ اب اشاعت کا حق تو ہر صورت بنتا تھا نا، رومی بھائی مجھے کیا ہونا ہے؟ عبادت کاظمی آپ سے ایک بار پھر جاسوسی کے پلیٹ فارم سے بھی معذرت، امید ہے معافی کی گنجائش نکل آئے گی کیوں؟ اس کے علاوہ رومی انصاری، محمد یوسف اور ایم عمران کا بھی شکریہ۔ پرویز بلگرامی صاحب کی والدہ صاحبہ کے لیے دعائے مغفرت، اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر دے۔ سلسلے وار کہانیاں سب سے پہلے پڑھیں۔ اب کیا لکھوں؟ ہر ماہ وہی الفاظ، خراجِ تحسین، تعریف و تحسین۔ ایک ہی تحریر پر ہر ماہ لکھنے سے لگتا ہے گزشتہ کا اعادہ ہو رہا ہے۔ مکمل تحریروں میں کاشف زبیر مرحوم کی محافظ، اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ اس طرح کی تحاریر پڑھ پڑھ کر دل میں یہ کسک پیدا ہوتی ہے کہ وسائل سے مالا مال ہمارے اس ملک میں جو ایک خود مختار ریاست ہے، عملی طور پر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور پھر خود ہی جواب مل جاتا ہے کہ حاکم خود ہی امن نہیں چاہتے۔ وہ عوام کو مسائل میں الجھا کر وسائل پر ہاتھ صاف کرنے میں جو مصروفِ عمل ہیں۔ محمد فاروق انجم کی خوابیدہ عذاب میں راشد کا خواب خوفناک حقیقت کا روپ دھارے بالآخر اس کے سامنے آہی گیا۔ انا اور لالچ نے نازی اور راشی کو اندھا کر دیا اور دونوں کی زندگی برباد۔ اگر راشد، نواز کو ناپسند کرتا تھا تو بیوی کو کیا پڑی تھی تھرڈ پارٹی بننے کی۔ شکیل صدیقی کی کہانی ذات بدذات الجھنوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی جنہیں سلجھاتے وقت دانتوں پسینا آ گیا۔ قاتل کا تو اینڈ میں پتا چلا۔ چلیں جو بھی ہے راجیش کو کامنی مل گئی اور کامنی کو راجیش یعنی پوری طرح سے ہیپی اینڈنگ۔ مریم کے خان کی براوقت، جناب جمال دستی کی بھینٹ، سیر ناراض صاحبہ کی رقابت، علی اسد کی انوکھا منصوبہ اور جناب عزت مآب محترم منظر امام کی متوالا بھی دلچسپ تحاریر تھیں۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ رسالہ اپنی مثال آپ تھا بس سرورق جاذبِ نظر نہیں لگا۔“

کوہستان نمک کھیوڑا سے شفقت محمود کی نمک پاشی ”ماہ اپریل کا جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار اس دفعہ 4 اپریل کو فیصل آباد ریلوے اسٹیشن کے سنسان پلیٹ فارم پر ہو گیا تھا۔ لیکن ہم نے سوچا اگر یہاں سے لے لیا تو کھیوڑا والے بھائی صاحب جو میرے لیے علیحدہ سے ایک ڈائجسٹ سائڈ پر کر دیتے ہیں، اس کا کیا بنے گا۔ یہی سوچ کر ہم نے ہاتھ واپس کھینچ لیا اور شام کو کھیوڑا پہنچ کر ان سے جاسوسی وصول کر لیا۔ ٹائٹل اس دفعہ رمیوں کے حساب سے بہت میچ کر رہا تھا۔ بال کھولے لڑکی کافی اچھے موڈ میں تھی اور اوپر گمنام بھائی صاحب لڑکی سے بھی زیادہ اچھے موڈ میں تھے۔ لگتا ہے ان کی کمیٹی نکل آئی ہے اور پستول والا ہاتھ نہ تو لڑکی کا تھا اور نہ ہی گمنام بھائی کا یقیناً وہ کسی تھرڈ پرسن کا ہی ہوگا۔ چیں نکتہ چینی میں گلشن پارک کی دہشت گردی پر جامع اور کھول کر تبصرہ کیا گیا اور بلوچستان میں پکڑا جانے والا را کا ایجنٹ اور اس کے جواب میں کی جانے والی دہشت گردی بہت ہولناک تھی، کئی خاندان اجڑ گئے اور کئی چراغ گل ہو گئے۔ نادر سیال صاحب کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ ایم عمران جونانی صاحب کا تبصرہ سادہ مگر عمدہ تھا۔ معراج محبوب صاحب کا تبصرہ تھوڑا انوکھی قسم کا تھا، کافی پسند آیا۔ محی الدین اشفاق کے مزے، ہارٹ کیچر کی تنقید اور انور یوسف زئی کی شکایت، محمد انعام کی خود ساختہ ناراضی، ادریس احمد خان کی محبتیں، محمد یوسف کی دلی کیفیت، طاہرہ گلزار کی زہر میں بجھی ہوئی الفاظ گری، سعید عباسی کی معروفیت، چوہدری محمد سرفراز کا سرفراز نامہ، سید عبادت کاظمی کی ریاضت اور محبت، عابد حسین کی خواہش بہت عمدہ اور لاجواب تھے اور محمد صفدر معاویہ کو محترم نواب صاحب اور کاشف زبیر مرحوم کی وجہ سے جو صدمہ تھا، اس سے دل کافی دکھی ہوا۔ عبدالجبار رومی اور سیف الرؤف کا انتہائی باریک قسم کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ محافظ، حق ناحق انصاف اور بے انصافی کے مابین جنگ کے دلدوز مراحل سے گزرتی کہانی لاجواب تھی۔ انگارے بہت اچھی جا رہی ہے۔ شاہ زیب ایک بار پھر ایکشن کے موڈ میں ہے۔ آوارہ گرد نے یک دم ہی ماحول بدل لیا ہے۔ امید ہے شہزی، عابدہ کو چھڑا کے ہی لائے گا۔ موزے کی گواہی فضول کہانی تھی۔ براوقت، منشیات فروشوں کی اعلیٰ اسٹوری تھی۔ جمال دستی صاحب کی بھینٹ کافی پُراثر تھی۔ منظر امام کی متوالا فراقِ عشق میں دھواں دھواں ہو جانے والے متوالوں کا تحیر آمیز

فسانہ۔ پُراسرار، عزت اور ناموس لیے ایک سچے عاشق کا فسانہ جو اَن پڑھ اور جاہل ضرور تھا لیکن غیرت مند تھا۔ انوکھا منصوبہ، نامراد اور آخری رنگ بہت زبردست کہانیاں تھیں۔“

فیصل آباد سے سیف الرؤف کی کارگزاری ”اپریل کا جاسوسی چار تاریخ کو ملا، اس بار ٹائٹل کو معاف کرتے ہوئے تبصروں میں ہی جا پہنچا۔ (شکریہ) نادر سیال آغاز میں بیٹھے لوگوں کو یاد کرتے نظر آئے۔ محترمہ زویا اعجاز معروفیات کی وجہ سے نہ کرکٹ سے دور ہوتی ہیں نہ جاسوسی سے اور کھیل کو اتنا دل پر نہیں لیتیں، آپ ان کی وڈی امی بننے کی کوشش نہ کریں۔ ایم عمران جونانی کا تبصرہ خوب رہا۔ معراج محبوب عباسی کا تبصرہ انتہائی شاندار رہا۔ ہارٹ کیچر تو تبصروں کے شیخ رشید ہی لگے۔ محمد یوسف صاحب کا تبصرہ اچھا لگا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ نے ٹھیک کہا، یہ شیطانوں کو نہیں سمجھا سکتیں۔ سعید عباسی نے اچھے تبصرے کے ساتھ سوئیوں والا مشورہ بھی اچھا دیا۔ عبادت کاظمی کا تفصیلی غور اچھا تھا۔ عبدالجبار رومی انصاری تو مجھے ہوئے دانشور لگے اور کمال لگے اتنے لمبے لمبے تبصرے جو کہ کرائے پر سائیکل لے کر پڑھنے پڑے۔ (آپ ہی دیکھیں ہم کس کس پر بیٹھ کے پڑھتے ہوں گے؟) ان کے بعد اپنے تبصرے پر پہنچا تو ایسا لگا جیسے دو مرلے کے پرائیویٹ اسکول والے چھٹی کرنے پر ٹیچرز کی تنخواہ کاٹتے ہیں اس فارمولے کے تحت تبصرہ کاٹا گیا چلیں خیر کوئی بات نہیں۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کی محافظ ایک عمدہ تحریر تھی۔ انتہائی عرق ریزی سے لکھی گئی یہ تحریر مدتوں یاد رہے گی۔ بلاشبہ ہم بھی پروطن عزیز کے انفرادی محافظ بن کے اسے اجتماعی تقویت دینا واجب ہے۔ انگارے میں سجاول سیالکوٹی اور شاہ زیب کی فائٹ جارج گورا VS تابش اور شکر شکرا VS جہانی استاد کی فائٹس سے زیادہ سنسنی خیز ہونے کی توقع ہے۔ پہلا رنگ بالکل بے رنگ تھا۔ دوسرا رنگ قدرے بہتر تھا لیکن مزید بہتری کی گنجائش بہر حال تھی۔ مختصر کہانیوں میں متوالا، براوقت اور خوابیدہ عذاب بہترین تھیں۔ باقی بس گزارا ہی تھا۔ مریم کے خان کی مزید تحاریر کے دل و جان سے منتظر ہیں۔“

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کے دعائیہ کلمات ”جاسوسی ڈائجسٹ اس دفعہ سات تاریخ تک دستیاب ہوا۔ سرورق بالکل سرورق جیسا ہی لگ رہا تھا اور یہ ایک شاندار اتفاق کہلائے جانے کے قابل ہے۔ چیں نکتہ چینی میں اس دفعہ ملکۂ جذبات شمیم آرا کے طرز کے تبصروں کی بہتات تھی۔ ابتدائی تبصرے میں صرف سالگرہ کا ذکر ہی قابل ذکر تھا اس لیے سالگرہ کی مبارک باد قبول کریں۔ ایم عمران جونانی اور معراج محبوب عباسی کے تبصرے مناسب انداز میں لکھے ہوئے تھے۔ محی الدین اشفاق صاحب مرحا گل کو میرے متعلق چیاں مخبریاں کرنے میں مصروف نظر آئے اور ہارٹ کیچر صاحب پرانے زخم ہنوز سہلا رہے تھے۔ خیر محترم آپ کی تاکید آپ کے سر آنکھوں پر۔ آپ تبصرہ نگاری کی طرف دھیان دیں تو کافی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ انور یوسف زئی کو محفل میں دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ باقی طاہرہ گلزار صاحبہ کی الف لیلہ بھی دلچسپ تھی اور میرے متعلق آپ کچھ بھی گمان کر سکتی ہیں، میں تصدیق یا تردید کرنا وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔ عبادت کاظمی، عبدالجبار رومی اور سیف الرؤف نے بھی محفل میں تقریباً تین چاند لگائے۔ کہانیوں کا ذکر کریں تو مجھے قدیم ہند کی ایک روایت یاد آ گئی۔ راجے مہاراجے اپنے دشمنوں کو مارنے کے لیے ایک انسانی ہتھیار تیار کرتے تھے جن کو اصطلاح میں ”وش کنیا“ یا زہریلی لڑکی کہا جاتا تھا۔ انگارے میں مولوی صاحب کی بیٹی اور تاجور سے متعلق منصوبے کے تانے بانے مجھے اسی طرف جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسی لڑکی کی پرورش اور شروع سے ہی زہریلی خوراک اور زہر آلود ماحول سے کی جاتی ہے۔ اس کی سانس تک زہریلی تصور کی جاتی تھی۔ پھر اس کو کنیز کی صورت میں بادشاہوں یا راجاؤں کے حرم میں بھیج دیا جاتا تھا اور ان سے کسی قسم کے بھی جسمانی تعلق سے ان کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ بہر حال یہ میری سوچ کا گھوڑا ہے جسے مغل صاحب کسی بھی وقت منہ کے بل گرا سکتے ہیں، کہانی کو کوئی نیا موڑ دے کر۔ آوارہ گرد کا دائرہ وسیع ہوا اس دفعہ۔ شہزاد احمد عرف شہزی پاکستان سے باہر نکلا۔ امید ہے یہ اسی بہانے امریکا کی بھی سیر کر آئے گا اور عابدہ کو بغیر کسی مقدمے کے ہی چھڑوا لے گا اپنے سابقہ ریکارڈ کی بدولت۔ اس ماہ کی سب سے جاندار کہانی محبوب اور مرحوم مصنف کاشف زبیر کی محافظ تھی۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اور ملک و قوم کے لیے کچھ کرنے کی لگن پیدا کرنے والی پُرتجسس اور سسپنس سے فل کہانی کمال کر گئی۔ فرحت کا ایسی خطرناک سچویشن میں ہمت دکھانا بہت اچھا لگا۔ ایسی تحاریر ہی کاشف زبیر صاحب کا خاصہ تھیں اور وہ اس میں ملکہ رکھتے تھے۔ اللہ پاک اس درویش صفت انسان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔“

میانوالی سے احسان خان نیازی کی دکھ بھری باتیں ”باتیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی، باتیں ہنساتی بھی ہیں اور رلاتی بھی ہیں۔ باتیں بارش کی طرح دل کی زمین پر برستی ہیں اور دل کو شاداب کر دیتی ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پتا چلا کہ جاسوسی محبوب کی دہلیز پر آ پہنچا ہے جس کو دیکھنے کی تمنا دل میں ضدی بچے کی طرح ہمکنے لگی۔ دیدار جاسوسی کا شرف حاصل کیا، ٹائٹل کی صنف نازک کچھ کچھ پسندیدگی کا درجہ حاصل کر پائی میری نظر و دل میں، ناگن جیسے بالوں میں پستول کی جھلک معاملہ خطرناک لگا۔ اوپری سائڈ پر دانت نکالتا مرد مستی میں مست نظر آیا۔ آگے جہاں اور بھی ہیں۔ آگے بڑھے جہاں، جہاں بھی نظر آیا۔ میانوالی سے نادر سیال کو گلاب کی طرح مہکتا پایا، بہت اچھا لگا۔ ہر چیز کی ایک لسٹ ہوتی ہے، ہر چیز وقت پر آتی ہی اچھی لگتی ہے اور جاتی بھی۔ مجھے آج بھی وہ مہینا اور سال یعنی (اکتوبر 2011ء) یاد ہے جب ہم نے تبصرہ نگاری کا آغاز کیا تھا جاسوسی میں۔ پیار ہی پیار ملتا رہا۔ سچا پیار تھا محفل میں، سلسلہ چلتا رہا لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے کہ اب ہمارا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا وہ جذبہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ نفرتوں کا سامنا کرتے کرتے نڈھال ہو چکا ہے، اسی لیے ہم نے کسی سے مشورہ کیے بغیر اس محفل سے گم ہونے کا ارادہ کر لیا ہے۔ (کیوں بھئی ایسا کیا ہو گیا ہے؟) تنولی بھائی ناراض نہیں ہونا، آپ فون پر بہت کچھ کہیں گے اور آپ کو حق بھی ہے۔ طاہرہ گلزار باجی، قاسم رحمان سب دوستوں سے دلی معذرت، ہوسکتا ہے یہ خط بھی بلیک لسٹ ہو جائے پر مجھے کوئی فکر نہیں آخری محبت نامہ ہے اور پھر ہم بھی ہو

جائیں گے دنیا کی بھیڑ میں گم۔ سب سے معافی کا طلب گار ہوں، پڑھنے والوں سے بھی اور ادارے والوں سے بھی۔ کبھی میری کوئی بات بری لگی ہو تو دل سے معاف کر دینا، بہت پیارا اور خوشگوار سفر رہا اور بڑی میٹھی یادیں وابستہ رہیں گی ماضی کی۔ جنہیں میں مزید آگے جا کر نا خوشگوار اور کڑوا نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا میں اپنے دل و دماغ..... اور حالات کو دیکھ کر جاسوسی و سسپنس کی محفل سے جدا ہو رہا ہوں۔ یہ ہمارا آخری محبت نامہ قبول کریں۔"
(ہمیں آپ کا یہ الوداعیہ خط بالکل قبول نہیں ہے۔ آئندہ محفل میں اپنے نفیس انداز بیان کے ساتھ شریک ہوں..... آپ سب کے دم سے محفل ہے، اس سے کنارہ کشی کسی طور قبول نہیں۔)

چوک سرور شہید سے **فاروق احمد کی پسند ناپسند** "جاسوسی دو برس سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ مجھے امید ہے آپ ضرور شائع کریں گے ورنہ میں دوبارہ لکھ ماروں گا۔ (یہ ہوئی ہے اسپرٹ..... شاباش!) سرورق میں رفتہ رفتہ جاسوسی پن نایاب ہو رہا ہے۔ البتہ کہانیوں میں تیز رفتاری آ گئی ہے۔ انگارے کو ہی لے لیجیے۔ کتنی تیز رفتاری سے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ آوارہ گرد تو اب بور کرنے لگی ہے، اسے اب ختم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ فاروق انجم کا انداز تحریر جداگانہ اور بے حد پیارا ہے۔ مرحوم مصنف کی تحریر محافظ اولین صفحات کی شاندار تخلیق۔ سعد کی بہادری کو سلام، اگر ایسے نوجوان اب بھی موجود ہوں تو حالات پاکستان پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ رنگوں نے اس بار کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا، حلیم فاروقی البتہ کہانی کے ساتھ انصاف کرتے دکھائی دیے۔ باقی تراجم وغیرہ سے تو مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لیے بس طبع زاد پڑھنے کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔"

گاؤں پھلکارا سے **بہادر خان لغاری کا محبت نامہ** "اپریل کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا، سرورق پر ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں پسٹل لیے مسکرا رہی تھی اور پیچھے ایک بندہ قہقہے لگا رہا تھا۔ سب سے پہلے خط پڑھے۔ بڑی بات ہے بھئی میرا بھانجا عابد حسین بھی جاسوسی میں خط لکھ رہا ہے۔ ارے بھانجے صاحب میں 10 سال سے نہیں بلکہ 20، 22 سال سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں، پر میرا خط لکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا پر عابد حسین نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ 2 نایاب ہیرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کاشف زبیر اور محی الدین نواب کے انتقال کا سن کر بڑا افسوس ہوا۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ لگتا ہے سجاول کی موت آنے والی ہے۔ پھر آوارہ گرد پڑھی۔ بے چارہ ہشام چھلکری افسوس شہزی ہشام کو بچا نہ سکا۔ لگتا ہے شہزی لولودش کے چنگل میں بری طرح پھنس گیا ہے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ دعا ہے اللہ پاک پاکستان کو امن کے دشمنوں سے بچائے اور پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے، آمین۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے **سید عبادت کاظمی کا صدمہ** "7 اپریل کو جاسوسی زبردستی میرے ہاتھوں میں تھما گیا کیونکہ اس دفعہ میرا لینے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ 19 مارچ کو میرے پیارے ابو جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تو زندہ رہنے کو دل نہیں کرتا بس سانسیں چل رہی ہیں، اسی کا نام زندگی ہے۔ دعا کریں کہ میں جاسوسی سے رشتہ برقرار رکھ سکوں، سر پر بہت بڑی ذمے داری ہے۔ اور کیا کہوں دکھ بہت بڑا ہے الفاظ کم۔ (ہمت سے کام لیں..... اللہ آپ کو صبر عطا فرمائے) سرورق خوب صورت تھا۔ سرورق حسینہ بہار کا پتا دے رہی تھی لیکن جب دل کے موسم اچھے نہ ہوں تو کوئی موسم اچھا نہیں لگتا۔ نادر سیال، سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے، آمین۔ مثال کو شادی مبارک ہو۔ عمران جونانی اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ معراج محبوب عباسی جناب پڑوسن اس کام میں ماہر ہیں وہ تو خودکشی کے ہاتھ پیر توڑ چکی ہیں۔ سید محی الدین اشفاق دعا کے لیے جزاک اللہ مگر ابو جان کو خدا نے بلا لیا ابھی تو میرے ابو ینگ تھے۔ طاہرہ گلزار روایتی آن بان کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ پرویز بلگرامی کی والدہ کا افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت نصیب فرمائے۔ عبدالجبار رومی کا تبصرہ زبردست تھا۔ سید شکیل کاظمی کیوں غائب تھے۔ کبیر عباسی، منظر سلیم، وڈے شاہ جی، طاہرہ گلزار، اکبر تاج، قاسم رحمان آپ سب کا بہت شکریہ۔ کال کر کے میرا غم کچھ ہلکا کیا، آپ جیسے اچھے دوستوں کا ساتھ ہوگا تو میرا حوصلہ بڑھے گا۔ ہمیشہ کی طرح انگارے سے اسٹارٹ کیا، عبدالرحیم کی موت افسردہ کر گئی اب تو اموات سے ڈر لگتا ہے۔ آوارہ گرد تو بہت تیز بھاگ رہی ہے۔ عابدہ کی رہائی ناممکن نظر آ رہی ہے۔ شہزی کرنل کی قید میں ہے خیر اچھی جا رہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر چھا گئے۔ آپ کی تحریریں لاجواب ہوتی ہیں۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"

سینٹرل جیل میانوالی بیرک نمبر 17 سے **سجاد خان آف موچھ کی فریاد** "ماہ اپریل کا جاسوسی ڈائجسٹ 9 تاریخ کو ملا جو کہ اچھی بات نہیں ہے اگر جلد ملتا تو اچھی بات ہوتی۔ سمجھ نہیں آتی پہلے میانوالی بک ڈپوز پر 2 تاریخ کو پہنچ جاتا تھا اب وہاں بھی 8 تاریخ کو آتا ہے خدا پاک بہتر جانتا ہے ماجرا کیا ہے میں تو جاسوسی کے لیے فریادیں کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح سرورق اچھا تھا اگر حسینہ کے ساتھ پستول والا آدمی نہ ہوتا اور بھی اچھا ہوتا۔ چینی نکتہ چینی میں سانحہ گلشن پارک کا ذکر دیکھ کر دل پریشان ہو گیا انشاء اللہ جلد معصوم لوگوں کو شہید کرنے والے ذلیل و رسوا ہوں گے۔ سب سے پہلے نواب محی الدین نواب اور کاشف زبیر کو اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ محفل یاراں میں داخل ہوئے۔ نادر سیال صاحب کو براجمان پایا۔ بادشاہو مبارکاں ہووے، نادر سیال بھائی آپ کو دیکھ کر تو لگتا ہے کہ آپ کی عمر 230 سال ہو گی پھر بھی سالگرہ مبارک ہو۔ نادر بھائی آپ کی وجہ سے کہیں آگ لگی ہے نہ ہی تپش ہے جناب کی غلط فہمی ہے ویسے آپ کسی مجذوب کی طرح دعائیں دیتے اچھے لگتے ہیں۔ نادر بھائی آپ کیا کیا نوش فرماتے ہیں مجھے پتا ہے۔ ایم عمران جونانی بھائی کا تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ معراج محبوب عباسی صاحب آپ کی عمر کی پختگی کا اندازہ تبصرے سے ہو رہا ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ کا تبصرہ محفل کی شان ہوتا ہے۔ خدا پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ لگتا ہے بلقیس خان تبصرے لکھ لکھ کر تھک چکی ہیں۔ سید عبادت کاظمی، عبدالجبار رومی انصاری بھائی میرے چار لیٹر محفل میں نہیں پہنچے

تو آپ نے ہمیں بھلا دیا۔ سب سے پہلے کاشف زبیر کی محافظ پڑھی، پسند آئی۔ سعد اور فرحت کی دلیری نے معصوم لوگوں کو بچا لیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے اچھی جا رہی ہے۔ رحیم کی موت نے افسردہ کر دیا۔ آوارہ گرد میں شہزی فی الحال مشکل میں ہے لیکن جلد نکل جائے گا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ آخر میں دوستوں کی نذر ایک شعر

یہ اندھیرے تو سمٹ جائیں گے ایک دن اے دوست
پھر تمہیں یاد آئے گا مجھ سے گریزاں ہونا

جہلم سے **مثال اینڈ نوال کی کہانی** "سب سے پہلے تو جناب محی الدین نواب اور جناب کاشف زبیر کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کی فیملی کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ اس بار جاسوسی آیا۔ 7 اپریل کو ہمیں ملا۔ 8 اپریل کو جب ہم سب امی کے گھر دعوت پر آئے تھے۔ ہم اپنے گھر اور جاسوسی سے ملنے کو بے تاب تھے۔ امی کے گھر میں گئی تو مثال پہلے سے موجود تھی اور جاسوسی پڑھ رہی تھی اور ساتھ اس کے میاں بھی..... تبھی میں نے کہا کہ مجھے دو تو بہت مشکل سے دیا اور ہمارے ہاتھ سے ہمارے میاں جی لے اڑے اور پانچ منٹ بعد واپس بھی کر دیا کیونکہ وہ پورے ڈائجسٹ میں سے صرف کترنیں پڑھتے ہیں۔ ہم نے شکر کیا کہ واپس ملا پھر جاسوسی کا سرورق دیکھا تو امی کا حکم آ گیا، پہلے کام پھر جاسوسی، پھر کیا تھا، کام ختم کیا اور جاسوسی لے کر بیٹھ گئی۔ کھانے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ سرورق دیکھا، جاسوسی پڑھا اور ابھی 11 اپریل کو خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ سرورق اچھا تھا کیونکہ اس میں کوئی اچھا رنگ نظر آیا۔ سبز رنگ میرا فیورٹ ہے نا اس لیے، لڑکی بہت پیاری لگی اور اس کی بیک میں جو صاحب تھے، وہ ذرا نہیں بھائے۔ اس کے بعد محفل میں انکل کو پڑھا اور سانحہ لاہور کا دکھ پھر تازہ ہو گیا۔ را کا ایجنٹ جو پکڑا گیا، اس کا خبروں میں سنا تھا پر ہماری حکومت کو نہ جانے کب ہوش آئے گا۔ محفل میں سب سے پہلے نادر سیال نظر آئے۔ میری طرف سے آپ کو سالگرہ مبارک ہو بہت بہت اور بھائی آپ کے یاد کرنے کا شکریہ اور دعاؤں کا بھی اور ہماری مثال غائب نہیں ہو گئی ہیں نوال جو ہے اس کو واپس لانے کو۔ ایم عمران جونانی یاد آوری کا شکریہ۔ تبصرہ اچھا تھا۔ معراج محبوب عباسی ہم خوش ہی ہیں اور وہ بھی اپنے خرچ پہ۔ آپ کا تبصرہ جاندار تھا۔ ہارٹ کیچر آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ طاہرہ گلزار شکریہ کس بات کا؟ آپ بہن ہیں تو آپ کو یاد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے کاشف زبیر کی محافظ پڑھی، پڑھ کر دل خوش ہوا کہ پاک سرزمین کے محافظ ہیں جو اس وطن کے لیے جان قربان کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔ موزے کی گواہی بھی اچھی رہی۔ شاطر میں مجرم بہت شاطر نکلا۔ انگارے میں شاہ زیب ابھی تک قید ہے۔ نہ جانے کب سیالکوٹی کے چنگل سے نکلے گا تاجور بے چاری بہت برے حالات کا شکار ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی کو راوالے لے گئے اور شہزی کی ہمت کی داد دینی پڑی کہ وہ واقعی ایک بہادر سپاہی کا بیٹا ہے۔ سرورق کے دونوں.. رنگ اچھے تھے۔"

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے **رانا حبیب الرحمن کی عجلت پسندی** "ڈاکر انکل پرانے ٹائٹل ختم کر کے نئے جاندار ٹائٹل بنائیں۔ محفل میں سب سے پہلے نادر سیال صاحب ایسے سوال کرتے نظر آئے جیسے ان کو کسی بات کا علم نہیں اور یہ نئے نئے آئے ہیں اور ابھی تک ڈائجسٹ کی دنیا سے دور ہیں، امید ہے سب سمجھ گئے ہوں گے۔ ایم جونانی صاحب کہانیاں قتل ہونے سے پہلے ہی شروع ہوتی ہیں سمجھے۔ معراج عباسی، آپ کا تبصرہ بے حد پسند آیا، مزاح سے بھرپور۔ اشفاق محی الدین اور ہارٹ کیچر بھی اچھا تبصرہ کر رہے تھے۔ میری دوست محترمہ طاہرہ گلزار آپ کو ایک ماہ بعد سالگرہ مبارک اور آپ سے معذرت بھی چاہتا ہوں کیونکہ آپ کو میری مجبوریوں کا پتا ہے اور اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوسرے دوست کی خامیوں کو نظرانداز کرے اور اچھائیوں کو مدنظر رکھے۔ مثال صاحبہ شادی مبارک ہو اور نوال صاحبہ آپ کے تبصروں کا انتظار رہتا ہے۔ خوب تر لکھا کریں۔ رضوان تنولی غائب کیوں ہو گئے؟ نازپری، العیلی، سعدیہ بخاری سب صنفِ نازک حاضری دیں۔ باقی آوارہ گرد اور انگارے اور براوقت اچھی اسٹوریز تھیں، باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

ملتان سے **شیخ وقار احمد کی گستاخی** "آپ کے زیادہ تر قاری خاموش قاری ہیں۔ میرا تعلق بھی خاموش قاری گروپ سے ہے۔ آج سے تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے میرا تعلق آپ کے جریدوں سے جڑا تو اس وقت یہ نوخیز محبت سولہ سال کی الھڑ اداؤں سے مزین تھی۔ جاگنے اور کاغذ قلم سے استفادہ کرنے کی وجہ جناب طاہر جاوید مغل صاحب ہیں۔ انگارے کی تپش نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ مغل صاحب کو جذبات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر احساسات کی نازک گرہیں کھولنے میں کمال حاصل ہے۔ کئی دفعہ اور کئی مقامات پر تو انہوں نے شاہ زیب کی جگہ جا کھڑا کیا۔ اور اس ماحول سے واپس آنے کے لیے کافی کوششیں کرنی پڑیں، اگر محفل میں شرکت کی جرأت کر ہی لی ہے تو باقی کا تبصرہ کرنے کی گستاخی بھی قبول کر لیں۔ مرحوم کاشف زبیر کی محافظ کے استقبال نے ان کے ہمیشہ کے لیے کھو جانے کا غم تازہ کر دیا۔ بہت اچھی اور موجودہ حالات کے تقاضوں کو پورا کرتی کہانی تھی جس میں مصنف کی گرفت کہیں کمزور نہیں پڑی۔ تنویر ریاض کی موزے کی گواہی نے میری سراغ رسانی کی پوشیدہ صلاحیت اس وقت نمایاں کر دی جب آغاز سے ہی انجام کا اندازہ ہو گیا۔ سلیم انور کی شاطر بس خلا پر کرنے کے کام آئی۔ مریم کے خان کی براوقت نے موت کا ایک دن معین ہے کا یقین دلا دیا۔ جمال دستی کی بھینٹ ایک دلخراش کہانی تھی۔ ضعیف الاعتقادی تو ہمارے معاشرے کا بھی ناسور ہے اور آئے دن بھیانک سے بھیانک واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس پس منظر پر بھی کوئی طبع آزمائی کرے۔ سیریناراض کی رقابت بھی ایک دلچسپ کہانی تھی مگر سارہ کو سزا کافی تاخیر سے ملی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد میں غیر ضروری الفاظ کی بھرمار تھی۔ منظر امام کے ہاں اب موضوعات کی قلت محسوس ہونے لگی ہے۔ انہیں جاندار موضوعات کی اشد ضرورت ہے۔ محمد فاروق انجم کی خوابیدہ عذاب کافی افسانوی کہانی تھی۔ شکیل صدیقی نے ذات بدذات میں نئے

پرانے افسانوں کو کانٹ چھانٹ کر پہلے رنگ کو رنگوں کا مجموعہ بنا دیا۔ سلیم فاروقی کی وحشت گرد بچوں کا جاسوسی ناول محسوس ہوئی جو کہ بڑے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ چیزیں اتنی بھی سادہ نہیں ہیں اگر ہوتیں تو حالات کب کے سنبھل جاتے اور آئے روز ہمیں اتنا نا قابلِ تلافی نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ ایک عمدہ شمارہ تھا۔ ایک اچھی تفریح جس کے لیے آپ داد کے مستحق ہیں۔“

کورنگی، کراچی سے محمد خواجہ کی تنقید نگاری ”جاسوسی ماہنامہ اپریل معمولی تاخیر سے ملا۔ 2 یا 3 دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن انتظار کی گھڑیاں اور شوق کی بے تابیاں بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ سرورق پر ایک حسینہ جو چہرے اور آنکھوں سے بہت چالاک نظر آرہی تھی اس کے پیچھے ایک مکروہ غنڈا جس کے ہاتھ میں پستول وہ بھی حسینہ کے بالوں میں داخل ہوتا ہوا۔ چیتی نکتہ چینی میں افسوسناک واقعہ لاہور کا ذکر ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آنکھ سے آنسو تو ایسے بے شمار واقعات نے خشک کر دیے۔ خطوط کی محفل بھی کیا خوب ہے۔ ہر دوست کے جذبات، احساسات اور عمدہ تبصرے رسالے کی جان ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک خط کچھ تو میٹھے میٹھے شکوے، گلے۔ انگارے، ایک عظیم داستان، میں جب شروع کرتا ہوں تو دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔ مصنف کا طرزِ بیان، تیزی سے بدلتے حالات اور منظر کشی کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ رسالے کی جان ہے۔ ایک شخص کی بہادری، جفاکشی لہو گرم کر دیتی ہے۔ آوارہ گرد، رسالے کا دوسرا دلچسپ ترین سلسلہ، شہزی کا کردار، اس پر پڑنے والی آفتیں، اس کا عزم اور دل گردہ کیا بات ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا حادثہ ایک بڑی مصیبت اور ان سے نمٹنا اور ایک نئی مصیبت میں قدم رکھنا۔ منظر کشی ایسی کہ ذہن محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم میں اتنی چابکدستی اور ذہن میں غیب سے آمد ہونے والے واقعات کو کاغذ پر منتقل کرنا، ہر ایکشن کی بھرپور عکاسی کہ آنکھوں کے آگے ایک فلم سی چل رہی ہو۔ محافظ، ہمارے ملک کے گزرتے حالات سے مناسبت رکھتی ایک لاجواب کہانی۔ ایک مجاہد جو گھر کے حالات کے ساتھ دہشت گردوں سے بھی نبرد آزما تھا۔ حب الوطنی کا جذبہ رکھنے والے کا خدا ہمیشہ ساتھ دیتا ہے اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ بہت عمدہ اور دلچسپ تحریر قابلِ تحسین۔ موزے کی گواہی، ایک قتل اور خودکشی کے درمیان لٹکی جاسوسی کہانی ایک گہری نظر نے موزوں کو دیکھ کر معاملہ حل کر دیا۔ شاطر، جرائم کی دنیا کے کرداروں کی باہمی کشمکش، جس کی بازی چل گئی وہ جیت گیا۔ ایک کہانی جس کو مزیدار بنانے کی کوشش کی گئی۔ براوقت، ایک پراثر کہانی۔ زمین کی گندگی سے اٹھ کر آسمان پر پہنچنے والے شخص کی کہانی۔ اتنی بلندی پر پہنچنے کے لیے جرائم کا سہارا لینے والے شخص کا دردناک انجام۔ ایک ایسی حماقت جو بے صبرے پن کی بنیاد پر کی گئی اور وہی غلطی موت کا باعث بن گئی۔ بھینٹ اور رقابت، دونوں کہانیاں جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن دونوں میں الجھی ہوئی داستانیں ہیں۔ کہیں کہیں بوریت کا احساس ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ انوکھا منصوبہ، ایک قیمتی تصویر کی چوری، اور چالبازیوں سے نقل بنا کر بہت پیسہ بناتے ہیں۔ آخر میں جعلسازی کی دولت برباد ہو جاتی ہے۔ اصل تصویر کسی کو مل جاتی ہے۔ پادریوں کی جعلسازی بھی سامنے آتی۔ ایک بے مزہ کہانی۔ تانا بانا جوڑ کر ایک کہانی کی تکمیل کی گئی۔ کوشش کے باوجود مزہ نہ دے سکی۔ ہو سکتا ہے کچھ قارئین کو پسند آسکتی ہے۔ خوابیدہ عذاب، ایک شخص صرف دشمنی کی بنیاد پر ایک اچھے گاہک کو پلاٹ فروخت نہیں کرتا اور عجیب خواب دیکھتا ہے۔ اس کی بیوی ایک سمجھ دار عورت تھی وہ وقت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے لیکن احمق شخص اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ نفرت کی انتہا ایک شخص کو اتنا احمق بنا دیتی ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ سب کچھ کھو دیتا ہے۔ اس کہانی کو بچوں کی طلسماتی کہانی کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔ کوئی تانا بانا نہیں، بے شمار جھول ہیں جس نے کہانی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ ذات بدذات، ایک دلچسپ اور سسپنس سے بھری کہانی، مجرمانہ چال جو بڑی خوب صورتی سے بنا گیا۔ آخر تک اصلی مجرم پوشیدہ رہا۔ وہ ہر وقت سامنے رہا لیکن آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا۔ مگر برائی برائی ہے۔ آخر مجرم کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ مصنف نے آخر تک کہانی کو دلچسپ بنائے رکھا۔ وحشت گرد، آخری کہانی، ملک میں بدامنی، عیار دشمنوں کی بڑی دیرپا پلاننگ اور ہماری بے خبری ایک بہت بڑا سانحہ تھا، ہے اور آئندہ بھی ایسا ہونے کا خوف۔ چند لوگوں کی چالبازی نے اتنی پختہ پلاننگ اور دہشت گردی کو خاک میں ملا دیا۔ کیا یہ ہماری فورسز کی بے بڑائی ہے یا بے خبری کہ دشمن کو اتنا منظم ہونے کا موقع ملا۔ یہ خدا داد مملکت ہے۔ خدا اس کا حامی و ناصر ہے اور ہمیشہ رہے، آمین۔“

کراچی سے ادریس احمد خان کی سیاحت کے قصے ”جاسوسی ڈائجسٹ کا حصول 6 اپریل کو ہوا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا جس میں بلاشبہ ذاکر صاحب کی کاوشوں کا دخل ہے۔ پچھلے ہفتے لاہور اور راولپنڈی جانا ہوا، دونوں جگہ ڈائجسٹ نہیں مل سکا۔ کراچی آکر ہی ملا۔ ایک عرصے بعد کراچی سے باہر جانا ہوا بہت اچھا لگا۔ موسم بھی خوش گواریت لیے ہوئے تھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا۔ اس کے درمیان گندم کی فصل تیار تھی۔ کئی جگہوں پر کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ بہت سی جگہ گندم کے پودے ڈھیر کی شکل میں زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ مانو ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا ہوا اور یہ سچ بھی ہے کہ کسان کے لیے اس کی فصل سونا ہی ہوتی ہے جس کے لیے وہ خون پسینا بہاتا ہے اس کو پروان چڑھاتا ہے۔ لاہور سے پنڈی کا سفر اور بھی زیادہ پر لطف ہوتا ہے۔ سرسبز پہاڑ، دریا دیکھ کر روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ بیچ بیچ میں پہاڑی سرنگیں غرض ٹرین کا سفر بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ بمقابلہ روڈ کے ذریعے سفر کرنے میں جس سے بوریت اور شدید تھکن کا احساس زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لمبی تمہید کے بعد اب آتے ہیں اصل مدعا کی طرف۔ اندر چیتی نکتہ چینی میں سب سے پہلے اداریے سے استفادہ کیا۔ ناموں کی فہرست میں نادر سیال نظر آرہے تھے سو مبارک۔ نئے پرانے دوستوں کی بھی بھرپور حاضری نظر آرہی تھی۔ جناب پرویز بلگرامی کی والدہ کے لیے دعائے مغفرت، ان کو اللہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ آگے کہانیوں میں محافظ پر نظر پڑی ساتھ ہی کاشف زبیر کا نام کہانی پر پڑھ کر مزہ آگیا۔ سعد نے وطن کا حق ادا کر دیا۔ کاش پاکستان میں ہر شخص سعد جیسا بن جائے کہ مرتا ہے تو وطن کے لیے جیتا ہے تو وطن کے لیے۔ موزے کی گواہی میں انتہائی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈیتھ انویسٹی گیٹر نے ملزم کی نشاندہی کر دی۔ پولیس والے منہ دیکھتے رہ گئے۔ براوقت میں جونی براؤ نے موت سے بچنے

کی حتی الامکان کوشش کی مگر موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ چاہے وہ کتنی ہی کوشش کر لے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانی ہے جس میں بندہ پڑھنے میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اور کسی طرف دھیان نہیں جاتا۔ آوارہ گرد بھی دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ کہانی کا دائرہ کار اب انڈیا کا جا پہنچا ہے۔ متوالا بھی بہت اچھی لگی۔ چرواہے نے دنیا کی دولت کو ٹھوکر ماردی محض اس بنا پر کہ اس کی آواز اس کی مرحوم محبوبہ کی امانت ہے۔ انوکھا منصوبہ بھی اچھی تحریر تھی۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیوں نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔“

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی روداد ”جاسوسی 2 اپریل کو مسرور بیس میں ملا۔ سرورق کو صنفِ نازک اور صنفِ وجاہت سے سجایا گیا۔ بہرحال صنفِ نازک مجھے تو شاہ جی کی پڑوسن لگ رہی ہے اور کافی خطرناک تیور ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ دکانیں سجانا آسان ہوتا ہے لیکن عملی قدم بہت مشکل۔ لاہور میں جو کچھ ہوا دل کو دکھی کر گیا۔ اپنی محفل میں آئے بھائی نادر کو دیکھا بہت خوشی ہوئی۔ عمدہ تبصرہ نادر بھائی۔ بات لفظوں میں لکھنے کی نہیں ہوتی بلکہ دل میں رکھنے کی ہوتی ہے اور آپ میرے دل میں ہو۔ جوتانی صاحب کی بھی اچھی کارکردگی۔ معراج محبوب عباسی آپ نے بالکل ٹھیک کہا نظام بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا خود کو بدلنا ہوگا، نظام خود ٹھیک ہو جائے گا۔ سید محی الدین اشفاق کی بھی عمدہ انٹری۔ ہارٹ کچر کا خوب صورت انداز میں تبصرہ۔ محمد انعام شاید آپ ٹھیک ہوں کہ تعلیم حاصل کر کے بھی نوکری نہیں ملتی پر میرے نزدیک تعلیم اللہ تعالیٰ کے احکامات اور انسانیت سیکھنے کے لیے ہوتی ہے باقی رزق اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے جس کو جتنا دے۔ بھائی عابد حسین لغاری آپ کی ذرہ نوازی ہے باقی کبھی بلیک لسٹ میں بھی آنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اوروں کو بھی تو موقع ملنا چاہیے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی بہترین رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محترم کاشف زبیر مرحوم کی محافظ پڑھی۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ سعد تو ملک کے لیے جان لڑا رہا تھا پر فرحت کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ جب خود پر بنی تو اسے پتا چلا کہ سعد بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔ سعد جیسے کئی نوجوان ہیں ہمارے جو فضائی اور زمینی دونوں طریقوں سے دشمن کو خاک چٹا رہے ہیں۔ ہم پر عزم ہیں کہ جلد ملک پاکستان امن کا گہوارہ ہوگا۔ تنویر ریاض موزے کی گواہی لے کر آئے۔ انجیلا رچ مین نے بہت عمدہ طریقے سے کیس کو حل کیا۔ سلیم انور کے قلم سے شاطر نکلی۔ گیلارڈی نے اچھی چال چلی۔ اسے کہتے ہیں سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مریم کے خان براوقت لے کر آئیں۔ عمدہ پیرائے میں لکھی بہترین تحریر تھی۔ انگارے کی دسویں قسط بہت اچھی رہی جہاں شاہ زیب کو کئی اہم راز معلوم ہوئے۔ اس نے سیالکوٹی کے ٹکڑے بندے کو شکست دے کر سیالکوٹی کو بھی مقابلہ کی دعوت دی۔ تاجور کا بھی کچھ کرنا، اگلی قسط کا انتظار ہے جس میں شاہ زیب قید سے نکل جائے گا کیونکہ اس کے تن بدن میں آگ لگ چکی۔ جمال دتی بھینٹ لے کر آئے۔ جہاں پر والد نے کاروبار بچانے کے لیے اپنے بیٹے کو قربانی کا بکرا بنایا پر مناتسی نے اس کا خواب چکنا چور کر دیا۔ سیر یناراض کی رقابت بھی اچھی رہی۔ منظر امام کی متوالا بھی بہترین تحریر رہی۔ واقعی متوالے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ بکنے والے نہ جھکنے والے۔ علی اسد کی انوکھا منصوبہ میں کام تو سب نے غلط کیا پر ارادے نیک تھے کہ فلاحی ادارے قائم کر کے عوامی خدمت۔ محمد فاروق انجم خوابیدہ عذاب لے کر آئے، اس کے ہاتھوں اس کی بیوی قتل ہوئی۔ بیوی کو کس نے کہا تھا کہ لالچ میں آئے۔ اچھی تحریر تھی۔ ارشد بیگ کی نامراد بھی اچھی رہی۔ شکیل صدیقی کی ذات بدذات دولت کے لالچ انسان سے کیسے کیسے کام کرواتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کو دیکھ لیجیے۔ ساتھ میں مادھوری جو پڑا اور نرگس سب لالچ کی بھینٹ چڑھ گئے پر کسی کے کام نہ آئی وہ دولت۔ سرورق کی دوسری کہانی سلیم فاروقی کے قلم سے وحشت گرد پاکستانی نوجوان کی عزم اور حوصلے کی بہترین مثال، دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے دانیال نے۔ وہیں نوید نے بھی اپنا کام کیا۔ دونوں نے ملک پر جان دے دی۔ ارسلان کا کردار بھی بہت عمدہ رہا۔ آخر بریگیڈیئر صاحب کی انٹری بھی اچھی رہی۔“

فتح پور لیہ سے محی الدین اشفاق کی تعریفیں ”ٹائٹل گرل نادر سیال کو اول نمبر پر آنے پر مبارک باد دے رہی تھی۔ مدیرِ اعلیٰ نے بہت واضح انداز میں دہشت گردی کے واقعات کی تشریح کی ہے اسی وجہ سے اصل لوگ جو کہ ماسٹر مائنڈ ہوتے ہیں، وہ سامنے نہیں آپاتے۔ معراج محبوب صاحب یہ ترقی بھی ہے اور تبدیلی بھی ہے۔ ہارٹ کچر صاحب بڑا دل نشین قسم کا تبصرہ تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ شکریہ اینڈ آپ کی بات سے متفق ہوں۔ عابدہ اور شہزی کی شادی ہو۔ حالات کی گرمی کبھی بھی انسان کو کم گو بھی کر دیتی ہے۔ رومی انصاری اپنی پارٹی کے ہو کر صنفِ وجاہت کو صنفِ کرخت کیوں کہتے ہو جناب! اولین کہانی نے کاشف زبیر کو پھر سے زندہ کر دیا ہے وہ تحریروں کے ذریعے سے ہمارے اندر زندہ رہیں گے۔ انگارے میں ماؤجی اور اس کی پوتی مائی دونوں کا کردار دلچسپ ہے۔ آخر کار سجاول نے شاہ زیب کو پہچان لیا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ساتھ ہی سجاول کی دائیں ہاتھ کی غیر معمولی طاقت والی بات نے بہت دلچسپی بڑھا دی ہے۔ خط کا معما بھی حل ہو گیا۔ باقرے اور شاہ زیب کا دنگل بہت پسند آیا۔ عالمگیر تیری اب خیر نہیں ہے۔ ہمارا شاہ زیب آرہا ہے تیری گردن پکڑنے۔ اگر میں یہ کہوں کہ کافی عرصے کے انتظار کے بعد جاسوسی میں دونوں قسط وار کہانیاں مقابلے کی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ آوارہ گرد میں شہزی فل ایکشن میں ہے اور اب تو اس کو کو ہارا جیسے کردار کا بھی سامنا ہے جو کہ بشام کو بھی ختم کر چکے ہیں۔ ان کے ذریعے سے بوٹ میں ہی شہزی صاحب انڈیا یاترا کر چکے ہیں۔ اب نئے محاذ اور نئے لوگوں کو شہزی کو سامنا کرنا ہوگا۔ سلیم فاروقی کی وحشت گرد بہت سنسنی خیز تحریر تھی۔ جاسوسی اب کی بار اور بھی زیادہ اچھا تھا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مرحا گل، دراہن کلاں۔ امجد عبداللہ، ساہیوال۔ محمد اقبال، کراچی۔ کاشف رفیق، حیدر آباد۔ سونیا جمشید، کوٹری۔ ہما انصار، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ راحیل علی، کراچی۔

برفیلا جہنم

امجد رئیس

الاسکا کے ہولناک برف زاروں میں بھٹکتی ہوئی دو بہنوں کی تحیّر انگیز داستان... وہ ایک دوسرے پر جان دیتی تھیں لیکن تقدیر کی گردش اور ستم ہائے دوراں نے انہیں جدا کر دیا... چاہت اور لگن کے ساتھ اپنے لہو کی خوشبو نے پھر ملا دیا اور انہوں نے عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی جدا نہیں ہوں گی لیکن مقدر کا لکھا کس نے اور کب جانا ہے... وہ دونوں شانہ بہ شانہ اپنے دشمنوں سے بقا کی خون ریز جنگ لڑتی رہیں کیونکہ پسپائی ان کی سرشت میں ہی نہیں تھی... ایک طرف موسم کی جان لیوا سختیاں... برفانی طوفان دوسری طرف خون کا پیاسا دشمن... نئے ماحول ایک نہ بھولنے والی کہانی... جس کی ہر سطر قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے...

برفیلے جہنم میں زندگی اور موت کا ہولناک تصادم... عزم و ارادوں کی فتح و شکست...

وقت نصف شب سے آگے جا رہا تھا..... لزا کی حالت ابتر تھی، وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ قاتلوں کے آگے بھاگتے ہوئے لزا کو پانچ گھنٹے بیت گئے تھے..... مزید یہ کہ طوفان تھمنے کے آثار مفقود تھے۔ یخ بستہ کاٹ دار ہوائیں اسی شدت کے ساتھ چنگھاڑ رہی تھیں۔ درجۂ حرارت گرتے گرتے منفی بیس فارن ہائٹ تک چلا گیا تھا۔ الاسکا جیسے سرد ترین علاقے میں بھی، منفی بیس غیر معمولی تھا۔ تاہم طوفان کی نوعیت لزا سے کہہ رہی تھی کہ اسے منفی تیس فارن ہائٹ تک جانا چاہیے۔

خود کو گرم رکھنے کی اس کی تمام تر کاوشیں ناکامی سے ہمکنار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ جلد از جلد اسے کسی پناہ گاہ تک پہنچنا تھا۔ لزا اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھی کہ وہ اور اس کے کُتّے موت کے منہ میں ہیں۔ غراتی، گرجتی بادِ زمہریر کے شور میں برفانی گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں حسِ سماعت تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ لیکن لزا کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کے تعاقب میں آنے والے زیادہ دور نہیں ہیں۔

یمی آٹو میٹک اعشاریہ پینتالیس کے فائر کی گونج ابھی تک اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ فائر کرنے کے بعد مخصوص برفانی کیموفلاج سفید رنگ کے لباس والا لزا کی طرف گھوما تھا۔ اگر لزا کے دونوں ''ہسکی'' HUSKIES (سرد علاقوں کے کتوں کی مخصوص نسل)، روسکو اور موک نہ ہوتے تو لزا ماری گئی تھی۔

روسکو اور موک کی وجہ سے نہ صرف وہ بال بال بچی بلکہ فرار ہونے میں بھی کامیاب رہی۔ مت سوچو۔ لزا! گزرے واقعات کے بارے میں مت سوچو...... اپنی توجہ جان بچانے پر مرکوز رکھو۔

لزا اپنی گھٹتی ہوئی توانائی کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ معاً اسے منجمد دریا کے آثار نظر آئے۔ لزا نے آگے جانے کے لیے کتوں کو ہشکارا۔ گزشتہ ہفتہ کم درجۂ حرارت پر دریا کی یہ حالت نہیں تھی۔ تاہم اس وقت دریا مکمل ٹھوس حالت میں تھا۔ لزا کو یقین نہیں تھا کہ بظاہر ٹھوس دریا، کتوں کا، اس کا اور برفانی قدمچوں کا وزن سہار لے گا۔ یہاں ایک دن سورج جھانکتا دکھائی دیتا تو اگلے روز برف اور بادلوں کے ساتھ سرد ہوائیں...... نگاہ کی رسائی کو محدود کر دیتیں۔ ہر شے سفید رنگت اختیار کر لیتی۔

بہرحال منجمد دریا کی موجودگی سے لزا کو اپنی صحیح لوکیشن کا اندازہ ہو گیا۔ کتوں کی راسیں اس نے مضبوطی سے تھامی ہوئی تھیں، انگلیوں کے جوڑ اکڑ گئے تھے۔ ٹھنڈ، حفاظتی اشیا اور لباس کے باوجود ہڈیوں میں اتری جارہی تھی۔ چہرہ بے حس ہو گیا تھا۔ یہی حال ہاتھ پیروں کا تھا۔ رک کر سو جانے کی خواہش نہایت شدت اختیار کر گئی تھی۔ توانائی کا ہر ذرہ خرچ ہو چکا تھا۔ وہ محض قوتِ ارادی کے سہارے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے ہر صورت اپنے متعاقبین کو شکست دینی تھی۔ وہ ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی، اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنے وفادار کتوں سمیت دریا میں ڈوب کر فنا کی وادیوں میں گم ہو جائے۔

کتوں کے سہارے وہ اب دریا پر سفر کر رہی تھی۔ دریا کی ٹھوس سطح کتنی مضبوط ہے؟ اس اندیشے کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

اچانک علاقے کا انداز بدل گیا۔ وہ اب بلندی کی طرف جارہے تھے...... مشکل در مشکل...... روسکو اور موک رکے اور پلٹ کر اپنی نیم جان مالکن کو دیکھا۔ کتوں کی آنکھوں میں الجھن اور تکلیف تھی۔ وہ آرام کے طلبگار تھے۔

دفعتاً پتا نہیں کیونکر اینڈریا کی شبیہ لزا کے تصور میں در آئی۔ کاش ''اینڈریا'' اس کے ساتھ ہوتی تو وہ بہ آسانی اوپر تک پہنچ جاتے۔

اینڈریا! ہاں وہ اینڈریا تھی...... وہ سامنے کھڑی تھی۔ مردانہ انداز، مردوں کی طرح چوڑے شانے...... ایتھلیٹ کے مانند مضبوط و توانا جسم...... لزا نے رشک سے اپنی بہن اینڈریا کو دیکھا۔ بچپن کی یادوں نے یلغار کی۔ جب دونوں بہت چھوٹی تھیں۔ آپس میں کھیلتی تھیں اور لڑتی تھیں۔ لڑائی میں اینڈریا جیت جاتی تھی۔

چار سال قبل جب دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں تو الاسکا میں اینڈریا، لزا کے کیبن سے عالم اشتعال میں اس طرح نکلی کہ دونوں کے تعلقات آتش گیر عداوت کی نذر ہو چکے تھے۔

اس وقت اینڈریا برفانی طوفان سے بے نیاز کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لزا بھول گئی کہ وہ رونا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہن کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنی تھک چکی ہے...... وہ رو سکی نہ کچھ بول سکی۔ وہ گھٹنوں پر گر گئی۔ برف اس پر جمع ہونے لگی۔ اس کی نگاہ دھندلانے لگی، تاہم مسکراتی ہوئی اینڈریا اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

دونوں ہسکی اپنی تھوتھنی لزا کے پہلوؤں سے رگڑ رہے تھے۔ تاہم لزا کو مسکراتی ہوئی اینڈریا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

سڑکوں پر بھیڑ تھی۔ اینڈریا، آج کا کام نمٹا کر بارش میں ہی پیدل گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ دس منٹ بعد وہ گھر پر تھی۔

''میں پہنچ گئی ہوں۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''لباس تبدیل کر لو تو ملتی ہوں۔'' اندر سے ماں کی آواز آئی۔

اس کی ماں بائیولوجیکل سائنس کی پروفیسر تھی۔ پروفیسر جولیا میکال۔ اینڈریا تیار ہو کر بال خشک کرتی ہوئی، ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جولیا، بستر پر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھی تھی۔ اطراف میں پنسلیں اور ریفرنس بکس بکھری ہوئی تھیں۔ اینڈریا ٹھٹک کے رک گئی۔ کوئی گڑبڑ ہے یا اس کا وہم ہے؟ اس کی نظر ماں کے زرد چہرے پر گئی۔ اینڈریا کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔

طویل عرصے بعد اینڈریا نے ماں کی یہ کیفیت دیکھی تھی۔ آخری بار اس وقت، جب وہ لزا کے ساتھ اسکول سے

واپس گھر آئی تھی اور دونوں بہنوں پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ ان کا باپ کسی اور عورت کی خاطر ان کی ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ وہ آسٹریلیا بزنس ٹرپ پر گیا تھا۔ واپسی پر اس کے ساتھ آسٹریلین فٹنس انسٹرکٹر تھی پھر تلخی...... آنسو...... اور جدائی......

حیرت انگیز طور پر باپ کے جانے کے بعد گھر کی فضا پرسکون ہو گئی۔ بعدازاں جولیا نے بیٹیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ باپ سے رابطہ رکھ سکتی ہیں لیکن دونوں بہنیں دل گرفتہ اور غصے میں تھیں۔ ان کے دل میں ایسا کوئی احساس نہیں بیدار ہوا کہ باپ سے رابطہ رکھا جائے۔

چار برس بعد آج ماں کی پھر ویسی ہی کیفیت تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اینڈریا نے بے ربط دھڑکنوں کے درمیان سوال کیا۔ ''آپ بہت پریشان ہیں؟'' وہ ماں کے قریب بیٹھ گئی۔

''لزا......'' جولیا کی آواز ٹوٹ گئی۔

''کیا ہوا لزا کو؟''

''اسے تمہاری مدد چاہیے۔''

اینڈریا، ماں کو تکتی رہ گئی، اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ چار برس بیت گئے تھے۔ اینڈریا اور لزا کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کیا ماں ان دونوں کے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کی خواہش مند ہے؟

اینڈریا بستر سے اٹھنے ہی والی تھی کہ اسے ماں کی سرگوشی سنائی دی۔ ''الاسکا سے پولیس کی کال آئی ہے کہ لزا لاپتا ہے۔''

اینڈریا نے دیکھا کہ ماں کا جسم لرز رہا ہے، وہ خود کو رونے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''اوہ مام۔'' اینڈریا نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ''آپ لزا کو جانتی ہو...... مجھے یقین ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں منظرِ عام پر آ جائے گی۔'' اینڈریا نے ماں کو تسلی دی۔

جولیا نے نفی میں سر ہلایا، وہ سسکیاں قابو کرنے کی کوشش میں الفاظ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ اینڈریا نے نرمی سے ماں کا ہاتھ پکڑا، ہاتھ کمزور اور سرد تھا۔ اینڈریا نے ہاتھ کو اپنے رخسار کے ساتھ لگا لیا۔ جولیا کے چہرے پر آبدیدہ اور نحیف مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے گہری سانس لی اور خود کو سنبھالا۔

''لزا، اسکائی جورنگ (SKIJORING) کے لیے نکلی تھی۔'' بالآخر جولیا نے پریشان لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''دونوں کتے اس کے ساتھ تھے۔ پہاڑوں میں انہیں خوفناک طوفان نے آ لیا۔ چار دن گزر گئے ہیں، لزا کا کوئی نشان نہیں ملا۔'' جولیا کی بائیں آنکھ سے ایک آنسو فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اینڈریا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''آپ مذاق......'' وہ تھم گئی۔

''ہفتے کے روز لزا نے اپنے دوست کے پاس پہنچنا تھا لیکن وہ نہیں پہنچی۔ اس کا دوست چند گھنٹے انتظار کر کے لزا کے کیبن تک گیا...... وہاں کچھ نہیں تھا۔ کچھ سامان اور کتے بھی غائب تھے۔''

''وہ اپنے کتوں کے ساتھ کسی بار میں رک گئی ہوگی۔ اس کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی کرنا دشوار ہے۔'' اینڈریا نے کہا۔

''اینڈریا، میں جانتی ہوں کہ تم اپنی بہن سے ناراض ہو لیکن وہ تمہاری بہن ہے، تم دونوں ہی میرا اثاثہ ہو۔ اس مرتبہ مجھے تمہاری ضرورت ہے کہ تم میری بات سنو...... لزا کے دوست نے ہی گمشدگی کی اطلاع دی تھی، وہ کوئی رینجر ہے۔ اسی نے متعدد افراد کو لزا کی تلاش پر مامور کیا ہے۔ تاہم مجھے شک ہے کہ مجھے پوری بات نہیں بتائی گئی ہے...... میری خواہش ہے کہ تم وہاں جاؤ اور لیک ایج کی پولیس سے رابطے میں رہتے ہوئے، حقائق معلوم کرو۔''

''لیک ایج؟'' اینڈریا کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ گریگ کے ساتھ رہنے کے لیے واپس ''فیئر بینک'' آ گئی تھی۔''

''ان دونوں میں علیحدگی ہو گئی ہے۔'' جولیا نے بتایا۔

اینڈریا کے دماغ میں غیر یقینی کی کھچڑی پکنے لگی۔ ماں دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

اینڈریا سوچ رہی تھی کہ لزا، لیک ایج میں ہی کیوں لاپتا ہوئی؟

''آپ چاہتی ہیں کہ میں لیک ایج کا سفر کروں؟''

جولیا نے بیٹی کو دیکھا، تاہم خاموش رہی۔ اس کی بولتی آنکھوں میں اینڈریا کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

''تھامس کا کیا ہوگا؟'' اینڈریا نے استفسار کیا۔ اینڈریا کا اشارہ لزا کے باس کی جانب تھا۔ باس، یونیورسٹی آف الاسکا، فیئر بینک میں مقیم تھا۔ ''کیا تھامس کو ناگوار نہیں گزرے گا کہ لزا کو فیئر بینک میں ہونا چاہیے تھا؟''

''نہیں۔'' جولیا نے ٹشو پیپر نکالا۔

''لیک ایج، طاقتور مقناطیسی میدان کے وسط میں

ہے۔ جہاں الاسکا یونیورسٹی والے تحقیق کرتے چلے آرہے ہیں۔لزا، فیئر بینک ہر ہفتے واپس آتی ہے۔ وہ کُل وقتی لیب ورکر نہیں ہے...... اسے کھلی فضاؤں میں کام کرنے سے محبت ہے۔ ویسے اس کا زیادہ تر کام کمپیوٹر پر ہوتا ہے۔'' جولیا کا رنگ اب بھی زردی مائل تھا۔ تاہم وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔

''پلیز اینڈریا، ہوسکتا ہے اس کی جان خطرے میں ہو...... ہوسکتا ہے، اس طرح تم دونوں پھر ایک ہو جاؤ...... تم دونوں کا خون ایک ہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ تمہاری منتظر ہو۔''

اینڈریا کے اندر بچپن کے غصیلے بچے نے انگڑائی لی۔ نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ اسے چار سال قبل پیدا ہونے والی تلخی یاد آئی۔ اینڈریا نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اس نے معاً لزا کو برفانی طوفان میں رینگتے دیکھا۔ اینڈریا نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ کیا واقعی خون، خون کو آواز دے رہا ہے؟

''میں جانتی ہوں، تم ہمیشہ سے ضدی رہی ہو۔''

''آپ یوں نہ سوچیں۔ مجھے صرف یہ مخمصہ ہے کہ میرے جانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟'' اینڈریا نے جواب دیا۔

''میں ماں ہوں...... میں پھر کہوں گی کہ لزا کو تمہاری ضرورت ہے، وہ تمہاری بہن ہے۔''

اینڈریا نے لوکل کونسل کے لینڈ اسکیپنگ پروگرام کے بارے میں سوچا، جہاں دریا کنارے وہ قدیم پارک کی نئی منصوبہ بندی میں مصروف تھی۔ وہ یقیناً اس کی غیر موجودگی پر شور کریں گے۔ ماں کی اینگزائٹی کو وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ اینڈریا کے پاس دوسری کوئی چوائس نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اینڈریا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں جاؤں گی۔''

جولیا کی آنکھوں میں اٹکے ہوئے آنسو دفعتاً پھسل پڑے۔ اس نے بیٹی کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''ڈارلنگ، تھینک یو۔''

☆☆☆

اینڈریا کا مضبوط بدن کپکپا اٹھا۔ اس نے کھڑے کھڑے جاگنگ کی۔ گلوز میں چھپے ہاتھوں سے ٹرٹل نیک سویٹر کو ٹھوڑی تک اوپر کھینچا۔ جہاز میں سامان لوڈ کرنے والے کے کان چھپے ہوئے تھے۔ اینڈریا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ خود اس کے کان سرد ہوا کی زد میں تھے۔ اس کا سویٹر اور واٹر پروف جیکٹ ناکافی تھے۔ دوسروں کے مانند اس کے جسم پر بھی فر، لائن پارکا ضروری تھا۔

اپریل کی مناسبت سے موسم اتنا سرد نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاہم سرما کے اواخر میں آنے والے طوفانوں نے موسم کے تیوروں پر ڈرامائی اثر چھوڑا تھا۔ اینڈریا نے پہلے کبھی ایسی ٹھنڈ محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بائے روڈ جانا چاہتی تھی لیکن موسم نے فلائنگ پر مجبور کردیا تھا اور اینڈریا بائی ائر جانے سے الرجک تھی۔ اس کے برعکس لزا کو فلائنگ سے لگاؤ تھا۔ لزا کی ایڈونچر پسند طبیعت میں گلائڈ، پیراشوٹ اور اسکائی ڈائیونگ شامل تھی۔ حالانکہ دونوں کی جسمانی ساخت میں نمایاں فرق تھا۔ اینڈریا کا ظاہر اور انداز مردانہ تھا۔ باوجود اس کے اینڈریا کے ایڈونچر ویلز کی پہاڑیوں میں گھومنے تک ہی محدود تھے۔ البتہ دونوں بہنوں میں مشترکہ چیز ان کی حوصلہ مندی تھی۔ اینڈریا نے اسکارف کے ذریعے منہ اور ناک کو چھپا کر دور پہاڑوں کو دیکھا۔ وہیں کہیں اس کی بہن پھنسی ہوئی تھی۔ ماں کے کمرے میں جب اس نے آنکھیں بند کی تھیں تو اسے لزا ناگفتہ بہ حالت میں نظر آئی تھی۔ یہ کیا تھا؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیا واقعی لزا مصیبت میں ہے؟

اینڈریا اپنا بیگ لے کر جہاز میں سوار ہوگئی۔ یہ ایک چھوٹا جہاز تھا۔ پائلٹ کا نام میک تھا۔ وہاں کُل تین ہی افراد تھے۔ میک اور اینڈریا...... تیسرے کے سامان سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کوئی ایکسپلورر تھا۔ اینڈریا کو اس جہاز میں سفر نہیں کرنا تھا لیکن اس کا مطلوبہ جہاز لیک اتیج کے لیے ایک ہفتے بعد روانہ ہوتا، چنانچہ اسے میک کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ میک، لمبے بال اور گھنی مونچھوں والا آدمی تھا۔ تیسری سواری کا نام وکٹر تھا۔ وکٹر کا قدوقامت اور انداز فوجی کے مانند تھا۔ اس کے انداز میں بھی غیر محسوس قسم کی جارحیت تھی۔

اینڈریا پہلے بھی اس علاقے میں جا چکی تھی۔ سائنس دانوں کے ایک گروپ کے ساتھ دو مہینے اینڈریا نے وہاں گزارے تھے۔ چارٹرڈ ہیلی کاپٹر روز ان کی ٹیم کو ''لیک اتیج'' سے ''بروک رینج'' لے جاتا تھا۔ جہاں وہ ریسرچ کے لیے کیمپنگ کرتے اور شام میں واپس آجاتے۔ اس دوران میں وہ کال نامی شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ کال، پیشہ ور شکاری اور جنگلی حیات کا ماہر تھا۔ ماضی کے دو مہینوں کے تصور نے اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑادی۔

جہاز کو فضا میں اُڑتے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ جب بھی جہاز کی چال میں فرق آتا، اینڈریا کے ذہن میں یہی خدشہ سر اٹھاتا کہ یہ کھلونا نما جہاز اب گرا کہ تب گرا......

اس وقت وہ تمنا کرتی کہ کاش وہ اپنی نڈر بہن کے مانند ہوتی۔ لزا کے لیے ایڈونچرز کھیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ لزا کا شعبہ طبعیات اور ریاضی تھا۔ لزا کے تحقیقاتی معمے اینڈریا کے سر پر سے گزرتے تھے۔ اینڈریا کے کام کی نوعیت عملی تھی، جس میں جسمانی محنت کا بھی دخل تھا جبکہ لزا سائنس کے ذریعے تصورات کو حقیقت کا روپ دینے کی جستجو میں رہتی تھی۔

اینڈریا پتا نہیں کب خوابیدہ حالت میں چلی گئی۔ معاً میک نے اسے بیدار کیا۔ جہاز نیچے کی طرف جا رہا تھا۔

"وکٹر کا ٹھکانا قریب ہے۔" اس نے بتایا۔

میک نے وکٹر کو مع ساز و سامان اور رائفل کے ایک ویران برفستاں میں اتار دیا۔ وہاں درخت کے تنوں سے بنے ایک چھوٹے کیبن کے سوا کچھ نہ تھا۔ اینڈریا کو حیرت ہوئی کہ وہ اس ویران جگہ پر کیا کرنے آیا ہے؟

اینڈریا کو خیال گزرا کہ آئندہ شاید ہی اس کی ملاقات اس اکھڑ شخص سے دوبارہ ہو۔ میک نے انجن بند کیے بغیر دوبارہ ٹیک آف کیا۔ رخ مغرب کی جانب تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ لیک ایج کے اوپر تھے۔ ماضی کی یادیں پھر اینڈریا کے ذہن میں کھلبلی مچانے لگیں۔ اینڈریا نے نیچے دیکھا۔ دو پہاڑوں کے درمیان ایک گہری وادی تھی۔ وادی کی جھیل منجمد حالت میں تھی۔

☆☆☆

اینڈریا بغلوں میں ہاتھ دیے کھڑی تھی۔ اس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ چند عمارتیں، شیڈز اور درخت...... کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی کار نہ کوئی برفانی مشین...... ہُو کا عالم تھا۔ میک نے اینڈریا کا بیگ اس کے حوالے کیا اور جانے کے لیے ہاتھ ملایا۔

"تم رکو گے نہیں۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔ کیسے واپس جاؤ گے؟"

"نکل جاؤں گا۔" وہ مڑا۔

اینڈریا نے اسے روکا۔ "پولیس اسٹیشن کا تو تمہیں علم ہوگا؟"

"قریب ترین، تمہیں "کولڈ فٹ" میں ملے گا، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹروپر "ڈیمارکو" پہنچنے والی ہوگی۔ امید ہے، تمہاری بہن تمہیں مل جائے گی۔"

"مجھے بھی امید ہے، شکریہ۔"

میک، گڈ لک کہہ کر مڑ گیا۔ ذرا دیر میں اس کا چھوٹا جہاز فضا میں بلند ہو کر غائب ہو گیا۔ اینڈریا وہاں تنہا کھڑی رہ گئی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اسے گاؤں کا رخ کرنا چاہیے۔ اچانک ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"مس میکال؟" یہ سوالیہ آواز تھی اور قریب سے آئی تھی۔

اینڈریا میکال نے رخ پھیرا۔ وہ اپنی فیملی میں سب سے مختلف تھی۔ اسی لیے آواز دینے والی کی آواز میں سوال کا عنصر شامل تھا۔ فیملی البم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اینڈریا اپنی نارویجیئن پردادی پر گئی تھی۔

"یس، اینڈریا میکال۔" اینڈریا نے وردی میں ملبوس خاتون ٹروپر پر نظر ڈالی۔ وردی گہرے نیلے رنگ کی تھی۔ بالائی لباس پر سنہری پٹیاں بھی نمایاں تھیں۔ جیبوں کی تعداد کافی سے زیادہ تھی۔ ایک کولہے پر گن اور دوسرے پر واکی ٹاکی نظر آ رہا تھا۔

"میم۔" وہ بولی۔ "میں ٹروپر ڈیمارکو ہوں۔"

"ہائے۔"

"امید ہے، سفر ٹھیک رہا ہوگا۔" ڈیمارکو کی ذہین آنکھیں اینڈریا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اینڈریا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں فیئر بینک سے ہیلی کاپٹر پر آئی ہوں۔ یہاں کے باشندے کھلے دل کے ہیں۔ مجھے ایک کار مل گئی۔"

اینڈریا نے ڈیمارکو سے نگاہ ہٹا کر فورڈ ایکسپلورر کو دیکھا۔

"میں فی الحال تمہیں اسکول لے جاتی ہوں، وہاں کسی ٹیچر کا کمرا مل جائے گا۔ یہ عارضی انتظام ہے۔ ہمارے پاس یہاں ٹروپر پوسٹ نہیں ہے۔ محض ایک VPSO ہے۔" ڈیمارکو نے فورڈ کی جانب حرکت کرتے ہوئے وضاحت کی۔

فورڈ ناہموار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ہیٹر کی تاب فل پر تھی۔ تازہ برف نے راستے کو کیچڑ زدہ کر دیا تھا۔ غالباً اسنو پلو کچھ دیر قبل ہی گزرا تھا۔ رہ گزر کے دونوں کناروں پر برف کی پانچ فٹ بلند دیوار بن گئی تھی۔

"تم پہلے بھی اس علاقے میں آ چکی ہو؟"

جواب میں اینڈریا نے محتاط رویہ اختیار کیا، کچھ بولے بغیر اس نے سر کو جنبش دی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، وہ متعجب تھی کہ یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گھوسٹ ٹاؤن میں آ گئی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی کتا تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ موز بار کے قریب سے گزرے، نیون سائن چمک رہا تھا۔ ہاٹ کافی، آل ڈے بریک فاسٹ اور موز بار اینڈریا کے لیے شناسا تھا لیکن ساتھ ہی اسے ناقابلِ فہم اجنبیت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اسے ایک تبدیلی نظر آئی تھی کہ بار دوسری دکان تک وسعت اختیار کر گیا تھا۔

فورڈ، یک منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ ڈیمارکو، اینڈریا کو لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچی۔ کمرے میں ایک ڈیسک اور چار کرسیاں رکھی تھیں۔ اندر گرمائش تھی۔ ایک فائل کیبنٹ بھی موجود تھا۔ ڈیسک پر کاغذات کا ڈھیر تھا۔ کونے میں ایک چھوٹی ٹیبل پر ٹی بیگز پیپر کپس اور دیگر سامان موجود تھا۔

ڈیمارکو کافی مشین کی طرف گئی اور کپ بنا لائی۔ اس نے ایک کپ اور کرسی اینڈریا کو پیش کی۔ اینڈریا نے کپ لیا اور کرسی مسترد کر دی۔ چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے، وہ جانتی تھی کہ اسے آرام ملا تو سو جائے گی۔

ڈیمارکو نے کرسی سنبھال کر ایک سبز فولڈر کھولا۔ اس کی انگلی ایک صفحے پر پھسلتی رہی۔

"لزا، ابھی تک لاپتا ہے؟" اینڈریا نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"تمام کوششیں جاری ہیں۔ ہر ایک اسے تلاش کر رہا ہے۔"

"مثلاً؟" اینڈریا نے کافی کا سپ لیا۔

"یہاں موجود تقریباً ہر کوئی...... "وائز مین" اور "کولڈ فٹ" کی اکثریت گھروں سے باہر ہے۔ ہمارے کتے بھی سرگرم ہیں۔ ران اور لیو...... میرا مطلب ہے مسٹر اور مسز ویملی اپنے ائرکرافٹ پر سرگرداں ہیں۔" ڈیمارکو نے فون کی جانب دیکھا۔ "یہ لوگ تاریکی ہونے تک واپس آ جائیں گے۔"

"کہاں تلاش کیا جا رہا ہے؟" اینڈریا نے ایک اور سوال کیا۔

ڈیمارکو نے ایک نقشہ کھولا۔ "ہم یہاں پر ہیں۔" اس نے لیک ایج کے مقام پر انگلی رکھی۔ پھر اس کی انگلی پھسلتی ہوئی شمال مغرب کی طرف گئی۔ "یہاں پر تلاش جاری ہے۔" انگلی رک گئی۔ اس علاقے کو بڑے سیاہ الفاظ سے نمایاں کیا گیا تھا: WILDERNESS۔

اینڈریا نے کپ رکھ کر نقشے کا جائزہ لیا۔ نقشے پر سبز، خاکی، سیاہ، سرخ نشان تھے۔ جو گلیشیرز، کھائیوں، پہاڑ کی چوٹیوں، جنگلات، آبشار و دیگر آبی علاقوں کی نشاندہی کر رہے تھے۔

"تمہاری بہن کو ویک اینڈ پر "جو چینا گا" سے ملنا تھا۔ جو، فاریسٹ رینجر ہے۔ اس نے لزا کو وہاں گر سکھائے تھے کہ کن علاقوں اور کن حالات میں کیسے زندہ رہا جاتا ہے۔ جب لزا نے ویک اینڈ پر ملاقات نہیں کی تو جو چینا گا اس کے کیبن پر پہنچا۔ لزا وہاں نہیں تھی۔ جو چینا گا یہی سمجھا کہ وہ اسکائی جورنگ کے لیے گئی ہوئی ہے۔"

"اسکائی جورنگ؟" اینڈریا نے الفاظ دہرائے۔ ماں نے بھی ایسا ہی کچھ کہا تھا۔

"برف پر کتوں کی راسیں پکڑ کر اسکیٹنگ کی جاتی ہے۔ اس قسم کی اسکیٹنگ میں دونوں ہاتھوں میں پول نہیں ہوتے۔" ڈیمارکو نے سمجھایا۔ "ساتھ میں پشت پر بیگ یا ساتھ میں سلیج ہوتی ہے۔"

وہ اس شغل کی عادی تھی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ وہ کسی مشکل سے دوچار معلوم ہوتی ہے۔

"کیا تم میری بہن سے ملی ہو؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ تاہم وہ اطراف میں کافی معروف ہے۔" ٹروپر ڈیمارکو نے جواب دیا۔ "ایک اہم بات تمہارے علم میں لانا چاہتی ہوں۔" اس نے مزید کہا۔

اینڈریا نے بغور اس کے تاثرات دیکھے اور بے قراری محسوس کی۔ تاہم وہ خاموشی سے منتظر رہی کہ ڈیمارکو کس بات کا انکشاف کرنے جا رہی ہے۔

"لزا کا ایک کتا خراب حالت میں یہاں واپس پہنچ گیا تھا۔ اس کی ہارنس ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ چرمی راسوں کو چبا کر رہائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جزوی طور پر فراسٹ بائیٹ کا شکار تھا، اس کا وزن گر چکا تھا۔" ٹروپر نے خاموش ہو کر اینڈریا کا ردِعمل جانچنے کی کوشش کی۔

یہ خبر اینڈریا کے لیے اچھی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ تاہم تصور میں بے یار و مددگار، بدحال لزا برفستاں میں رینگتی دکھائی دے رہی تھی۔ اینڈریا نے خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔ لزا کے تصور کو پرے دھکیلا۔ لزا، سروائیور تھی، وہ بحرانوں سے سلامت نکل آتی تھی۔ کتے کی واپسی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کی بہن ختم ہو چکی ہے۔

طوفانوں میں پھنسنے اور لاپتا ہونے والے افراد کی نشاندہی میں جو چینا گا مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ ڈیمارکو نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی، جہاں سیاہ نشان بنا ہوا تھا۔ جو کو یقین ہے کہ حال ہی میں کوئی ویرانے میں موجود کیبن میں ٹھہرا تھا۔

''تمہاری بہن مارلبرو پیتی تھی؟''

''ہاں، ہاں......'' اینڈریا نے خاموش زبان میں کہا۔ ''لیکن مارلبرو برانڈ استعمال کرنے والی وہ دنیا میں واحد شخصیت نہیں ہے۔ نہ ہی تنہا چاکلیٹ میں لپٹی ہوئی مونگ پھلیاں کھاتی ہے۔''

گفتگو کچھ دیر کے لیے تھم گئی۔ اینڈریا کھڑکی سے باہر ویران سڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً فون کی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔

ڈیمارکو نے کال وصول کی۔

''وہاٹ؟ کہاں پر؟ اوہ گاڈ...... شناخت ہوگئی؟ او کے......اور کون ہے وہاں؟''

اینڈریا کے کان کھڑے ہوگئے۔

ڈیمارکو نے ریسیور شانے اور سر کے درمیان دبا کر نقشے کا جائزہ لیا۔ ''او کے...... میں سمجھ گئی۔'' اس نے فون رکھا اور نقشے پر جھک گئی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' اینڈریا نے استفسار کیا۔ ''کیا یہ لزا کے بارے میں ہے؟''

ڈیمارکو نے سر اٹھا کر اینڈریا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تلاش کنندگان کو کچھ ملا ہے لیکن جہاں تمہاری بہن گم ہوئی تھی، یہ مقام وہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔''

''انہوں نے کیا چیز دریافت کی ہے؟'' اینڈریا نے آواز متوازن رکھی تاہم اس کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' ٹروپر نے نقشہ لپیٹا۔ اینڈریا کو اس کا انداز پسند نہیں آیا۔

''پلیز تم اپنی بہن کے کیبن میں چلی جاؤ۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں چھوڑ آتی ہوں۔ وہاں تم آرام کرو۔ پھر ہم کل ملتے ہیں۔''

اینڈریا خاموش رہی، وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی باڈی دریافت ہوئی ہے۔ اس نے ذہن کو بمشکل منفی اندیشوں سے پاک رکھا۔ تاہم ڈیمارکو کا رویّہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

ڈیمارکو نے کیبن کے باہر ایک چابی اس کے حوالے کی۔ ''دوسری چابی ڈانا کے پاس ہے۔ تم جانتی ہو نہ ڈانا کو؟ موک نامی کتا پہلے ڈانا ہی کے پاس تھا۔''

''ہاں شاید۔'' اینڈریا نے رخ پھیرا۔

چابی اینڈریا کے حوالے کر کے ڈیمارکو مستعار لی ہوئی فورڈ میں روانہ ہوگئی۔ کیبن کا دروازہ کھولتے ہوئے لاشعوری طور پر اینڈریا کی دھڑکنیں اضطراب کا شکار ہو گئیں۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے چار سال پرانی عداوت، رنجش اور شکوے سب یک لخت تحلیل ہوگئے۔ لزا کا مسکراتا ہوا حسین چہرہ اس کے تصور میں ابھرا۔ اس کے زندگی سے بھرپور قہقہے...... اینڈریا کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔

سب سے پہلے اس نے روشنی کا سوئچ تلاش کیا اور کیبن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کیبن کی حالت ابتر تھی۔ ہر شے جگہ بے جگہ تھی۔ اینڈریا نے جلد ہی بھانپ لیا کہ یہ محض ابتری نہیں تھی بلکہ کسی نے اس جگہ کی تلاشی لی تھی۔ اینڈریا کے اعصاب تن گئے۔ دھیمے قدموں سے اس نے تمام کیبن کا جائزہ لیا۔ بلاشک و شبہ اس جگہ کو خوب کھنگالا گیا تھا۔ کیوں؟...... کس لیے......؟

آخر میں وہ چند سیڑھیاں اتر کے مڈ روم کے دروازے پر آئی۔ لاک کے اردگرد کی لکڑی کی حالت بتا رہی تھی کہ لاک توڑا گیا تھا۔ اینڈریا کے ذہن میں نئے وسوسے سر اٹھا چکے تھے۔ یقیناً معاملہ طوفان میں گمشدگی کا نہیں تھا۔

ایک کونے میں اسے سیاہ و سفید رنگ کی ڈھیری نظر آئی۔ اینڈریا نے بوٹ مار کے ڈھیری کو بکھیرا اور پنجوں کے بل وہاں بیٹھ گئی۔ جلد ہی اس نے کمپیوٹر کی جلی ہوئی مڑی تڑی ڈسکس برآمد کرلیں۔ وہ عالم پریشانی میں ڈسکس کو گھور رہی تھی۔ دھڑکنیں تیز تر ہوگئی تھیں۔

اینڈریا واپس لزا کے بیڈ روم میں آئی۔ خواب گاہ کا ایک گوشہ لزا آفس کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ فائلیں، کاغذات، لیپ ٹاپ اور متعلقہ لوازمات اینڈریا کو کہیں دکھائی نہیں دیے۔ کیا یہ نقب زنی کی واردات تھی۔ لزا کی کمپیوٹر ڈسک خود لزا نے جلائیں یا کسی اور نے؟ سوال کے پیچھے سوال آرہا تھا۔ داخلی دروازے کا لاک کیوں سلامت تھا۔ ماں کا خیال ٹھیک تھا کہ تمام باتیں اس تک نہیں پہنچی ہیں۔ ایک بات طے تھی کہ لزا زندہ ہے تو لازماً خطرے میں ہے۔ اینڈریا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ خطرہ انسانی ہے یا موسم کی طرف سے یا پھر دونوں جانب سے؟ کتے کی واپسی اچھی علامت نہیں تھی۔ اگر لزا نے خود کتے کو بھیجا ہے تو یقیناً وہ زندہ ہے اور مدد کی طلبگار ہے...... کیا پولیس نے لزا کے کیبن کی حالت نہیں دیکھی؟ یا وارنٹ حاصل کرنے کا مسئلہ تھا؟

اینڈریا نے ڈیمارکو سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ موبائل اس علاقے میں ناکارہ تھے۔ لینڈ لائن کی سہولت تھی...... تاہم ناقابلِ اعتبار......

بہرحال اینڈریا نے لینڈ لائن پر ہی نمبر ملایا، نمبر ڈیمارکو نے ہی اسے دیا تھا۔ غیر متوقع طور پر پہلی کوشش میں ہی رابطہ ہوگیا۔ فون کسی اور نے ہی اٹھایا تھا۔ اینڈریا نے خشک لہجے میں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ڈیمارکو سے رابطے کی خواہش ظاہر کی۔

''تم ذرا انتظار کرو، میں ڈیمارکو سے ریڈیو پر رابطہ کرتی ہوں۔'' دوسری جانب سے مثبت جواب ملا۔ اینڈریا کو چند منٹ انتظار کرنا پڑا، پھر دوسری جانب سے آواز آئی۔

''میری بات ہوگئی ہے۔ وہ فارغ ہوتے ہی پہلے تم سے ملاقات کرے گی۔''

☆☆☆

ڈیمارکو نے بمشکل نصف گھنٹا لزا کے کیبن میں گزارا۔ وہ نوٹ بک میں لکھتی جارہی تھی۔ ٹوٹا ہوا اندرونی تالا چیک کرنے کے بعد اس نے تبصرہ کیا۔ ''اس علاقے میں بریک اِن کی وارداتیں تقریباً مفقود ہیں۔''

اینڈریا کو حیرت کے ساتھ غصہ بھی تھا۔ یہ لوگ اب تک کیا کرتے رہے؟ اس نے تلخی سے سوچا۔ یقیناً ان کی سرگرمیاں ایک ہی زاویے پر مرکوز تھیں کہ یہ طوفان میں گمشدگی کا عام کیس ہے۔ تاہم اینڈریا نے غصہ دباتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم پرنٹ لینے کے لیے کچھ کرنے جارہی ہو؟''

''فی الحال میں یہاں تنہا ہوں۔ جلدی کرائم لیب کے کارندوں کی خدمات حاصل کروں گی۔'' ڈیمارکو نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''بہت خوب...... کتنی جلدی؟ میری بہن کی گمشدگی کو ہفتہ ہونے کے قریب ہے۔'' اینڈریا سے برداشت نہ ہوا۔

''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' اس مرتبہ ڈیمارکو نے ضبط سے کام لیا۔ اس نے اینڈریا کے طنز کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا کر باہر نکل گئی۔

ڈیمارکو کے جانے کے بعد اینڈریا نے ماں سے رابطہ کیا اور مختصر الفاظ میں صورتِ حال بتاتے ہوئے اطمینان دلایا۔ اینڈریا نے ماں کو جزئیات سے آگاہ کرتے وقت پریشان کن امور حذف کردیے تھے۔

بستر پر جانے سے قبل اس نے ایک بار پھر وہاں موجود اشیا کا جائزہ لیا۔ بیڈ سائڈ کیبنٹ کی بالائی دراز

کھولتے ہی اس کی نگاہ ساکت ہوگئی۔ وہ غیر یقینی انداز میں اپنے ہاتھ کی تحریر کو گھور رہی تھی۔ چند ثانیے بعد اس نے خطوط کا پلندا باہر نکال کر ربن کو کھولا۔ خطوط، تہنیتی کارڈز اور بچکانا تصاویر...... ہاتھ سے بنائی ہوئی ڈایاگرامز کافی پرانی تھیں۔ انہیں اسکول کی کاپیوں سے پھاڑ کر نکالا گیا تھا۔ پلندا خاصا وزنی تھا۔

اینڈریا بستر پر گر سی گئی۔ اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے لرزیدہ ہاتھ سے دوسری دراز کھولی اور پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ وہاں لزا اور اس کی تصاویر بھری ہوئی تھیں۔ زیادہ فوٹو دونوں کے بچپن کے تھے۔ کسی میں دونوں بائیسکل چلا رہی تھیں، کہیں کھیلتے ہوئے یا لڑتے ہوئے...... گارڈن میں...... کرسمس کے موقع پر تحفے کھولتے ہوئے تصاویر...... ہنستی مسکراتی تصاویر...... اینڈریا نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ذہن ماضی میں سفر کر رہا تھا۔ سماعت میں بچپن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں، آنکھوں میں پانی تھا۔ لزا کے برعکس اس نے ایسی کوئی یادگار محفوظ نہیں رکھی تھی۔ دفعتاً اسے شدت سے احساس ہوا کہ چار سال قبل ہونے والی بدمزگی سے قطع نظر دونوں کے دلوں میں دور کہیں ایک دوسرے کی محبت نہاں تھی، پھر چار برس پہلے دونوں کے درمیان خلیج کیونکر حائل ہوگئی تھی۔ اینڈریا نے ہاتھ کی پشت سے بھیگی آنکھیں صاف کیں۔ بمشکل خود کو تصورات کی دنیا سے باہر نکالا اور تھکے ہوئے ذہن کو نیند کے حوالے کردیا۔

وہ پتا نہیں کب سوئی، کتنی دیر نیند کی آغوش میں رہی، تاہم آنکھ شور کی وجہ سے کھلی تھی۔ کوئی چوبی دروازے کو کوٹ رہا تھا۔ اینڈریا کو احساس ہوا کہ وہ گہری نیند سوتی رہی تھی۔ چوبی دروازے کے رخنوں سے سورج کی روشنی دن چڑھنے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ گاؤن کی ڈوریاں لپیٹتی ہوئی اٹھی۔ دروازے کی جھری سے باہر نظر ڈالی۔ وہ، ٹروپر ڈیمارکو تھی۔ جو غالباً آغاز میں دستک انداز ہونے کے بعد دروازہ پیٹنے پر مجبور ہوئی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی اینڈریا نے سرد موسم کی شدت کو محسوس کیا۔ ڈیمارکو کے نتھنوں سے سانس کا اخراج بھاپ کے مانند نمودار ہو رہا تھا۔ اینڈریا معذرت کے ساتھ کافی کی آفر کرتے کرتے تھم گئی۔ ڈیمارکو کے تاثرات نے اینڈریا کے ذہن میں گھنٹی بجائی۔ اس کا دل یک بارگی شدت سے دھڑکا۔

ڈیمارکو نے ہیٹ اتار کر شرٹ پر پیٹ کے قریب رکھ لیا اور مخصوص انداز میں سر کو خم دیا۔ اس کا خاص رسمی انداز اور حزنیہ سنجیدگی، قوتِ گویائی کی محتاج نہیں تھی۔

اوہ، گاڈ، نہیں...... پلیز نہیں۔ اینڈریا نے مضبوطی سے چوکھٹ تھام لی۔ نہیں، لزا نہیں مر سکتی۔ اس کے ذہن میں خاموش چیخ بلند ہوئی۔ پلیز گاڈ، وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ تاہم اینڈریا کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر ڈیمارکو کو گھور رہی تھی۔

بالآخر ٹروپر نے لب کشا کیے۔ ''اینڈریا...... آئی ایم سوری۔'' اس نے اینڈریا سے نگاہیں چرائیں۔ ''ہمیں پہاڑوں میں ایک لاش ملی ہے۔''

☆☆☆

اینڈریا، ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے میں بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں نیچے تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی برفانی سفیدی پر چکرا رہی تھیں۔ سانسوں میں گھٹن، دھڑکنوں میں اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ ذہن میں خوف کی گھٹا میں گاہے گاہے امید کی کرن سر اٹھاتی اور ڈوب جاتی۔

ہیلی کاپٹر کی پرواز زیادہ طویل نہیں تھی۔ ایک کھاڑی کے قریب اس کی بلندی کم ہونا شروع ہوئی۔ اینڈریا نے اندازہ لگایا کہ پائلٹ کھاڑی کے اندر اترنے جا رہا تھا۔ ایک جانب کھاڑی کے اندر گرنے والی آبشار تک منجمد حالت میں تھی۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ اینڈریا کے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ ہیلی کاپٹر کھاڑی کے اندر برف میں ملفوف سطحِ زمین کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ روٹرز کی بلند آواز حرکت کے ساتھ بھربھری برف کا طوفان سا اٹھا۔ اینڈریا کی نگاہ برفاب سفیدی میں گم ہو گئی۔ اس کے سینے میں بھی ایک طوفان سر اٹھا رہا تھا۔ جبڑے بھینچ کر اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

نرم دھکے کے ساتھ ہیلی کاپٹر لینڈ کر گیا۔ انجن بند ہوا، پروں کی گردش کا زور ٹوٹتے ٹوٹتے برفانی ذرات پھر سے برف آلود زمین پر بیٹھ گئے۔ دروازے کھل گئے، پائلٹ اپنی نشست پر گھوما۔ اینڈریا کی نظریں چار ہوئیں۔ پائلٹ کی آنکھوں میں ترحم کے ساتھ ہمدردی موجود تھی۔ اینڈریا نے نگاہ ہٹا کر اکڑی ہوئی انگلیوں سے سیٹ بیلٹ کھولی۔ دبیز اسکارف چہرے پر لپیٹ کر وہ باہر آ گئی۔ ڈیمارکو کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھی۔

جلد ہی اس نے الاسکا اسٹیٹ ٹروپرز کا ہیلی کاپٹر دیکھ لیا۔ قریب ہی کئی برفانی گاڑیاں موجود تھیں۔ مخصوص وردی میں تین اہلکار بھی کھڑے تھے۔ سفید زمین پر زرد رنگ کا باڈی بیگ رکھا تھا۔

اینڈریا کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ڈیمارکو نے اسے سہارا دیا۔ وہ خود پر انحصار کرنے کی عادی تھی۔ سہاروں سے اسے نفرت تھی۔ وہ حوصلے اور وقار کے ساتھ حالات کا سامنا کرے گی۔ اینڈریا نے ٹروپر ڈیمارکو کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ مضبوط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہاں موجود ایک آدمی چند قدم پسپا ہو گیا۔ تاہم دوسرے نے سر اٹھا کر اینڈریا کا جائزہ لیا۔

اینڈریا کی نظریں زرد رنگ کے بیگ پر تھیں۔ بیگ کی زپ سینے تک کھلی تھی۔ بیگ میں موجود باڈی کے سر پر برف آلود ٹوپی تھی جس میں سے چھوٹے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ اینڈریا، بے جان چہرے کو گھور رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ پلکوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ جلد پر اودے دھبے نظر آ رہے تھے۔ تڑخے ہوئے ہونٹ سیاہ پڑ چکے تھے۔ ایک کان میں طلائی رِنگ نظر آ رہا تھا۔ اینڈریا کی پیشانی پر شکن نمودار ہوئی...... دوسرا رِنگ کدھر ہے؟

جسم پر عام لباس تھا جو برفانی موسم میں باہر جانے کے لیے قطعی موزوں نہ تھا۔ اینڈریا کی نگاہ سینے پر پڑی اور ذہن میں بھی جیسے سرد بھربھری برف بھر گئی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور لاش کے سینے پر موجود سیاہی مائل نشانات کو دیکھا جو کسی وقت سرخ رنگ کے حامل رہے ہوں گے۔ بلاشک و شبہ نشانات گولیوں کے تھے......

اینڈریا کی پلکیں ساکت تھیں اور سانس رکی ہوئی تھی۔ ''یہ میری بہن نہیں ہے۔'' اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

☆☆☆

لزا وقتی طور پر حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس کی حسیات واپس آئیں تو اسے اولین خیال یہی آیا کہ وہ کسی مقبرے میں ہے۔ ایک بار...... دو بار...... وہ پلکیں جھپکتی چلی گئی۔ تاہم حسِ بینائی جیسے مردہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔ گھور تاریکی اور ٹھنڈ لہو کی گردش جمانے پر تلی ہوئی تھی۔ لزا نے بینائی پر زور دینے کے بجائے حسِ سماعت کو آزمایا۔ جواب ملا کہ طوفان کی غارت گری جاری ہے۔

حیرت انگیز طور پر وہ کسی بھی قسم کی اذیت سے محروم تھی۔ حتیٰ کہ خوفناک ٹھنڈ بھی اسے تکلیف پہنچانے سے قاصر تھی۔ یقیناً وہ موت کی گرفت میں ہے...... موت ایسی ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ہائپوتھرمیا کے باعث ہونے والی موت

تکلیف سے عاری ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں شدید نیند آتی ہے، ہائپوتھرمیا کا متاثر نیند سے شکست کھا جائے تو یہ ابدی نیند میں بدل جاتی ہے۔ دیگر علامتوں کے ساتھ بالآخر خون کی پمپنگ رک جاتی ہے، پھیپھڑوں میں سانس کھینچنے کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ نبض برائے نام رہ جاتی ہے، اعضا اکڑنے لگتے ہیں، یہ برفانی موت کی شکل ہے۔ ایک ہی مثبت نکتہ ہے کہ ہائپوتھرمیا میں کوئی خاص اذیت نہیں سہنی پڑتی۔ بہرحال جان تو جانی ہے اور کون خوشی سے جان دیتا ہے۔ وہ بھی لزا جیسی فائٹر اور ایڈونچر پسند...... لہٰذا مثبت نکتے کی اہمیت بھی دہشت ناک حقیقت سے زیادہ نہ تھی۔

وہ یقیناً سوئی نہیں تھی، ورنہ بیداری نصیب نہ ہوتی۔ اونگھتے اونگھتے لاشعوری طور پر اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ لاشعور میں مزاحمت جاری تھی...... وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایسے نہیں مرے گی۔ مرنے سے قبل اسے ایک نہایت اہم کام سرانجام دینا تھا۔ جس کے آثار بظاہر مفقود تھے۔ تاہم اس کی فطری ہمت جوان تھی۔

لزا نے ہلنے جلنے کی کوشش کی۔ تاہم اس کے بدن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حرارت کا کوئی ذرہ اس کے جسم میں نہیں بچا تھا۔ لزا نے اپنے تجربے کے مطابق بہترین کوششیں آزما ڈالیں۔ لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کا جسم سرد ترین مذبح خانے میں لٹکے ہوئے بے جان ٹکڑے کے مانند بے حس و حرکت رہا۔

لزا کو اینڈریا کا خیال آیا۔ کیا اسے علم ہو گیا ہوگا، کیا وہ اس کی مدد کو آئے گی؟ اگر آئی بھی تو کیا بہت تاخیر نہ ہو جائے گی؟ لزا کو منطقی شک تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ وہ چار سال قبل ہونے والی کڑوی عداوت کو بھولی نہیں تھی۔ تاہم خود وہ اینڈریا سے نفرت نہیں کرتی تھی۔

اچانک لزا نے محسوس کیا کہ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔ اس نے دعا کی کہ اینڈریا اس سے نفرت کرتی رہے اور کبھی اسے ڈھونڈنے نہ آئے پھر اسے اپنی ماں جولیا میکال کا خیال آیا۔ لزا نے جان توڑ کر آخری کوشش کی۔ جان تو بے جان تھی۔ یہ اسپرٹ تھی۔ جب جان ہارتی ہے تو اسپرٹ کام کرتی ہے اور معجزے رونما ہوتے ہیں۔ انسانی اسپرٹ سے بڑھ کر کوئی چیز طاقتور نہیں۔ کسی نے کہا کہ سب سے طاقتور ''مسل'' انسانی دماغ ہوتا ہے۔ جب تک دماغ لڑتا ہے، جسم نہیں گرتا اور وہ اب بھی اجل سے پنجہ آزما تھی۔

☆☆☆

''تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ یہ باڈی کس کی ہے۔'' اینڈریا نے اعتراض نما سوال اٹھایا۔ ''کسی نہ کسی نے گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہوگی۔''

ڈیمارکو محض ہنکارا بھر کے رہ گئی۔ دریافت شدہ باڈی لزا کی نہیں تھی۔ اس بات نے ڈیمارکو کو بدمزہ کر دیا تھا۔ ڈیمارکو کا کام ختم ہونے کے بجائے دگنا ہو گیا تھا۔

''کیا وہ تنہا تھی؟'' اینڈریا نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''ایسی علامت ملی ہو کہ کوئی اس کے ساتھ تھا؟''

ڈیمارکو نے گاڑی کو بریک لگائے۔ تاہم وہ اب بھی خاموش تھی۔

''باڈی کے جسم پر آؤٹ ڈور جانے والا لباس نہیں تھا، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟'' اینڈریا کے تاثرات میں تلخی در آئی۔

ڈیمارکو نے سر اٹھایا۔ اینڈریا کو لگا کہ وہ کچھ کہنے والی ہے۔ تاہم وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔ اینڈریا کے چہرے پر سرخی کی لہر نمودار ہوئی۔ ڈیمارکو کی خاموشی اسے کھلنے لگی تھی۔ اینڈریا نے نقشہ نکالا۔ کچھ دیر اس نے نقشے کا جائزہ لیا پھر بولی۔ ''نامعلوم باڈی جہاں دریافت ہوئی ہے، لزا کی گمشدگی کی جگہ وہاں سے چالیس میل دور ہے۔ دونوں برفانی پہاڑوں میں لاپتا ہوئی ہیں اور اسے محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ تم کو کوئی رائے دینی ہے یا منہ بند کر کے بیٹھی رہو گی۔'' اینڈریا نے غصے کا اظہار کیا۔

''ہم آدھے گھنٹے میں پبلک میٹنگ کال کریں گے۔'' بالآخر ڈیمارکو نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب تک میں تمہیں کیبن تک چھوڑ دیتی ہوں۔ تم فریش ہو جاؤ۔''

☆☆☆

اینڈریا نہیں چاہتی تھی کہ وہ میٹنگ میں دیر سے پہنچے۔ لہٰذا اس نے پھرتی دکھائی اور تیار ہو کر سرخ رنگ کی جیپ میں بیٹھ گئی۔ لزا کے کیبن کے باہر سرخ شیوی بلیزر کھڑی تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کا دروازہ نہ صرف کھلا تھا بلکہ اگنیشن میں چابی بھی موجود تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد جیپ میں بیٹھ گئی۔ لزا کی گاڑی لاک تھی جس کی چھت پر برف کا ڈھیر تھا۔ جیپ اسٹارٹ کرنے میں اس کا ایک منٹ خرچ ہو گیا تاہم طاقتور گاڑی کا انجن غرانے لگا۔ قبل اس کے کہ وہ گاڑی آگے بڑھاتی اس کی نگاہ پسنجر سیٹ پر پڑی جہاں کان کا طلائی رِنگ پڑا تھا۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ نامعلوم لاش کے کان میں ایک طلائی رِنگ تھا جس کی بناوٹ بالکل یکساں تھی۔ دوسرا رِنگ یہاں پسنجر سیٹ پر پڑا تھا۔

اینڈریا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس کی نظر ایئرویومرر سے لٹکتے ہوئے رینٹرل کارٹیگ پر رک گئی۔ اس نے گلو باکس کھول کر رینٹرل ایگریمنٹ نکالا...... ایگریمنٹ، میری گلی موٹ، ورجینیا کا تھا۔

☆☆☆

میٹنگ کا انتظام موز بار میں کیا گیا تھا۔ گاؤں کی طرح موز میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کاؤنٹر پر ایک مقامی شخص کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اینڈریا نے اس سے ڈیمارکو کے بارے میں استفسار کیا۔ اینڈریا نے محسوس کیا کہ وہ کچھ جلدی آگئی ہے۔ موز میں اِکاّ دُکاّ افراد ہی نظر آرہے تھے۔

کاؤنٹر پر موجود شخص نے جواب دینے سے پہلے، نیچے سے اوپر تک اینڈریا کا جائزہ لیا۔ اینڈریا بھی اطمینان سے اس کو ٹٹول رہی تھی۔ وہ ایک بھیم شیم، پہلوان نما آدمی تھا۔

”ڈیمارکو نے میری ذمے داری لگائی ہے۔“ وہ بولا۔ ”کہ میں تمہیں ”ریسرچ اینڈ ریسکیو کمانڈ پوسٹ“ لے جاؤں۔ میرا نام ”جو چینا گا“ ہے۔ لوگ مجھے بگ جو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔“ اس نے اپنا ریچھ جیسا پنجہ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

اینڈریا نے پلکیں جھپکائیں۔ ”تم لزا کے دوست ہو؟“

بگ جو نے اثبات میں سر ہلایا۔

اینڈریا نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں کار لاتا ہوں، تم یہاں رکو۔“ وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔

اینڈریا کی ذہنی رَو دریافت شدہ باڈی کی طرف چلی گئی۔ اگر وہ واقعی لزا ہوتی تو کیا اینڈریا کے اعصاب...... اینڈریا نے اجنبی باڈی کا تصور ذہن سے نکال دیا۔ وہ طلائی ائررنگ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ کیا عقدہ ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ لزا اور نامعلوم باڈی کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق رہا تھا۔ گاڑی میں پایا جانے والا اکلوتا ائررنگ، اینڈریا نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

معاً اینڈریا، بگ جو کے ساتھ ڈیمارکو کو بار میں داخل ہوتے دیکھ کر چونک اٹھی۔

”ڈیمارکو کے پاس ایک اطلاع ہے تمہارے لیے۔“ بگ جو نے قریب آکر کہا۔ ”اگر یہ نہیں بتائے گی تو میں بتادوں گا۔“

تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈیمارکو نے سنجیدگی سے کہا۔

”لزا مل گئی ہے؟“ اینڈریا نے بیٹھے بغیر سوال کیا۔

ڈیمارکو نے نفی میں سر ہلایا اور نشست سنبھالی۔

اینڈریا منتظر نگاہوں سے ڈیمارکو کو تکتی رہی۔

”میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تھا۔“ ڈیمارکو نے بولنا شروع کیا۔ ”کیونکہ یہ غیر ضروری تھا۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ لزا کی باڈی نہیں تھی۔ تاہم اب ہمیں علم ہو گیا ہے کہ وہ لاش کس کی تھی۔ نیز وہ تمہاری بہن سے بھی ملی تھی۔“

”تم میری گلی موٹ کی بات کر رہی ہو؟“ اینڈریا نے استفسار کیا۔

ڈیمارکو واضح طور پر چونک اٹھی۔

”تم جانتی ہو اسے؟“ ڈیمارکو کی آواز میں ہیجان تھا۔

”نہیں، لزا کے کیبن کے باہر اس کی شیوی بلیزر کھڑی تھی۔ شیوی میں جو ٹیگ تھا، اس پر میری کا نام لکھا تھا۔ کار، ورجینیا کی فیئر بینک رینٹ کمپنی سے حاصل کی گئی تھی۔“

چند ساعت کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اینڈریا، ڈیمارکو کے ردِعمل کی منتظر تھی جبکہ ڈیمارکو خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بگ جو ابھی تک کھڑا تھا۔ اینڈریا نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بالآخر ڈیمارکو نے ایک گہری سانس لی اور لب کشا کیے۔ ”جیسا میں نے کہا تھا کہ...... میں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ تم نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ پہاڑوں میں ملنے والی لاش کو گولی ماری گئی تھی۔ یہ اور بات کہ تم نے اظہار نہیں کیا۔ بہت قریب سے سینے میں دو گولیاں ماری گئی تھیں۔ مرڈر۔“

اینڈریا خاموش تھی۔ جبڑے بھینچے ہوئے اور تاثرات پتھرائے ہوئے تھے۔

”لاش برف کے نیچے دبائی گئی تھی۔“ ڈیمارکو پھر گویا ہوئی۔ ”کسی برفانی جانور، غالباً بھیڑیے کی کارستانی تھی کہ لاش مکمل طور پر پوشیدہ نہ رہ سکی۔ سرچ اور ریسکیو ٹیم کے ایک فرد کی نظر لاش کے ہاتھ پر پڑ گئی۔ معما کھلتا چلا گیا۔ لاش اِن ڈور کپڑوں میں اس لیے تھی کہ اسے پہاڑوں میں قتل نہیں کیا گیا تھا۔ وہاں خون بھی بہت کم تھا۔ دونوں باتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ ”کرائم سین“ کہیں اور تھا۔ جہاں سے لاش کو پہاڑوں میں لاکر دفن کیا گیا۔

ڈیمارکو اور اینڈریا پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے

کو گھور رہی تھیں۔ اینڈریا بخوبی سمجھ رہی تھی کہ ڈیمارکو کیا سوچ رہی ہے۔ شیوی بلیزر، لزا کے کیبن پر موجود تھی۔ لزا غائب تھی۔ میری کو قتل کر دیا گیا تھا۔ بظاہر کرائم سین، لزا کا کیبن تھا۔ دوسرے الفاظ میں لزا مفرور تھی۔

”ہم تمہاری بہن کے کیبن نما گھر کے لیے سرچ وارنٹ کی تیاری کے آخری مراحل میں ہیں۔ شیوی بلیزر، میری، اور ”فیئر بینک“ رینٹ کی تصدیق ہو چکی ہے۔ اگلا مرحلہ لزا کے گھر کی تلاشی ہے۔ میں کسی بات کا اعلان نہیں کر رہی ہوں...... یہ محض تفتیش کا حصہ ہے۔ معمول کی تفتیش۔“

اینڈریا نے ڈیمارکو کے تسلی آمیز آخری فقرے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ڈیمارکو شروع سے ہی کیس کو جلد از جلد ختم کرنے کے چکر میں ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے تھوڑی بہت ہیرا پھیری ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ لزا کو بھی ختم کر دیا گیا ہے؟“ اینڈریا نے بمشکل آواز کو سپاٹ رکھا۔

”کہا نہیں جاسکتا۔ ضروری ہے کہ پہلے اس کے کیبن کی چھان بین کی جائے۔“ ڈیمارکو نے اگلے قدم کے بارے میں بتایا۔ ”نیز تمہارے تعاون کے مشکور ہوں گے اگر تم کیبن سے دور رہو...... میرا مطلب ہے کہ جب تک ہم اپنی کارروائی مکمل نہیں کر لیتے۔“

”میرا سامان؟“ اینڈریا نے اعتراض کیا۔

”وہ تمہیں مل جائے گا۔ فی الحال تمہارے لیے متبادل قیام گاہ کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ تم خیال نہیں کرو گی۔“ ڈیمارکو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک نظر بگ جو پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ اینڈریا فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ بگ جو بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اینڈریا کا جسم غیر محسوس انداز میں کانپ رہا تھا۔ وہ خیالوں میں گم تھی۔ بگ جو غور سے لزا کی بہن کو دیکھ رہا تھا۔

ڈیمارکو کے حالیہ انکشافات نے اینڈریا کا حوصلہ اور توانائی نچوڑ لی تھی۔

”لزا زندہ ہے۔“ بگ جو کا صبر جواب دے گیا۔

اینڈریا کو جھٹکا لگا۔ اس نے سر اٹھا کر بگ جو کی آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ اینڈریا نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

”میں جانتا ہوں۔“ بگ جو نے سکون اور اعتماد سے جواب دیا۔ بگ جو کے تیقن نے اینڈریا کے بدن میں امید کی لہر اٹھا دی۔

”چلو اٹھو، تمہارا سامان لے آتے ہیں۔“ بگ جو نے کرسی چھوڑ دی۔

”لیکن ڈیمارکو......“ اینڈریا نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”وہ ابھی سرچ وارنٹ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں اس سے قبل ہی سامان نکال لینا چاہیے۔“ اینڈریا نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور بگ جو کے ساتھ چل پڑی۔ بگ جو کے پاس سفید رنگ کی ”ڈاج ریم“ تھی۔ دونوں اسی میں لزا کے کیبن تک پہنچے۔

بگ جو کے ساتھ چلتے ہوئے اینڈریا کی امید اور حوصلہ لوٹ آیا تھا۔ اگرچہ امید کی کرن موہوم سی تھی۔ تاہم جس انداز میں بگ جو نے لزا کی زندگی کا انکشاف کیا تھا، وہ غیر معمولی تھا۔

کیبن پر ایک ٹروپر وردی میں چوکس کھڑا تھا۔ اس کی عمر بیس سال سے کم رہی ہوگی۔ اس نے شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ تاہم ان دونوں کو اندر نہیں جانے۔ اس ضمن میں اس کے پاس واضح احکامات موجود تھے۔

اینڈریا دل میں لعنت ملامت کرتی ہوئی واپس ڈاج میں بیٹھ گئی۔ بگ جو نے گاڑی گھمائی...... معاً اینڈریا نے کچھ دور جانے کے بعد بگ جو کو روک لیا۔ راستے کی ایک سمت میل باکس کی قطار تھی۔ بگ جو سوالیہ نظروں سے اینڈریا کو دیکھ رہا تھا۔ اینڈریا گاڑی سے اتر گئی۔ وہ لزا کے میل باکس کو پہچانتی تھی۔ باکس زرد رنگ کا تھا۔ اینڈریا، باکس خالی کر کے واپس ڈاج میں آگئی۔ انجن اسٹارٹ تھا۔ بگ جو نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

”مجھے چند چیزیں درکار ہیں۔ کیا ہم کچھ دیر کے لیے سپر مارکیٹ پر رک سکتے ہیں؟“ اینڈریا نے درخواست کی۔

بگ جو نے مسکرا کر ایک جگہ ڈاج روک لی۔ اینڈریا تیزی سے مارکیٹ نما بڑے سے اسٹور میں داخل ہو گئی۔ بنیادی ضرورت کی اشیا خرید کر وہ واپس آگئی۔ مارلبرو اور لائٹر لینا وہ نہیں بھولی تھی۔ اگرچہ کئی برس قبل وہ سگریٹ نوشی ترک کر چکی تھی۔

گاڑی میں واپس آنے کے بعد اس نے ایک سگریٹ نکالی اور بگ جو کا عندیہ لیا کہ اسے اعتراض تو نہیں...... بعد ازاں تھوڑی سی کھڑکی کھول کر اینڈریا نے سگریٹ سلگا لیا۔ اس نے گہرا کش لے کر پریشان کن

خیالات کو سگریٹ کے دھوئیں میں چھپالیا۔
بگ جو ٹاؤن سے باہر مقیم تھا، پانچ میل دور۔ اس کا چوبی کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی اندر چلا گیا۔ اینڈریا گاڑی سے اتر کر باہر کھڑی تھی۔ بھوک کے مارے اس کا پیٹ احتجاج کررہا تھا۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ چند منٹ بعد بگ جو دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں نرم فر (Fur) نما کوئی چیز تھی۔ ایک لمحے کے لیے اینڈریا کو خیال گزرا کہ وہ کوئی مردہ جانور ہے۔ فر کے ڈھیر میں ایک چھوٹا سا نیلا دائرہ نمودار ہوا، جس کے گرد سیاہ لکیر تھی۔ بگ جو کے ہاتھوں میں کتا تھا۔ زندہ کتا......

''موک سے ملو۔'' بگ جو نے قریب پہنچ کر انکشاف کیا۔

''اوہ نو، یہ لزا کا کتا ہے۔ اس کا نام موک ہے؟''

''ہاں۔'' بگ جو نے تصدیق کی۔ ''آؤ میں تمہارے لیے قیام گاہ کا بندوبست کروں۔'' بگ جو نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ کیبن خاصا معقول تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ پردے پڑے تھے۔ ''یہ موسم سرما میں بند رہتا ہے۔ اس لیے اسے گرم رکھنے کے لیے تمہیں کچھ وقت لگے گا۔ اسٹوو جلا کر رکھنا۔''

اینڈریا کی آنکھوں میں پسندیدگی کا رنگ تھا۔ حیرت بھی عیاں تھی۔ اس علاقے میں اس نے اتنا شاندار چوبی گھر نہیں دیکھا تھا۔ قبل اس کے وہ کوئی سوال کرتی، بگ جو نے خود ہی اطلاع فراہم کی۔

''یہ لزا کے دوست مائیکل فلنٹ کی ملکیت ہے۔ تم جب تک چاہو یہاں سکونت اختیار کرسکتی ہو۔''

''مائیکل؟ کون مائیکل فلنٹ؟''

''دوست، محض ایک دوست۔''

''کرائے کا کیا ہوگا؟''

''پہلے تم اچھی طرح جائزہ لے لو، پھر خود فیصلہ کرو۔''

''اوکے۔''

''میں بیس منٹ بعد آتا ہوں، پھر سرچ اینڈ ریسکیو سینٹر چلیں گے۔'' بگ جو نے بتایا۔

''جو، میں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی مشکور ہوں۔''

بگ جو نے مسکرا کر سر ہلایا اور گود میں موجود کتے کی دبیز فر سہلانے لگا۔ کتے کی آنکھیں بھی اینڈریا کی طرح نیلی تھیں۔

''تم اسے کہاں لے جارہے ہو؟'' اینڈریا نے استفسار کیا۔

''موک کو ختم کرنا پڑے گا۔'' بگ جو کی آواز میں ہلکی سی اداسی تھی۔ ''زہریلا انجکشن لگانا پڑے گا۔''

''نہیں، تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' اینڈریا گویا کراہ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور درد کی ملی جلی آمیزش تھی۔

''اینڈریا، یہ ناکارہ ہوچکا ہے...... کیا تم مجھے ایک ظالم شخص سمجھ رہی ہو؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہاری مجبوری سمجھتی ہوں۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''یہ لزا کا کتا ہے...... مم...... میرا...... مطلب ہے، کیا میں اسے رکھ سکتی ہوں؟''

بگ جو نے غور سے اینڈریا کی آنکھوں میں جھانکا، پھر آگے بڑھ کر موک کو اس کی بانہوں میں ڈال دیا۔

''اب یہ تمہارا ہے، پورے کا پورا......''

''اوہ، جو......'' اینڈریا کھل اٹھی۔ ''لیکن کیا مائیکل فلنٹ یہاں موک کو برداشت کرے گا؟''

''کتوں سے مائیکل کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بگ جو نے اینڈریا کو اطمینان دلایا پھر اس نے مرہم کی ایک ٹیوب اینڈریا کے حوالے کی اور ڈوگ فوڈ کے بارے میں بتایا۔

''ہاں، اسے پانی زیادہ پلانا اور اپنا حلیہ اچھا بناؤ، خانہ بدوش لگ رہی ہو...... ٹاؤن میں اسپورٹس شاپ ہے...... وہاں سے کم از کم یہ گندے جوتے ضرور تبدیل کرلینا۔'' بگ جو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

عقب میں اینڈریا منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

سرچ اینڈ ریسکیو کمانڈ پوسٹ ایک وسیع میدان تھا جس کے ایک طرف جنگل اور دوسری جانب منجمد وادی تھی، اینڈریا نے پیڈڈ ٹراؤزرز، فر والا ''پارکا'' اور ہڈ کے ذریعے شدید سردی سے مدافعت کا بندوبست کیا تھا۔ پیروں میں نئے جوتے بگ جو نے اسے پیش کیے تھے۔ کلائیوں پر دبیز بینڈ، ہاتھوں پر دستانے...... کان بھی ڈھکے ہوئے تھے، گویا، موسم کی شدت سے نمٹنے کے لیے وہ پوری طرح مسلح تھی۔

موسم کی وجہ سے وہاں خاصے لوگ تھے۔ زیادہ تعداد ہائیکرز کی تھی۔ جگہ جگہ ان کے ٹینٹ لگے ہوئے تھے۔ فور

وہیل گاڑیاں اور چند برفانی گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ بیشتر افراد کے ہاتھوں میں سینڈوچ اور تھرماس تھے۔ یخ بستہ ہواؤں میں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔ گاہے بگاہے نسوانی چیخیں اور مردانہ قہقہے سنائی دے جاتے۔

کئی افراد نے اینڈریا کو پہچان کر ہاتھ ہلایا۔ میدان کے جنگل والے سرے پر چند کمرے بنے تھے۔ یہی کمانڈ لینڈ تھا۔ وہ بگ جو کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ یہاں اتنی ٹھنڈک نہیں تھی۔ دیواروں پر نقشے چسپاں تھے۔ جابجا جیکٹس اور دستانے بکھرے پڑے تھے۔

اینڈریا کی نظریں وہاں موجود افراد پر گھومتی ہوئی ایک دراز قامت شخص پر جم گئیں۔ وہ کچھ فاصلے پر ریڈیو پر محو گفتگو تھا۔ بات کر کے وہ پلٹا تو اینڈریا حیران رہ گئی۔ وہ کال پیگاٹی تھا۔

اینڈریا نے فوراً ہی نگاہ ہٹالی۔ تاہم دل، سینے میں تین گنا رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ کال پیگاٹی ہی کے باعث لزا اور اینڈریا کے مابین گہری خلیج حائل ہوئی تھی۔ قطع نظر اس کے، کون کتنا ذمے دار تھا...... اینڈریا کے تعلقات کال کے ساتھ تھے۔ کال کی بیوی سیفرون، لزا کی بہترین دوست تھی۔ اینڈریا کے علم میں یہ بات لزا کے ذریعے آئی کہ کال شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی سیفرون، لزا کی بہترین دوست ہے۔ اس شادی کو آٹھ سال ہوگئے تھے۔ لزا کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ کال اور اینڈریا کے تعلقات کی وجہ سے اس کی دوست سیفرون کو کسی قسم کی جذباتی اذیت برداشت کرنی پڑے یا اس کے اور کال کے ازدواجی تعلقات متاثر ہوں۔ اس موضوع پر دونوں بہنوں کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہوئی بعدازاں اینڈریا پہلی فرصت میں الاسکا سے پرواز کرگئی۔

اینڈریا نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ کال ریڈیو چھوڑ کر کھڑا ہو رہا تھا۔ اینڈریا نے ظاہر کیا جیسے وہ دیوار پر آویزاں نقشے کا جائزہ لے رہی ہے۔

''اینڈی!''

''کال، تم؟'' اینڈریا نے پلٹ کر نارمل انداز میں جواب دیا۔ ''کیسے ہو تم؟''

''بظاہر ٹھیک...... لیکن دیگر افراد کے مانند تمہاری بہن کے لیے متفکر ہوں۔''

''تم ابھی تک ''فیئر بینک'' میں ہو؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' کال نے جواب دیا۔ وہ بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔

''کوئی پریشانی ہے؟'' اینڈریا نے سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''اینڈی، بات یہ ہے...... مجھے تمہیں آگاہ رکھنا چاہیے۔'' اس نے خاموش ہو کر پُرسوچ انداز اختیار کیا۔

''کیا بات ہے؟'' اینڈریا کے کان کھڑے ہوئے۔

''اینڈی، میں یہاں آفیشل وزٹ پر ہوں۔'' اس نے نچلا ہونٹ چبایا۔

''میری یادداشت کے مطابق تم اپنا کاروبار سیٹ کرنے جارہے تھے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے...... لیکن میں ساتھ ہی کچھ اور بھی کررہا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ باہر چلتے ہیں۔'' کال نے نرمی سے کہا۔

اینڈریا اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں باہر سرد ماحول میں آگئے۔

''تم آفیشل وزٹ کی بات کررہے تھے؟'' اینڈریا کی آواز میں تجسس تھا۔

''فالکن نام کی ایک بڑی فرم ہے۔ میں اس کے لیے وقتاً فوقتاً انویسٹی گیٹر کا کام کرتا ہوں۔ انشورنس انویسٹی گیٹر...... ہمارے اچھے تعلقات رہے ہیں۔''

''یعنی تمہیں اچھے پیسے مل رہے ہوں گے؟''

''ہاں، لیکن پیسا مسئلہ نہیں ہے۔'' کال پھر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ اب وہ واضح طور پر بےکل دکھائی دے رہا تھا۔

''پھر؟'' اینڈریا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

''میرا اسائنمنٹ، لزا ہے۔'' کال نے نظریں چرائیں۔ لمحہ بھر کے لیے اینڈریا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''کیا کہا تم نے؟'' اس کی آواز از خود بلند ہوگئی۔

''ایسا ہی ہے۔ بڑی اڑچن ہے۔ دو اعشاریہ چار ملین ڈالرز داؤ پر لگے ہیں۔''

''لزا کا کیا تعلق ہے؟'' اینڈریا پلکیں جھپکائے بغیر کال کو گھور رہی تھی۔

''چھ مہینے پہلے اس نے لائف انشورنس کرائی تھی۔'' کال نے پژمردگی سے انکشاف کیا اور بالوں میں ہاتھ گھمانے لگا۔

''ڈیم شٹ، مسٹر کال پیگاٹی......'' اینڈریا تڑخ اٹھی۔

''دیکھو، اینڈی...... تم کیا سمجھ رہی ہو؟''

''میں خوب سمجھ رہی ہوں۔ انشورنس کمپنیوں میں اس قسم کے فراڈ عام ہیں۔ پراپرٹی، کار، فارم یا زندگی یا کسی اور چیز کا بیمہ کراؤ...... بعدازاں مجرمانہ طریقوں سے بیمے کی رقم وصول کرو۔ لائف انشورنس کا معاملہ اور ہے۔ بیمہ کنندہ اپنے کسی عزیز کو بینی فشریز بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موت کی صورت میں بیمے کی رقم سے خود وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اصل وصول کنندہ اگر مجرمانہ ذہنیت رکھتا ہے اور بیمہ کنندہ کے ساتھ مخلص نہیں یا بیمہ کنندہ کی موت کا انتظار نہیں کرسکتا تو وہ بیمے کی رقم وصول کرنے کے لیے اسے ختم کردیتا ہے یا مروا دیتا ہے۔ انشورنس کمپنیاں اتنی آسانی سے رقم ادا نہیں کرتیں اور تفتیش کی صورت میں عموماً اس قسم کے بیشتر جعلی کلیم پکڑے جاتے ہیں لیکن اگر بیمہ کنندہ خود انشورنس کی رقم سے مستفید ہونا چاہتا ہے تو اسے زندہ رہتے ہوئے مرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں عموماً اسے ایک شراکت دار کی ضرورت پڑتی ہے۔ شراکت دار، بیمہ کنندہ کا وصول کنندہ یا بینی فشری ہوتا ہے...... دونوں کے مابین منصوبے کی نوعیت کچھ بھی ہو......''

''اینڈی، تمہاری بیشتر باتیں ٹھیک لیکن......''

''مجھے بات پوری کرنے دو۔'' اینڈریا کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ ''تم انشورنس کمپنی کی طرف سے لزا کے کیس پر تفتیش کررہے ہو...... یعنی تم سمجھتے ہو کہ لزا......''

''اوہ، ہو، تم خاموش تو رہو۔ آخر یہ ایک بھاری رقم ہے اور دنیا میں ایسے ویسے لوگوں کی کمی نہیں جو اتنی بڑی رقم کے لیے اس سے بھی آگے جاسکتے ہیں۔''

اینڈریا نے پیر پٹخے اور دو انگلیاں جوڑ کر کال کے سینے کو ٹھوکا۔ ''تمہیں ہمت کیسے ہوئی؟ کیا میری بہن کا شمار ایسے ویسے لوگوں میں ہوتا ہے؟ کال، تمہاری سوچ نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے...... اگر یہ مذاق ہے تو بہت سنگین ہے۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ انشورنس کے معاملے میں لزا کوئی سازش کررہی ہے۔'' کال نے اٹکی ہوئی آواز میں مدافعت پیش کی۔

''اوہ، ویری گڈ۔ گویا تم کورٹ کے دونوں جانب کھیل رہے ہو۔'' اینڈریا نے طنز کیا۔

''میں تو صرف اپنا کام کررہا ہوں۔''

''تم لزا کو جانتے ہو اور مجھے بھی...... تمہیں یہ ٹاسک لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''میں نے اسائنمنٹ تمہاری وجہ سے لیا تھا۔'' کال نے برف پوش زمین کی جانب دیکھا۔

''وہاٹ، کیا بکواس ہے؟ تم نے تو کئی برس پہلے بھی مجھے دھوکا دیا اور اپنی بیوی کو بھی...... اب تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟'' ماضی کے تصور نے اینڈریا کے حلق میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔

''جب تک تم یہاں ہو، کیا ہم مل سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ بات چیت کرسکتے ہیں؟''

''نہیں اور کمپنی کو جاکر بتادو کہ لزا کی انشورنس پالیسی میں کوئی فراڈ نہیں ہے۔ تفتیش سے ہاتھ اٹھالو۔'' اینڈریا نے خشک لہجے میں بات ختم کرتے ہوئے رخ پھیرلیا۔

''اینڈی، رک جاؤ۔ میں ماضی کی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتا تھا اسی لیے......''

''اسی لیے تم نے اس کیس میں ہاتھ ڈالا۔'' اینڈریا نے مڑے بغیر جواب دیا۔

''اینڈی، تم نے پوچھا نہیں کہ موت کی تصدیق کی صورت میں 2.4 ملین ڈالرز کس کو ملنے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ بینی فشری میں لزا نے کس کا نام لکھا ہے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت زیادہ۔''

اینڈریا، سلوموشن میں گھومی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا تجسس بیدار ہوگیا۔ ''کیا پہیلی ڈالنے والے ہو؟'' اینڈریا کی آواز میں چبھن تھی۔

چند لمحے سکوت طاری رہا پھر کال دھیرے سے گویا ہوا۔

''لزا نے بینی فشری کی جگہ...... تمہارا نام لکھا ہے۔''

☆☆☆

اینڈریا اگلے روز بیدار ہوئی تو اس کے سر کے ساتھ اعضا میں بھی دکھن تھی۔ گزشتہ روز کال کا انکشاف اس کے سر پر بم کے مانند پھٹا تھا۔ متعدد سوالات نے سر اٹھایا تھا اور سوچتے سوچتے اینڈریا کا سر پھٹنے لگا تھا جو کچھ بھی تھا، کم از کم چھ ماہ قبل لزا کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ آخر ایسی کیا بات تھی؟ جس حقیقت نے اینڈریا کو ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ خود اس کا نام تھا جو لزا نے موت کی صورت وصول کنندہ کے طور پر ڈالا تھا۔ کہاں اینڈریا، لزا سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

لزا کے کیبن میں اینڈریا کے خطوط، تصاویر وغیرہ اور اب لائف انشورنس کی دھماکا خیز شق...... گویا اینڈریا یک طرفہ ہی برگشتہ تھی جبکہ لزا اپنے سب غم چھپا کر بھی اسی کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ سکھا اپنے سارے دے کر اس کی

بہن نے اپنی خاطر عذاب رکھ لیے...... لیکن اینڈریا اب حسرتوں کا حساب کیسے رکھے۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس کا پورا وجود ہی پگھلا جارہا تھا۔ میں نے ناحق اسے غلط جانا اور اپنا ہی اعتبار کھودیا۔ وہ لزا کو نہ بچاسکی تو آئینے کا سامنا کیسے کرے گی؟

لزا زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اینڈریا کے سینے میں طوفان اٹھا۔ وہ موسم کے ہاتھوں نہیں مرسکتی۔ انشورنس کا مطلب، اسے انسانوں سے خطرہ ہے۔ وہ لزا کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کرے گی۔ بگ جو نے کہا تھا کہ لزا زندہ ہے۔ کیا لزا، بگ جو سے رابطے میں ہے؟ اینڈریا نے بستر چھوڑ دیا۔

اینڈریا نے لزا کے میل باکس سے نکالی ہوئی اشیا برآمد کیں اور ایک ایک آئٹم دیکھنا شروع کیا۔ چند بل تھے، خطوط اور کارڈز...... صرف ایک خط ایسا تھا جس نے اینڈریا کی توجہ کھینچ لی۔ ارسال کنندہ کے نام کی جگہ ''ٹیسا'' لکھا تھا۔ خط کی ہیڈنگ عجیب اور بڑے حروف میں لکھی گئی تھی۔

''باسٹرڈ تمہارا کچھ نہیں بگاڑسکتا، دبنے کی ضرورت نہیں۔''

اینڈریا نے خط پڑھنا شروع کیا۔ متن غیر واضح تھا۔ اختتام کچھ اس طرح تھا: یہ ایک عام سی زیادتی ہے، لہٰذا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یکسر بھول جاؤ۔ ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ کون پروا کرتا ہے، کب، کہاں پر کیا ہوا۔

اینڈریا نے رقعہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی پتا، نہ فون نمبر۔ مایوسی کے عالم میں اس نے لفافے کا جائزہ لیا تو امید کی کرن چمکی۔ دو اپریل کی تاریخ تھی۔ کمپنی کا نام پیک ایڈونچر تھا جو فیئر بینک میں تھی۔

اینڈریا نے فون اٹھایا۔ قسمت کام کررہی تھی۔

''پیک ایڈونچر۔'' کسی خاتون کی کھنک دار آواز آئی۔

''ہائے، کیا میں ٹیسا سے بات کرسکتی ہوں؟''

''وہ آج ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ اگر کوئی پیغام ہے تو......؟''

اینڈریا نے اپنا تعارف کرایا۔ دوسری جانب سے فوری ردِعمل آیا۔ ''اوہ، گاڈ...... کیا تم نے لزا کو ڈھونڈ لیا ہے؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔''

''ڈیئر لارڈ، امید ہے تم اسے تلاش کرلوگی۔ ہم سب اسے بہت پسند کرتے تھے۔ میں تمہیں نمبر دیتی ہوں۔ تم ٹیسا کے گھر پر بات کرلو۔ وہ بہت خوش ہوگی۔''

''تھینک یو۔'' اینڈریا نے سگریٹ سلگایا۔

دوسری بیل پر اٹھانے والی ٹیسا ہی تھی۔ اینڈریا سے متعارف ہوکر اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ تاہم وہ یہ سن کر مضطرب ہوگئی کہ لزا ابھی تک لاپتا ہے۔ دورانِ گفتگو اینڈریا کو پتا چلا کہ لزا اور ٹیسا کی دوستی پیک ایڈونچر کے ذریعے ہی پروان چڑھی تھی۔ پیک ایڈونچر کا ایک ونگ اپنے گاہکوں کو ہیلی کاپٹر سروس بھی فراہم کرتا تھا۔ ٹیسا کی بیشتر ذمے داریاں ہیلی کاپٹر سروس سے متعلق تھیں۔ وہ گاہکوں کو کوہ پیمائی اور ہائیکنگ کے لیے پہاڑوں پر لے جاتی تھی۔ بعض گاہک نچلی چوٹیوں اور گلیشیر زتک رسائی کو ترجیح دیتے تھے۔ بنابریں لزا تیزی سے ٹیسا کے قریب ہوتی چلی گئی۔

ٹیسا کے تعاون اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے اینڈریا نے ہمت کرکے اسے بتادیا کہ وہ لزا کے نام اس کا خط پڑھ چکی ہے۔ ٹیسا نے برا نہیں منایا، البتہ حیران ضرور ہوئی تھی۔

''اس سے کیا مدد مل سکتی ہے؟''

''شاید کچھ نہیں لیکن کیا تم وضاحت کروگی کہ اس فقرے سے تمہاری کیا مراد تھی۔ 'باسٹرڈ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا'......؟''

''ہاں، باسٹرڈ ایک ہی ہے۔'' ٹیسا نے گہری سانس لی۔ اس کا نام پیٹر سانٹونی ہے۔''

''ٹیسا، معاف کرنا...... کیا تم ''میری گلی موٹ'' کو جانتی ہو؟'' اینڈریا نے معاً کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

''نہیں۔'' ٹیسا نے لاعلمی ظاہر کی۔

اینڈریا نے اسے میری کے قتل کے بارے میں بتا دیا۔

''گڈ لارڈ......''

لمحاتی سکوت نے بات چیت کا سلسلہ منقطع کردیا۔

''ٹیسا، تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں، تاہم مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''پیٹر سانٹونی کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟''

''وہ دونوں ساتھ کام کررہے تھے۔ پتا نہیں دونوں کے درمیان ناپسندیدگی کب اور کیسے پروان چڑھی۔ تاہم خراب تعلقات میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب سانٹونی کو لزا کے کورٹ کیس کے بارے میں پتا چلا۔''

''کورٹ کیس؟''

''لزا نے اگرچہ اس معاملے میں مجھ سے رازداری کا

وعدہ لیا تھا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں باخبر رہنا چاہیے...... چھ سال قبل یو ایس ڈسٹرکٹ کورٹ نے لزا کو طلب کیا تھا۔ اس کا سبب یونیورسٹی کا پروفیسر کرو تھا۔ اسی نے سمن جاری کرائے تھے۔ پروفیسر کرو، لزا کی غیر ذمے دارانہ سرگرمیاں روکنے کے لیے اسے کورٹ لایا تھا...... یہی چارجز تھے۔ اور وہ جیت گیا، لزا جیل جانے کا رسک لیے بغیر عدالتی جنگ کو طول نہیں دے سکتی تھی۔"

اینڈریا سوچ رہی تھی کہ چھ سال قبل لزا کی عمر تیئس برس تھی۔ گویا وہ پی ایچ ڈی کے درمیان تھی۔ یعنی واشنگٹن ڈی سی سے پی ایچ ڈی کرنے کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ عدالتی جنگ کے باعث یونیورسٹی سے فریقین کی بے دخلی یقینی تھی۔

"آخر لزا ایسا کیا کر رہی تھی کہ پروفیسر کرو نہ صرف اسے کورٹ لے گیا بلکہ اپنی پروفیسر شپ بھی داؤ پر لگا دی؟"

"لزا نے پروفیسر پر قتل کا الزام لگایا تھا۔" ٹیسا نے جواب دیا۔ جواب سن کر اینڈریا کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔

"پندرہ سال پہلے۔" ٹیسا نے بات آگے بڑھائی۔ "جیرالڈ نام کا ایک طالب علم ہائیکنگ کے دوران مارا گیا تھا۔ اسے حادثے سے ہی تعبیر کیا گیا۔ جیرالڈ ایک جینئس طالب علم تھا۔ تاہم قبل اس کے وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کرتا، حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ حقیقت سے ہر کوئی لاعلم تھا۔ تاہم اس وقت کرو اس کے ساتھی طالب علم کی حیثیت سے اس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ کسی طرح جیرالڈ کے تھیسس کی نقل لزا کے ہاتھ لگ گئی۔ کرو نے جو مقالہ جمع کرایا تھا، پُراسرار طور پر وہ جیرالڈ کے مقالے سے بے حد مماثلت رکھتا تھا۔ کرو نے مقالہ جیرالڈ کی موت کے کچھ عرصے بعد جمع کرایا تھا...... لزا کا فطری تجسس بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنے طور پر چھان بین شروع کر دی۔ کرو اس وقت تک پروفیسر بن چکا تھا۔

"ذاتی تفتیش کے دوران میں لزا کے علم میں یہ بات آئی کہ کرو گاہے گاہے کوہ پیمائی کا شوق پورا کرتا تھا جس دن جیرالڈ کی موت ہوئی، کرو اسے پہاڑ پر لے گیا تھا۔ لزا کا اسکرو ڈھیلا ہو گیا اور پروفیسر کرو پر چڑھ دوڑی۔ غالباً اس نے عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کورٹ میں پروفیسر کے مقابل اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال یہ خاصا اسکینڈل بن گیا تھا۔"

اینڈریا شاک کی حالت میں یہ عجیب کہانی سن رہی تھی۔

"کس کس کو پتا تھا؟"

"تنازعہ کافی پھیل گیا تھا۔ کیونکہ ایک ہائر علمی ادارے میں اس قسم کا معاملہ غیر معمولی تھا۔ مستزاد کہ ایک طالب علم بھی مارا گیا تھا۔" ٹیسا نے جواب دیا۔

"پیٹر سانتونی کو کیونکر پتا چلا، یہ میں نہیں جانتی۔" ٹیسا کی آواز آئی۔ "لیکن یہی بات تھی جس کے ذریعے وہ لزا کو کسی معاملے میں چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔"

ٹیسا نے اینڈریا کی معلومات میں توقعات سے بڑھ کر اضافہ کیا تھا۔ تاہم اینڈریا مزید کچھ کام کی بات معلوم کرنے میں ناکام رہی۔ فون بند کر کے وہ سوچوں میں غلطاں کمرے کی لمبائی چوڑائی ناپنے لگی۔ موک بھی اپنی نئی مالکن کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اس نے اینڈریا سے مانوس ہونے میں بہت کم وقت لیا تھا۔ موک کی صحت بھی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اینڈریا کا رخ لزا کے کیبن کی طرف تھا۔ وہاں گاڑیوں کی خاصی تعداد دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ مزید براں، کیبن کے اردگرد پول نصب کر کے زرد رنگ کے ٹیپ سے احاطہ بندی کر دی گئی تھی۔ گویا وہ کوئی کرائم سین تھا۔ ٹروپر وینڈنگ کو دیکھ کر اینڈریا اس کی طرف بڑھی۔ یہ وہی کم عمر اہلکار تھا جس نے پہلے بھی اینڈریا اور بگ جو کو کیبن میں جانے سے روکا تھا...... اینڈریا نے ڈیمارکو کے بارے میں استفسار کیا۔ وینڈنگ نے اسے انتظار کرنے کو کہا اور خود ایک طرف غائب ہو گیا۔ اس کی واپسی جلدی ہوئی تھی تاہم اینڈریا کا منہ بن گیا۔ کیونکہ اس کے ہمراہ ڈیمارکو کے بجائے کال پیگانی تھا۔

"ڈیمارکو کہاں ہے؟" اینڈریا کی آواز میں خشکی تھی۔

"مصروف ہے۔" جواب کال کی طرف سے آیا تھا۔

اینڈریا نے چبھتی ہوئی نگاہ کال پر ڈالی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ پولیس میں بھرتی ہو گئے ہو؟"

"میں تفتیشی ٹیم کا حصہ ہوں، اگرچہ "کرائم سین" کے ہر کونے کھدرے تک رسائی نہیں رکھتا۔"

"کرائم سین؟" اینڈریا کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ یعنی اس کا خدشہ ٹھیک نکلا تھا۔ زرد ٹیپ کا مطلب

واضح تھا بلکہ یہ خدشہ پہلے سے موجود تھا۔ جب میری کی گاڑی لزا کے کیبن کے باہر ملی تھی۔

کال نے بغور اپنی سابقہ گرل فرینڈ کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ "کیا ہم کسی مناسب جگہ بیٹھ کر کوئی ڈرنک نہیں لے سکتے؟" کال نے سرسری انداز میں کہا۔

اینڈریا نے اچٹتی نظر ٹروپر وینڈنگ پر ڈالی۔ اس نے کال کی آواز میں پنہاں خفیف سی ذومعنویت کو محسوس کر لیا تھا۔ لہٰذا اس نے خلافِ ارادہ ہامی بھر لی۔

کچھ دیر بعد دونوں موز بار میں براجمان تھے۔

"کال میں اس لیے تمہارے ساتھ آ گئی ہوں کہ شاید کرائم سین کے بارے میں تم کچھ بتا سکو۔ لہٰذا تم کوئی ناپسندیدہ موضوع نہیں چھیڑو گے۔" اینڈریا نے تنبیہ کی۔

"چار سال بعد بھی تم اس قدر نالاں ہو...... جبکہ میں چار سال سے نادیدہ بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں۔" کال نے اینڈریا کی آنکھوں میں دیکھا۔ جواباً اینڈریا نے ہاتھ اٹھا کر بیزاری کا اظہار کیا۔

کال نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ اس نے کافی مگ میں چاکلیٹ کو ہلایا اور چرمی نشست گاہ سے کمر ٹکا دی۔ "اوکے، اینڈی...... شاید تمہارا رویہ جائز ہے۔ میں نے وینڈنگ کے سامنے اس لیے بات نہیں کی تھی کہ پولیس تمہیں زیادہ کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے یا فی الحال ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے...... کیبن کی ایک چوبی دیوار سے انہوں نے اعشاریہ پینتالیس کیلیبر کی گولی برآمد کی ہے۔ گولی انہوں نے لیب روانہ کر دی ہے۔ انہیں تقریباً یقین ہے کہ "میری گلی موٹ" کی باڈی سے جو دو گولیاں حاصل ہوئی تھیں وہ اور کیبن والی گولی ایک ہی سیمی آٹومیٹک آتشیں ہتھیار سے فائر کی گئی تھیں۔ تینوں گولیوں کا کیلیبر بھی اعشاریہ پینتالیس ہے۔ بس انہیں لیب رزلٹ کا انتظار ہے۔" کال کافی مگ ہونٹوں تک لے گیا۔

گردن کی پشت پر اینڈریا کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ کال کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ یہ حقیقت پہلے ہی عیاں تھی کہ باڈی جہاں دریافت ہوئی تھی، ہلاکت وہاں نہیں ہوئی تھی۔

"میری کو لزا کے کیبن میں گولی ماری گئی؟" بدقت تمام اینڈریا نے سوال کیا۔

کال نے نظریں چرائیں۔ "پولیس کو وہاں خون کے نشانات بھی ملے ہیں اور وہ نمونے بھی لیب روانہ کر دیے گئے ہیں۔"

"لیکن...... مجھے وہاں ایسے کوئی نشان دکھائی نہیں دیے تھے۔" اینڈریا نے نشست میں پہلو بدلا۔ اس کی رفتارِ نبض میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"عام آدمی کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ایسے نشانات کو چھپانے کے کئی طریقے اور اسپرے موجود ہیں۔ گولی کی دریافت کے بعد پولیس نے شدومد کا مظاہرہ کرتے ہوئے، خون کے نشانات دریافت کر لیے۔" کال نے جواب دیا۔

دونوں کافی مگ میز پر دھرے تھے۔ سکوت کا پلڑا واضح طور پر بھاری ہو گیا۔ اینڈریا کے دماغ میں خیالات و خدشات کی یلغار، پیہم رواں تھی۔ لیب رزلٹ کے مطابق خون اگر لزا کا ہوا؟ کیا اسے بھی ہلاک کر دیا گیا ہے؟ لیکن بگ جو کے نزدیک وہ زندہ ہے؟ اگر خون واقعی میری کا ہوا تو اس کا کیا مطلب لیا جائے گا؟ دونوں ایک دوسرے کو جانتی تھیں؟ کیا دونوں کی کیبن میں جھڑپ ہوئی؟ سوال در سوال...... اینڈریا کا دماغ چکرانے لگا۔ گتھی الجھتی جا رہی تھی۔ دفعتاً اینڈریا کے مفلوج ہوتے ذہن میں زوردار کڑاکا ہوا۔ بقول، کال پیگانی...... اینڈریا، لزا کی لائف انشورنس کی رقم وصول کرنے کی قانونی حق دار تھی۔ اگر...... اگر......

اینڈریا نے آنکھیں موند لیں۔ اس نے سوچنا بند کر دیا تھا۔

اپنے ہاتھ پر لمس محسوس کرتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ کال نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ کال کا ہاتھ جیسے بول رہا تھا۔ لمس میں ڈھارس تھی، امید...... اپنائیت اور شاید کہیں دکھ والم بھی ہلکورے لے رہا تھا۔

"میری، لزا کو کیسے جانتی تھی؟" اینڈریا نے نرمی سے ہاتھ کھینچا۔

"یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے دونوں دوست تھیں۔ کاؤچ کے عقب سے میری کا بیگ ملا ہے۔"

"لیکن کیسے......؟ میری، ورجینیا کی رہائش کنندہ تھی؟"

"کانفرنس کے ذریعے یا کام کی وجہ سے...... دونوں کا تعلق سائنس سے تھا۔" کال نے خیال آرائی کی۔

اینڈریا کو لزا کا باس تھامس یاد آیا۔ "کیا تھامس، میری سے واقف تھا؟"

"میں اس بارے میں اندھیرے میں ہوں۔"

ایک بار پھر خاموشی کا پردہ تن گیا۔

اینڈریا اندر ہی اندر تھامس سے ملنے کا فیصلہ کر رہی تھی۔ اس گفتگو نے اس کے اعصاب ہلا دیے تھے۔

☆☆☆

اینڈریا، ٹروپر وینڈنگ کے ہمراہ بریفنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کمرے کا انتظام بھی اسکول میں کیا گیا تھا۔ وہاں ایک ہی میز تھی۔ ایک دیوار گیر سفید بورڈ تھا۔ ڈیمارکو نے بیٹھتے ہوئے اسے بھی اشارہ کیا۔ میز کی تیسری کرسی خالی تھی۔ ڈیمارکو نے وینڈنگ کی جانب دیکھا۔ اینڈریا نے حیرت محسوس کی جب وہ خلافِ توقع کرسی سنبھالنے کے بجائے باہر نکل گیا۔

ایک منٹ نہیں گزرا تھا کہ وینڈنگ کے بجائے دوسرا وردی پوش اندر داخل ہوا۔ اینڈریا کو ایک بار پھر حیرت کا سامنا تھا۔ چند روز قبل وردی پوش کو اس نے بڑھے ہوئے شیو اور شاٹ گن کے ساتھ دیکھا تھا۔ تاثرات میں درشتگی تھی۔ لباس بھی دوسرا تھا...... جس جہاز میں وہ میک کے ساتھ ''ایک ایچ'' پہنچی تھی۔ وردی پوش اسی جہاز میں تھا اور راستے میں اتر گیا تھا۔ ہاں، وہ وکٹر ہی تھا۔ نئے حلیے میں...... کلین شیو...... اس وقت اس کی عمر قدرے کم معلوم ہو رہی تھی۔ تاہم اینڈریا کے اندازے کے مطابق وہ پچاس سے اوپر ہی کا تھا۔

''مسٹر وکٹر۔'' اینڈریا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے نسبتاً شائستگی سے سرخم کرتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''سارجنٹ پیکائی۔''

اینڈریا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اگرچہ ماضی میں کال نے اپنی فیملی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا تاہم اس کے باپ کا فوجی پس منظر اینڈریا کے علم میں تھا۔ کال نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ بعد میں اس کا باپ عسکری ادارہ چھوڑ کر پولیس میں چلا گیا تھا۔

''کال پیکائی کے والدِ محترم؟''

سارجنٹ نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ڈیمارکو، تحقیقات میں میری معاون ہے۔'' سارجنٹ نے نشست سنبھالی۔ اس وقت اس کے بولنے کا انداز بھی بدلا ہوا تھا جبکہ جہاز میں وہ بالکل ہی اجڈ دکھائی دے رہا تھا۔

''ہم چند غیر رسمی سوالات کریں گے؟'' اس نے استفہامیہ انداز اختیار کیا۔

اینڈریا نے اپنی اس خواہش کو دبایا کہ وہ وکیل کی موجودگی میں بات کرے گی۔ اس نے سوال جواب کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔

''تمہاری بہن کے اکاؤنٹ میں ایک سو تیئس ہزار ڈالرز ہیں، کیوں اور کیسے؟'' پہلا سوال ہی قطعی غیر متوقع تھا۔

''وہاٹ؟'' اینڈریا کو سماعت کا دھوکا معلوم ہوا۔

سارجنٹ پیکائی نے پھر وہی الفاظ ویسے ہی دہرائے۔ اس کے لہجے میں خشکی در آئی تھی۔ اینڈریا نے بھی اشتعال محسوس کیا۔ ''خدا بہتر جانتا ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''ہم دونوں چار برس سے لاتعلق ہیں۔''

''وجہ؟''

''ذاتی!'' اینڈریا نے بھی مختصر اور خشک جواب دیا۔

سارجنٹ چند سیکنڈ، اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اینڈریا بھی پلک جھپکائے بغیر اسے تکتی رہی۔

''اوکے۔'' اس نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ 2.4 ملین خرچ کرنے کے لیے تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟'' سارجنٹ نے بدلحاظی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا براہِ راست اشارہ انشورنس کی رقم کی جانب تھا۔

چنگاری اینڈریا کے تلوے میں لگی اور پل بھر میں لپکتی ہوئی جا کے نظر میں شعلہ بن کے چمکی۔ ''سارجنٹ! کسی اچھے علاقے میں ایک شاندار فارم خرید کے تمہیں تحفے میں دوں گی۔'' اینڈریا کی فطری سرکشی میں ابال آگیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے میز پر جمائے اور جلتی ہوئی نظریں، سابق فوجی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

ڈیمارکو چونک اٹھی اور پیکائی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''تم اپنے لیے دشواریاں پیدا کر رہی ہو۔'' وہ پھنکارا۔

''مشغلہ ہے میرا۔'' اینڈریا کے اندز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مارے اشتعال کے پیکائی کے نقوش بگڑ گئے۔ قبل اس کے کہ وہ آپے سے باہر ہوتا، ڈیمارکو نے مداخلت کی۔

''اینڈریا تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہمیں ماحول کو خوشگوار رکھنا چاہیے۔''

اس قسم کے بے ہودہ سوالات کی ذمے داری میرے اوپر نہیں ہے۔'' اینڈریا نے ڈیمارکو کی جانب رخ کرلیا۔ دوسری جانب پیکائی کسمسا کے رہ گیا۔ اینڈریا کا ردِعمل اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ ایسی مردمار لڑکی سے پہلے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ڈیمارکو نے اسے آنکھ سے اشارہ دیا۔ پھر اینڈریا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اوکے، اوکے...... تم کیا پینا پسند کروگی؟''

''کچھ نہیں۔'' اینڈریا نے خود کو سنبھالنا شروع کیا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''پیکائی۔'' سارجنٹ نے فون اٹھایا۔ اس کے

جبڑے اب تک بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے خاموشی سے مختصر بات سنی اور کمرے سے نکل گیا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو ایک آدھ سوال کا جواب دے دو۔ ممکن ہے، تمہارے جوابات لزا کے لیے مددگار ثابت ہوں۔'' ڈیمارکو نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

''مثلاً؟''

''لزا کی کسی کے ساتھ دشمنی، میرا مطلب ہے اس کا کوئی دشمن یا کوئی عداوت؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔''

اچانک اسے ٹیسا کی سنائی ہوئی کہانی یاد آئی اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''البتہ چند برس پہلے یونیورسٹی میں...... میں نہیں سمجھتی کہ آیا اس بات کا موجودہ صورتِ حال سے کوئی تعلق بنتا ہے۔''

ڈیمارکو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''بعض اوقات غیر متعلقہ امور حیرت انگیز طور پر مددگار ثابت ہوتے ہیں۔'' ڈیمارکو نے اینڈریا کی حوصلہ افزائی کی۔

اینڈریا نے اختصار کے ساتھ پروفیسر کرو کے بارے میں بتایا لیکن ٹیسا کا ذکر گول کرگئی۔ ڈیمارکو نے تیزی سے نوٹ پیڈ پر لکھنا شروع کیا پھر وہ کرسی سے اٹھ کر اینڈریا کے قریب میز کے کونے سے ٹک گئی۔

''وہ ایک اچھا پولیس مین ہے۔'' ڈیمارکو بولی۔

اینڈریا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''وہ بُرا آدمی نہیں ہے، تم ایک بار اس کے طریقہ کار کو سمجھ لوگی تو سارجنٹ کو بہتر آدمی پاؤ گی۔''

''ممکن ہے۔'' اینڈریا نے نیم دلی سے کہا۔

''میں پیکائی کے بیٹے کال کو بتا چکی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔ لزا اپنی ہی موت کا ڈراما نہیں رچا سکتی...... اور چار سال سے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بہرحال وہ میری بہن ہے۔ بجا طور پر ہماری ماں فکرمند ہے۔ نتیجتاً میں اس کی مدد کے لیے یہاں دکھائی دے رہی ہوں۔ لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر کیا چکر چل رہا ہے؟''

''ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم لزا کو انشورنس فراڈ کے لیے موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ تاہم ہم انشورنس کے معاملے کو سرے سے نظرانداز بھی نہیں کرسکتے...... جبکہ یہ محض چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ تمہیں ہماری مجبوری سمجھنی چاہیے۔'' ڈیمارکو نے وضاحت پیش کی۔

عین اسی وقت وکٹر طوفانی انداز میں بریفنگ روم میں داخل ہوا۔ ڈیمارکو کو اشارہ کر کے وہ پھر پلٹ گیا۔ ڈیمارکو معذرت کر کے خود بھی باہر نکل گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

اینڈریا پھرتی سے اٹھی اور دبے قدموں دروازے تک پہنچی۔ اس نے بایاں کان دروازے پر رکھ دیا۔ تاہم وہ کچھ بھی سننے میں ناکام رہی۔ قدموں کی قریب ہوتی آواز پر وہ واپس اپنی جگہ پر آگئی۔

ٹروپرز نے بھی اندر آ کر اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔ پیکائی کا چہرہ بظاہر بے تاثر تھا۔ تاہم زیرِ جلد دباد باجوش اینڈریا کی تیز نگاہ کی زد میں آگیا۔ اینڈریا نے خود کو نارمل رکھا۔ تاہم دماغ میں دور کہیں الارم بجنے لگا تھا۔

وکٹر پیکائی نے حتی الامکان نارمل انداز میں سوال کیا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ لزا کسی پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی یا کام کی نوعیت کے بارے میں تمہارے پاس کوئی خبر ہو؟''

''نہیں۔''

''کیا کبھی، لزا نے ''میگ'' کا ذکر کیا تھا؟ میری مراد ہے چار سال پہلے کوئی بات کی ہو؟'' پیکائی محتاط تھا۔

''نہیں۔'' اینڈریا نے پھر مختصر جواب دیا۔ تاہم اس کے ذہن میں بجنے والے الارم کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر کسی بُری خبر کا سامنا کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ کم از کم پیکائی کے رُوبرو وہ کسی قسم کی کمزوری کے اظہار کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

''شاید تمہیں پتا نہ ہو کہ لزا کے کیبن میں دو چیزیں دریافت ہوئی ہیں۔ ایک سیمی آٹومیٹک سے چلائی گئی اعشاریہ پینتالیس کی گولی۔'' پیکائی نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

اینڈریا کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے اپنے ظاہر پر آہنی شیلڈ چڑھالی۔ وہ بدترین خبر عزم و حوصلے کے ساتھ سننا چاہتی تھی۔

''دوسری چیز خون کے دھبے تھے۔ کچھ دیر قبل دونوں کا لیب رزلٹ موصول ہوگیا ہے۔ خون، میری گلی موٹ کا تھا۔'' پیکائی نے رک کر بغور اینڈریا کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

اینڈریا کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ نہ اس نے نظریں چرائیں۔ البتہ میز کے نیچے اس کے دونوں ہاتھ مٹھیوں کی شکل میں سختی سے بھنچ گئے تھے۔

''میری کی ہلاکت اسی قسم کی گولی سے ہوئی ہے۔

میری کی ہلاکت کے معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے ہم نے تمہاری بہن کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے ہیں۔“

☆☆☆

لزا کے چہرے پر فولادی عزم کی سختی تھی۔ اکلوتے کُتّے ”روسکو“ کی مدد سے وہ قدم بہ قدم ڈھلوان پر چڑھ رہی تھی۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ ایک قدم رکھتی اور مطمئن ہونے کے بعد دوسرا قدم اٹھاتی۔ تھکاوٹ اور بھوک کی وجہ سے ذہن پر لہر در لہر غنودگی حملہ آور ہو رہی تھی۔ کھوپڑی میں جیسے دماغ کے بجائے برف کی گیند رکھی ہوئی تھی۔ یہ بھربھری گیند اب ٹھوس شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

وہ جس برفانی علاقے سے گزر رہے تھے، وہ وادیوں اور کھاڑیوں سے پُر تھا۔ چھوٹی بڑی پہاڑیاں راستے میں حائل تھیں۔ کبھی نیچے اترنا پڑتا اور کبھی رخ اوپر کی جانب ہو جاتا۔ لزا کے ذہن میں صرف ایک بات تھی کہ اب تک تعاقب کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ متعاقبین نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سفاک قاتل تھے۔ اور ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے مکمل طور پر یکسو۔

وہ تین تھے۔ انہوں نے بلا تامل میری کو گولیاں مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ لزا جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اگرچہ تب سے اس نے پیچھا کرنے والوں کو نہیں دیکھا تھا۔ تاہم اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ پُریقین تھی کہ قاتل بلائے بے اماں کی طرح اس کے پیچھے تھے۔ ان کے نظر نہ آنے کی ایک وجہ مخصوص کیموفلاج برفانی لباس تھا۔ لزا کو اس لحاظ سے سبقت حاصل تھی کہ وہ علاقے کو قاتلوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور سے جانتی تھی۔ نیز سورج، ستاروں اور زمینی نشانات کی مدد سے کب، کس طرف رخ کرنا ہے؟ ایسی تمام تراکیب اسے ازبر تھیں۔

دشمنوں کا سہارا، صرف لزا کے قدموں کے نشانات تھے یا پھر ”روسکو“ کے پنجوں کے نشانات...... موک کو روانہ کرنے کے بعد وہ اسکی جو رنگ نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا کتے کے ہمراہ پیدل رواں تھی۔ اکثر اوقات برف باری کے باعث قاتل اپنے مطلوبہ نشانات سے بھی محروم ہو جاتے تھے۔

روسکو وقتاً فوقتاً پلٹ کر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کے لیے سوگوار آواز بلند کرتا۔ موک، بمشکل اپنی مالکن سے جدا ہوا تھا۔ لزا کو یقین تھا کہ وہ سیدھا بگ جو کے پاس جائے گا۔ موک کو روانہ کرنے سے پہلے ایک مقام پر وہ نیم غشی کی حالت میں گری تھی۔ سدھائے ہوئے کتے تقریباً اس کے ساتھ لپٹے رہے اور فر کی حرارت لزا کے لیے مددگار ثابت ہوئی۔

موک نے جدا ہونے سے پیشتر روسکو کے ساتھ مل کر دوسری بار اس وقت لزا کی جان بچائی جب وہ کسی نہ کسی طرح ایک چٹانی کھوہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کھوہ میں وہ یخ بستہ ہوا کے براہِ راست تھپیڑوں سے بچ گئی۔ کینڈل روشن کرنے کے لیے اس نے سلیڈ کو کھوہ میں کھینچا...... اس زور آزمائی کے دوران میں اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

صبح اسے ہوش آیا تو وہ سمجھ نہ سکی کہ کہاں پر ہے۔ وہ کتوں کے درمیان سینڈوچ بنی پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے ادراک ہوا کہ کتے ایک بار پھر اسے زندگی کی طرف لے آئے ہیں۔

اس نے نئے عزم کے ساتھ ہمت پکڑی۔ ہاتھوں میں حرارت واپس لانے کے لیے اسے کافی دیر لگی، پھر کہیں جا کر وہ آگ روشن کر سکی۔ ٹن پین میں برف پگھلا کر پی اور کتوں کو پلائی، بچی کھچی چاکلیٹ کو حسر...... ے دیکھا۔ معمولی مقدار میں چاکلیٹ چبا کر بقیہ ٹکڑا اس نے واپس رکھ لیا۔ بعدازاں اس نے موک کی رسّیں چاقو سے کاٹ کر اسے روانہ کر دیا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر اپنی بدحال مالکن کو دیکھتا رہا۔

”گو، موک...... گو...... گڈ بوائے...... گو......“

موک وہاں سے بمشکل ٹلا تھا۔ لزا نے دعا کی اور نئے حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میلونی کے ٹھکانے تک پہنچے بغیر اس کا بچنا محال تھا۔

وہ دھیمی رفتار سے محوِ سفر تھی۔ لزا وقتاً فوقتاً چلتے چلتے رک جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے اور کتے کو دیکھ کر کوئی پرندہ یا جانور حرکت پذیر ہو...... اس طرح اس کی لوکیشن کا دشمنوں کو اندازہ ہو سکتا تھا۔ رکنے کی دوسری وجہ سماعت کا استعمال تھا۔ سماعت کے زور پر وہ کوئی مخدوش آواز سننے کی کوشش کرتی۔ پھر آگے بڑھتی۔ ابتر حالت میں یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ خطروں کا احساس بھی لزا کی گرتی ہوئی توانائی کو نچوڑ رہا تھا۔ ایک مقام پر اس کی مڈبھیڑ بھیڑیوں سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔

بالآخر وہ میلونی کے ٹھکانے کے قریب پہنچ کر گر گئی۔ راستے میں بھی دو مرتبہ وہ ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ روسکو کی موجودگی ایک بڑا سہارا ثابت ہوئی تھی۔

زمین پر پڑے پڑے اس نے چاکلیٹ ختم کر دی۔ میلونی کا کیبن جنگل نما قطعہ اراضی پر تھا۔ لزا نے خود پر قابو

پاتے ہوئے بے دھڑک اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ اطمینان کرنے کے بعد وہ روسکو کو لے کر اندر چلی گئی۔

ایک جانب شکار کیے ہوئے دو مردہ خرگوش لٹک رہے تھے۔ روسکو سیدھا اس جانب لپکا۔ لزا نے اشیائے خورونوش پر حملہ کیا۔ تاہم وہ کھانے پینے میں محتاط تھی۔ بہت تھوڑی پیٹ پوجا کرنے کے بعد اس نے وہاں موجود اپنی مطلوبہ اشیا اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ بعدازاں رک سیک اتار کر ایک طرف رکھا۔ رک سیک میں جو کچھ تھا، اسی وجہ سے میری قتل ہوئی اور اسی کے لیے قاتل لزا کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اگر وہ بروقت رک سیک میں موجود ”شے“ کو کہیں چھپا دیتی تو کم از کم فوری طور پر قتل و غارت گری کی نوبت نہ آتی۔

تیس منٹ آرام کرنے کے بعد وہ کیبن میں موجود ہیم ریڈیو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ذرا دیر میں وہ ”کنگ“ کے کوڈ نیم سے بگ جو سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لزا اپنی آواز اور لب و لہجہ بدلنا نہیں بھولی تھی۔ اس قسم کے ریڈیو کی بات کہیں اور بھی سنی جا سکتی تھی۔ بگ جو بھی اشاروں میں بات کر رہا تھا۔ ”الفا“ (اینڈریا) کی الاسکا آمد کی خبر نے لزا کو ناقابلِ بیان مسرت سے دوچار کر دیا۔ اس نے تیزی سے بگ جو کو چند ہدایات دیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کیبن میں رہ کر میلونی کا انتظار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لزا، روسکو کے ساتھ کیبن کے قریب ہی جنگل میں چھپ گئی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر وہ میلونی کو ٹاؤن بھیجنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

گھنٹوں بعد بالآخر اینڈریا، ماں سے رابطے کے لیے ہمت مجتمع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جولیا میکال، بیٹی کی آواز سن کر تڑپ اٹھی۔ اس کی اضطرابی، لرزیدہ آواز سن کر اینڈریا نے ماں کی بڑھتی ہوئی ذہنی پریشانی کا اندازہ لگایا۔ جولیا ایک ہی سوال کی تکرار کر رہی تھی۔ اینڈریا نے ماں کو لزا کی سلامتی کا یقین دلایا۔ تسلی تشفی کے بعد جب جولیا میکال قدرے پُرسکون ہوئی تو اینڈریا نے استفسار کیا۔

”لزا کس پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی؟“

”تم جانتی ہو کہ وہ اپنے کام کے بارے میں ہمیشہ اپنی مرضی کرتی تھی۔“ جولیا چند ساعت خاموش رہ کر پھر بولی۔ ”وہ موڈ میں ہوتی تو کبھی کبھی میگ کا ذکر کرتی تھی۔“ جولیا نے بتایا۔

اینڈریا چونک اٹھی۔ سارجنٹ نے بھی ”میگ“ کے بارے میں سوال کیا تھا۔

”ماں، میگ سے کیا مطلب...... میگان یا میگی؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی، شاید میگی...... وہ جب میگ کے بارے میں بات کرتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے میگ اس کی کوئی عزیز ترین سہیلی ہے۔“

”میگ کا سرنیم پتا ہے آپ کو؟“

”نہیں، لزا نے کبھی اس کا پورا نام نہیں لیا۔“ جولیا نے جواب دیا۔

”ماں، یونیورسٹی کے پروفیسر کرو کو آپ جانتی ہیں؟“

”ہاں، لزا کرو کا ذکر کرتی تھی۔ دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ شروع میں ساتھ کام کرتے تھے لیکن بعد میں کوئی بدمزگی ہو گئی تھی۔ ایسا کیوں ہوا، میں نہیں جانتی۔“

”ماں......“ اینڈریا مقدمے کے بارے میں سوال کرتے ہوئے رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“ جولیا نے سوال کیا۔

”ماں، اپنا خیال رکھنا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اینڈریا نے بات بدل کر فون بند کر دیا۔

وہ کچھ دیر خیالات میں غلطاں رہی پھر یونیورسٹی آف الاسکا کا نمبر ملایا۔ اس نے میگ کے بارے میں سوال کیا تھا۔

”کون میگ؟“ ڈپارٹمنٹ بتایئے۔“

”جیو فزیکل انسٹی ٹیوٹ۔“ اینڈریا نے کچھ سوچ کر اندازے سے جواب دیا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ سرجان راس انسٹی ٹیوٹ؟“

”یس۔“

وقفہ......

”ایک نام ہے۔ میگان ولسن۔ کیا لائن ملاؤں؟“

”یس پلیز۔“ اینڈریا اندھیرے میں تیر چلا رہی تھی۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی اور کچھ دیر بعد لائن کٹ گئی۔ وہ پھر کوشش کرے گی۔ اینڈریا نے فیصلہ کیا اور لزا کے باس تھامس کا نمبر ملایا۔ پتا چلا کہ تھامس چھٹیوں پر ہے۔ تین روز سے قبل اس کی واپسی ممکن نہیں...... اگلا سوال کرنے سے پہلے ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

بعدازاں اینڈریا، سپر مارکیٹ کی طرف نکل گئی...... ضروری شاپنگ کرنے کے بعد وہ لوٹی اور ایک بار پھر میگان کو ٹرائی کرنے والی تھی کہ ’موک‘ نے اچانک بھونکنا شروع کر

دیا۔ اینڈریا نے اسے خاموش کرایا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ حلق کی گہرائی سے ''ووف......ف......'' کی آواز نکال کر وہ بیٹھ گیا۔ تاہم اس کی دم گردش میں تھی اور اینڈریا کی دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔

دروازہ کھولنے پر وہ ڈیانا کو پہچان گئی۔ ڈیانا غیر یقینی نظروں سے ''موک'' کو دیکھ رہی تھی۔

''اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا۔'' وہ بولی۔ ''اس طرح نہیں غراتا تھا۔''

''کافی پیوگی؟'' اینڈریا راستے سے ہٹ گئی۔

''شکریہ، لیکن ابھی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذی ٹکڑا آگے بڑھایا۔ ''میں یہ پہنچانے آئی تھی۔''

کاغذ کا ٹکڑا کسی نوٹ بک سے پھاڑا گیا تھا۔ اسے چار تہوں کے ساتھ فولڈ کیا گیا تھا۔ اینڈریا نے پرچہ کھولا اور اس کا حلق بند ہوگیا۔ پھیپھڑوں کو آکسیجن کی ترسیل رک گئی۔

''میڈ میلونی کے ٹھکانے پر ملو۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں پایا جاتا ہے۔ کسی کو مت بتانا۔ لو یو......لزا۔''

اینڈریا کی رکی ہوئی سانس پھر سے جاری ہوگئی بلکہ سانس پھول گئی۔ اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے ڈیانا کو اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔ گھٹاٹوپ اندھیروں میں بالآخر دفعتاً امید کی کرن چمکی تھی۔

''میلونی، میرے انکل ہیں...... پہاڑوں میں رہتے ہیں...... شکاری ہیں۔ کل آدھی رات گزرنے پر وہ ٹاؤن میں آئے تھے۔ وہ عجلت میں تھے۔ تاکید کر گئے ہیں کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ خصوصاً پولیس تک بات نہ پہنچے۔''

''تم نے یہ پڑھ لیا ہے؟''

''لزا میری بھی دوست ہے۔''

''تمہارے انکل تک میں کیسے پہنچ سکتی ہوں؟''

''تم میری برفانی مشین استعمال کر سکتی ہو۔'' ڈیانا نے اندرونی جیب سے ایک نقشہ نکالا۔ اینڈریا نے ایک نظر نقشے پر ڈالی پھر ڈیانا کو دیکھا۔

''پتا نہیں لزا کس حال میں ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''ممکن نہیں ہے۔ میرے بغیر بار بند ہو جائے گا، جب تک دوپہر میں میرا کزن نہیں پہنچ جاتا۔''

''میں اس علاقے اور جنگلی حیات سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ اگر میں راستہ بھٹک گئی تو بہت برا ہوگا۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے لیکن میری مجبوری کو سمجھو...... ایسا کرتے ہیں کہ تم مائیکل فلنٹ کو ساتھ لے لو۔ تم اس پر بھروسا کر سکتی ہو۔'' ڈیانا نے مشورہ دیا۔

''مائیکل فلنٹ...... جو اس کیبن کا مالک ہے؟''

''ہاں، احتیاطاً تم نقشہ بھی ساتھ رکھو۔''

اینڈریا کو بگ جو کی بات یاد تھی کہ مائیکل، لزا کا دوست ہے۔ بگ جو ہی اینڈریا کو اس کیبن میں چھوڑ گیا تھا۔ اینڈریا سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے پھر نقشہ دیکھا...... ڈیانا نے نقشے پر میلونی کے ٹھکانے کی نشاندہی کی۔

''یہ کیا ہے؟'' ایک دائرے میں "U" کی شکل پر اینڈریا نے انگلی رکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یو'' کا نشان، میلونی کے چوبی کیبن سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

''اَن ویری فائیڈ لینڈنگ ایریا۔'' ڈیانا قریب ہو گئی۔ ''یہ غالباً فلنٹ کی ہنٹنگ لاج ہے۔''

''کیا فلنٹ مقامی ہے؟''

''نہیں۔ لیکن وہ یہاں خاصا معروف ہے۔''

''دولت مند معلوم ہوتا ہے، کیا کرتا ہے؟''

''متعدد کام۔ زنک اور گولڈ کی مائننگ میں وہ بڑا حصے دار ہے۔ کئی ہوٹلوں اور مہمان خانوں کا مالک ہے۔ ایک ٹمبر کمپنی بھی ہے۔ نیز اس کا اپنا ایئر کرافٹ بھی ہے۔''

''بہت خوب۔'' اینڈریا نے سیٹی بجائی۔

''فلنٹ، علاقے سے خوب واقف ہے۔ مزید یہ کہ جنگلات میں اس کے متعدد کیبن ہیں۔ جنہیں لزا اپنا سمجھ کے استعمال کرتی رہی ہے۔''

''یعنی فلنٹ، پولیس تک نہیں جائے گا؟'' اینڈریا نے نقشہ لپیٹا۔

''میں نہیں سمجھتی، لزا کے معاملے میں وہ ایسا کرے گا۔'' ڈیانا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اسے ابھی فون کرتی ہوں۔''

اینڈریا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

مائیکل فلنٹ دراز قد، مضبوط قد کاٹھ کا مالک تھا۔ اس کی وجاہت نمایاں نظر آتی اگر شیو بڑھا نہ ہوتا اور آنکھیں سرخ نہ ہوتیں...... یوں لگ رہا تھا کہ وہ کئی روز سے سویا نہیں ہے۔ اس نے اینڈریا سے ہاتھ ملایا تاہم شکریے کے الفاظ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کیبن کے کرائے کی پیشکش بھی اس نے ایک طرف کر دی۔ وہ جلد ہی اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

''بقول ڈیانا کے لزا نے تمہیں کوئی نوٹ بھیجا ہے؟''

''ہاں، مجھے امید ہے کہ تم رازداری کا خیال رکھو

گے۔''

''ظاہر ہے، لزا میری دوست ہے۔ میں پولیس تک کیوں جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ لزا کو گرفتار کر لیں گے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ لزا کسی کو قتل کر سکتی ہے؟ پولیس اسے میری کا قاتل سمجھ رہی ہے؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ اس خونی واردات کی ذمّے دار لزا ہے لیکن کیا تم سوالات کا ذخیرہ بعد کے لیے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ ہمیں روانہ ہونے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔'' فلنٹ کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''اوکے۔'' اینڈریا نے اتفاق کیا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ ڈیانا کے مسکن کے قریب اس کی برفانی مشین کے پاس کھڑے تھے۔ فلنٹ نے ماہرانہ انداز میں گاڑی کو دوبار چیک کیا۔ ایمرجنسی سپلائز، نائف، شاٹ گن، ایمو، فلیئر، ٹارچ، ڈرائی بیٹریز وغیرہ۔ مطمئن ہونے کے بعد فلنٹ نے گرم جیکٹ کی اندرونی جیب سے دستی جی پی ایس یونٹ نکالا۔ اور اینڈریا کو اس کے استعمال کا طریقہ سمجھایا۔ آخر میں اس نے ڈیانا کا مہیا کردہ نقشے کا مطالعہ شروع کیا۔ فلنٹ نے نقشہ زیادہ دیر نہیں دیکھا، نہ اسے ضرورت تھی لیکن اس کی پیشانی شکن آلود ضرور ہوگئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اینڈریا بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''جہاں وہ لاپتا ہوئی تھی اور جہاں اسے تلاش کیا جاتا رہا، یہ مقام اس سے کافی فاصلے پر ہے۔ میلونی کا ٹھکانا قطعی مخالف سمت میں ہے۔ تادیر جاری رہنے والے طوفان اور نامساعد حالات میں وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟'' فلنٹ نے سر اٹھا کر پُرسوچ انداز میں خلا میں جھانکا۔ اینڈریا اور ڈیانا خاموش تھیں۔

فلنٹ نے ڈیانا کی طرف رخ کیا۔ ''اگر ہم دوپہر تک واپس نہ آئیں تو چند افراد کے ساتھ ہمارے لیے اپنے انکل کے ٹھکانے پر آ جانا۔'' ڈیانا کے چہرے پر الجھن تھی، تاہم اس نے اثبات میں سر ہلایا جبکہ اینڈریا کی چھٹی حس نے سر اٹھانا شروع کیا۔ فلنٹ واضح طور پر غیر مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیانا کو دی گئی ہدایت کسی گڑبڑ کا اعلان کر رہی تھی۔ قبل اس کے، وہ کوئی سوال کرتی، فلنٹ نے چلنے کا عندیہ دے دیا۔ فلنٹ نے برفانی گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی کا انجن غراہٹ کے ساتھ بیدار ہوا تھا۔ اینڈریا نے سرعت سے عقبی نشست سنبھال لی۔

☆☆☆

سر سے پاؤں تک اس کا لباس کسی جانور کی کھال تھا۔ شانے پر مردہ خرگوش لٹک رہا تھا۔ ہاتھ میں شاٹ گن تیار حالت میں تھی۔

اگرچہ فلنٹ نے احتیاط کرتے ہوئے گاڑی جنگل میں فاصلے پر چھوڑ دی تھی اور اینڈریا کو لے کر وہ سامنے کے رخ سے نہیں آیا تھا۔ پھر بھی شکاری اچانک ہی ایک درخت کی آڑ سے نکلا اور فلنٹ کو غیر مسلح ہونے پر مجبور کر دیا۔

''میلونی۔'' فلنٹ شاٹ گن گرا کر آہستہ سے گھوما۔ ''میں ہوں۔ مائیکل فلنٹ۔''

''میں لزا کی بہن اور ڈیانا کی دوست ہوں۔ ڈیانا نے لزا کا بھیجا ہوا پرچہ مجھے دیا تھا، ہم لزا کے لیے آئے ہیں۔ تم یقیناً ڈیانا کے انکل ہو۔'' اینڈریا نے دوستانہ انداز میں کہا۔

میلونی، گن نیچے کیے بغیر تفتیشی انداز میں اینڈریا کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری شکل لزا سے تو نہیں ملتی؟''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' اینڈریا نے لزا کا پرچہ جیب سے نکال کر لہرایا۔

''میلونی، گن نیچے کرو...... لزا کئی روز سے لاپتا تھی۔ تمہارے ذریعے یہاں اس کی موجودگی کا علم ہونے پر ہم یہاں آئے ہیں۔'' فلنٹ نے عام سے انداز میں کہا۔

''طوفان بہت خوفناک تھا۔ سب اس کے لیے پریشان تھے۔''

اینڈریا حیران تھی کہ اسے کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔

''لزا خیریت سے ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں، خوفناک طوفان تھا۔'' میلونی نے فلنٹ کی بات کا جواب دیا۔

''سب سوچ رہے تھے کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔'' فلنٹ نے کہا۔

عجیب آدمی ہے۔ اینڈریا نے سوچا۔ میلونی کی گن جھکنے لگی۔

''آخری بار میں نے اسے دیکھا تو وہ زندہ تھی۔'' میلونی نے کہا۔ اینڈریا کی گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ یہ کیا جواب تھا۔ فلنٹ بھی چونک پڑا۔

''کیا مطلب ہے، اس بات کا؟'' فلنٹ نے سوال کیا۔

''کل رات میں ٹاؤن گیا تھا تو اسے یہاں چھوڑ گیا

تھا۔''

''ہاں، ڈیانا نے بتایا تھا کہ انکل نے لزا کے لیے کچھ ضروری اشیا بھی خریدنی تھیں۔'' اینڈریا نے کہا۔

''ہاں، میں اس کی مطلوبہ اشیا لے آیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' اینڈریا نے بے چینی سے سوال کیا۔

''میں واپس پہنچا تو وہ جا چکی تھی۔''

''وہاٹ...... لیکن کیوں؟'' اینڈریا شپٹا گئی۔

''پتا نہیں...... میں معذرت خواہ ہوں۔''

''وہ کس طرف گئی ہے؟'' فلنٹ نے اپنی گن اٹھالی۔

''سوری...... رات کچھ برف باری ہوئی تھی جس کے باعث میں اندازہ نہیں لگا سکا۔'' میلونی نے جواب دیا۔

''کیوں، آخر کیوں؟ اس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟'' اینڈریا کی آواز میں کرب تھا۔ ''وہ پریشان تھی؟''

''کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ بہت پہلے نکل گئی تھی۔ میں اس کے لیے جو اشیا لایا تھا، اس نے میرا ابھی انتظار نہیں کیا۔''

''میں دیکھ سکتی ہوں، اس نے کیا منگوایا تھا؟''

''ہاں۔'' میلونی کیبن کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔

میلونی کی خریداری میں کچھ طبی سامان تھا اور باقی اشیا خواتین کے مخصوص استعمال کی تھیں۔ دو ڈبے چاکلیٹ کے تھے۔

فلنٹ باریک بینی سے کیبن کا جائزہ لے رہا تھا۔

فراق کی اذیت ناک میخ اینڈریا کے دل میں چبھ رہی تھی۔ ایک اچھی خبر کے ساتھ، اتنے قریب آ کے وہ لزا کو دیکھ بھی نہ سکی...... دوسری تکلیف کیل سوال کی تھی، جو اس کے دماغ میں گھسی جا رہی تھی...... لزا نے اس کا انتظار کیوں نہیں کیا۔

وہاں زبردستی لے جانے کے کوئی اشارے موجود نہ تھے۔ ورنہ میلونی جیسے تجربہ کار و مشاق شکاری سے پوشیدہ نہ رہتے۔

فلنٹ کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہ ملا، جو یہ ظاہر کرتا کہ لزا کو زبردستی وہاں سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ لیکن کیوں؟ اسے جانا ہوتا تو وہ اینڈریا کو کیوں بلاتی؟ مزید یہ کہ اسے کیونکر پتا چلا کہ اینڈریا وہاں پہنچ چکی ہے؟ معاً اینڈریا کی نظر ہیم ریڈیو پر پڑی۔

''کیا لزا نے کسی کو کال کی تھی؟'' وہ تیزی سے میلونی کی طرف گھومی

''ہوسکتا ہے۔ تاہم میری موجودگی میں اس نے ایسا نہیں کیا۔'' اینڈریا پُریقین تھی کہ لزا نے کسی سے ریڈیو پر بات کی ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اسی نے لزا تک اینڈریا کی آمد کی اطلاع پہنچائی تھی۔

''تم نے ٹاؤن میں ڈیانا کے علاوہ کسی اور کو تو لزا کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟'' فلنٹ نے مشکوک نظروں سے میلونی کو تاڑا۔

میلونی نے جسم کا وزن دوسرے پیر پر منتقل کیا۔ اس کا چہرہ متغیر دکھائی دیا۔ وہ خاموش تھا۔

''پلیز انکل، سوچیے، لزا کو ہماری مدد درکار ہے۔'' اینڈریا نے گویا التجا کی۔

''دراصل یہاں ویرانے میں عرصے سے مجھے پینے پلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔'' میلونی نے جھینپتے ہوئے اعتراف کیا۔

اینڈریا کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر فلنٹ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دونوں سمجھ گے کہ میلونی کیا کہنے جا رہا ہے۔

''میں بار میں رک گیا اور خود کو روک نہ سکا۔ شاید تھوڑی زیادہ پی لی تھی۔''

''چچا، آپ نے بہت زیادہ پی لی تھی۔'' اینڈریا نے دل میں کہا۔ وہ کفِ افسوس مل کے رہ گئی اور فلنٹ کو دیکھا۔ فلنٹ نے مایوسی سے سر کو جنبش دی۔

''پھر میری مڈبھیڑ ہینک، بلی بوب، رونی...... اور آخری میں بگ جو سے ہوئی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ بگ جو بہت پریشان ہو گیا تھا۔''

اتنے لوگوں تک بات پہنچ گئی۔ اینڈریا نے عالمِ دہشت میں پھٹی پھٹی نظروں سے فلنٹ کو دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ فلنٹ اپنا غصہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میلونی کچھ شرمندہ دکھائی دیا۔

''لزا کی حالت کیسی تھی؟'' اینڈریا نے رنجیدہ آواز میں سوال کیا۔

''وہ شدید تھکن کا شکار تھی اور کمزور ہو گئی تھی۔ چہرے اور ہاتھ پر ایک آدھ جگہ فراسٹ بائٹ کے اثرات تھے۔'' میلونی نے بتایا۔

''انکل، لزا مشکل میں ہے۔ ایک عورت قتل کر دی گئی ہے جس کا الزام لزا پر لگایا جا رہا ہے۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا ہے۔ آپ جو کچھ بتا سکتے ہیں بتا دیں...... پلیز۔'' اینڈریا نے پھر التجا کی۔

قتل والی اطلاع پر میلونی چونک اٹھا۔

''تمہیں پتا ہے کہ قتل کس نے کیا ہے؟'' میلونی نے عجیب سوال کیا۔

''ابھی تک نہیں۔''

''میں شرط لگا سکتا ہوں اس بات پر۔''

''کس بات پر؟''

''کہ قتل کس نے کیا ہے؟''

''وہاٹ؟'' اینڈریا کے ساتھ فلنٹ بھی دنگ رہ گیا۔ یعنی واردات میلونی کے علم میں تھی۔

''قتل کس نے کیا ہے؟'' اینڈریا کا سوال سرگوشی میں ڈھل گیا۔

''اسی نے، جس سے وہ بھاگتی پھر رہی ہے۔'' میلونی نے ایک اور دھماکا کیا۔

''وہ کس کے آگے بھاگ رہی ہے؟'' فلنٹ نے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔

''اپنے شوہر کے آگے۔''

اینڈریا لڑکھڑا گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ فلنٹ بھی چند لمحوں کے لیے سناٹے میں آگیا۔

''اس نے شادی کر لی تھی؟'' الفاظ بمشکل اینڈریا کی زبان سے ادا ہوئے۔

''تمہیں نہیں بتایا تھا، اس نے؟'' میلونی نے الٹا سوال کیا۔

''کون ہے وہ؟''

''لزا نے کبھی اس کا نام نہیں لیا۔''

''مقامی؟ انگلش؟ امریکن؟'' اینڈریا نے تیزی سے پوچھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ فلنٹ بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اینڈریا نے وقتی طور پر فلنٹ کو نظر انداز کر دیا تھا۔

''کم آن، سوچو...... کبھی اس کی زبان پھسلی ہوگی۔''

میلونی چند ساعت کے لیے خاموش ہو گیا۔

''وہ پائلٹ ہے۔'' میلونی نے کلیو دیا۔

''پائلٹ؟ کمرشل، پرائیویٹ؟ ائرکرافٹ یا ہیلی کاپٹر یا پھر دونوں کا؟''

''یہ نہیں معلوم۔'' میلونی نے اعتراف یا۔

وہاں خاموشی چھا گئی۔ اینڈریا بری طرح چکرا گئی تھی۔ کچھ باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں۔ بیشتر امور فہم و ادراک سے بالاتر تھے اور کچھ انکشافات یقینی و بے یقینی کے بھنور میں قلابازیاں کھا رہے تھے۔

''کیا تمہارے لیے یا ہمارے لیے وہ کوئی اشارہ چھوڑ گئی ہے؟'' اینڈریا نے سوچ کر سوال کیا۔

''چھوڑا کچھ نہیں، البتہ لے گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میری پرانی شاٹ گن اور کچھ ایمونیشن لے گئی ہے۔'' میلونی نے بتایا۔ ''لیکن وہ ایک نوٹ چھوڑ گئی ہے کہ بعد میں ادائیگی کر دے گی۔''

اینڈریا کو کوئی اور سوال نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظر فلنٹ پر ڈالی۔

''چلنا چاہیے۔'' فلنٹ کھڑا ہو گیا۔ اینڈریا آبدیدہ ہو گئی۔ چار سال میں پہلی بار وہ لبِ دریا پہنچ کر بھی تشنہ لب تھی...... دفعتاً اینڈریا نے پیش قدمی کی اور میلونی کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

''بہن کا خیال رکھنے کا شکریہ۔''

میلونی منہ کھولے ہاتھ کی پشت کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہاں فراسٹ بائٹ نمودار ہو گیا ہو۔

☆☆☆

لیک ایج، واپسی کے سفر کے دوران میں اینڈریا کا ذہن متواتر قلابازیاں کھاتا رہا۔ بہرحال گھومتی چکراتی خیالی رو بار بار حیران کن انکشافات سے حاصل شدہ آسودگی پر اٹک جاتی کہ لزا نہ صرف زندہ ہے بلکہ شادی کر چکی ہے۔

لیکن وہ غائب کہاں ہو گئی۔ ایک کتے کے ساتھ وہ زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ وہاں موجود ہیم ریڈیو بھی اینڈریا کے تصور میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے ریڈیو پر کس کو کال کی؟ اور کیا وہ کال محفوظ تھی؟ اس قسم کے ریڈیو پر کال کوئی اور بھی سن سکتا تھا۔

واپس پہنچنے پر اس نے فلنٹ کا شکریہ ادا کیا۔ فلنٹ نے اینڈریا کو آرام کا مشورہ دیا اور جاتے جاتے لزا کا پرچہ ساتھ لے گیا۔ وہ ہچکچائی تھی، تاہم رقعہ فلنٹ کی درخواست پر اینڈریا نے اس کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی میگ کے بارے میں سوال کر بیٹھی۔

رخصت ہوتے فلنٹ کے پیر جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ اس کی آنکھوں میں ایک تاثر چمک کر غائب ہو گیا۔ اینڈریا الجھن میں پڑ گئی۔

''میگ؟'' اس نے لفظ دہرایا۔ ''کیوں؟ کہاں سنا تم نے یہ لفظ؟''

''پولیس نے استفسار کیا تھا۔''

ٹک...... ٹک...... سیکنڈ گزرنے لگے۔

''اینڈریا!'' اس کی آواز اور آنکھوں میں نرمی تھی۔

"مشورہ سمجھو یا نصیحت...... اس نام کے معاملے میں حد درجہ احتیاط سے کام لینا۔"

"کیوں؟ آخر میگ کون ہے؟ کیا کرتی......"

"وعدہ کرو، آئندہ یہ نام زبان پر مت لانا۔" اس کے تاثرات میں غصہ در آیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ اینڈریا عالمِ استعجاب میں اس کی پشت کو تکتی رہ گئی۔

خیالات میں غلطاں وہ فلنٹ کے شاندار کاٹیج نما کیبن میں آ گئی۔ گرم پانی سے غسل کر کے اس نے اشیائے خورونوش سے انصاف کیا۔ دبیز موزے لیے اور ٹریک سوٹ پر اپنا پسندیدہ سویٹر پہن کر اس نے فون اٹھایا اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ماں سے رابطہ کیا۔ اول لزا کی خیریت سے مطلع کیا۔

"ڈارلنگ، گزشتہ بار تم نے میگ کے بارے میں پوچھا تھا؟"

"ہاں ماں، کیوں؟ کیا بات ہے؟" اینڈریا کے کان کھڑے ہو گئے۔

"یہاں ایک آدمی آیا تھا۔ وہ لزا کی کولیگ میگ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

اینڈریا کے ذہن میں الارم کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کون آدمی؟ کیا اس نے دھمکایا تھا؟ کیا آپ خیریت......"

"سکون سے رہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بقول اس کے وہ لزا کا دوست تھا۔ لیکن وہ جو نام بتا رہا تھا، وہ نام لزا کے منہ سے میں نے کبھی نہیں سنا...... میتھیو ایوانز۔"

"وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"لحیم شحیم امریکی۔ براؤن ہیئر، براؤن آئیز...... عمر چالیس اور پچاس کے درمیان۔ آنکھوں کے لیے ٹینٹڈ گلاسز اس کے زیرِ استعمال تھے۔"

"وہ کیا جاننا چاہتا تھا؟"

"میگ کا اتا پتا...... وہ یہ بھی پوچھ رہا تھا کہ آخری بار میری اور لزا کی بات چیت کب ہوئی تھی اور موضوع کیا تھا؟ نیز کیا لزا نے مجھے کوئی چیز ارسال کی ہے...... وغیرہ وغیرہ...... بظاہر وہ چارمنگ تھا لیکن اس کے سوالات نے میرے اوپر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ اور ہاں وہ چین اسموکر تھا۔ میں لزا کو خوب جانتی ہوں۔ وہ اس قسم کے دوست نہیں پالتی۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔"

"ماں، بہت خیال رکھنا اپنا...... بلکہ رالف انکل کو کچھ دن کے لیے وہیں بلا لو۔" اینڈریا نے سگریٹ بجھاتے ہوئے مشورہ دیا۔ "لزا زندہ ہے۔ میں بہت قریب پہنچ گئی ہوں۔ جلد ہی اسے ڈھونڈ لوں گی۔ لزا کے لیے فکر مند مت ہونا۔"

"ڈارلنگ مجھے تم پر بھروسا ہے۔ تم نے بہن کے لیے وہاں جا کر میرا مان رکھ لیا۔ وہ اب بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

"ماں، میں جان گئی ہوں...... اگر یہاں نہ آتی تو خود کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔" اینڈریا جذباتی ہو گئی۔

"میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔" جولیا میکال کی جانب سے پُراطمینان جواب آیا۔

☆☆☆

"اینڈریا؟ اینڈریا میکال؟ اینڈریا؟" یہ نسوانی پکار تھی۔

کون شور مچا رہا ہے؟ اینڈریا سوچتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر آتشی رنگ زلفوں والی ایک قدرے فربہ عورت کھڑی تھی۔ گھنگریالے سرخ بال شانوں اور پیشانی کو چوم رہے تھے۔ ہاتھ میں خاصا بڑا کارپٹ بیگ تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔

"آئی ایم اینڈریا۔" اینڈریا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"اوہ تھینک گاڈ...... بالآخر تم مل گئیں۔ میں لزا کی دوست کونی بامین ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بیگ نیچے رکھ کر اینڈریا کا بڑھا ہوا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ تم ایک تکلیف دہ صورتِ حال سے گزر رہی ہو...... اگرچہ یہ ایک بے تکی بات معلوم ہوتی کہ میں تمہارے ہم قدم رہنے کی بات کروں۔ لیکن میں یہ ہمت کر بیٹھی ہوں۔ شاید تمہیں سہارا ملے، شاید میں کچھ کر سکوں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ کوئی طوفان لزا کو نگل سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے اور جہاں بھی ہے، مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ مجھے خوف تھا کہ تم مجھے غلط نہ سمجھو......" وہ بے تکان بول رہی تھی۔

اینڈریا کو کچھ عجیب لگا۔ تاہم اسے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہ تھا کہ یہ عورت اسے اچھی لگی تھی۔

"میں نے کہاں کہاں فون نہیں کیا۔ نیم پاگل ہو گئی۔ ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔" اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

اینڈریا پوچھتے پوچھتے رہ گئی کہ تم نے میگ کو بھی فون کیا یا نہیں۔ اسے فلنٹ کی نصیحت یاد آ گئی تھی۔ ساتھ ہی وہ حیران تھی کہ لزا کے دوستوں کی تعداد کہاں جا کر ختم ہو گی۔

میگ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کافی کی پیشکش کر بیٹھی۔ کونی نے بخوشی دعوت قبول کرتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ موک بیٹھے بیٹھے غرایا۔

"وہیں بیٹھے رہو اور خاموشی سے بیٹھو۔" اینڈریا نے اسے ڈپٹا۔

کافی کے علاوہ اینڈریا نے بلیو بیری مفن فریج سے نکالے۔ کونی کی زبان حسبِ معمول قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کے انگریزی لہجے سے اینڈریا نے اندازہ لگایا کہ اس کا پس منظر برطانیہ میں ہے۔ دونوں جلد ہی بے تکلف ہو گئیں۔

"میری بہن کو تم کیسے جانتی ہو؟"

"میں چھ مہینے سے اس کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ ہم تھامس کے ساتھ ہیں۔ تھامس کو تم جانتی ہو گی لیکن کئی روز سے وہ فون نہیں اٹھا رہا۔" کونی نے مفن کا ٹکڑا منہ میں منتقل کیا۔

"وہ چھٹیوں پر ہے۔" اینڈریا نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ لزا کی گمشدگی سے بھی بے خبر ہے۔ اسے معلوم ہوا تو وہ کھلبلی مچا دے گا۔ وہ دونوں بہت قریب تھے۔" کونی کی گفتار سے یہ بات عیاں تھی کہ یہاں کے معاملات کے علاوہ بھی وہ بہت باخبر ہے۔

اینڈریا کو ماں کی بات یاد آئی کہ لزا تھامس کو باپ کا درجہ دیتی ہے۔ دونوں میں بہت انڈراسٹینڈنگ ہے۔

"مجھے تھامس کی طرف سے بھی پریشانی ہونے لگی ہے۔" کونی نے کافی کا گھونٹ لیا۔ "اور میگ کی بھی فکر ہے۔"

"میگ؟" اینڈریا بے اختیار چونک اٹھی۔ کونی اسی کی جانب متوجہ تھی۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم نے یہ نام نہیں سنا۔" کونی نے پورے اعتماد سے کہا۔ اینڈریا نے لمحوں میں تردید نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

"کون ہے وہ؟"

"دیکھو ڈیئر۔" کونی نے کافی اور مفن کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ "میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتی ہوں، باوجود اس کے کہ میں نے تھامس سے وعدہ کیا ہوا ہے۔"

"کل ایک آدمی ہماری ماں کے پاس پہنچا تھا۔ وہ میگ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ مشکوک معاملہ ہے اور میں حقائق کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

کونی کے چہرے پر ہچکچاہٹ نمودار ہوئی۔ "میگ کے بارے میں جاننا تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ یہ بات تھامس اور لزا ابھی بخوبی جانتے ہیں۔"

اینڈریا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ معاملہ کیا ہے؟ فلنٹ نے بھی ایسی ہی بات کی تھی۔

"اوکے...... تم لزا کی بہن ہو۔ اسی کی مدد کے لیے یہاں آئی ہو۔ مشکل میں ہو۔ تمہارا حق بنتا ہے۔" کونی پُرسوچ انداز میں تھم تھم کر بولی۔ چند ساعت گزرنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میگ اِز ٹاپ سیکرٹ...... اگر ایک لفظ بھی تمہارے منہ سے نکلا تو میں، تھامس اور لزا تمہیں کچا چبا جائیں گے۔ یہ بات سمجھ لو۔" کونی قطعی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"سمجھ گئی۔" کچھ نہ سمجھتے ہوئے اینڈریا نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کونی کو اطمینان دلایا۔

"گڈ، ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ کسی کو میگ کی بھنک لگے۔" کونی قریب سرک آئی۔ "میگ کسی لڑکی کا نام نہیں ہے۔" کونی نے حیران کن انکشاف کیا۔ "میگ کا مطلب ہے میگا انجن جنریشن۔"

اینڈریا دنگ رہ گئی۔

"میگ پر تھامس اور پیٹر، پیٹر سانٹونی کئی سال سے کام کر رہے تھے۔" کونی نے مزید بتانا شروع کیا۔

پیٹر کے نام پر اینڈریا ایک بار پھر چونکی تھی۔ تاہم اس مرتبہ اس نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔

"پیٹر نے ایک مرتبہ میگ سے میرا تعارف کرایا تھا لیکن اس کی ٹیکنالوجی اتنی پیچیدہ تھی کہ مجھے کامیابی کے آثار مفقود دکھائی دیے۔ حالانکہ پیٹر ذہین تھا۔ اس کا ڈیٹا، فارمولے، طریقہ کار اور معلومات سب متاثر کن تھے۔ اس کے باوجود کامیابی کا پرندہ دور فضاؤں میں ہی پرواز کرتا رہا۔

"جب لزا پروجیکٹ میں شامل ہوئی تو اس نے نئے خیالات پیش کیے۔ اس کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ بڑا غیر روایتی قسم کا۔ لزا کے بعض آئیڈیاز بظاہر احمقانہ دکھائی دیے لیکن حیرت انگیز طور پر پروجیکٹ نے رینگنا شروع کر دیا۔ لزا اور پیٹر میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لزا اس کا مذاق اُڑانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ تلخی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ پیٹر نے پروجیکٹ سے لزا کی علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ مستزاد یہ کہ وہ

پروفیسر کرُو کے کیس سے بھی واقف ہوگیا۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تاہم باپ تھامس، لزا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آویزش خاصی بڑھ چکی تھی۔ آخر میں پیٹر واک آؤٹ کر گیا۔"

"تھامس اور لزا نے حفاظتی نقطہ نظر کے تحت لیب اور وفاتر میں تالے ڈالنے شروع کر دیے۔ پیٹر کی اہمیت اور حیثیت ختم ہوگئی۔ وہ آج تک اس معاملے پر برہم ہے۔"

"میگ کیا بلا ہے؟"

"میگ وہ بلا ہے جس پر تمہاری بہن فریفتہ ہو چکی ہے۔ "ٹیسلا" اس کا ہیرو تھا۔ لیکن وہ وھِلل کے کام سے بھی متاثر تھی۔ وھِلل نے جیٹ انجن پر کام کیا تھا۔"

اینڈریا کے ذہن میں لزا کی بات گونجنے لگی۔ وہ کہا کرتی تھی۔ "ہمیں ایک اور وھِلل کی ضرورت ہے جو ہمیں آگے لے جائے، مزید آگے۔ لندن سے سڈنی، صرف دو گھنٹے میں...... بغیر کسی عام اور مہنگے فیول کی مدد سے......"

وہاں گہرا سکوت چھا گیا۔

"ایک انوکھا جیٹ انجن۔" کونی مسکرائی۔

"تم مذاق کر رہی ہو؟" اینڈریا کا ذخیرۂ الفاظ ختم ہو گیا۔ اس کی دیوانی، سرپھری بہن نے کوئی ناقابلِ یقین چیز ایجاد کر لی ہے۔

کونی ہنسنے لگی۔ "کیا یقین نہیں آرہا؟"

"ہاں۔" اینڈریا نے جلدی سے کہا۔ تاہم اسے خوف کا بھی احساس ہوا۔ اگر کونی سچ بول رہی ہے تو پوری ایوی ایشن انڈسٹری کا مستقبل بدل جائے گا۔

"کونی، تم جانتی ہو، میری گلی موٹ کون تھی؟"

"ہاں، مجھے اس کی ہلاکت کی خبر جب ملی تو اس وقت میں ہوائی جہاز میں تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں ایک موٹی رقم کھو چکی ہوں۔"

مزید کافی تیار کرتے ہوئے اینڈریا کھڑکی سے باہر فاصلے پر منجمد جھیل کو دیکھ رہی تھی۔ کونی کی شکل میں اسے ایک ایسا ہمدرد مل گیا تھا جو لزا کی تلاش میں اسی کی طرح پُرعزم تھا بلکہ کونی بیشتر مخفی امور سے بخوبی آگاہ تھی۔

"رقم؟" اینڈریا، خیالات کی دنیا سے باہر آئی۔

"ڈیئر، میں ان کی بزنس انویسٹر تھی۔"

☆☆☆

کونی، برائٹ لائٹ یوٹیلیٹیز کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ تھی۔ برائٹ لائٹ، مستقبل کے منصوبوں پر تحقیق اور سرمایہ کاری کرتی تھی۔

"لیکن جیٹ انجن کا الیکٹرسٹی سے کیا تعلق بنتا ہے؟"

"میگ کسی شکل میں الیکٹرسٹی استعمال نہیں کرے گا بلکہ وہ توانائی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہوگی۔ لزا کے اکاؤنٹ میں 123,000 کی رقم برائٹ لائٹ کی جانب سے آئی تھی۔ 100,000 مزید ایک سال بعد آنے تھے۔" کونی کی گفتگو سے اینڈریا نے محسوس کیا کہ کونی کے نزدیک لزا اور برائٹ لائٹ کے سرمائے سے زیادہ میگ کی اہمیت ہے۔ بظاہر میگ کی لیب بکس کے ساتھ فرسٹ ڈیزائن غائب تھا۔ میگ کو پیٹنٹ کرانے کے لیے ان چیزوں کی شدید اہمیت تھی۔ کونی اس بات پر بدمزہ تھی کہ پروٹو ٹائپ (فرسٹ ڈیزائن) اور لیب بکس غلط ہاتھوں میں جا چکی ہیں۔ یعنی میگ کوئی بھی پیٹنٹ کرا سکتا ہے۔

"کیا اب تک پیٹنٹ نہیں کرایا گیا ہے۔" اینڈریا کی آواز میں خوف کی جھلک تھی۔

کونی نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "تھامس کچھ زیادہ ہی محتاط تھا کہ کوئی اس کا آئیڈیا نہ چرا لے۔ میں نے اسے متعدد بار بتایا کہ پیٹنٹ کرانے کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی آچکی ہے۔ جو درخواست پہلے جمع کرائے گا، پیٹنٹ کے حقوق اسے نہیں مل سکتے۔ حقوق اس کے نام پر رجسٹرڈ ہوں گے جو ثابت کرے گا کہ اصل آئیڈیا اس کا تھا۔ چنانچہ پرٹو ٹائپ اور لیب بکس کے بغیر تیس سال کی محنت تباہ ہو سکتی تھی۔" کونی نے تفصیل سے وضاحت پیش کی۔

"میری......؟"

"ہاں، میری کا تعلق پیٹنٹ آفس، ورجینیا سے تھا۔ ایک سال پہلے لزا USTPO آفس گئی تھی۔ تھامس درخواست فائل کرنا چاہتا تھا۔ لزا اور میری میں دوستی ہوگئی۔ جو آخر وقت تک جاری رہی۔

"USTPO، میگ کے بارے میں جان گئی تھی؟"

"نو، تھینک گاڈ، صرف میری کو پتا تھا لیکن میری کا رویّہ اور سوچ بھی پُراسرار تھی۔ "لزا، میری سے ملنے کے لیے فیئر بنکس کیوں نہیں گئی...... بجائے میری کو کرائے کی شیوی بلیزر میں یہاں آنا پڑا؟"

"میری تفتیش اور نظریے کے مطابق، وہ یہاں پروجیکٹ کا فرسٹ ڈیزائن دیکھنے آئی تھی۔ غالباً وہ لزا کو قائل کرنا چاہتی تھی کہ وہ پروٹو ٹائپ کی مدد سے ٹیکنالوجی کو پیٹنٹ کرانے میں خود پہل کرے۔ ایک بات ذہن میں

رکھو کہ میں پولیس کو بتا چکی ہوں کہ میں لزا کی بزنس انویسٹر ہوں۔ اس طرح لزا کے اکاؤنٹ میں موجود رقم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ تاہم میگ کا لفظ زبان پر لانے کی میں جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات جنگل کی آگ کے مانند پھیلتی اور لزا کے لیے خطرات میں اضافہ ہو جاتا۔"

"تم نے اگر پولیس کو سرمایہ کاری کے بارے میں بتایا ہے تو پھر سوال تو اٹھے گا کہ سرمایہ کاری کس چیز پر؟" اینڈریا نے سوال کیا۔

کونی ہنس پڑی۔ "کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے سائنسی اصطلاحات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ برائٹ لائٹ، ای والز (EVals) کی بات شروع کر دی۔ ہنڈرڈ بلین الیکٹرانز کو مقید کر کے کیسے الیکٹران والز میں استعمال کیا جائے گا وغیرہ...... وغیرہ۔ ٹروپر ڈیمارکو تو میری باتیں سن کر ہونق نظر آرہی تھی۔ سب کچھ اس کے سر پر سے گزر گیا۔" کونی پھر ہنسنے لگی۔

"ڈیئر، میگ کے بارے میں اور کون کون جانتا ہے؟" اینڈریا نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"اور کوئی نہیں جانتا۔" کونی نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسائی۔

اینڈریا کچن کے بہانے اٹھی۔ یہ اتنا ہی خفیہ مشن یا پروجیکٹ تھا تو فلنٹ کیونکر واقف ہے، وہ اس کے ساتھ جڑے خطرات سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ اینڈریا نے دماغ پر زور دیا۔ تھامس سے بات کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میگ اسی کی ایجاد تھی۔ تیس برس قبل اسی نے اس "خیال" پر کام کا آغاز کیا تھا۔ کچن میں چند منٹ گزار کر وہ واپس آگئی۔

"کونی، مجھے تھامس کو کال کرنی چاہیے۔"

"اچھا خیال ہے۔" کونی کھڑی ہوگئی۔ "کیا میں چلوں؟"

"نہیں، کیوں؟ بیٹھو نا......" اینڈریا نے نمبر ملانا شروع کیا۔

دوسری طرف سے آنسرنگ مشین، پیغام مانگ رہی تھی۔ اینڈریا نے پیغام ریکارڈ کرایا۔ تھامس کی آمد ایک روز بعد متوقع تھی۔ وہ فون رکھ کر پلٹی۔ کونی نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی لیکن اینڈریا کو شک ہوا کہ مسکرانے سے پہلے وہ بے چین تھی۔

"اوہ لارڈ، تھامس کو یقیناً ابھی تک نہیں پتا چلا کہ لزا لاپتا ہے۔" کونی نے تشویش ظاہر کی۔ "ہمیں فیئر بنکس جا کر براہِ راست تھامس سے ملنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"نہیں، میں یہیں سے ایک اور کوشش کروں گی۔"

اینڈریا کے ذہن میں تھا کہ شاید لزا کا دوسرا پیغام آئے۔ فی الحال وہ یہاں سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"او کے۔" کونی نے سر ہلایا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس حساس موضوع پر وہ فون پر بات کرے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ میگ کے لیے بہت محتاط ہے۔ بہرحال تم کوشش کر لو۔ کل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں، کل ملتے ہیں۔"

"گڈ، صبح ناشتے کے بعد......" کونی نے بیگ اٹھاتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد اینڈریا نے ڈیمارکو کا کارڈ نکالا۔

"ہیلو، می، اینڈریا۔ اطلاع دینی تھی کہ میں یہاں ہوں۔ اگر تمہیں میری ضرورت پڑے......" اینڈریا نے کہا۔

"شکریہ۔ میں قدر کرتی ہوں۔"

فون بند کر کے وہ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے؟ لزا کی مدد، لیکن کیسے؟ وہ یہاں آکر چکرا گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہاں اسے اتنے پُراسرار اور مخدوش حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مزید آزمائشیں دونوں بہنوں کی منتظر ہیں۔

یہ بات واضح تھی کہ میلونی بار میں بادہ پیمائی کے بعد اول فول بک آیا تھا اور لزا کا نامعلوم دشمن میلونی سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ اینڈریا نے بہن کی پیش بینی کی صلاحیت پر فخر محسوس کیا۔ یقیناً وہ میلونی کو روانہ کر کے غافل نہیں ہوئی تھی اور خطرہ محسوس کرتے ہی نکل گئی۔

تاہم اینڈریا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ خود اندر ہی اندر کسی حد تک ہراساں ہے۔ کئی بار بگ جو سے ملنے کا خیال آیا لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

☆☆☆

اگلی صبح روشن تھی۔ موسم اچانک تبدیل ہوا تھا۔ گرم ملبوسات غائب ہو گئے تھے۔ ہر کوئی ہلکے کپڑوں میں نظر آرہا تھا۔

تیز ڈرائیونگ غالباً کونی کی عادت تھی۔ اینڈریا کئی بار اسے ٹوکتے ٹوکتے رہ گئی۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھیں ایک سفید جیپ تعاقب میں ہے۔ اگرچہ وہ کونی کی گاڑی سے فاصلے پر تھی۔ ایک تنگ موڑ موڑتے ہی کونی نے سختی سے بریک دبائے۔ سامنے ایک ٹریکٹر اور ٹریلر نے سڑک بلاک کی ہوئی تھی۔

اینڈریا کے ذہنی الارم نے معاً کرخت سیٹی بجائی تھی۔ اس نے جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ''کونی، بھاگو۔'' وہ چلائی۔ کونی کچھ نہ سمجھی جبکہ اینڈریا اس اثنا میں دروازہ کھول کر نکل گئی تھی۔ عقب میں سفید جیپ سے دو آدمی لپکتے چلے آرہے تھے۔ ایک اینڈریا کے سر پر تھا...... اسے توقع نہیں تھی کہ شکار گاڑی رکتے ہی نکل جائے گا۔ تاہم وہ بھی بلا کا پھرتیلا تھا۔ اس نے بروقت اینڈریا کے بالوں پر ہاتھ ڈالا۔

کونی بھی گاڑی سے نکل آئی تھی اور سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

اینڈریا نے پلٹے بغیر عقب میں لات چلائی، لات مطلوبہ ہدف کے آس پاس ہی لگی تھی۔ ''اوغ'' کی آواز کے ساتھ حملہ آور نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ اینڈریا پلٹی، وہ دونوں ہاتھ زیرناف رکھے جھکا ہوا تھا۔ اینڈریا نے پوری طاقت سے دائیں لات اس کی ٹھوڑی کے نیچے رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا الٹ کر گرا...... اینڈریا نے دیکھا دوسرا آدمی گن کے اشارے پر کونی سے بونٹ کھلوا کر تاروں کا گچھا کھینچ رہا تھا۔

نسوانی چیخ کے بجائے مردانہ ڈکار سن کر وہ چونک اٹھا۔

اینڈریا سامنے نہیں بھاگ سکتی تھی۔ وہاں روڈ بلاک پر حملہ آوروں کے ساتھیوں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ قریبی ڈھلوان پر اتر بھی جاتی تو آتشیں ہتھیاروں کی زد سے بچنا محال تھا۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ہتھیار بدست نے کونی کی گاڑی ناکارہ کر دی تھی۔ ایک آپشن تھا کہ وہ سفید جیپ پر ریورس میں جتنی دور جا سکے، نکل جائے۔

سفید جیپ کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اینڈریا نے دوڑ لگا دی۔ ہتھیار بدست نے کونی کی طرف سے توجہ ہٹا کر اینڈریا کو للکارا۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے والا ابھی سنبھل رہا تھا۔ کونی غڑاپ سے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب کھلے دروازے میں گھس گئی۔ اس نے سامنے نظر ماری۔ ٹریکٹر کی جانب سے ایک آدمی گن ہاتھ میں لیے کونی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زمین پر گرنے والا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھی کے ہمراہ جیپ کی طرف بھاگا۔

اینڈریا نے اگنیشن پر ہاتھ مارا۔ مایوسی نے اس کے اعصاب سن کر دیے۔ غیر متوقع طور پر وہاں چابی نہیں تھی۔ ہنگامی حالات میں چابی لے کر اترنے کا خیال کون رکھتا ہے۔

اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ نکل بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ دونوں حملہ آور دائیں بائیں سے جیپ کے دروازے پر تھے۔ اینڈریا نے جھٹکے سے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ پھر کھولا۔ اس طرف سے آنے والے کے پاس گن تھی۔ دروازے کے ساتھ تصادم کے بعد اس کے حلق سے وزنی گالی برآمد ہوئی۔ دوسرے دروازے پر چوٹ کھایا ہوا چوکنا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس بار اینڈریا کی چلائی ہوئی ٹانگ خالی گئی۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ لات سے بچ کر اس نے وہی ٹانگ تھام کر بے دردی سے اینڈریا کو گھسیٹ کر گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ دوسرا بھی گھوم کر آیا۔ اینڈریا نے گھیرے میں آئی ہوئی جنگلی بلی کے مانند بھرپور مزاحمت پیش کی۔

''گولی ماردوں گا۔'' ہتھیار بدست نے گن کی نال اس کے پیٹ میں گھسا دی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ تینوں فریق ہانپ رہے تھے۔ اینڈریا نے خاصی چوٹیں برداشت کی تھیں۔ پل بھر میں اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے بے دست و پا کر دیا گیا۔ اینڈریا نے خون آلود برف تھوکی...... اس کی آنکھوں اور منہ پر ٹیپ لگا کر گاڑی کے عقب میں پھینک دیا گیا۔ اینڈریا کے ہر بُنِ مُو سے پسینا بہہ نکلا تھا۔

وہ فلور کارپٹ پر چہرہ رگڑ کر آنکھوں سے ٹیپ ہٹانے کی سعی کرنے لگی۔ ناکام ہونے کے بعد اس نے ذہن مرکوز کیا کہ جیپ کس طرف جا رہی ہے۔ ساتھ ہی اس کی سماعت دونوں کی آوازوں پر تھی۔

جلد ہی اس پر انکشاف ہوا کہ جیپ ڈالٹن ہائی وے پر پہنچ گئی ہے۔ اوہ گاڈ...... اس نے خوف کو پرے دھکیلا، اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ آگے تین سو میل تک کوئی ٹاؤن نہیں تھا۔

☆☆☆

ہائی وے پر سفر دو تین گھنٹے جاری رہا۔ اینڈریا کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ بازو اکڑ گئے تھے۔ جبڑے کے ایک جانب ورم تھا۔ جیپ کی رفتار کم ہوئی۔ وہ ہائی وے سے اتر گئی۔ ٹائروں کی آواز بتا رہی تھی کہ جیپ برفیلے ٹریک پر رواں تھی۔

بالآخر ہلکے جھٹکے کے ساتھ جیپ کا سفر تمام ہوا۔ اگلا دروازہ کھول کر کوئی اترا۔ پھر عقبی دروازہ کھلا۔ یخ ہوا کا تھپیڑا اندر گھسا۔

''آؤٹ۔'' مردانہ غراہٹ ابھری۔

اینڈریا نے اٹھنے کی کوشش کی اور کراہ کے رہ گئی۔ دو مردوں سے ہاتھا پائی میں وہ مجروح ہوئی تھی۔ پھر باندھ کر اسے مختصر جگہ میں ڈال دیا گیا تھا۔ طویل سفر کی وجہ سے اعضا بھی اکڑ گئے تھے۔

''اٹھاؤ اِسے۔ اس کا دم خم ختم ہو گیا ہے۔ بہت زور مار رہی تھی۔'' دوسرا اگلا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

وہ دونوں اسے اٹھا کر برفانی زمین پر چل رہے تھے۔ پاپیادہ سفر جلدی ختم ہو گیا۔ اسے کسی ٹھوس ڈربا نما خلا میں ڈال دیا گیا جس کی گہرائی زیادہ نہیں تھی۔

''یہاں اچھل کود مچائی تو ہزار فٹ نیچے جا کے گرو گی۔'' ایک مردانہ دھمکی سماعت سے ٹکرائی۔

اینڈریا ہول کے رہ گئی۔ وہ برفانی مشین کے ساتھ منسلک سامان رکھنے کے چھوٹے سے ڈبے میں پڑی تھی۔ برفانی گاڑی میں اب اغوا کنندگان کے کیا عزائم ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مخصوص غراہٹ کے ساتھ گاڑی کا انجن بیدار ہوا۔

اینڈریا کا ایک نامعلوم اندھا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ایک خطرناک سفر تھا۔ کئی مرتبہ جھٹکا لگنے پر اس کا جسم چند انچ ہوا میں بلند ہوا۔ ہر مرتبہ اس کا دل بیٹھ سا جاتا...... وہ دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتی رہی، جسم سنبھالتی رہی کہ باہر نہ جا پڑے۔ اوپر سے ٹھنڈ خون جمائے دے رہی تھی۔

نشیب و فراز کا یہ خوفناک جہنمی سفر بھی تمام ہوا۔ برفانی گاڑی کا انجن بند ہوا۔ ان دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر برف میں چلانا شروع کیا۔ چلنے سے زیادہ وہ گھسٹ رہی تھی۔ سردی کی شدت سے بدن کانپ رہا تھا۔ اس مرتبہ مسافت چند منٹ میں اختتام پذیر ہو گئی۔ اس کے ایک بازو پر سے ہاتھ ہٹ گیا۔ کوئی چوبی دروازہ خفیف چرچراہٹ سے کھلا۔ کسی نے اسے دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ اینڈریا کا پیر لکڑی سے ٹکرایا۔ اس نے اندازے سے پیر اٹھایا۔ اندازہ لگایا کہ وہ کسی کیبن میں ہے۔ اس کے پشت پر بندھے ہاتھ کھول دیے گئے۔ وہ دونوں فوراً ہی باہر نکل گئے تھے۔ دروازہ بند ہوا اور ڈبل بولٹ گرنے کی آواز آئی۔

اینڈریا بے اختیار گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ آنکھوں اور ہونٹوں پر سے ٹیپ نوچ کر پھینکا۔ کچھ دیر تک اسے اندھے پن کا احساس ہوا۔ ویسے بھی وہاں نیم تاریکی تھی۔ دھیرے دھیرے اسے نظر آنے لگا۔ اینڈریا نے ہاتھ پیر ہلا کر اعضا میں خون کی گردش بحال کی۔ اچانک باہر سے اسے برفانی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ وہ اچھل کر دروازے پر آئی اور مکے برسانے لگی۔ فوراً ہی اسے سعیِ لاحاصل کا ادراک ہو گیا۔ گاڑی کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ خوف اور اندیشوں نے ذہن پر یلغار شروع کر دی......

اینڈریا نے گہرے گہرے سانس لے کر ذہن صاف کیا اور اعصاب کو تھپکی دی۔ بدحواس ہونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ یہ ایک کمرے کا کیبن تھا۔ فضا کی کثافت اور بو کہہ رہی تھی کہ کیبن جنگل میں ہے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ کمر تک بلند لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک روشن دان، چمنی، لکڑی کا شیلف...... شیلف کی لمبائی پانچ فٹ سے زیادہ تھی۔ غالباً وہ اس چوبی زنداں کا بیڈ تھا۔ ایک طرف دس گیلن پانی کا کنٹینر اور سربند غذا کے ڈبے پڑے تھے۔

''اوہ نو۔'' اس نے خود کلامی کی۔ آثار بتا رہے تھے کہ نامعلوم ویرانے میں اسے تنہا... کئی روز کے لیے قید کیا گیا ہے۔ اینڈریا نے پلٹ کر دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ بلندی پر آمنے سامنے دو چھوٹے روشن دان تھے۔ جن سے بمشکل سر ہی باہر نکالا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

میلونی اچھا آدمی تھا۔ لیکن لزا کو ایک ہی بات کا ڈر تھا کہ وہ ٹاؤن میں جانے کے بعد حواس مےنوشی کی نذر نہ کر دے۔ خوش قسمتی سے وہ اس کے لیے تیار تھی۔ اس کی یہی پیش بندی کام آ گئی۔ وہ روسکو کے ساتھ میلونی کے کیبن کے عقبی سمت پہاڑی کی چوٹی پر درختوں کے نیچے تھی، جب فضا میں ہیلی کاپٹر کی نمایاں آواز گونجنا شروع ہو گئی۔

ہیلی کاپٹر، میلونی کے کیبن کے قریب ہوتا چلا گیا۔ پھر جتنا نیچے آسکتا تھا...... پائلٹ، مشین کو نیچے لے گیا۔ ہیلی کاپٹر حتی الامکان قریب رہتے ہوئے، بڑے دیوقامت بھونرے کے مانند کیبن پر منڈلا رہا تھا۔ لزا خوب جانتی تھی کہ مشینی پرندے میں جو بھی تھا، وہ بغور دوربین سے اپنے مطلوبہ ٹریکس یا قدموں کے نشان ڈھونڈ رہا ہے...... لزا نے خود کو مبارک باد دی۔ اس نے اندر باہر کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ باہر برف میں قدموں کے جو نشان پڑے تھے، وہ اس نے چھپا دیے تھے۔ کچھ دیر چھان بین کے بعد ہیلی کاپٹر نے واپس بلند ہونا شروع کیا۔ وہاں ایک میل کے دائرے میں لینڈنگ کی جگہ نہیں تھی۔ البتہ رسی کی سیڑھی کے ذریعے اترا جا سکتا تھا۔ تاہم ہیلی کاپٹر کی آواز دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

لزا عارضی پناہ گاہ سے نکل آئی اور اگلی منزل کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ چند دوستوں اور سیفرون (Saffron) کے ہمراہ چند سال پہلے موسم گرما میں آوارہ گردی کرتے ہوئے اس کیبن میں رکی تھی۔ اس وقت لزا کا اگلا پڑاؤ وہی کیبن تھا، جسے تلاش کرنے میں اسے خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسے یاد تھا کہ میلونی کے ٹھکانے سے کس سمت اور کتنی دور جانا ہے۔ وہاں موجود مختلف ریڈیوز اس وقت لزا کے لیے سب سے اہم تھے۔ کیبن میں شارٹ ویو اور لانگ ویو دونوں ریڈیو...... علاوہ ازیں ہیم ریڈیو بھی تھا۔

شاٹ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ بے دھڑک کیبن میں گھسنے کے بجائے پہلے اس نے سن گن لی۔ بعدازاں قدم آگے بڑھائے۔

''براوو جیریکو؟ یوریڈ؟ دس از کنگ۔''

''براوو جیریکو؟ دس از کنگ......''

''کنگ، ہم لوگ پریشان ہیں۔ کہاں ہو؟'' بگ جو کی آواز آئی۔

''سوری فاروبٹ۔ تمہارا نیا پرندہ الفا کیسا ہے؟''

''الفا اُڑ گیا۔ ہر طرف سے اطلاع آرہی ہے کہ وہ اُڑا نہیں بلکہ اسے چرالیا گیا ہے۔''

لزا کا دل اچھل کر حلق کی جانب لپکا۔ یوں لگا جیسے اس کی ائرلفٹ کی کیبل تڑاخ سے ٹوٹ گئی ہے...... اور وہ قلابازیاں کھاتی ہوئی نیچے گر رہی ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اینڈریا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اس کے بدترین خدشے نے حقیقت کا روپ دھارلیا تھا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' لزا کی آواز بھرّا گئی۔ بدحواس ہونے کے باوجود اس نے اپنی آواز اور لہجے کے بدلاؤ کو برقرار رکھا تھا۔

''دیکھتا ہوں۔ پھر بتاؤں گا۔''

☆☆☆

اینڈریا کا بدن لرز رہا تھا۔ شاک کا اثر کم ہوگیا تھا لیکن کڑاکے کی سردی ہڈیوں میں اترتی جارہی تھی۔ پہلی ترجیح سرخ، نارنجی آگ تھی۔ بصورت دیگر سفید، نیلگوں برفیلی آگ اسے کھا جاتی۔ اس نے فی الفور آتش دان جلا کر اس میں دو لکڑیاں جھونک دیں۔ چند موم بتیاں اور ایک کین اوپنر بھی اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ متواتر حرکت میں تھی۔ چھوٹا سا فرائنگ پین اور ایک پرانا سلیپنگ بیگ بھی مل گیا۔ اس نے احتیاط سے امکانات کا تخمینہ جوڑا۔ وہ اگر یہاں سے نہ نکل سکی یا اسے لینے کوئی نہ آیا تو وہ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے نکال سکتی تھی۔

سلیپنگ بیگ، آتش دان کے قریب لاکر وہ اس کے اندر گھس گئی۔ منفی خیالات سے بچنے کے لیے دھیان اس نے کونی کی طرف کرلیا۔ اسے کونی کی گاڑی کے تار ادھیڑنے والے کا جملہ یاد آگیا۔ ''تم خوش قسمت ہو، ٹاؤن تک پیدل جاسکتی ہو۔''

کیا وہ لیک ایج پہنچ گئی ہوگی؟ اس نے پولیس کو اطلاع کردی ہوگی؟ کیا پولیس کی تلاش شروع ہوچکی ہے؟ اغوا کنندگان کون ہیں؟ ان کے عزائم کیا ہیں؟ کیا اغوا کا تعلق میگ سے ہے یا پھر لزا سے؟

دفعتاً ایک حیوانی آواز بلند ہوئی اور اینڈریا بھڑک اٹھی۔ اس نے اٹھ کر دروازے سے کان لگائے۔ سکوتِ بے کراں...... بے پایاں سناٹا...... ایسے میں دھڑکتے دل کا شور بھی بہت لگ رہا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے دروازے سے کان ہٹایا۔ اسی وقت باہر سے آواز پھر بلند ہوئی، آواز قریب آگئی تھی۔ یہ بھیڑیے کی غراہٹ تھی۔ باہر بھیڑیا نہیں، پورا غول تھا۔ وہ دروازے کو گھورتی ہوئی قدم قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ گردن کی پشت پر نرم رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ اس نے تیزی سے لکڑی کا ایک اور ٹکڑا اٹھا کر آگ میں جھونکا۔ تاہم اس میں نمی تھی۔ بوجہ تپش اور روشنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اگر باقی لکڑیاں بھی نم آلود ہوئیں تو اسے ہائپوتھرمیا کا شکار ہونے سے کوئی بچانے والا نہیں تھا۔

اسے ادراک ہوا کہ وہ لزا کے ساتھ ناساعد حالات کی ایک ہی کشتی میں سوار ہوچکی ہے۔ اب دونوں کو مدد درکار تھی۔ لزا کے مقابلے میں اس وقت وہ زیادہ مخدوش حالت میں تھی۔ لزا اب بھی آزاد تھی اور اینڈریا نامعلوم مقام پر درندوں کے درمیان محصور ہوچکی تھی۔ اسلحے کے نام پر وہ چاقو تک سے محروم تھی۔

باہر دبی دبی آہٹیں، غراہٹیں بتارہی تھیں کہ بھیڑیے جان گئے ہیں کہ کیبن آباد ہوچکا ہے۔ وہ قریب آگئے تھے۔ اینڈریا نے سماعت پر زور دیا۔ بھوکے، خون آشام بھیڑیے کیبن کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ ان کی تعداد کا اندازہ نہیں لگاسکی۔ چار، چھ، آٹھ یا زیادہ۔ یک لخت پھر خاموشی چھاگئی۔ چند ساعت کے وقفے سے بدلی ہوئی آواز ابھری۔ روشن دان کی سمت والی دیوار کو پنجوں سے کھرچا جارہا تھا۔ اینڈریا کی سانسیں اب تک ناہموار تھیں۔ تاہم وہ کیبن کی مضبوطی سے مطمئن تھی۔

اسے حوصلہ بلند رکھتے ہوئے خود کو ڈپریشن سے بچانا تھا۔ کسی طرح اسے یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔ بھیڑیوں سے دھیان ہٹا کر اس نے پھر کیبن کو کھنگالنا شروع کیا۔ ایک شیشے کے ٹکڑے کے علاوہ کوئی نئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ ایک بار پھر سکوت طاری ہوگیا۔ تاہم اینڈریا بھیڑیوں کی موجودگی محسوس کررہی تھی۔ بے اختیار اسے موک کی یاد آئی...... پھر کال کی شبیہ یادداشت کی سطح پر ابھری...... اس کے ساتھ ماضی میں بتائے گئے وقت کی فلم چلنے لگی۔ یہاں مشکل میں، تنہائی میں وقتاً فوقتاً کال کی یاد آرہی تھی۔ وہ چار سال بعد اس سے ملی تھی۔ برہم تھی۔ لیکن اس وقت اسے اکیلے میں پہلی بار احساس ہوا کہ کال کی شخصیت میں کوئی چیز بدل گئی ہے۔ کئی بار اس نے کال کی آنکھوں میں بے کلی دیکھی تھی۔

کال کی باتیں اور ٹپس یاد آئیں۔ بھیڑیوں کے متعلق وہ اینڈریا کو بتاتا تھا کہ اشتعال دلائے بغیر بھیڑیے شاذ ہی انسانوں پر حملہ کرتے ہیں...... اسے یاد آیا کہ کال بعض اوقات کس طرح کیمپ فائر روشن کرتا تھا۔ وہ اٹھی اور وہاں رکھی لکڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ ایک ٹکڑا انتخب کرکے اس نے بیرونی چھال ہٹائی اور اسے آتش دان میں جھونک دیا۔ ساتھ ہی اپنے لباس کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر انگاروں پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد آگ میں اضافہ ہونے لگا۔

آتشدان کے قریب سلیپنگ بیگ میں گھس کر وہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے نم شاخوں کی مدد سے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ آگ ایک حد سے باہر نہ جائے۔

☆☆☆

اگلے روز کچی پکی نیند کے بعد وہ بیدار ہوئی۔ دن کا بیشتر حصہ میگ اور لزا کے گمنام شوہر کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا۔ علاوہ ازیں، زمین سے لے کر چھت تک اس نے کیبن کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہاں موجود اشیا کو اس طرح ایک دیوار کے ساتھ سجایا کہ تاریکی کی صورت میں وہ بہ آسانی اپنی مطلوبہ شے تک پہنچ سکے۔

تیسرے روز سہ پہر کے وقت دور کہیں مدھم آواز ابھری۔ اینڈریا شیلف نما بیڈ پر لیٹی ہوئی ایک سربند ڈبا کھول کر کاجو کے دانوں سے لطف لے رہی تھی۔ آواز سن کر اس کے جبڑوں کی حرکت یک لخت تھم گئی۔ دھیان حسِ ذائقہ کی جانب سے ہٹ کر سماعت پر مرکوز ہوگیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور بلی کی چال سے دروازے پر پہنچ گئی۔ کیا وہ لوگ واپس آرہے ہیں یا اس کا وہم تھا۔ وہ دروازے سے ہٹنے والی تھی کہ اس کی سماعت نے برف وہیکل کی مخصوص گرج کرچ پکڑ لی۔ آواز تیزی سے قریب آرہی تھی۔ برفانی گاڑی کی آواز کا دور قریب کہیں پتا نہ تھا۔ دفعتاً دروازہ غیر معمولی انداز میں ہلا، اینڈریا اچھل کر پیچھے گئی اور گرتے گرتے بچی۔ تاہم اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

باہر سے حیوانی چیخ بلند ہوئی۔ کسی نے زوردار طریقے سے دروازہ دھڑدھڑایا۔ جیسے دو بھاری شاخیں دروازے پر ماری گئی ہوں۔ اینڈریا کے مسامات نے پسینا اُگل دیا۔ باہر ریچھ موجود تھا۔

''جاؤ یہاں سے۔'' وہ خوف زدہ انداز میں چلّائی۔ ریچھ نے بھیانک آوازیں نکالیں اور گھوم کر کیبن کی پشت پر آگیا۔ اینڈریا نے بوکھلاہٹ میں کال کی باتیں یاد کیں۔ کھانے پینے کی اشیا کو چھپا کر رکھنا چاہیے تاکہ ان کی بُو ریچھ کی قوتِ شامہ تک نہ پہنچے۔ حتیٰ کہ پیپرمنٹ اور ٹوتھ پیسٹ تک چھپا دینا چاہیے۔ اینڈریا نے تیزی سے فرائنگ پین خالی کیا اور اشیائے خورونوش پر سلیپنگ بیگ ڈال دیا۔ تاہم اسے احساس تھا کہ قدم اٹھانے میں اسے تاخیر ہوچکی ہے۔

ریچھ یقیناً بھوکا تھا۔

''یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ سراسیمگی کے عالم میں پھر چلّائی۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

ریچھ، کتوں کے مانند سمجھدار اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس کی سماعت میں جیسے کال نے سرگوشی کی۔ اگر وہ زبردستی اندر گھسنا چاہیں تو باز نہیں آتے اور کوئی نہ کوئی طریقہ دریافت کرلیتے ہیں۔

دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے چرچرایا۔ کیبن لرز اٹھا۔ اینڈریا پوری جان سے ہل کے رہ گئی۔ بھیڑیوں کا پورا غول انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن یہ ریچھ تھا، بلاشبہ بھوک سے پریشان...... دروازے کو لگنے والی ٹکر اس کی جسامت اور قوت کو ظاہر کررہی تھی۔

اینڈریا تھرتھر کانپ رہی تھی۔ ان حالات میں کوئی سپرہیرو بھی ہوتا تو گھبرا جاتا۔ ریچھ کی حیوانی آوازیں اس کے اشتعال کو ظاہر کررہی تھیں۔ اینڈریا کی بے قابو دھڑکنیں پسلیاں توڑنے پر تلی ہوئی تھیں۔

وہ دہشت زدہ، آنکھیں پھاڑے دروازے کو گھور رہی تھی۔ ریچھ غالباً نئے منصوبے کے ساتھ دروازے پر ہلّا بولنے والا تھا۔ اینڈریا نے وزنی قدموں کی آواز کو دور جاتے سنا۔ آواز توقع سے زیادہ دور ہوتی چلی گئی۔ وہ الجھ گئی۔ کیا درندہ واپس جارہا ہے؟

اچانک ایک دوسری طرز کی آواز سنائی دی۔ وہ

برفانی گاڑی کی آواز تھی۔ اینڈریا کو یقین نہیں آیا۔ ریچھ، انجن کی آواز سے بوکھلا کر پسپا ہو گیا تھا۔ چہ خوب...... ایک دشمن نے دوسرے دشمن کو بھگا دیا تھا۔ اینڈریا کے ستارے اچھے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ متواتر دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔

اطمینان ہونے کے بعد وہ جھجکی اور دروازہ پیٹتے ہوئے چیخنے لگی۔ ''مجھے یہاں سے نکالو...... جلدی کرو......''

''آرام سے، ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''کوئی ہوشیاری دکھائی تو برف میں دفنا کر چلے جائیں گے۔''

''میں پیچھے ہٹ رہی ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

ایک آدمی پستول ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔

''گھوم جاؤ۔''

''گھوم گئی۔''

''ہاتھ دیوار پر رکھ لو۔''

''ہاتھ دیوار پر۔''

''ہلوگی تو پہلی گولی ٹانگ پر ماروں گا۔''

''نہیں ہلوں گی۔'' اینڈریا فرمانبردار بچی کی طرح حکم کی تعمیل کر رہی تھی، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔

''بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔''

''بیٹھ گئی۔'' اسے حیرت کے ساتھ خوشی تھی کہ انہوں نے منہ پر ٹیپ نہیں لگایا تھا۔ ہاتھ بھی کھلے ہوئے تھے۔

''کال ملاؤ۔'' اس نے کسی کو ہدایت دی۔ اینڈریا نے الجھن محسوس کی۔ کیا یہ تاوان کا معاملہ ہے۔

''ٹک...... ٹک...... وقت گزرتا رہا۔ دس منٹ تک کچھ بھی نہ ہوا۔ ہر جانب خاموشی تھی۔ اینڈریا نے سگریٹ کی بو محسوس کی پھر فون کی گھنٹی بجی۔

''یپ، رائٹ، او کے۔''

قدموں کی آہٹ ابھری۔ کسی نے موبائل فون اینڈریا کے کان سے لگا دیا۔ اسے موبائل فون پر تعجب ہوا۔ تاہم فون کے سائز نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ وہ سیٹلائٹ فون تھا۔

''ہیلو کہو۔'' کسی نے اینڈریا کے لیے حکم صادر کیا۔

''ہیلو؟''

''اینڈی؟''

اینڈریا کے دماغ میں رنگ رنگ کے ان گنت ستارے گردش کرنے لگے۔ اسے لگا کہ وہ کرۂ ارض سے بہت دور بے وزنی کی کیفیت میں ہلکورے لے رہی ہے۔

وہ لزا کی آواز تھی۔ وہ حیرتِ پیہم کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ وہ لزا کی آواز تھی۔ ملاقات ایسے ہونی تھی؟ اینڈریا نے چار سال بعد بہن کی آواز سنی تھی۔ تاہم اسے یوں محسوس ہوا جیسے لزا پہلو میں بیٹھی ہے۔ اسباب و تغیرات کی نذر ہونے والے تعلقات کا اِک نیا باب کھل رہا تھا۔ کتنی محبت اور ہم آہنگی تھی دونوں میں۔ مزاج و عادات میں تضادات کے باوجود۔ پھر کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟

''اینڈی؟''

''جواب دو۔'' کوئی اینڈریا کے دوسرے کان کے قریب غرایا۔ اینڈریا کو جھٹکا لگا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔

''اینڈی، کہاں ہو؟ تم ٹھیک تو ہو؟''

''یس۔'' وہ بولی۔ ''یس، لزا۔ میں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔ ہاں، میں ٹھیک ہوں۔''

''میں تمہیں نکال لوں گی، او کے؟'' لزا نے تیزی سے کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

اسی وقت فون ہٹا لیا گیا۔

اینڈریا اچھل کر کھڑی ہوئی، وہ چیخ رہی تھی۔ ''پہاڑوں میں۔ بال روڈ کے شمال میں۔ پہاڑوں پر۔''

ایک مضبوط بازو اینڈریا کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ کسی نے اس کے لیے ایک فحش گالی ایجاد کی۔ اسے واپس بٹھا دیا گیا۔ وہ شدتِ جذبات سے لرزاں تھی۔ اس کی مٹھیاں کھل بند ہو رہی تھیں۔

''یس۔'' مردانہ آواز آئی۔ ''ہاں، فال وے پر۔ چھ بجے...... جیسا کہ طے ہوا تھا۔ چھ بجے پہنچ جانا۔ ورنہ تمہاری بہن کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا کہ تم دونوں خود ہی خودکشی کر لو گی۔'' بولنے والے نے سفاک لہجے میں دھمکی دی۔ وہ غالباً لزا سے بات کر رہا تھا۔ اینڈریا کسمسا کر رہ گئی۔

کچھ دیر وہاں خاموشی رہی۔

''چلو نکلو۔'' کسی نے کہا۔ لیکن اینڈریا ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کے اغوا کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ وہ اگر اسے آزاد بھی کر دیتے تو ظاہر ہے، پہلے لزا کو قابو کرتے۔ ضروری نہیں تھا کہ لزا کو دبوچنے کے بعد وہ اینڈریا کو چھوڑ دیتے۔ اگر چھوڑ بھی دیتے تو بے معنی تھا۔ دونوں بہنوں کی جان ایک دوسرے میں اٹکی ہوئی تھی۔ اینڈریا کو کسی بھی طرح فرار ہونا تھا۔

تینوں کیبن سے نکل چکے تھے اور برفانی ڈھلوان پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس مرتبہ ایک ہی آدمی نے اس کا بازو تھاما ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی کھلے ہوئے تھے۔ کیا کرنا چاہیے؟ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ معاً اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ اسے برف دبنے کی مخصوص کرنچ سنائی دی۔ جو اگرچہ مدھم تھی لیکن اینڈریا کی سماعت نے نہ صرف محسوس کر لی بلکہ شناخت بھی کر لی۔

فوراً بعد آہٹیں بلند ہوئیں، شاخیں چٹخنے کی آواز آئی اور ایک حیوانی چیخ بلند ہوئی۔ وہ لوگ یوں رکے، جیسے چلتی گاڑی میں ایمرجنسی بریک لگ ہوں۔

''یہ کیا ہے؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''خدا جانے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''لیکن رکو مت، یہاں سے نکلو۔''

درندے کی غصیلی، حیوانی آواز پھر بلند ہوئی۔

دہشت کے تیز دھار بلیڈ نے گویا اینڈریا کے اعصاب کو اُدھیڑ ڈالا۔ اگر یہ مادہ تھی۔ تو وہ سب خوفناک آفت کی زد میں تھے۔ ریچھنی اپنے بچوں کی وجہ سے بہت جلد غضب کی انتہا کو چھونے لگتی ہے اور ہلاکت خیز حملہ کرنے میں قطعی نہیں ہچکچاتی۔

''یہ ریچھ ہے۔'' اینڈریا کو بتانا پڑا۔ اس کی آواز میں خوف و ہراس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ''خدا کے لیے ساکت ہو جاؤ۔'' اس نے آنکھوں کی پٹی نوچ پھینکی۔ اسے دو آدمیوں کی جھلک نظر آئی۔ ایک کے چہرے پر داڑھی تھی۔ وہ دونوں اینڈریا کے بجائے، بیس گز دور سفید رنگ کی بھاری بھرکم ریچھنی کو دیکھ رہے تھے۔

ان کے بائیں جانب ریچھنی کے بچے کی آواز سنائی دی۔ اینڈریا کا خدشہ درست نکلا تھا۔ ریچھنی کی موٹی بالدار کھال ''ہیبر نیشن'' کے باعث مزید دبیز ہو گئی تھی۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل ان کو گھور رہی تھی۔ اس کا وزن کم سے کم بھی 800 سو پونڈ تھا۔

''حرکت مت کرنا۔'' اینڈریا نے التجا کی۔ ''پلیز بالکل مت ہلنا۔''

داڑھی والے نے گالی بکی اور پستل والا ہاتھ سیدھا کیا۔

ریچھنی عقبی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ پلٹ گئے۔ اس کے دو انچ لمبے فولادی دانت نمایاں ہو گئے۔ اس نے منہ کھول کے بند کیا۔ کھٹ کی ایسی آواز آئی، جیسے الیکٹرک اوون کا ڈور بند کرتے وقت آتی ہے۔

''نہیں، پلیز نہیں...... کچھ مت کرو۔ وہ چلی جائے گی۔'' اینڈریا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ جانتی تھی کہ ریچھنی کی کھال کے لیے پستل کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ احمق...... گدھے...... اس نے زیرلب کہا اور انچ انچ کر کے پیچھے کھسکنے لگی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ دونوں آدمی پاگل پن سے باز رہیں۔ وہ اور اینڈریا، ریچھنی اور اس کے بچے کے درمیان نہیں تھے۔ پھر بھی اگر ریچھنی نے خطرہ محسوس کیا تو بلا تامل ان پر چڑھ دوڑے گی۔

''لعنت ہے۔'' گن بردار نے فائر کیا۔ دہشت سے اینڈریا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بدن کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا۔

ریچھنی کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر چاروں پیروں پر آئی اور ہلّا بول دیا۔ اتنے وزن کے ساتھ وہ برق رفتاری سے بیس گز کا درمیانی فاصلہ طے کر رہی تھی۔ دھمکتے قدموں کے ساتھ برف کے ذرات اُڑ رہے تھے۔ اینڈریا پلٹ کر دیوانہ وار درختوں کی طرف بھاگی۔ اوپر تلے کئی فائر ہوئے اور ریچھنی کی بھیانک آواز گونجی۔ پلٹ کر دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا نہ ضرورت۔ اینڈریا خوب جانتی تھی کہ وہ لوگ کس قیامت کو دعوت دے بیٹھے ہیں۔

درندے کی ایک اور مشتعل چیخ بلند ہوئی۔ اینڈریا نے ریچھنی کے بچے کی خوف زدہ آواز بھی سنی۔ وہ درختوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے عقب میں جھانکنے کا رسک لے ہی لیا۔ فائر کرنے والا فرار ہو رہا تھا۔ دوسرا اینڈریا کی طرح درختوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔ مشتعل ریچھنی گولیاں چلانے والے کے سر پر تھی۔

اینڈریا نے ہانپتے ہوئے دوڑ لگائی اور درختوں میں گھس گئی۔ رکے بغیر وہ گھنی جھاڑیوں میں گھستی چلی گئی۔ اس کے ہاتھ اور پیروں پر خراشیں پڑ گئیں۔

آخری فائر گونجا اور پھر انسانی چیخیں۔ ''گولی چلاؤ، خدا کے لیے گولی چلاؤ۔'' غالباً وہ اپنے ساتھی کی مدد کا طالب تھا۔ جھاڑیوں میں سے اینڈریا کو اس کا دوسرا ساتھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔

ڈھلوان پر سے ایک بھیانک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ اینڈریا نے گردن گھمائی۔ بڑا ہولناک نظارہ تھا۔ اینڈریا کی نگاہ پتھرا گئی۔ ریچھنی نے فائرنگ کرنے والے کو چھاپ لیا تھا۔ آناً فاناً درندے نے اس کا گن والا ہاتھ شانے سے اس طرح اکھاڑ لیا، جیسے کوئی بہ آسانی شاخ سے پھول توڑ لیتا ہے۔ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ خون کا فوارہ بلند ہوا اور سفید برف انسانی خون سے رنگ گئی۔ اینڈریا پر سکتہ طاری تھا۔

ریچھنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہوئی اور انسانی عضو ایک طرف اچھال دیا۔ وہ دوبارہ زخمی پر گری۔ وہ وزنی، جسیم ریچھنی کے بوجھ تلے برف میں دفن ہوگیا۔ وہاں صرف درندہ نظر آرہا تھا۔ معاً ہر طرف مرگ آسا سناٹا سرایت کرگیا۔ سفید درندے کے آس پاس نقرئی برف خون سے رنگین ہوگئی تھی۔

درندے نے سر اٹھایا اور چاروں پیروں پر پوری طرح کھڑا ہوگیا۔ اس کی تھوتھنی خون سے سرخ ہورہی تھی۔ ریچھنی نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر درختوں کی طرف منہ کرلیا۔

اینڈریا ساکت تھی، اس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ پھر ریچھنی کیوں اس کی طرف متوجہ تھی جس آدمی کو ریچھنی نے اینڈریا کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا تھا، وہ آخر میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ نتیجتاً اس وقت سفید ریچھنی درختوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اور براہِ راست اینڈریا کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے نہایت آہستگی سے نظر جھکالی۔ براہِ راست دیکھنے سے بہتر تھا کہ وہ نظر نیچی رکھے۔ سینے میں دل ڈھول کے مانند بج رہا تھا۔

بندھی نظر کا تار ٹوٹنا درندے کے نزدیک کم خطرے کی علامت ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ نظریں چار رکھی جائیں۔ ریچھنی سر جھکا کر اینڈریا کی طرف چل پڑی۔ وہ درندے کی اس حرکت پر حواس باختہ ہوگئی۔

”پلے ڈیڈ...... پلے ڈیڈ...... مردہ بن جاؤ......“ اس کے تصور میں کال کی چیخ بلند ہوئی۔ اینڈریا آنکھیں بند کر کے ڈھیرے سے لڑھک گئی۔ خوفناک حالات میں یہ آخری ترکیب تھی، جس پر عملدرآمد کرنے کے لیے غیر معمولی قوتِ ارادی درکار ہوتی ہے۔ دل کہہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگو۔

”پلے ڈیڈ......“ تصور میں کال چیخ رہا تھا۔

ریچھنی کا منہ محض چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اینڈریا نے سانس تک روک لی۔ ریچھنی کے منہ سے سڑے ہوئے گوشت کی بُو آرہی تھی۔ اینڈریا نے منہ بنانے سے احتراز کیا۔ لاش منہ نہیں بناتی۔

”تم مر چکی ہو۔ میلونی کے خرگوش کے مانند مردہ ہو۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ درندے نے پنجے سے ٹہوکا دیا۔ اس کا جسم پیٹ کے بل گھوم گیا۔ چہرہ برف میں دھنس گیا۔ وہ بے حد کڑے لمحات تھے۔ پتا پانی ہوا جارہا تھا۔ ریچھنی متواتر اسے ٹٹول رہی تھی، تاہم جارحیت کا عنصر ناپید تھا۔ نہ اس کے حلق سے کوئی آواز نکل رہی تھی۔ اچانک کچھ فاصلے پر بچے کی آواز آئی۔ ریچھنی کی توجہ بٹ گئی۔ پھر بچے کی فکر نے اسے ”مردہ“ اینڈریا کے قریب سے ہٹالیا۔

اینڈریا نے فوراً ہی حرکت کی حماقت نہیں کی۔ البتہ اس نے آہستگی سے سانس کھینچی۔ ”تھینک یو، کال۔“ اس نے خود سے کہا۔ کرشمہ ہوگیا تھا۔ اذیت ناک موت کا خطرہ ٹل رہا تھا۔ چند منٹ بعد نہایت احتیاط سے اس نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ریچھنی غائب تھی۔ وہ ڈھیرے سے گھٹنوں کے بل اٹھی۔ چاروں طرف دیکھا اور کھڑی ہوکر آہستہ سے ایک درخت کی آڑ میں سرک گئی۔ کئی جگہ سے اس نے کانٹے اور پتے ہٹائے، لباس درست کیا۔ ”تھینک گاڈ، بلین تھینکس۔“

درختوں کی آڑ لیتی ہوئی وہ تیزی اور اندازے سے اس طرف بڑھی جہاں اس کے خیال میں برفانی گاڑی کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ حرکت کرتے ہوئے کسی قسم کی آواز نہ پیدا ہو۔ کچھ تگ و دو کے بعد اسے گاڑی نظر آگئی۔ برداشت کا بندھن ٹوٹ گیا۔ چابیوں سے متعلق دعا کرتی ہوئی وہ گاڑی کی سمت بھاگی۔

گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے اس نے سکون کی سانس لی۔ چابیاں جگہ پر تھیں۔ سکون کی سانس ٹوٹی نہ تھی کہ فائر کی آواز آئی۔ اس نے دھماکے کی سمت دیکھا اور چابی گھمائی۔ درختوں میں سے جان بچا کے بھاگنے والا دوسرا ساتھی برآمد ہوا تھا۔ وہ پسٹل لہراتا ہوا چلا رہا تھا۔ اس کا رخ اینڈریا کی طرف تھا۔ اینڈریا نے مشین گھمائی اور پہاڑ سے نیچے اترنے لگی۔ ہتھیار بدست قریب پہنچ گیا تھا اور گولی مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ وہ رخ بدل کے گاڑی کے متوازی دوڑ رہا تھا۔ اینڈریا نے رفتار بڑھائی اور سر نیچے کر کے معاً گاڑی کا رخ حملہ آور کی جانب کردیا۔

دھماکا ہوا۔ پتا نہیں گولی گاڑی میں لگی یا برف میں گھسی...... بہرحال اینڈریا محفوظ تھی۔ اینڈریا رفتار بڑھاتی گئی۔ وہ حملہ آور کے سر پر تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی کے مانند پسٹل پر انحصار کرنے کی غلطی دہرائی۔ دو مزید دھماکے ہوئے۔ ٹارگٹ کلیئر نہیں تھا۔ گاڑی برف کے ذرات اُڑا رہی تھی۔ تیسرا عنصر اس کی حد سے بڑھی ہوئی بدحواسی تھی۔ یقیناً اس نے بھی اپنے ساتھی کی دلخراش موت کا منظر دیکھا تھا اور اب تک شاک میں تھا۔ اس نے گاڑی سے بچنے کے لیے چھلانگ لگانے میں خاصی تاخیر کردی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا لیکن کوئی چیخ برآمد نہ ہوئی۔ تصادم کے بعد وہ فضا میں بلند ہوا اور قلابازی کھا کر منہ کے بل برف پر گرا۔ گاڑی کا توازن بگڑا۔ کوشش کے باوجود گاڑی دائیں

جانب جھکتی چلی گئی۔ اینڈریا نے سر اٹھا کر ہینڈل بارز چھوڑ دیں اور بائیں جانب کودی۔ برفانی مشین دائیں جانب پہلو کے بل گر کر کچھ دور گھسٹتی چلی گئی۔ اینڈریا بائیں جانب لڑھکنیاں کھانے کے بعد چت پڑی آسمان کو گھور رہی تھی۔ ٹانگوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سانس ہموار ہوئی اور دل اپنے ٹھکانے پر آکر معمول کے مطابق دھڑکنے لگا۔

اس نے ٹانگیں ہلا کر ہڈیوں کی سلامتی چیک کی پھر لنگڑاتی ہوئی اٹھی۔ بازو بھی دکھ رہا تھا۔ اس نے حملہ آور کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ زندہ تھا، لیکن سانس کی رفتار تسلی بخش نہیں تھی۔ اس نے اضطراری طور پر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ خود اس کی سلامتی ابھی تک خطرے میں تھی۔ حالیہ دھماکوں کے بعد کوئی بھی درندہ وہاں نازل ہوسکتا تھا۔

وہ گری ہوئی گاڑی کی طرف چل دی۔ جیسے تیسے اس نے گاڑی کو سیدھا کیا۔ تاہم وہ انجن اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہی۔ پیدل ہی نکلنا پڑے گا۔ اس نے سوچا۔ کھانے پینے کی اشیا کے لیے کیبن جانے کا خیال آیا۔ جسے اس نے فوراً ہی رد کردیا۔

سوچ بچار کے بعد وہ اس مقام پر واپس آئی جہاں پر اس نے برفانی مشین اسٹارٹ کی تھی۔ ڈھلوان پر اس نے مشین کے نشانات کا جائزہ لیا اور انہیں دیکھتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔

اینڈریا نے گھڑی دیکھی۔ غروبِ آفتاب میں چار گھنٹے باقی تھے۔ اغواکنندگان جب اسے برفانی گاڑی پر کیبن تک لائے تو اندازاً گاڑی نے ایک گھنٹا سفر کیا تھا۔ یعنی تیس میل کے لگ بھگ پہاڑ سے اترنے کے لیے اسے کم از کم تیس میل چلنا پڑے گا۔ سورج غروب ہوتے ہوتے ٹھنڈ بڑھتی جائے گی۔ ساتھ ہی درندوں کا خطرہ بھی۔ اگر وہ نیچے پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تو ہائی وے تک جانے کے لیے ایک دو میل مزید طے کرنے پڑیں گے۔

وہ خود سے باتیں کرتی ہوئی ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ میں اور لز ابھی نہیں لڑیں گے۔ وہ جیسی ہے ٹھیک ہے، میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی۔ میں کال کو معاف کردوں گی۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، میں اسے بولنے دوں گی۔ اور...... اور میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔ لز ابھی صحیح سلامت رہے گی۔ اس نے آسمان کو دیکھ کر خدا کو یاد کیا۔

دفعتاً اس کی سماعت سے ٹکرانے والی آوازوں نے اسے ہوشیار کردیا۔

”ہاؤ...... ہاؤ...... چارج......“ ایک مردانہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی آئی۔ وہ آٹھ عدد کتوں کے ساتھ اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ برف پر پھسلنے والی لکڑی کی مخصوص سلیڈ (Sled) کو آٹھ کتے کھینچ رہے تھے۔ سلیڈ پر ہیڈ لیمپ اور کئی اشیا موجود تھیں۔ اس کے شانے سے بندوق جھول رہی تھی اور بیلٹ کے ساتھ چھرے نما چاقو...... گلے میں دوربین جھول رہی تھی۔ اس کے چوڑے چہرے پر تجسس کے آثار نمایاں تھے۔

”تم کون ہو؟ میں نے دھماکوں کی آواز سنی تھی؟“ وہ بولا۔ ”راستے میں ایک سفید ریچھ کی جھلک بھی دیکھی تھی۔“

اجنبی کو دیکھ کر اینڈریا پر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ زندگی میں کوئی چیز دیکھ کر وہ اتنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ ان حالات اور اس موقع پر اجنبی نے اسے ناقابلِ بیان مسرت سے ہمکنار کیا تھا۔

”میرا نام والٹر ہے۔“ اس نے تعارف پیش کیا۔ نقوش سے وہ مقامی لگ رہا تھا۔

”والٹر، تم ایک اسٹار ہو۔“ اینڈریا جذباتی ہوگئی۔ اس نے خود کو بمشکل والٹر کو گلے لگانے سے روکا۔ ”میرا خیال تھا کہ اس ویرانے میں مجھے بے یارومددگار ساری رات چلنا پڑے گا۔“

”تمہاری مشین کہاں ہے؟“

”برف میں پھنس گئی تھی، پھر اسٹارٹ نہیں ہوئی۔“

اینڈریا نے اختصار کے ساتھ سفید ریچھنی کے حملے اور اپنے اغوا کے بارے میں بتایا۔

”تم ہی وہ لڑکی ہو، جس کے اغوا کی خبریں چل رہی ہیں؟“ والٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”ہاں، میں ہی ہوں۔“

”ویل...... ویل......“ اس کے دانت نکل آئے۔ ”یعنی میں ہیرو بننے جارہا ہوں۔ جس نے کئی روز بعد اس دورافتادہ ویرانے سے تمہیں زندہ سلامت نکال لیا۔“ اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

”کوئی شک نہیں کہ تم ہیرو بن چکے ہو۔“ اینڈریا نے مسکراتے ہوئے تائید کی۔

☆☆☆

وہ جس گاؤں میں داخل ہوئے، والٹر کے مطابق وہ راون کریک کہلاتا تھا۔ اس علاقے میں والٹر ہی واحد شخص تھا، جس کے پاس اب تک کتوں کی ٹیم صحیح سلامت تھی۔ اس

کا بچپن بھی یہیں گزرا تھا۔ وہ علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اینڈریا نے وہاں والٹر کے کیبن سمیت ہر کیبن پر سیٹلائٹ ڈش دیکھی۔ اسے ٹیلی گراف پول بھی نظر آئے۔ یعنی بجلی اور فون دونوں کی سہولت تھی۔

''اندر چل کر حلیہ درست کرو اور تازہ دم ہو جاؤ۔'' والٹر نے دعوت دی۔

والٹر نے اپنی بیوی کیتھی سے اینڈریا کا تعارف کرایا۔ ان کے پانچ بچے تھے جو اسے یوں گھور رہے تھے جیسے وہ دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ اینڈریا نے دیکھا کہ وہاں دو ہی کمرے تھے۔ پانچوں بچے ایک ہی بیڈ استعمال کرتے تھے۔ دوسرا والدین کے زیر استعمال تھا۔ آتش دان تھا، کچن کی گنجائش نہیں تھی۔ البتہ ٹی وی موجود تھا۔ یقیناً ٹی وی پر اس کے اغوا کی خبریں چلائی گئی ہوں گی۔

''کیتھی...... اینڈریا کے طعام کے لیے کچھ کرو، میں ٹروپرز کو اطلاع دیتا ہوں۔'' والٹر نے فون اٹھایا۔

والٹر نے لاف زنی سے احتراز کرتے ہوئے سارجنٹ پیگائی کو بتایا کہ اس نے اینڈریا کو بچا لیا ہے اور وہ اس کے گھر میں محفوظ ہے۔

اینڈریا حال سے بے حال ہو گئی تھی۔ کوئی نازک اندام لڑکی ہوتی تو خوف و دہشت سے ہی ہارٹ فیل ہو جاتا......

کیتھی بھی اپنے شوہر کی طرح تھی۔ وہ خوش اخلاقی سے ملی اور خاطر مدارات میں جُت گئی۔ اینڈریا فون کی گفتگو سن رہی تھی۔

''نہیں ہم انتظار نہیں کر سکتے، دھند پھیل جائے گی...... ہیلی کاپٹر میں پہنچ رہے ہیں۔'' والٹر سنتا رہا پھر بولا۔ ''اوکے۔'' اور فون اینڈریا کو پکڑا دیا۔

وکٹر، اغوا کنندگان کا حلیہ جاننا چاہتا تھا۔ اسے کہاں رکھا گیا تھا؟ سفید جیپ کیسی تھی؟ وہ کیسے فرار ہوئی؟ اینڈریا جواب دیتی رہی۔ بعدازاں اس نے لزا کی خیریت معلوم کی۔

''وہ اغوا کنندگان سے رابطے میں ہے لیکن درمیان میں کوئی اور آدمی ہے۔'' وکٹر نے بتایا۔

''درمیانی رابطہ کون ہے؟''

''ہم کوشش کر رہے ہیں...... شاید لزا کو علم ہو۔ لیکن وہ تمہارے تحفظ کی خاطر احتیاط برت رہی ہے۔''

اینڈریا کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم اغوا کنندگان کو پہچان گئے ہیں لیکن درمیانی رابطہ ہی بنیادی کڑی ہے۔ ہم ایک ایئر کرافٹ پہاڑوں میں بھیج رہے ہیں۔ تیسرے آدمی کو وہیں کہیں ہونا چاہیے۔ تم کیا مدد کر سکتی ہو؟''

تیسرا آدمی کون ہو سکتا ہے؟ کیا لزا کا شوہر؟ کیا لزا کو پتا ہے کہ وہ آزاد ہو چکی ہے، چنانچہ خود لزا کو ''فال وے'' سے دور رہنا چاہیے۔

''کوئی کہاں ہے؟ کیا وہ ٹھیک ہے؟'' اینڈریا کو کوئی کا خیال آیا۔

''وہ گھبرائی ہوئی ہے۔ ویسے ٹھیک ہے۔ وہ پندرہ میل پیدل چل کر واپس آئی تھی۔ تمہاری خیریت سے آگاہی کے بعد اس کی حالت مزید بہتر ہوئی ہے۔ تین سے چار آدمی ملوث ہیں اور تمہیں چارے کے طور پر استعمال کر کے لزا کو قابو کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ لزا کس چیز پر ریسرچ کر رہی تھی۔ یہ کوئی بہت اہم معاملہ لگتا ہے، جس کی وجہ سے سارا فساد پھیلا ہوا ہے۔''

''نہیں، میں نہیں جانتی۔'' اینڈریا نے جھوٹ بولا۔

''آر یو شیور۔''

''یس۔ آئی ایم سوری۔'' اینڈریا نے جماہی لی۔

''میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سوال جواب بعد کے لیے رکھو۔'' اینڈریا نے تھکی ہوئی نرم آواز میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ تم آرام کرو۔''

''تم غسل کر کے کچھ کھا پی لو...... بچے نیچے لیٹنے کے عادی ہیں۔ تم ان کا بیڈ استعمال کر سکتی ہو۔'' کیتھی نے کہا۔

اس غریب گھرانے کی مہمان نوازی پر اینڈریا کی آنکھوں میں تحسین و تشکر کے جذبات نظر آئے۔

جب وہ استراحت کے لیے لیٹی تو والٹر اپنے دوست احباب کو اپنی کارکردگی کے بارے میں زور شور سے باری باری آگاہ کر رہا تھا۔ اینڈریا خاموشی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

☆☆☆

شور شرابے سے معاً اینڈریا کی نیند اُچٹ گئی۔ چند لمحے تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا ہو رہا ہے اور وہ خود کہاں ہے۔

''فلیئرز لاؤ۔'' والٹر چیخا۔ وہاں روشنیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ٹی وی بھی آن تھا۔ اینڈریا اٹھ بیٹھی۔ گھڑی دیکھی ایک بج رہا تھا۔ بچے بھی اٹھ گئے تھے۔ کیتھی کے ہاتھ میں لوڈڈ شاٹ گن تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اینڈریا پریشان ہو گئی۔

''ایئر کرافٹ ہے۔ تاریکی میں لینڈ نہیں کر سکتا۔'' والٹر نے بتایا۔

''اور یہ شاٹ گن؟''

''احتیاط اچھی ہے، پتا نہیں کون ہے۔'' کیتھی نے کہا۔

کچھ دیر کی افراتفری کے بعد والٹر فلیئرز لے کر باہر نکل گیا۔ وہ طویل رن وے نما پٹی کی نشاندہی کے لیے فلیئرز رکھنے جا رہا تھا۔ محلے کے کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ رات ہی وہ سب والٹر کی ''ہیروشپ'' سے باخبر ہو چکے تھے۔

اینڈریا بھی چوکس ہو چکی تھی۔ اس نے اشارے سے پسٹل کے بارے میں پوچھا۔ کیتھی نے بڑے لڑکے، جو ابھی چھوٹا ہی تھا، کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک چھوٹے کپ بورڈ میں سے پسٹل نکال کر اینڈریا کو پکڑا دیا۔ بچے اینڈریا سے مرعوب تھے۔ گاؤں بیدار ہو چکا تھا۔ جو اندر تھے، ان کی نگاہ بھی باہر تھی۔ اینڈریا نے کھڑکی پر پوزیشن سنبھال لی۔ کیتھی دروازے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وقت گزرنے لگا۔

ایئر کرافٹ لینڈ کر چکا تھا۔

والٹر کے ساتھ ایک دراز قامت شخص گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے شانے سے بھی شاٹ گن جھول رہی۔ والٹر کی شاٹ گن اس کی کہنی اور بازو کے حلقے میں تھی۔ گاؤں کے چند افراد ان دونوں کے دائیں بائیں تھے۔ فاصلہ تھا۔ اینڈریا پہچان نہ سکی۔ روشنی بھی کم تھی۔ تاہم اسے دراز قامت کی مخصوص چال میں شناسائی کا احساس ہوا۔

وہ لوگ قریب آتے گئے۔ چہروں کے نقوش واضح ہونے لگے۔

''اوہ تو۔'' اینڈریا نے کیتھی کو گن چھوڑنے کا اشارہ دیا، اور اپنا پسٹل بھی واپس کر دیا۔ والٹر کے ہمراہ کال پیگائی تھا۔ وہ دونوں جوتوں سے برف جھاڑ کر اندر داخل ہو گئے۔

''اینڈی، تمہیں دیکھ کر...... بلکہ زندہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' کال نے شاٹ گن ایک طرف دیوار سے ٹکا دی۔

''لیکن تاریکی میں کوئی ایئر کرافٹ اتارنے کی کوشش نہیں کرتا۔'' وہ بولی۔

''ہاں ٹھیک ہے لیکن میں خود کو روک نہ سکا۔''

''تم نے خود کو اور ایئر کرافٹ کو خطرے میں ڈال دیا۔ کیا پاگل پن ہے؟'' والٹر نے تبصرہ کیا۔

''کوئی ریڈیو پر بہت سے لوگوں کو اینڈریا کی بازیابی اور ''راون کریک'' کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پتا نہیں، یہ باتیں کس کس نے سنی ہوں گی۔ اگر دشمنوں کو بھنک لگ چکی ہے تو ''راون کریک'' تک پہنچنے میں ان کو زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' کال نے آمد کی وجہ بھی بتا دی۔

والٹر کا منہ لٹک گیا۔ رات وہی ریڈیو پر اپنے کارنامے کی تشہیر کر رہا تھا۔

''تو تم میری حفاظت کے لیے نکلے ہو؟'' اینڈریا نے لہجہ نرم رکھا تھا۔

''لزا کی کوئی اطلاع ہے؟'' کال نے اینڈریا کے سوال سے کنی کترائی۔

''اوہ، تم سمجھے کہ وہ یہاں ہوگی۔ دیکھ لو، وہ یہاں نہیں ہے۔'' اینڈریا کی آواز میں ہلکی سی تلخی ظاہر ہوئی۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔'' وہ کہنا چاہتی تھی۔ تاہم وہ اسے جانے کے لیے نہ کہہ سکی۔

''اینڈی......؟'' کال کی آنکھوں میں پھر بے کلی اور شکوہ ظاہر ہوا۔ ''وژیول فلائٹ رولز کے تحت ''لیک ایج'' رسائی سے باہر ہے۔ کلیرنس ملتے ہی میں چلا جاؤں گا۔ کال نے شاید اینڈریا کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

اینڈری نے تاسف محسوس کیا۔

''تمہیں سارجنٹ پیگائی نے نہیں بھیجا؟''

''نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' کال نے زخمی نگاہ اینڈریا پر ڈالی۔ وہاں خاموشی چھا گئی۔

کیتھی نے دخل اندازی کی۔ ''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بچوں کا بیڈ کافی بڑا ہے۔ تم اسے اینڈریا کے ساتھ شیئر کر سکتے ہو۔''

☆☆☆

اینڈریا زیادہ سے زیادہ فاصلہ رکھ کر بیڈ کے کنارے پر لیٹی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ آرام سے درمیان میں لیٹو۔ ذہن کہہ رہا تھا کہ باہر والٹر کے کتوں کے درمیان لیٹ رہو۔ لیکن وہ دونوں میاں بیوی کے ظرف کو بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

اس نے دیکھا کہ تین بچے والدین کے کمرے میں ہیں اور دو آتش دان کے پاس کمبل میں گھسے ہوئے ہیں۔ اسے لگا جیسے کال کے جسم کی حدت اس تک پہنچ رہی ہے۔ غیر ارادی طور پر دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ اسے ماضی یاد آیا۔ پھر سیفرون کا خیال آیا۔ اگر اسے پتا چلا کہ چار سال بعد وہ دونوں پھر ایک ہی بستر پر ہیں تو کیا ہوگا؟ کال وہاں

کسی بھی وجہ کے تحت آیا ہو، اینڈریا حیران تھی کہ ایک انوکھی سی خوشی اس کے اندر کیوں سر اٹھا رہی ہے۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور ایک آہ سرد کھینچی۔

”نیند نہیں آرہی؟“ کال نے سرگوشی کی۔ ”میں بھی نہیں سو پارہا۔ پتا نہیں کیوں؟“

”سو جاؤ۔“ کال نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ وہ میکانیکی انداز میں سیدھی ہوگئی۔

”اینڈی۔“ اس نے اینڈریا کی طرف کروٹ لی۔ ”کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے کال کی طرف دیکھا۔

”سو کیوں نہیں رہی ہو؟“

”پتا نہیں۔“

”ہونہہ......“ کال نے اسے خود سے قریب کرلیا۔ وہ کچھ نہ کرسکی۔ نہ کچھ کہہ سکی۔ پتا ہی نہ چلا کہ نیند ہے یا رت جگا۔ خواب ہے یا عالمِ بیداری ہے؟ طلسمِ حسن و باطل کیا ہے؟ دل کیا ہے...... اسلوبِ حیات کیا ہے...... عذابِ جان کیا ہے...... اور جی کا زیاں کیا ہے...... اک کیف کہ اضطراری بھی ہے...... اک جذب کہ غیر اختیاری بھی ہے۔

☆☆☆

سورج افقی لکیر کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ روسکو بل کھا کر گیند کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ دم گھما کر اس نے اپنی ناک پر رکھ لی تھی۔ لزا، روسکو کے ہمراہ مقررہ جگہ پر ایک گھنٹا قبل ہی پہنچ گئی تھی۔ طے شدہ مقام سے دور وہ ایک جگہ منتخب کر کے انتظار کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک اسالٹ رائفل، جو چند دیگر اشیا کے ساتھ بگ جو نے فراہم کی تھی۔ فال وے، ایک چھوٹا سا برج تھا۔ چھ بج چکے تھے۔ لزا کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اپنی بلند کمین گاہ سے برج پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وقت، ڈیڈ لائن سے دو گھنٹے اوپر ہو چکا تھا۔ کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔

بالآخر ایک نیلے رنگ کی فورڈ نمودار ہوئی۔ برج کی روشنی میں لزا نے گاڑی کا نمبر یاد کیا۔ فورڈ میں ایک ہی آدمی تھا۔ اینڈریا کہاں ہے؟ لزا کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ آدمی فورڈ میں چالیس منٹ تک بیٹھا رہا۔ معاً وہ رائفل ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا۔ لزا اپنی کمین گاہ میں دبک گئی۔ فورڈ والے نے اطراف کا جائزہ لیا لیکن گاڑی سے دور نہیں گیا۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ انجن کی آواز دور ہوتے ہوئے بالکل ہی معدوم ہوگئی۔

لزا پر فرسٹریشن نے حملہ کیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخنا شروع کر دے۔ تاہم اس نے خود پر قابو پالیا۔ بوکھلاہٹ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے ہائی انرجی چاکلیٹ بار نکالی اور کھانا شروع کر دی۔ وہ غور کر رہی تھی کہ اینڈریا کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ زخمی ہے؟ یا اس پر تشدد کیا گیا ہے اور وہ قریب المرگ ہے یا پھر ماری گئی ہے۔ لزا نے منفی خیالات و خدشات کے حشرات کو ذہن سے نکال کر پھینکا۔ اس کی بہن اتنی کمزور اور سیدھی نہیں تھی۔ یقیناً وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ دشمنوں نے لزا کو کہاں بلایا ہے۔ اس کا مطلب جلد یا بدیر وہ یہاں پہنچے گی۔ اسے یہاں پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

لزا نے خیالات کا در بند کر کے انتظار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

”میں پولیس کو بتا دیتا ہوں کہ تمہیں واپس لا رہا ہوں۔“ کال نے کہا۔ وہ دونوں کیبن سے باہر تھے۔

”نہیں، تم مجھے پہلے کہیں اور لے جاؤ گے؟“

”الاسکا بیورو آف انوسٹی گیشن سے تمہارا ملنا ضروری ہے۔“ کال نے اصرار کیا۔

”اگر میں بتا دوں کہ میں کہاں جانا چاہ رہی ہوں تو کیا تم پہلے وہاں لے چلو گے؟“

”کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”وہ جگہ میرے علم میں ہے جہاں وہ لوگ مجھے چھوڑ کر لزا کو پکڑنا چاہتے تھے۔“ اینڈریا نے کال کو بتایا۔

”تم نے پولیس کو نہیں بتایا تھا؟“

”نہیں۔“

”تم جس مقام کا ذکر کر رہی ہو، وہ گلیشیر کے جنوب میں ہے۔ وہ خطرناک جگہ ہے۔“

”کم آن، کال...... تم وہاں جاسکتے ہو۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد کال نے ہامی بھری لیکن ایک شرط بھی عائد کر دی کہ بعد ازاں اینڈریا چند سوالات کے جواب دے گی۔

اینڈریا نے اپنے میزبانوں کا دل سے شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں فال وے کے لیے روانہ ہوگئے۔ فال وے پر پہنچ کر انہوں نے نشانات کے لیے تلاش شروع کر دی۔ کال نے رائفل ہاتھ میں لے لی تھی۔ فورڈ کے نشانات بہ آسانی مل گئے۔ انہوں نے تلاش جاری رکھی۔ کال نے ایک پسٹل دے کر اینڈریا کو مخالف سمت میں روانہ کرتے ہوئے تلاش کا دائرہ بڑھایا۔ اینڈریا کو دیکھے بغیر لزا سامنے

نہیں آسکتی تھی۔ لہٰذا دونوں متفق تھے کہ لزا اب بھی دشمنوں کی پہنچ سے دور ہے۔

کال کی پکار سن کر اینڈریا پلٹی۔ وہ فاصلے پر ایک جگہ گھٹنا ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اینڈریا تیز قدموں کے ساتھ وہاں پہنچی۔

”یہ دیکھو۔“ کال نے اشارہ کیا۔ اس پتھر کے پیچھے لزا انتظار کرتی رہی ہے۔ اینڈریا نے وہاں پڑے ہوئے استعمال شدہ سگریٹ کے ٹوٹوں کو دیکھا۔ برانڈ مارلبرو تھا۔ لزا نے یہاں بیٹھ کر غالباً سگریٹ کا پورا پیکٹ خالی کر دیا تھا۔

کال نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ”اس نے بہترین جگہ منتخب کی تھی۔ برج سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً تمہیں نہ پا کر وہ سامنے نہیں آئی اور گاڑی والا خالی ہاتھ واپس چلا گیا۔ اینڈریا نے بے چینی سے اطراف میں نظر دوڑائی کہ شاید کہیں سے لزا کا مسکراتا ہوا چہرہ بلند ہوگا اور وہ دوڑتی ہوئی آ کے گلے لگ جائے گی۔ لیکن کال کو ہمراہ دیکھ کر اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔

اینڈریا نے ایک نامعلوم خلش محسوس کی۔ بالآخر ان دونوں نے واپسی کے لیے ائرکرافٹ کی سمت چلنا شروع کیا۔ دونوں خاموش تھے۔ فضا میں پہنچنے کے بعد اینڈریا کے ہیڈ فون میں کال کی آواز آئی۔ ”اینڈی؟“

”میں تمہارے اس وعدے پر یہاں آیا تھا کہ ہم چار سال پہلے والی آؤٹ ڈور مہم کے بارے میں کچھ بات کریں گے۔“

اینڈریا خاموش رہی۔

”مہم کے دوران میں جسمانی تعلقات کے علاوہ بھی کچھ اور تھا۔“ اس نے کہا۔

اینڈریا نے گردن گھمائی۔ ”تمہاری وائف سیفرون کیسی ہے؟“

کال نے چند سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

”ڈیڈ، وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

لزا کو اپنی حماقت پر شدید غصہ آیا تھا۔ اس نے بروقت اپنی کمین گاہ بدل ڈالی تھی۔ بصورت دیگر ان دونوں میں کوئی ایک اسے دیکھ لیتا۔ اینڈریا کے ساتھ کال کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ اینڈریا سے اس قسم کی بنیادی حماقت سرزد ہوگی۔

اسے یقین تھا کہ کسی طرح اینڈریا وہاں ضرور پہنچے گی اور تنہا آئے گی۔ جیسے خود لزا وہاں پہنچی تھی۔ اگرچہ اینڈریا کے لیے بیشتر علاقے اجنبی تھے، وہ کسی کو ساتھ لاسکتی تھی لیکن لزا کے گمان میں نہ تھا کہ ساتھ آنے والا کال ہوگا۔ کیا اینڈریا، سیفرون کی المناک موت سے واقف ہے؟

اینڈریا کو دیکھ کر وہ چیختی ہوئی سامنے آنے والی تھی کہ بروقت تھم گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ کال مسلح حالت میں ہے۔ کال کے بارے میں وہ شکوک و شبہات کا شکار تھی۔ میگ، وہ خزانہ تھا۔ جو کسی بھی دوست کو دشمن میں بدل سکتا تھا۔ اینڈریا سے رابطے کے لیے اب کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

”جب تم نے الاسکا سے پرواز کی، اس کے بعد سیفرون صرف چھ ماہ زندہ رہ سکی تھی۔ میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی...... خطوط روانہ کیے۔ لیکن شاید تم نے کسی خط کو کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی۔“ کال نے رنجیدگی سے بتایا۔

اینڈریا کے لیے یہ خبر ناقابلِ یقین تھی۔ جب اس کی لزا سے جھڑپ ہوئی تھی تو لزا نے کہا تھا۔ اگر اس افیئر کا سیفرون کو علم ہوگیا تو وہ ختم ہو جائے گی۔

”کیا سیفرون کو پتا چل گیا تھا؟“ اینڈریا نے سوال کیا۔

”نہیں، لیکن تم نے میرے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیا؟“

”میں کسی کا گھر تباہ نہیں کرسکتی تھی۔“ اینڈریا نے تاسف کے ساتھ جواب دیا۔ اس اطلاع نے اسے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ ذمے داری اس پر عائد نہیں کی جاسکتی۔

”اینڈی، تمہیں میری بات پر یقین کرنا ہوگا۔ افیئر کا آغاز کیونکر ہوا...... میرا کوئی قصور نہیں تھا لیکن تم سے جب میری ملاقات ہوئی تو میری شخصیت میں از خود کوئی تبدیلی رونما ہونے لگی۔“ وہ خاموش ہوگیا۔ اینڈریا سامنے خلا میں دیکھنے لگی۔

”سیفرون مقامی تھی۔ مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے، اگر میں یہ اعتراف کروں کہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ کیونکہ یہی حقیقت تھی۔ یہ ڈیڈ کا فیصلہ تھا۔ میں کوئی معذرت نہیں پیش کر رہا۔ اسے بچپن سے دمے کا مرض لاحق تھا۔ ہماری شادی کو آٹھ سال ہوگئے تھے۔ میں نے اپنا ذہن

داری کو نبھایا تھا اور اچھے شوہر کے مانند اس کی دیکھ بھال کرتا تھا پھر ایک مرتبہ انفیکشن کے بعد حالت خراب ہوگئی، وہ سانس لینے کے لیے مچھلی کے مانند تڑپتی تھی۔'' وہ پھر خاموش ہوگیا۔ اینڈریا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ بھی چپ تھی۔ معاملہ ڈاکٹرز کے ہاتھ سے نکلنے لگا...... پھر...... وہ چلی گئی۔''

''یس۔'' اینڈریا کو اپنی آواز اجنبی لگی۔ کال جن حالات سے گزرا، وہ بہتر سمجھ سکتی تھی کیونکہ بیماری کی حالت میں ماں کے ساتھ اس کی حالت بھی غیر ہو جاتی تھی۔

''میری ملاقات تم سے ہوگئی۔ یہ ملاقات سیفرون کی زندگی میں نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ میری غلطی تھی۔ شاید میں بے بس ہوگیا تھا۔ میری وضاحت سے پہلے ہی تم الاسکا سے نکل گئیں۔''

اینڈریا کو احساس ہوا کہ کال کیوں ایک سال تک برابر ہر ماہ خط بھیجتا رہا تھا۔

''میری غلطی نہیں تھی۔'' وہ بمشکل بولی۔

''ہاں، لیکن کیا تم مجھے معاف کرسکتی ہو؟'' کال نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ اینڈریا اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

☆☆☆

زمین پر اترے تو وکٹر اور ڈیمارکو منتظر تھے۔ کال انہیں خبر دے چکا تھا۔ تاہم اس نے یہ بتایا کہ راون کریک سے لیک اتیج پہنچنے میں اتنی دیر کیوں لگی۔

''تمہیں خیریت سے دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' ڈیمارکو نے ہاتھ ملاتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو۔''

وکٹر نے بھی اس کی سخت جانی اور جدوجہد کا اعتراف کیا۔ ڈیمارکو نے اسے فورڈ ایکسپلورر میں بٹھایا۔

''یہ ایک بھیانک خواب تھا جس کے اثرات تمہارے اوپر باقی ہوں گے۔'' وکٹر نے کہا۔ ''سوالات کے ذریعے ہم اس میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ تم آرام کرو۔ اپنی سہولت سے کچھ بتانا چاہو تو بتا سکتی ہو۔'' وکٹر نے کہا۔

''کیوں نہیں، کیا تم برداشت کرلو گے؟''

وکٹر کی آنکھیں سکڑ گئیں، وہ مسکرایا۔ ''ہاں...... ہاں...... تم بتاؤ۔''

''پیٹر سانٹونی کا نام سنا ہے؟''

''ہاں، جانتا ہوں۔''

''تمام فساد کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے۔ وہ ایک سرپھرا سائنس داں ہے۔ جسے لزا اور تھامس نے پروجیکٹ سے الگ کر دیا تھا۔ اس بات پر وہ سخت برافروختہ ہے۔''

''ہاں، ہم نے سنا ہے۔'' وکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''کیا تم پروجیکٹ کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ تھامس اور لزا نے اس معاملے کو بہت خفیہ رکھا ہے۔''

اینڈریا پھر میگ کا ذکر کرتے کرتے رہ گئی۔

''سوری، میں خود حیران ہوں کہ ایسی کون سی ریسرچ ہے کہ اس دور دراز پُرامن علاقے میں برف خون سے رنگین ہونا شروع ہوگئی ہے۔''

''سانٹونی، پروفیسر گرُو کو جانتا ہے۔ تاہم ہم پروفیسر تک نہیں پہنچ سکے، جس پر لزا نے قتل کا الزام عائد کیا تھا۔ جس علاقے میں تمہیں اغوا کر کے لے جایا گیا تھا، وہاں سے ایک آدمی زخمی حالت میں ملا ہے جبکہ دوسرا ریچھ کے حملے میں مارا گیا ہے۔ زخمی ملزم کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اس معاملے میں وہ خوش قسمت رہا۔ اس نے کافی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔''

''شکر ہے ایک تو ہاتھ لگا۔'' اینڈریا نے کہا۔

''تیسرا درمیانی آدمی ہے، وہی اہم مہرہ ہے...... جسے ہم تلاش کر رہے ہیں۔''

ان کی گاڑی اسکول تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں خاصا رش تھا۔ کونی، بگ جو، ڈیانا، میک دی پائلٹ......

''عقبی راستے سے چلتے ہیں۔'' ڈیمارکو نے کہا۔

''نہیں یہ میرے دوست اور بہی خواہ ہیں...... سامنے سے چلیں گے۔'' اینڈریا نے کہا۔ اس کے باہر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے کونی بھاری تکیے کے مانند آن لپٹی۔ وہ اینڈریا کے چہرے کو چوم رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھر ڈیانا نے اینڈریا کو جکڑ لیا اور رخسار پر بوسہ دیا۔ ڈیانا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بعد ازاں سب نے ہاتھ ملاتے ہوئے اظہارِ تشکر کیا۔ اینڈریا کو پتا چلا کہ ڈیانا نے اس کے لیے ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ اس نے فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کیا۔

• اسکول میں جانے کے بعد اس کی خاطر تواضع شروع ہوگئی۔ ڈیمارکو اور وکٹر کا رویہ بدل چکا تھا۔ وہ لوگ نام نہاد بریفنگ روم میں آگئے۔ وکٹر، سفید جیپ میں دلچسپی لے رہا تھا جو اینڈریا کو اٹھا کر لے گئی تھی۔

فون کی گھنٹی بجنے پر اس نے کال ریسیو کی اور اس کا رنگ بدل گیا۔ فون رکھ کر اس نے ان دونوں کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔ ''کوئی نئی آفت؟'' اینڈریا کی چھٹی حس

نے سوال کیا۔

''کیا بات ہے؟''

''بری خبر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ اینڈریا نے خاص اثر محسوس نہیں کیا۔ بری خبریں سن سن کر وہ عادی ہوگئی تھی اور جن ہولناک حالات سے گزر کے آئی تھی، اس سے وہ اور مضبوط ہوگئی تھی۔ بس اسے فکر تھی کہ ''بری خبر'' لزا سے متعلق نہ ہو۔

''کیا خبر ہے؟'' ڈیمارکو نے سوال کیا۔

''اینکوریج کے نواح میں تھامس کی باڈی دریافت ہوئی ہے۔ ایک جلی ہوئی کار کے اندر۔''

اینڈریا کے جبڑے بھنچ گئے۔ خبر غیر متوقع تھی۔ بری نہیں بہت بری خبر تھی۔

☆☆☆

جس وقت وکٹر ''بری خبر'' کا اعلان کر رہا تھا۔ اسی دن لزا اور تھامس، مخالف سمتوں میں ایک دوسرے سے الگ ہو رہے تھے۔ تاریخ تھی اپریل 2۔ جمعے کا دن تھا۔ تھامس، میگ کو ساتھ لیے اینکوریج کی طرف محوِ سفر تھا۔ لزا کا رخ لیک اتیج کی جانب تھا۔

''میں نکلتی ہوں۔'' ڈیمارکو نے سارجنٹ کو بتایا۔

وکٹر نے اینڈریا کی طرف رخ کیا۔ ''تھامس کو تم کتنے قریب سے جانتی تھیں؟''

''میں اس سے چند بار ملی اور ہر مرتبہ اچھا تاثر لیا۔ وہ ایک شریف، نرم دل اور فیاض آدمی تھا۔'' اینڈریا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''آئی ایم سوری۔'' وکٹر نے اسے پانی کا گلاس پکڑایا۔ ''کاش یہ خبر تم میرے بجائے میڈیا سے سنتیں۔''

''کسی نے فوری طور پر شناخت نہ کیے جانے کے مقصد کے تحت اسے نذرِ آتش کیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے بندھے تھے۔'' آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے وکٹر کے جبڑے بھنچ گئے اور اینڈریا یہ سن کر لرز اٹھی۔

''ہوسکتا ہے، وہ تھامس نہ ہو۔'' اینڈریا نے آس بھرے لہجے میں کہا۔

''ڈینٹل فارنسک کے بعد شک کی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔'' کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

''کیا تم اب بھی سمجھتے ہو کہ میری بہن قاتل ہے؟''

وکٹر نے ہاتھ پھیلائے۔ ''دیانت داری سے کہوں گا کہ وہ دوست تھیں۔ ایک ہی ہدف کے لیے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ مقصد تھا ٹیکنالوجی کو پیٹنٹ کرانا۔ ٹیکنالوجی تھامس

کے ذہن کی پیداوار تھی۔ تھامس برسا برس سے اپنے آئیڈیے پر کام کررہا تھا۔ لزا سے ملاقات ضروری ہے۔ تفتیش کا دل وہ پروجیکٹ ہے جس کی حقیقت پردۂ اخفا میں ہے۔" وکٹر کھڑا ہوگیا۔

"پیٹر سانٹونی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اینڈریا بھی کھڑی ہوگئی۔

"وہ گزشتہ ہفتہ الاسکا سے نکل گیا ہے۔ اسے کھوجنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔"

"یعنی وہ غائب ہوگیا ہے؟"

وکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

"تھامس کا سن کر دلی افسوس ہوا۔" کال نے خلوص سے کہا۔

"شکریہ۔" اینڈریا نے مسکرانے کی کوشش کی اور موک کی فر میں انگلیاں چلانے لگی۔ "میں کافی بناتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" کال نے کافی کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ڈیمارکو نے تمہاری حفاظت کے لیے ایک ٹیم بنائی ہے، شومیٔ قسمت ٹیم کے بیشتر افراد مصروف ہیں۔ ڈیڈ کا بھی جانا ضروری تھا۔ شاید ڈیمارکو ہی یہاں موجود رہ سکے۔"

اینڈریا کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ اغوا کنندگان کو بھلا بیٹھی تھی......

"اینڈی، کیا تم جانتی ہو کہ لزا کیا ریسرچ کررہی تھی؟"

"اس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔ ماں کو بھی نہیں بتایا۔"

"ہم...... اینڈی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" کال کے لہجے میں کوئی بات تھی جو فلنٹ سے ملتی جلتی تھی۔ اینڈریا کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوگیا۔

"کال، یہ فلنٹ کون ہے؟"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"میں اس کے کیبن میں ٹھہری ہوں...... وہ اس کیبن کا مالک ہے۔"

"گاڈ، یہ آدمی ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس سے بچ کے رہنا۔"

اینڈریا کے اعصاب تن گئے۔ ہر نیا پرانا کردار اینڈریا کو خطرے کا احساس دلا رہا تھا اور ہر کوئی اینڈریا کو دوسرے سے بچنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"لیکن کیوں؟" اینڈریا نے سوال کیا۔

"ڈیڈ نے لزا کا فون ریکارڈ چیک کیا تھا۔ فلنٹ اسے متواتر کال کرتا رہا ہے۔"

"پھر؟"

"اس کی فیملی اوسس (OSIS) آئل کمپنی کو اون کرتی ہے۔ وہ خاصا مالدار ہے۔ الاسکا کی معیشت آئل پر انحصار کرتی ہے۔ بدقسمتی سے "پروڈ ہوبے" خشک ہورہا ہے۔ پندرہ سالوں میں پیداوار پچاس فیصد گر گئی ہے۔ فلنٹ چکر میں ہے کہ آرکٹک والٹر فائر ریفوج کی کوسٹ لائن کے ساتھ ڈرلنگ کا آغاز کرے۔ میرے اندازے کے مطابق لزا کی ریسرچ فلنٹ کے لیے نہ صرف مفید ہے بلکہ اس کی دولت میں بھی کئی گنا اضافہ کرسکتی ہے۔"

"کیا وہ لزا کا دوست ہے؟" اینڈریا نے قطع کلامی کی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" کال کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ڈیانا نے۔"

کال کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "ہر کوئی جانتا ہے کہ لزا اور فلنٹ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔"

اس انکشاف نے اینڈریا کو ایک نئی الجھن سے دوچار کردیا۔ "اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو تو فلنٹ فون پر لزا سے رابطے کی کوشش کیوں کرتا رہا؟"

"بظاہر وہ لزا سے اختلافات دور کرنا چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل مدعا تھامس اور لزا کے پروجیکٹ تک رسائی ہے۔" کال نے عقدہ کشائی کی۔ "اینڈی اگر تم لزا کے پروجیکٹ کے بارے میں جانتی ہو تو کبھی بھولے سے بھی فلنٹ سے ذکر مت کرنا۔"

یہ کیا اسرار ہے؟ میگ آخر کیا بلا ہے؟ کتنے لوگ اس کے پیچھے لگے ہیں؟ کال بھی نہیں جانتا کہ فلنٹ تو پہلے ہی میگ سے آگاہ ہے یا پھر فلنٹ صرف "میگ" کے نام سے واقف ہے اور اینڈریا کے ساتھ بلف کررہا تھا؟

کال نے کافی ختم کی اور کھڑا ہوگیا۔ "تمہارے اعزاز میں پارٹی ہے۔ بار میں آنا مت بھولنا۔" یہ کہہ کر وہ نکل گیا۔

☆☆☆

اسٹو روشن کرتے ہوئے لزا کا دھیان اینڈریا کی جانب تھا۔ اسے علم تھا کہ لزا لیک اسٹیج واپس پہنچ چکی ہے۔

اس نے گرم دودھ میں چاکلیٹ ملانی شروع کی۔ وہ آبدیدہ ہوئی جارہی تھی۔ تھامس کے ساتھ جو پروگرام طے ہوا تھا، وہ دعا کررہی تھی کہ تھامس کامیابی سے لیب بکس منزل تک پہنچا دے۔ کل کسی اور نے میگ کو پیٹنٹ کرالیا تو وہ ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔ یہ اسی کی غلطی تھی جب اس نے تھامس کے مشورے پر کان نہیں دھرے کہ میگ کے معاملے میں کچھ عرصے مزید خاموشی اختیار کی جائے لیکن بقول لزا کے وہ لوگ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ پیٹر سانٹونی کے پاگل پن سے جان چھڑانا ضروری ہوگیا تھا۔

سانٹونی بعدازاں ناسا تک جا پہنچا اور میگ کے بارے میں بتادیا۔ پیری نے لزا کو وارن کیا۔ پیری ناسا کے BPP پروگرام سے منسلک تھا۔ چند سال پہلے وہ لوگ سالک لیک سٹی کی کانفرنس میں ملے تھے۔ پیری سر سے گنجا تھا، مزاج شگفتہ اور قد لمبا تھا۔

روسکو نے منہ لزا کے پیر سے رگڑا...... اگر وہ سانٹونی کے سامنے اینڈریا کا ذکر نہ کرتی تو اینڈریا کو اتنی مصیبتیں نہ جھیلنی پڑتیں۔

☆☆☆

دستک سن کر موک نے غرانا شروع کردیا۔ اینڈریا نے جھانک کر دیکھا۔ باہر دو آدمی کھڑے تھے۔ اینڈریا نے بغور جائزہ لیا۔ دونوں اجنبی تھے۔ کم ازکم اغوا کنندگان میں سے نہیں تھے۔ اینڈریا نے کھڑکی پر دستک دے کر انہیں متوجہ کیا۔ "کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

ایک آدمی کھڑکی کی جانب آیا اور اپنی آئی ڈی دکھائی، وہ ناسا کا کارڈ تھا۔ اینڈریا کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ گویا بات اتنی دور نکل گئی ہے۔

"تمہاری بہن سے متعلق چند باتیں کرنی ہیں۔" وہ بولا۔

اینڈریا دروازے کی طرف گئی اور موک کھڑا ہو کے غرانے لگا۔

نشست گاہ میں آنے کے بعد تعارف شروع ہوا۔ "میرا نام بین ایلسن ہے اور یہ فلیکس کیرالا ہے...... میں زیادہ وقت نہیں لوں گا ہمیں احساس ہے کہ تم حال ہی میں نامساعد حالات کا شکار رہی ہو۔" وہ دونوں خوش دلی کا مظاہرہ کررہے تھے لیکن اینڈریا نے سنجیدہ تاثرات قائم رکھے۔

وہ دونوں جلد ہی مطلب کی بات پر آگئے۔ "لزا کے لیے ہم افسوس محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک مقبول و معروف ہستی ہے۔"

"کیا تم لوگ اس سے ملے ہو؟"

"اوہ ہاں، کئی بار...... میگ کی وجہ سے۔"

"میگ کا نام سنا ہے میں نے۔" اینڈریا کی آواز سپاٹ تھی۔

"ہم...... ہم......" ایلسن نے ہنکارا بھرا۔ "شاید تم جانتی ہو کہ میگ کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ اسپیس ٹریول کے لیے اس کی افادیت ناقابلِ یقین ہے...... تاہم اس وقت ٹیکنالوجی کا تحفظ خطرے میں ہے۔ نہ صرف دونوں سائنسداں لاپتا ہیں بلکہ میگ کے ساتھ ریسرچ کا مواد بھی غائب ہے۔"

اینڈریا نے سوچا کہ کیا وہ لوگ تھامس کے مرڈر سے واقف ہیں؟

"تم ہمیں میری کے مرڈر کے بارے میں کچھ بتاسکتی ہو؟"

اینڈریا نے تول کر جواب دیا۔ "پولیس کے مطابق وہ لزا کی دوست تھی۔"

"اور وہ پیٹنٹ آفس کے لیے کام کرتی تھی؟"

"ٹھیک بات ہے۔"

وہ دونوں گھما پھرا کر سوال کرتے رہے۔ تاہم اینڈریا اتنے دن میں کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ دونوں مطلب کی کوئی بات حاصل نہ کرسکے۔

"پروٹوٹائپ کے بارے میں تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہے؟" وہ کھلنے لگے۔

"نہیں، آئی ایم سوری۔" اینڈریا نے ان کے چہروں پر فرسٹریشن دیکھی۔

"پولیس اب تک بے خبر ہے۔ پھر تم لوگوں کو میگ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" اینڈریا کے سوال میں چبھن تھی۔

"یہ اتنا بھی خفیہ نہیں ہے۔ لزا ہمارے ایک سائنس داں پیری سے ملی تھی، غالباً وہ ایک کانفرنس تھی۔ بعدازاں ہم نے تھامس سے رابطے کی کوشش کی۔ وہ ملنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ہم نے تمہاری بہن کو ٹیکنالوجی کے بدلے ایک خطیر رقم کی پیشکش کی۔ لیکن اس نے یہ پیشکش ٹھکرادی۔ اس کا کہنا تھا کہ میگ جو کچھ بھی ہے وہ انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔"

"خوب۔"

"وہ پیشکش ابھی تک کھلی ہے۔" ایلسن نے معنی خیز

انداز میں کہا۔
"جنٹلمین تم لوگ اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔"
اینڈریا کھڑی ہوگئی۔
"تم سمجھیں نہیں...... اس غیر معمولی پیشکش سے تم بھی فائدہ اٹھا سکتی ہو، اگر میگ اور لیب بکس ہم تک پہنچا دو۔"
کیرالا نے چارا ڈالا۔
"او کے، کتنی بھاری پیشکش کی بات کررہے ہو؟"
اینڈریا نے اپنی سرکشی پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔
"کم سے کم بھی یہ رقم آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہوگی۔"
اتنی بڑی رقم کے لیے خونی رشتوں میں خون خرابہ بھی معمولی بات تھی۔
"اتنی رقم سے تم اپنے تمام خواب حاصل کرسکتی ہو۔"
ایلسن کو امید ہوئی کہ کام بن رہا ہے۔
"گیٹ آؤٹ۔" اینڈریا اچانک بپھر گئی۔ "ہر کوئی لزا کے بجائے ٹیکنالوجی کے حصول کی فکر میں ہے۔"
وہ دونوں ایک دم بوکھلا گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اینڈریا نے موک کو اشارہ کیا۔ موک اچھل کر قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے حلق سے خطرناک غراہٹ خارج ہورہی تھی۔ نظریں دونوں آدمیوں پر تھیں۔
"او کے، او کے......" دونوں نے پسپائی اختیار کی۔
"آئندہ یہ دونوں نظر آئیں تو چھوڑنا مت۔" اینڈریا نے موک سے کہا۔

☆☆☆

پارٹی میں اینڈریا کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ لزا کی غیر موجودگی نے اسے بے سکون کیا ہوا تھا۔ وہاں اس کی کال اور کونی سمیت کئی شناسا لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کونی کے شوہر سے بھی اس کا تعارف ہوگیا۔ اینڈریا کو تعجب ہوا کہ وہ کونی کا تیسرا شوہر تھا۔ اس کا نام اسکاٹ تھا۔ میک بھی وہاں موجود تھا۔ ڈیانا کی موجودگی تو لازم تھی۔ اسکاٹ کی شخصیت، اینڈریا کو بے چین کررہی تھی۔ نامعلوم بے چینی......
معاً اینڈریا کے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ وہ مائیکل فلنٹ تھا۔ چند باتیں کر کے وہ بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ اینڈریا نے اس کا اشارہ دیکھ لیا تھا، چنانچہ اس کے پیچھے جانے میں اس نے کوئی مضائقہ محسوس نہیں کیا...... کچھ دیر بعد دونوں فلنٹ کے کیبن میں بیٹھے تھے، جو بظاہر اینڈریا نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ عمومی گفتگو کے بعد فلنٹ نے اینڈریا کو مشورہ دیا کہ وہ کسی اور خطرے سے دوچار ہونے سے قبل گھر واپس چلی جائے۔ اسے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔
اینڈریا، فلنٹ کے بارے میں مشکوک ہوچکی تھی۔ وہ اگر واپس چلی بھی جاتی تو ماں کو کیا منہ دکھاتی...... اول تو لزا کو خطرناک، الجھے ہوئے حالات میں تنہا چھوڑ کر جانے کا تصور ہی محال تھا۔
"ماحولیاتی تحفظ کے حوالے سے کیا تمہاری اور لزا کی ان بن ہوگئی تھی؟"
فلنٹ چونکا، تاہم خود پر قابو لیا۔ "ہاں، ایسا ہوا تھا لیکن ہم نے اختلافات ختم کر کے ہم آہنگی اختیار کرلی تھی۔"
فلنٹ نے کھڑکی کے باہر جھانکا، پھر آواز دھیمی کر کے بولا۔ "دیکھو ایک بات ایسی ہے جو تمہارے علم میں رہنی چاہیے لیکن تم وعدہ کرو کہ تم اسے سیکرٹ رکھوگی؟"
اینڈریا نے اثبات میں سر ہلایا تاہم فلنٹ کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ لہٰذا وہ خاموش رہی۔
میں لزا کے بی ہاف پر درخواست جمع کرانے USTPO جارہا ہوں، لزا کے پاس میگ، پروٹوٹائپ اور لیب بکس ہونے چاہئیں اور ٹیکنالوجی رجسٹرڈ ہوجائے گی۔"
"وہ تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ لزا خود بھی یہ کام کرسکتی ہے۔" اینڈریا نے اعتراض کیا۔
"لیکن اگر میرے پاس پاور آف اٹارنی ہو تو پھر؟"
"پروٹوٹائپ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"
"اگر ہم میگ، پروٹوٹائپ اور لیب بکس بھی لے جائیں پھر؟"
"وہ کیسے؟"
"تم بھی ساتھ چلوگی۔"
"تم سمجھتے ہو کہ پروٹوٹائپ اور بکس کا اتا پتا مجھے معلوم ہے؟" اینڈریا نے منہ بنایا۔ "یہ کام صرف لزا کرسکتی ہے۔"
"تم جانتی ہو کہ یہ چیزیں کہاں ہیں؟"
"بہت خوب...... اچھی خوش فہمی ہے۔" اینڈریا نے تلخی سے کہا۔ "اور تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی؟"
"اگر تمہیں پتا بھی ہے تو تم مجھے نہیں بتاؤ گی۔" وہ بولا۔
"اگر تم اسی طرح سوچتے ہو تو اس گفتگو سے کیا حاصل ہوگا؟"
فلنٹ کے جبڑے بھنچ گئے۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم واپس لوٹ جاؤ...... تمہاری وجہ سے مشکلات مزید بڑھ گئی

ہیں۔" وہ کھڑا ہوگیا۔
اینڈریا نے خوف محسوس کیا۔ لیکن وہ ایڑیوں پر گھوم کر باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے مڑا۔ "ممکن ہے دونوں چیزیں میرے قبضے میں ہوں۔"
فلنٹ کا تعلق بنیادی طور پر تیل کے کاروبار سے تھا جبکہ لزا ماحولیات کی آلودگی کے خلاف تھی۔ یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے دوست ہوسکتے تھے۔ یعنی کال کا انتباہ صحیح تھا۔ حالیہ گفتگو نے فلنٹ کے خلاف، اینڈریا کے شکوک میں اضافہ کردیا تھا۔ تاہم متعدد سوالات تھے جس کے جوابات اب تک اس کی دسترس سے باہر تھے۔ فلنٹ کا آخری فقرہ اینڈریا کے سر سے گزر گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز اینڈریا دردکش کا ڈبل ڈوز لے کر باہر تازہ ہوا میں آگئی تھی۔ کچھ دیر بعد کونی وہاں آن دھمکی۔ رسمی کلمات کے بعد اینڈریا اسے کیبن میں لے آئی۔
"اسکاٹ واپس چلا گیا ہے۔" کونی نے بتایا۔ "کل پارٹی سے فلنٹ تمہیں لے گیا تھا...... میری نظر پڑ گئی تھی...... اینڈریا، فلنٹ سے محتاط رہو۔" کونی نے پھر مشورہ دیا۔
اینڈریا جھلا گئی...... اسے کس کس سے محتاط رہنا چاہیے۔
"وہ مجھے، بس کیبن تک چھوڑ کے چلا گیا تھا۔" اینڈریا نے کہا۔
"کیا وہ میگ کی بات کررہا تھا؟" کونی نے اپنا تجسس چھپانے کی کوشش کی۔ کونی، لزا اور تھامس کے لیے سرمایہ کاری کررہی تھی اور اگر فلنٹ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا تو اینڈریا کو بتا دینا چاہیے تھا کہ فلنٹ کے کیا ارادے ہیں...... وہ کوئی فیصلہ نہ کرپائی۔
"اینڈی، میری طرف دیکھو۔" کونی نے مطالبہ کیا۔
اینڈریا نے رخ بدلا۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں اور ساتھ ہی معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اغوا کرلیا جائے گا۔"
"کیا مطلب ہے، تمہارا؟"
"مجھے اپنی حماقت کا احساس دیر سے ہوا...... مجھے معاف کردو، میں تمہاری حفاظت نہ کرسکی۔"
"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"
"ہاں، لیکن میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔"
"میگ کس چڑیا کا نام ہے؟" اینڈریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"میگنیٹک انرجی جنریٹر۔ یہ مقناطیسی توانائی کو الیکٹرسٹی میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کا مطلب توانائی کے حصول کے لیے تیل، گیس اور کوئلے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ناقابلِ یقین حد تک ارزاں اور کاربن فری ہے...... میگ، گلوبل وارمنگ اور آلودگی کے مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کار، ٹرک، جہاز، راکٹ کو توانائی بھی دے سکتا ہے اور زمین کے ماحولیاتی نظام پر بھی مضر اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ یہ ایک انقلابی ایجاد ہے۔"
اینڈریا نے حیرت اور استعجاب کے عالم میں کونی کے انکشافات سنے۔ یعنی میگ کسی جیٹ انجن کا نام نہیں تھا۔
"الیکٹرک کے کیبل کی ضرورت ختم ہوجائے گی۔ ہر گھر میں ایک چھوٹا سا میگ ہوگا۔" کونی کا چہرہ چمکنے لگا۔ "لزا کو یقین ہے کہ یہ توانائی کو ری سائیکل کر کے ماحول کی بہتری کے لیے بھی کام کرے گا۔" "کیا تم یقین کروگی؟"
"تیل انڈسٹری کا تو کباڑا ہوجائے گا۔" اینڈریا نے اضافہ کیا۔
"بالکل، بالآخر ایسا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ لزا کے خون کے پیاسے ہیں کہ ایسا نہ ہونے پائے۔"
اینڈریا کو ناسا کے آدمیوں کا خیال آیا۔
"کیا میگ کو تباہ کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں؟"
"دو باتیں ہیں یا تو اسے برباد کردیا جائے گا یا پھر کوئی گروپ اسے دولت کے پہاڑ کھڑے کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔"
اینڈریا نے سر ہلایا۔ اس کا دماغ سن ہوگیا تھا۔ اسے اب احساس ہوا کہ کونی کس قدر ہوشیار ہے۔ میری، میگ کی حقیقت سے واقف تھی، اس لیے ماری گئی۔ چنانچہ کونی نے جیٹ انجن کی کہانی پھیلا کر خود کو اور اینڈریا کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ میری کے ساتھ لزا بھی ماری جاتی لیکن وہ بچ گئی لیکن میری کا قاتل کون ہے؟
"ڈیئر اینڈی...... مجھے سن گن ملی ہے کہ تم میگ کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان چکی ہو۔"
"کیا مطلب ہے؟"
"فلنٹ تمہارے گرد منڈلا رہا ہے اور وہ ہنٹنگ لاج کے چکر بھی لگا رہا ہے جبکہ ہنٹنگ لاج وہ کبھی کبھار ہی جایا کرتا تھا۔" کونی نے بیگ سے ایک نقشہ نکالا۔ ایک جگہ وہی دائرے کے اندر U کا نشان تھا۔ "یہ پہاڑ پر 4,053 بلند ہے۔ ویری فائڈ لینڈنگ ایریا...... اس کا اصل نام کلیئر کریک لاج ہے، جو فلنٹ کی ملکیت ہے۔ میرا غالب خیال

ہے کہ لزا یہاں روپوش ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پچھلے سال جون میں فلنٹ وہاں صرف ایک مرتبہ گیا تھا جبکہ اس سال وہ کئی بار جا چکا ہے۔ شاید اسے بھی شک ہو گیا ہے۔ فلنٹ کی لاج میلونی کے ٹھکانے سے چالیس میل دور ہے۔"

"کیا ایک کتّے کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں لزا وہاں تک سفر کر سکتی ہے؟"

"یقیناً، یہ ایک انتہائی دشوار مرحلہ ہے لیکن تمہاری بہن کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ورنہ اب تک ماری جاتی یا پکڑی جاتی۔" کونی نے اعتراف کیا۔ "کوئی اہم بات ہے جو فلنٹ وہاں کے چکر کاٹ رہا ہے اور اہم ترین بات لزا ہی ہو سکتی ہے۔"

اینڈریا کو بچپن کا ہائیڈ اینڈ سیک والا کھیل یاد آیا۔ لزا ہمیشہ جیت جاتی تھی۔ دشمن کی ناک کے نیچے چھپنا بہترین جگہ ہے۔

"ناممکن۔" اینڈریا نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے جھوٹ بول کر نفی میں اظہار کیا۔ اینڈریا نے ڈرامائی انداز میں سانس بھری۔ "لزا میں اتنی طاقت نہیں بچی ہے کہ وہ لمبا سفر کر سکے۔" اینڈریا نے کونی کے چہرے پر مایوسی کا رنگ ابھر کے ڈوبتے دیکھا۔

'ہوشیار لزا۔ اس نے چھپنے کے لیے بہترین جگہ چنی ہے۔' اینڈریا دل ہی دل میں مسکرائی۔

☆☆☆

اینڈریا کا رخ موزبار کی جانب تھا۔ اس نے ڈیانا سے SOV کرائے پر لینے کے لیے استفسار کیا۔ ڈیانا نے فی الفور اپنی گاڑی اینڈریا کے حوالے کر دی اور کرائے کی بات بھی نہیں کی۔ اینڈریا نے شکریہ ادا کیا۔ اور ذہن حساب کتاب میں لگایا۔ فلنٹ کی لاج، لیک اینج سے تقریباً 30 میل شمال میں اور ہال روڈ سے مغرب میں 20 میل کے فاصلے پر تھی۔ راستے میں دریا، جنگل، پہاڑیاں اور جھیل بھی حائل تھی۔ اینڈریا کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ تنہا جانے کے لیے پرعزم تھی۔

موزبار سے روانہ ہوتے وقت اسے ایک شناسا آواز سنائی دی۔ وہ پلٹی اور ڈیمارکو کو دیکھ لیا جو تیز قدمی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔

"چند باتیں ہو سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اینڈریا نے جواب دیا۔

"سارجنٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں بتا دیا جائے کہ جو آدمی اسپتال میں بچ گیا تھا، اس نے چند شرائط پر زبان کھول دی ہے۔ وہ کرائے کے آدمی تھے۔ ان کی ذمّے داری تمہیں اغوا کرنے تک محدود تھی۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ اس قسم کے کام پہلے بھی کر چکے ہیں۔ انہیں لزا کو قتل کرنے کے لیے ہی ہائر کیا گیا تھا۔ جب وہ لیک اینج پہنچے تو میری سے ناواقف تھے۔"

"میری خوامخواہ ماری گئی اور لزا بال بال بچ گئی۔ غالباً تیسری گولی لزا پر چلائی گئی تھی۔ لزا جو کچھ نہ لے جا سکی، وہ اس نے نذرِ آتش کر دیا تھا۔"

"تیسرا آدمی کون تھا؟" اینڈریا نے بے چینی سے سوال کیا۔

"تمام رابطے ای میل کے ذریعے ہو رہے تھے اور ادائیگی وائر ٹرانسفر کے ذریعے۔ ای میل کی چھان بین سے پیٹر سانٹونی کا نام سامنے آیا ہے۔ خیال غالب ہے کہ کرائے کے آدمیوں سے میری کو بھی اسی نے مروایا ہے۔"

"کیا اسے گرفتار کر لیا گیا ہے؟"

"ابھی تک نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ......" ڈیمارکو نے اینڈریا کی آنکھوں سے نظر ہٹائی۔ "ہم اس تک پہنچ گئے ہیں...... لیکن وہ زندہ نہیں ہے۔"

"وہاٹ؟"

"ہاں، اسے گاڑی میں نذرِ آتش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کہ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے بندھے تھے۔"

اینڈریا کا سر گھومنے لگا۔

"کیس خاصا الجھ گیا ہے...... حالانکہ متعدد جوابات مل گئے ہیں۔ لزا ہی پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھا سکتی ہے۔"

"کوئی اور مشتبہ شخص؟" اینڈریا نے پوچھا۔

"ایک آدھ پر ہم نے نظر رکھی ہے۔ مختصر یہ کہ اصل مجرم اب تک پردۂ اخفا میں ہے۔"

"مائیکل فلنٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تم کیا جانتی ہو اس کے بارے میں؟"

"میں نے سنا ہے کہ دونوں میں مخاصمت تھی۔"

"میرے خیال میں تمہیں سارجنٹ سے بات کرنی چاہیے۔"

☆☆☆

اینڈریا کو دیکھ کر بگ جو کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم وہ اس کی آمد کا مقصد نہ جان سکا۔ کافی ختم کر کے اینڈریا نے بات شروع کی۔ "تم جانتے ہو مجھے کن لوگوں نے اغوا کیا تھا؟"

بگ جو خاموش رہا۔

"وہ لوگ پیشہ ور تھے۔ جنہیں پیٹر سانٹونی نے استعمال کیا۔ پیٹر، لزا اور تھامس کے ساتھ کام کرتا رہا تھا لیکن پیٹر کو کس نے مارا؟"

بگ جو کا سر نفی میں ہلا تھا۔

"ہونہہ...... پیٹر از ڈیڈ ناؤ۔"

بگ جو نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

اینڈریا نے دوسری ترکیب آزمانے کا فیصلہ کیا۔

"تم لزا کی مدد کر رہے ہو؟"

جو نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

اینڈریا کھڑی ہو گئی۔

"کیا مسئلہ ہے، تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟"

"ہم دونوں کی کوشش تھی......" وہ مناسب الفاظ تلاش کرنے کے لیے رکا۔ "کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"اوہ گاڈ، تم دونوں کا رابطہ کس طرح تھا؟"

"وہ کبھی کبھی موقع ملتے ہی ریڈیو کے ذریعے بات کر لیتی تھی۔"

"تمہیں، میری کے قتل کا پتا چل گیا تھا؟"

"بروقت نہیں۔ لیکن لزا بدک گئی تھی اور اس نے احتیاطاً میگ میرے حوالے کر دیا تھا لیکن اسے واپس لینے کا موقع ہی نہ ملا۔"

"تو میگ تمہارے پاس ہے؟"

"اب نہیں۔ ہال وے پر جو ڈیل ہوئی تھی، اس کے لیے میگ کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میگ، میں نے وہاں پہنچا دیا تھا۔"

"کاش تم مجھے پہلے بتا دیتے۔"

"لزا نے تمہارے تحفظ کے لیے مجھے منع کر دیا تھا۔" جو نے کہا۔

"اب کیوں بتا رہے ہو؟"

"اب وہ میرے پاس نہیں ہے اور اگر اسے کچھ ہوتا ہے تو پیٹنٹ کرانے کے سلسلے میں تمہارا ساتھ دوں تا کہ لزا کا خواب پورا ہو سکے۔"

"یعنی تھامس، دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے اینکورج جا رہا تھا۔ تا کہ اس دوران میں لزا اور میری پیٹنٹ کرانے کے لیے روانہ ہو جائیں۔ لیکن منصوبہ فیل ہو گیا اور میری کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بس لزا اور میگ پروٹو ٹائپ محفوظ رہے۔ جو اب بھی خطرے میں ہیں۔" اینڈریا نے تجزیہ پیش کیا۔

"اب لزا کہاں ہے؟"

"اس نے بتایا نہیں۔" جو بولا۔ "لیکن وہ محفوظ ہے...... پولیس نے قاتل کو پکڑ لیا تو وہ سامنے آ جائے گی اور میگ کو پیٹنٹ کرا لے گی۔"

"کیا پیٹر سانٹونی قاتل نہیں ہے؟"

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پیٹر کے پیچھے بھی کوئی اور ہو۔"

"لیب بکس، لزا کے پاس ہیں؟" اینڈریا نے سوال کیا۔

"اس نے بتایا نہیں۔"

اینڈریا نے غور کرنے کے بعد فلنٹ کے ارادے بھی ظاہر کر دیے۔

بگ جو خاموش رہا۔ اینڈریا بھی کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"ایک منصوبہ ہے۔" وہ بولی۔ اس نے بگ جو کو منصوبہ بتایا اور ایک پرچہ اس کے حوالے کر دیا۔

"تمہاری بہن کے بغیر کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے علم ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

"کیا؟" پہلی بار جو کے تاثرات بدل گئے۔

☆☆☆

آدھی رات کو اینڈریا نے اٹھ کر تیاری شروع کر دی اور موک کے ساتھ ڈیانا کی SOV میں روانہ ہو گئی۔ ڈرائیونگ کے دوران وہ احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ کئی جگہ گاڑی برف پر پھسلی تاہم اینڈریا نے اسے بے قابو نہ ہونے دیا۔ سفر کسی ناگہانی کے بغیر جاری رہا، حتیٰ کہ ستاروں کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔

لاج ایک بڑا سا گھر تھا، اس میں پانچ عدد چوبی کیبن تھے۔ برف سے ڈھکی ایک ائر اسٹرپ تھی، جس کے اختتام پر ایک کھلی عمارت تھی۔ دو فور وہیلر کے ساتھ ایک برفانی گاڑی بھی اینڈریا نے دیکھی۔

اینڈریا موک کے ساتھ باہر نکل آئی۔ کیبن

شاندار تھے۔ اینڈریا نے باری باری ہر کیبن کا جائزہ لیا۔ کوئی ذی نفس نظر آیا نہ لزا کے آثار دکھائی دیے۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ لزا یہاں موجود ہے۔ اینڈریا، لاج کی عقبی سمت میں چلی گئی۔ ہوا ساکت تھی۔ ماحول میں خاموشی رچی بسی تھی۔ اینڈریا کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ لزا کہیں آس پاس ہے۔ پرندے تک خاموش تھے۔ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ اچھا یا بُرا؟ اس نے بنظر غائر جنگل کا جائزہ لیا پھر دوبارہ لاج میں گھس گئی۔ ایک بار گراؤنڈ فلور کا سرسری جائزہ لے کر اس نے اوپری منزل کا رخ کیا۔ موک متواتر اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ باتھ روم، بیڈ روم، کپ بورڈ، اینڈریا نے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ پھر معاً وہ رک کر لزا کے انداز میں سوچنے لگی کہ وہ لزا کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟ یقیناً کسی چیز کو روپوش کرنے کے لیے اسے بالکل سامنے رکھ دیتی یا پھر کسی عام سی جگہ پر۔ وہاں تین فریزر تھے۔ اینڈریا تینوں کو چھان چکی تھی۔

دفعتاً اس کی نگاہ سات فٹ بلند چوبی کپ بورڈ پر پڑی، جسے وہ پہلے ہی اندر باہر سے دیکھ چکی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے نیچے خلا میں بھی جھانکا تھا۔ جس طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا تو وہ کپ بورڈ کی چھت تھی۔ اینڈریا کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر کپ بورڈ کے قریب کی، کرسی پر چڑھ کر پُرامید نظر کپ بورڈ کی چھت پر ڈالی۔ چھت اونچی تھی، نیز اس پر سجاوٹ کی کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔

اوپر نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ پتلا سا سیاہ رنگ کا چرمی تھیلا دیوار کے ساتھ متوازی حالت میں پڑا تھا۔ اینڈریا نے ہاتھ دراز کر کے بکس کھینچا اور کرسی سے اتر آئی۔ کرسی کو جگہ پر رکھا۔ بکس پر غبار نمایاں تھا اور وہ مقفل تھا۔ اسے میز پر رکھ کر اینڈریا نے پیچ کس اور ہتھوڑا تلاش کیا۔

چرمی بکس کھلتے ہی، پہلی بار اینڈریا نے خوف محسوس کیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہورہی تھی۔ بکس میں نوٹس، ماہانہ رپورٹس، ہر ایک پر شہادت کے طور پر دستخط ثبت تھے۔ ہر ورق کی پیشانی پر MAG لکھا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے کرسی دوبارہ گھسیٹی اور چرمی کیس واپس جگہ پر رکھ دیا۔

ایک زمانہ جس خزانے کے پیچھے سرگرداں تھا۔ وہ فلنٹ کے لاج میں کھلے عام رکھا تھا۔ اینڈریا، لزا کی خطرناک سوچ اور فیصلے پر اش اش کر اٹھی۔ اس کے خیال میں ان اشیا کو تلاش کرنا ناممکن حد تک دشوار ہو جاتا اگر وہ انہیں کہیں برف میں دبا دیتی۔ بہرحال لزا کا اپنا اسٹائل تھا۔ اینڈریا نے کانپتے ہاتھوں سے بریف کیس نما پتلا بکس بند کر دیا۔

دفعتاً ایک خوفناک خیال اس کے شعور کی سطح پر ابھرا۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ لیب بکس خود فلنٹ نے یہاں رکھی ہوں۔ اب وہ لزا کی تلاش میں ہوتا کہ میگ پروٹوٹائپ حاصل کرنے کے بعد اسے پیٹنٹ کرالے۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ تھامس اور لزا دو مختلف راستوں سے الاسکا سے نکل رہے ہیں...... اسے یقین تھا کہ لیب بکس اور میگ ان کے پاس ہیں۔ تاہم وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ دونوں چیزیں کیسے حاصل کرے۔ ایک وقت میں وہ ایک کے تعاقب میں جا سکتا تھا۔ اس نے تھامس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے لیب بکس مل گئیں۔ لیکن لزا اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اینڈریا کو پاور آف اٹارنی کا جھانسا دے کر وہ لزا کا پتا معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ کبھی اسے لگتا کہ فلنٹ دغاباز نہیں ہے۔

اینڈریا کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ کیا یہ تھیوری صحیح ہے؟ وہ سوچنے لگی یا فلنٹ پہلے ہی لیب بکس چرا چکا تھا اور میگ کے حصول کی خاطر تھامس کے پیچھے گیا اور مایوسی کے عالم میں اسے قتل کر دیا لیکن پیٹر سانتونی کو کس نے قتل کیا؟ اینڈریا چرمی کیس لے کر جنگل کی طرف چل پڑی۔ وہ واضح خوف محسوس کر رہی تھی۔ میری سمیت اب تک تین قتل ہو چکے تھے۔ چوتھا، درندے کے وحشت کی نذر ہو چکا تھا۔ معما اب تک حل پذیر تھا۔ خطرات ہر طرف منڈلاتے نظر آرہے تھے۔

''موک، میرے قریب رہو۔'' اس نے موک کو اشارہ کیا۔ موک اینڈریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک رک گیا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ بال کھڑے ہوگئے اور دم اکڑ کر سیدھی ہوگئی۔

دہشت اینڈریا پر حملہ آور ہوئی۔

جواباً بلند غراہٹ سنائی دی۔ موک نے بے تحاشا بھونکنا شروع کر دیا۔ اس کے دانت نمایاں ہوگئے تھے۔

درختوں میں سے معاً کوئی جانور نکل کر موک پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اینڈریا، درختوں کے پیچھے جانے کے لیے دوڑ لگانے والی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ موک کے مدِمقابل کوئی ریچھ نہیں اس جیسا ہی دوسرا کتا ہے۔ آناً فاناً دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کا منہ سونگھ رہے تھے۔ ان دونوں کی آوازیں تبدیل ہوگئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے گرد بھاگ رہے تھے، الجھ رہے تھے...... یہ لڑائی نہیں، کھیل تھا۔

اچانک اینڈریا کے دماغ میں پھلجھڑی سی پھوٹی...... چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہوگیا۔ دوسرا کتا سو فیصد لزا کا ''روسکو'' تھا۔

''موک۔'' اس نے پکارا۔ ''روسکو۔'' دونوں اپنی جگہ تھم گئے۔ موک فوراً اینڈریا کے قریب آگیا۔ روسکو نے بھی دھیرے دھیرے موک کی نقل کی اور اینڈریا کے قریب بیٹھ کر بغور اسے دیکھنے لگا۔

''لزا۔'' اینڈریا نے آہستہ سے آواز دی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ معاً عقب سے کوئی ٹکرایا اور اینڈریا زمین بوس ہوگئی۔ لزا، بے تحاشا بہن کو چوم رہی تھی۔ اینڈریا نے اسے مضبوط بانہوں میں جکڑ لیا۔ ماضی لوٹ آیا تھا۔ دونوں بچپن کی طرح لڑ رہی تھیں۔ دونوں کتے ناقابلِ فہم آوازیں نکالتے ہوئے یہ تعجب خیز منظر دیکھ رہے تھے۔ لزا کے پاس ڈبل بیرل گن تھی، وہ اس نے ایک طرف ڈال دی تھی۔

''یو اسٹوپڈ، بہت چالاک سمجھتی ہو خود کو...... آخر میں نے ڈھونڈ ہی لیا۔'' اینڈریا نے ہلکا گھونسا لزا کے پیٹ میں رسید کیا۔ دونوں پھر لپٹ گئیں، ناک سے ناک ملی تھی اور آنکھ سے آنکھ...... جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو پی لینا چاہتی ہوں۔

دونوں یقین و بے یقینی کے درمیان جھول رہی تھیں...... محوِحیرت تھیں۔ مضطرب تھیں۔

''کیوں گھورے جا رہی ہے؟'' لزا، آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی۔

''تو گھور رہی ہے، میں تو تیرے گھورنے کو دیکھ رہی ہوں۔'' اینڈریا نے جواب دیا۔

''شاعر بن گئی ہے؟''

''تو نے بنا دیا ہے۔''

''کیسے؟'' اینڈریا نے بہن کی پیشانی چوم لی۔

''لزا۔''

''ہونہہ؟''

''ایک بات کہوں؟''

''ایک نہیں دو۔''

''مجھے معاف کردے۔''

''کس بات پر؟''

''بس معاف کردے۔'' اینڈریا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔''

''پاگل ہوئی ہے۔'' لزا نے اسے گلے لگا لیا۔

''تو نے شادی کب کی؟''

لزا ہنس پڑی۔ ''کس نے بتایا؟''

''میلونی نے۔''

''وہ سنکی ہے۔''

''یعنی جھوٹ بول رہا تھا؟''

''پھر بتاؤں گی کہ کیا بات تھی۔ ہم دونوں (لزا اور اینڈریا) ہی غیر شادی شدہ ہیں...... فی الحال یہاں سے نکلو۔ ابھی ہم خطرات سے باہر نہیں ہوئے۔'' لزا کھڑی ہو گئی۔ ''تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''کوئی نہیں، میں تنہا آئی ہوں۔'' اینڈریا نے جواب دیا۔ ''تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے، وزن بھی گر گیا ہے۔'' اینڈریا نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

☆☆☆

اینڈریا گھنے جنگل میں لزا کے کیبن میں تھی۔ دونوں کافی اور چاکلیٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ گفتگو کا رخ عام باتوں سے ہوتا ہوا سنجیدہ امور کی طرف مڑ گیا۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ایک دو آئیڈیے ہیں میرے پاس، تاہم میں خود سوچ رہی ہوں کہ کیا قدم اٹھایا جائے؟''

''بگ جو نے بتایا تھا کہ میگ تمہارے پاس ہے؟''

لزا کی آنکھوں میں دھند اتر آئی۔ وہ خاموش تھی۔

''تھامس کے بارے میں، میں دل سے رنجیدہ ہوں۔'' اینڈریا نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن لیب بکس میرے پاس ہیں۔''

''ہاں، میں نے چرمی بیگ دیکھ لیا ہے...... اینڈی، تھامس، وہ میرے باپ کے مانند تھا۔'' لزا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جانتی ہوں۔'' اینڈریا نے غم زدہ آواز میں کہا۔

''ماں کا کیا حال ہے؟''

''شی از اوکے۔''

''تمہیں کال کے بارے میں پتا چلا؟'' لزا نے سوال کیا۔

''ہاں، لیکن میں فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ اسے معاف کر دوں؟''

''تم خود ہی جج ہو اور خود ہی جیوری۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔
''تمہارے ذہن میں کیا آئیڈیا ہے؟''
''ہم میگ، پیٹنٹ آفس لے جائیں گے۔ پیٹنٹ ہوتے ہی ہنگامہ آرائی ازخود انجام پذیر ہوجائے گی۔''
اینڈریا نے بگ جو کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا، وہ لزا کو بتایا۔
لزا نے حیرت سے بہن کو دیکھا۔ ''یہ تم نے میرے لیے کیا؟ ریئلی؟''
جواباً اینڈریا نے کہا۔ ''تم نے میگ کے لیے مجھ پر بھروسا کیا؟ ریئلی؟'' لزا بے ساختہ ہنس پڑی۔
اینڈریا نے معاً محسوس کیا کہ وہ میگ کے دیدار کے لیے مری جارہی ہے...... آخر یہ کیا بلا ہے؟
''میگ کی شکل دیکھوگی؟'' لزا نے اس کے منہ کے الفاظ چھین لیے۔ ''مگر اس کے لیے تمہیں تھوڑی کھدائی کرنی پڑے گی۔''

☆☆☆

میگ، پائن کے ایک بلند درخت کے نیچے دفن تھا۔ اینڈریا اس کا سائز اور وزن دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بمشکل ڈھائی کلووزنی تھا۔
''اسے مینٹی نینس کی ضرورت نہیں ہے۔'' لزا نے بتایا۔ تم اس کے ذریعے گھر کے لیے توانائی کی تمام ضروریات پوری کرسکتی ہو۔ اگر اس کے سائز میں اضافہ کیا جائے تو یہ کار، ٹرک اور فیکٹری کے لیے بھی کافی ہے اور ایک دن یہ جہاز بھی اُڑائے گا...... اسے انجن کی ضرورت نہیں ہے...... یہ زمین کی مقناطیسی توانائی استعمال کرتا ہے۔ تھامس نے لگ بھگ تیس برس اس آئیڈیا پر کام کیا تھا۔''
وہ کُتوں کے ساتھ واپس کیبن کی طرف چل دیں۔ لزا نے میگ کو یوں گود میں سنبھالا ہوا تھا جیسے کوئی ماں اپنی بچی کو سنبھالتی ہے۔
''اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ ماحولیات کو آلودہ نہیں کرتا۔'' کیبن میں پہنچ کر لزا نے میگ، ایک چوڑے تنے پر رکھ دیا۔
''لزا، تمہیں خبر ہے کہ سانٹونی کو بھی تھامس کی کار میں زندہ جلا کر ہلاک کردیا گیا۔''
لزا گھوم گئی۔ ''مذاق کررہی ہو؟''
''نہیں۔''
''قاتل پکڑے گئے؟''
اینڈریا نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ موک نے بھونکنا شروع کردیا۔ دونوں بہنیں پھرکی کے مانند گھومیں۔ اب روسکو بھی موک کے ساتھ شامل ہوگیا۔ دونوں بہنوں نے بدمزگی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ آنکھوں میں وحشت تھی...... لزا نے وقت ضائع کیے بغیر میگ کو بیک پیک میں منتقل کرکے رسی سے باندھا اور بنڈل کو سلیپنگ شیلف کے نیچے دھکیل دیا۔
لزا نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی۔ اینڈریا نے دوسری کھڑکی کا رخ کیا۔ اینڈریا نے دروازہ اندر سے بند کرنے کا اشارہ کیا۔ لزا نے نفی میں سر ہلایا۔ بیشتر کیبنوں کی طرح یہ کیبن سارا سال کھلے رہتے ہیں...... کوئی بھی ایمرجنسی کی صورت میں اندر آسکتا ہے۔ ایسے کیبن صرف باہر سے ہی بند کیے جاسکتے ہیں۔
اچانک دھماکے کی آواز آئی۔ لزا اور اینڈریا دونوں کے چہرے غم و غصے سے سرخ ہوگئے۔ لزا کو یاد آیا کہ وہ رائفل پورچ میں چھوڑ آئی تھی۔
''اینڈی۔'' لزا نے بہت آہستہ سے پکارا اور اسے چھپنے کا اشارہ کیا۔ اچانک بگڑتی ہوئی صورتِ حال نے اینڈریا کو مفلوج کردیا تھا۔
دروازہ انچ انچ کرکے کھل رہا تھا۔ اینڈریا نے آتش دان کے عقب میں پناہ لی جبکہ لزا کھلتے ہوئے دروازے کے پیچھے تھی۔ وہ آدمی دروازے سے اندر نہیں آیا تھا۔ تاہم اینڈریا کو اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ پسٹل تھا۔
''اینڈی، تم کہاں ہو...... آر یو اوکے؟'' وہ کال کی آواز تھی۔
لزا نے سرکو...... دائیں بائیں حرکت دی۔ یہ اینڈریا کے لیے خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ دروازہ کھلتا جارہا تھا۔
لزا دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں ایک مضبوط لٹھ تھا...... بیس بال کے مانند......
دروازہ کھلا اور کال قدم بہ قدم اندر آیا۔ ''لزا، اینڈی...... تم دونوں ٹھیک ہو؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ پسٹل اس نے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا...... پھر اس کی نگاہ اینڈریا پر پڑی اور چہرے پر اطمینان کا تاثر ظاہر ہوا۔ تاہم اس نے پسٹل جھکایا نہیں تھا۔
''اینڈی، تم وہاں......''
کال کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ لزا نے دونوں

ہاتھوں میں پکڑا ہوا لٹھ جسم و جان کی پوری طاقت سے کال کے سر کی پشت پر رسید کیا...... اینڈریا کو کچھ کہنے اور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کال کا منہ کھل گیا، سر نے جھٹکا لیا اور آنکھیں اوپر گھوم گئیں۔ کال اس طرح زمین بوس ہوا کہ پسٹل اس کے جسم کے نیچے دب گیا۔ اس کے گھنے بالوں سے خون رس رہا تھا۔
اینڈریا گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ لاشعوری طور پر اس نے کال کے بالوں کو چھوا۔ فائر کس نے کیا تھا؟ کال کتے کو نہیں مار سکتا۔
''یہ یہاں کیا کررہا ہے؟'' لزا نے سوال کیا۔
اینڈریا جانتی تھی کہ کال لزا کی تلاش میں ہے۔ تاہم گزرتے وقت کے ساتھ کال کے لیے اس کے منفی جذبات بدلنا شروع ہوگئے تھے۔ تاہم اسے یہاں دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔
''یقیناً اس نے تمہارا تعاقب کیا ہے۔'' لزا نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔'' لزا نے ضروری چیزیں بیک پیک میں میگ کے اوپر ٹھونسنی شروع کیں۔ ''ہمیں نکلنا چاہیے، ہوسکتا ہے کوئی اور بھی ہو۔'' لزا نے کہا۔ اینڈریا ابھی تک کال کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کا دماغ سن ہوچکا تھا۔
لزا نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ ''نکلو یہاں سے۔''
اینڈریا سلوموشن میں اٹھی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ اگر لزا کا اندیشہ صحیح تھا تو زندگی کی ڈور بھی ٹوٹنے والی تھی۔ اسے وہ رات یاد آئی، جب اغوا کنندگان نے اسے دور ویرانے کے کیبن میں محبوس کردیا تھا۔ لزا نے شیلف پر سے آئل اسکن پارسل اور اینڈریا نے ایمرجنسی سپلائی کا کین اٹھالیا۔ دونوں چلنے کے تیار تھیں۔ اینڈریا کے دل پر بوجھ تھا۔ اس نے بھیگی پلکوں سے پلٹ کر کال کو دیکھا۔ ''وہ ہوش میں آکر یہاں سے نکل جائے گا۔ وہ اتنا کمزور نہیں۔'' لزا نے بہن کو اطمینان دلایا۔
کلک......
گن لوڈ کرنے کی آواز آئی۔ اینڈریا کی سانس رک گئی۔ دروازے پر نگاہ پڑتے ہی وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی۔
''وہ ٹھیک ہے۔'' کونی مسکرائی۔ ''میں نے لزا کا وار دیکھا تھا...... لیکن وہ مر بھی سکتا ہے۔''
کونی دونوں ہاتھوں میں گن پکڑے اندر آگئی۔
''تو کُتے کو تم نے مارا تھا...... دوسرا کہاں ہے؟''
''دوسرے کا نام موک ہے شاید...... وہ لزا کی طرح چالاک ہے لیکن وہ بھی نہیں بچے گا۔ نہ لزا زندہ رہے گی۔'' کونی نے اطمینان سے کہا۔ اینڈریا نے بہن کو دیکھا۔ لزا کے چہرے سے خون نچڑ گیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔
اتنا بڑا دھوکا۔ اینڈریا کے خون میں اُبال آیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
''نہ...... نہ......'' دوسرا قدم بڑھایا تو سینے میں ٹرک کے ٹائر جتنا سوراخ ہوجائے گا۔'' کونی نے اجنبی لہجے میں کہا۔
''تم......'' لزا نے صرف ایک لفظ کہا۔ ایک لفظ میں، شناخت، نفرت، حقارت...... سب عیاں تھا۔
''اوہ، یا...... می۔'' کونی مسکرائی۔ ''میں ہی ہوں لیکن اس مرتبہ فتح حاصل کرنے آئی ہوں۔ کہاں ہے میگ؟''
''تمہیں میگ کا پتا بتانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگالوں۔'' لزا نے قہر آلود نظروں سے کونی کو گھورا۔
اینڈریا اُلجھن کا شکار ہوگئی۔ کونی تو انویسٹر تھی۔ بلاشبہ کونی نے اینڈریا سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کبھی لزا کو دیکھتی، کبھی کونی کو۔
''برائٹ لائٹ۔'' بمشکل اس نے ایک لفظ ادا کیا۔
لزا کے چہرے پر تحیر نمودار ہوا۔ ''برائٹ لائٹ کا انویسٹر سانٹونی تھا۔ اس کتیا کو سانٹونی کے ذریعے میگ کے بارے میں پتا چلا۔''
معاً اینڈریا کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اغوا کنندگان سے جان چھڑا کر جب وہ واپس آئی تو ڈیانا نے بار میں پارٹی دی تھی۔ وہاں کونی نے اپنے شوہر اسکاٹ سے تعارف کرایا تھا۔ اسکاٹ کی آنکھوں پر رنگ دار گلاسز تھے۔ اس کا حلیہ بھی وہی تھا جو ماں نے بتایا تھا۔ اینڈریا کے دماغ میں اس وقت چبھن ہوئی تھی لیکن فلنٹ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اسکاٹ کی شناخت کرتے کرتے رہ گئی۔ سانٹونی نے تمام تفصیلات بتا کر اسکاٹ کو اینڈریا اور لزا کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ تاہم اینڈریا ایک بات نہ سمجھ سکی کہ اگر کونی نہیں تھی تو پھر لزا اور تھامس کا انویسٹر کون تھا؟ اینڈریا نے یہ سوال کرڈالا۔
لزا نے زہریلی نظروں سے کونی کو دیکھا۔
''اس سوال کا جواب تو بہت آسان ہے۔'' کونی نے

کہا۔ ”کوئی بچہ بھی جواب دے سکتا ہے۔“

”ہاں، تم جیسا بچہ۔“ لزا کی آواز میں آگ تھی۔ ”تم جیسے بچے بڑے ہوکر بھی بچے ہی رہتے ہیں اور کوئی نیا آئیڈیا پروڈیوس کرنے سے معذور ہوتے ہیں...... ایسے بڑے بچے، چیٹنگ، رشوت اور قتل ہی کر سکتے ہیں...... ساتھی اسٹوڈنٹ کا قتل...... محض اس لیے کہ اس کا مقالہ چرا سکیں۔“

”کون پروا کرتا ہے؟ تھیسس لکھنے والا مر چکا ہے۔ تم بھی مرنے والی ہو۔ میگ کا پتا بتا دو تو شاید میں تمہاری جان بخشی کر دوں۔“ کونی نے سفاک لہجہ اختیار کیا۔

”دیر مت کرو۔ مجھے ختم کر دو۔“ لزا نے تھوک دیا۔ ”کون پروا کرتا ہے...... پروفیسر کُرو!“

”اوہ گاڈ...... تو...... تو......“ اینڈریا سر سے پیر تک ہل گئی۔ لزا کا دشمن نیا نہیں تھا۔ نہ وہ مرد تھا۔ دشمن یونیورسٹی کے زمانے کا تھا۔ جس پر لزا نے قتل کا الزام لگایا تھا۔

”تم میگ تک کبھی نہیں پہنچ سکتیں...... تمہارا چوہیا جیسا معذور ذہن اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ میگ کو کہاں ہونا چاہیے۔“ لزا نے بےخوفی سے مضحکہ اُڑایا۔ ”شان و شوکت اور مقبولیت کے تم صرف خواب دیکھ سکتی ہو۔ تم اکیلی اور گمنام حالت میں مرو گی۔“

شدتِ اشتعال سے کونی یا پروفیسر کُرو کے نقوش بگڑ گئے۔

اینڈریا اسے چھاپنے کے لیے بدن تول رہی تھی۔ وہ کونی سے بمشکل ایک گز دور تھی۔ وہ کسی بھوکی بلی کے مانند اچھلی تھی۔ تاہم وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ کونی ہوشیار تھی۔ اس کے پسٹل کا دستہ اینڈریا کے سر سے ٹکرایا اور وہ بے ڈھنگے انداز سے زمین پر گری۔ دھندلی نگاہ سے اس نے دیکھا کہ لزا چیختی ہوئی کونی پر جست لگا چکی تھی۔ اینڈریا نے چیخ کر بہن کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ آخری منظر جو اس نے دیکھا وہ کونی کا فائر تھا...... لزا گری اور پیٹ پکڑ کر دہری ہو گئی۔ اینڈریا نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تیز چکر آیا اور ذہن اندھیروں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

اینڈریا کو ہوش آیا تو اسے گھٹن کا احساس ہوا۔ کوئی چیز اس کے منہ سے گردن تک لپٹی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ سانس لینے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی۔ تاہم پھیپھڑے آزادانہ آکسیجن وصول نہیں کر رہے تھے۔

”زور مت لگاؤ۔“ کونی کی آواز آئی۔ ”اس طرح سانس لینے میں آسانی ہوگی۔“ اینڈریا نے گردن گھمانے کی کوشش کی تو ادراک ہوا کہ گردن میں رسی ہے۔ آہستہ آہستہ اسے اپنی بےبسی کا مکمل احساس ہوا۔ وہ فرش پر پڑی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ پیر بھی بندشوں میں جکڑے تھے۔ اس کے سر کے پیچھے دیوار قریب تھی۔ گردن سے لپٹی رسی دیوار میں کسی چیز سے بندھی تھی۔ منہ پر گردن تک تکیہ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

اینڈریا نے تڑپنا، مچلنا شروع کر دیا۔

”اینڈی، جیسے کہوں ویسے کرو۔“ لزا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”تمہارے سر پر تکیے کا غلاف ہے۔ جدوجہد کرو گی تو آکسیجن تیزی سے کم ہوگی۔“

اینڈریا نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ ”اسے میرے چہرے پر سے ہٹاؤ۔“

”میں ہٹا دوں گی، میگ کا پتا بتا دو۔“ کونی کی آواز سنائی دی۔

”ہنٹنگ لاج کے پاس دفن ہے۔“ اس نے ایک درخت کا حوالہ دیا۔

”ٹھیک جگہ بتاؤ۔“

”سامنے کی جانب کہیں دفن ہے...... میرا چہرہ آزاد کرو۔“

کونی کے قدموں کی آہٹ باہر چلی گئی۔

اینڈریا جدوجہد کر رہی تھی۔ سر کے اوپر بندھے ہوئے ہاتھ چھڑانے کے لیے بھی وہ زور لگا رہی تھی۔

”اینڈی، تمہارے ہاتھ دیوار میں نصب آہنی حلقے کے ساتھ بندھے ہیں۔ جتنے سکون سے رہو گی، آکسیجن اتنی ہی دیر تک ساتھ دے گی۔“ لزا کی آواز کرب و اذیت سے لڑکھڑا رہی تھی۔

”تمہیں گولی کہاں لگی ہے؟“ اینڈریا نے جدوجہد ترک کر کے سوال کیا۔

”پیٹ میں۔“

اینڈریا کا دل بیٹھ گیا۔

”اینڈی، سنو۔ مائیک فلنٹ میرا حقیقی انویسٹر تھا۔ یہ بات صرف تھامس جانتا تھا۔ فلنٹ کو اپنے کاروبار کے لیے میگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے نہیں پتا کال کے لیے تمہارے کیا جذبات تھے جب میں فلنٹ سے ملی تو کچھ کچھ مجھے احساس ہوا اور مجھے تمہاری جذباتیت کا احساس ہوا۔ سیفرون بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ تم کال اور مجھے معاف کر

دو......“ لزا کے کراہنے کی آواز آئی۔

”میلونی، جنگل کا باسی ہے۔ وہاں اسے شراب اور عورت میسر نہیں۔ اسی لیے میں نے اپنی شادی کا شوشہ چھوڑا ہوا تھا...... اور...... اور تھامس، فلنٹ کو لیب بکس دینا چاہتا تھا...... دنیا چھوڑنے سے پہلے وہ فلنٹ سے مل سکا یا نہیں......“

”ہاں اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ لیب ورک، ہنٹنگ لاج میں ہے۔“ اینڈریا نے بتایا۔

”فلنٹ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجھ سے اور میگ سے دور رہے۔“

”کال...... کال......“ اینڈریا نے آواز دی۔ ”اٹھو، ہماری مدد کرو...... کال......“

”دروازہ کھلا ہے؟“ اینڈریا نے لزا سے معلوم کیا۔

”ہاں۔“

”موک۔“ اینڈریا چیخی۔ ”موک، روسکو، کال...... ہیلپ اَس۔“ وہ متواتر چیختی رہی۔ دفعتاً نرم دبیز فر کا لمس محسوس ہوا۔

”موک؟“

جواباً کُتے کی آواز ابھری۔ اینڈریا کوشش کر رہی تھی کہ موک سمجھ جائے اور کم از کم اس کا چہرہ آزاد کر دے۔

پورچ میں آہٹ سنائی دی۔ اینڈریا نے موک کو حملے کے لیے ہشکارا۔ کُتے کی نرم آواز غراہٹ میں بدل گئی۔ کونی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے چیخ مار کر فائر جھونکا۔ کوئی ایسی آواز نہ آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ کونی کا فائر کارگر ہوا تھا۔

کونی نے ہانپتے ہوئے موک کو گالی دی۔ یقیناً موک وہاں سے نکل چکا تھا۔ شکار اور شکاری دونوں بچ گئے تھے۔ موک، ہوشیار کتا تھا، گن کی غیر موجودگی میں وہ بھی کونی کا... تیاپانچہ کیے بغیر وہاں سے نہ نکلتا۔

کونی قریب آئی اور اینڈریا کے چہرے سے غلاف اتار دیا۔ اینڈریا نے گہری گہری سانسیں لے کر لزا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ پیٹ پر لزا کے کپڑے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔

کونی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے پسٹل کی نال اینڈریا کے ہونٹوں پر رکھ دی اور زور لگایا۔ اس کا مقصد سمجھ کر اینڈریا نے دانت پر دانت جما لیے۔

”منہ کھول دے، گولی تو میں ویسے بھی مار دوں گی۔“

اینڈریا کا ایک ہونٹ خون آلود ہو گیا۔ کونی نے اس کی ناک چٹکی میں پکڑ کر سانس بند کر دی۔ بالآخر اینڈریا کو منہ کھولنا ہی پڑا۔ کونی نے پسٹل کی نال حلق تک اندر گھسیڑ دی، اینڈریا مچل اٹھی۔

لزا جانتی تھی کہ کونی بلف کر رہی ہے۔

”بہن کو بچانا ہے تو میگ کا پتا بتاؤ۔“ کونی ناگن کی طرح پھنکاری۔

”میں تو یہاں سے زندہ جاؤں گی نہیں، تو خود بک چکی ہے پھر میگ کے بارے میں بتانے کی منطق کیا ہے۔ شاید بتا دوں اگر تو اسے چھوڑ دے۔“ لزا نے جواب دیا۔

وہاں سکوت طاری ہو گیا۔ اینڈریا ساکت پڑی تھی۔ پسینا پیشانی پر پھوٹ پڑا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ لزا کسی طرح اینڈریا کو آزاد کرانا چاہتی ہے تاکہ وہ کال کے نیچے دبی گن حاصل کر لے۔

”نہیں۔“ بالآخر کونی نے جواب دیا۔

”پیاری اینڈی، جان سے پیاری اینڈی......“ لزا نے درد بھری نرم آواز میں کہا۔ ”اینڈی بازی زچ ہو گئی ہے۔ نہ اس کی، نہ میری...... یہ موٹی گائے عقل سے عاری ہے۔“ ...... لزا نے رک کر درد کی لہر کو دبایا۔ ”اینڈی آئی لو یو...... اینڈ آئی ایم سوری...... ریئلی سوری...... میں جو کہنے والی ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔“ لزا کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ”میں محبت کرتی ہوں...... حد سے زیادہ اور تم یہ جان چکی ہو......“ لزا خاموش ہو گئی۔ وہ پھر بولی تو اس کی آواز میں فولاد کی سختی اور چٹانی عزم چیخ رہا تھا۔

”شوٹ ہَر، پروفیسر کُرو، ناؤ شوٹ مائی سسٹر۔“

دل کا معاملہ ہے کوئی کیا جانے...... عشاق کا حوصلہ کوئی کیا جانے...... باایں ہمہ محرومی و پامالیٔ شوق...... تقدیر کا فیصلہ کوئی کیا جانے......

”شوٹ ناؤ!“

☆☆☆

کونی نے جھٹکے سے پسٹل باہر نکالا اور اینڈریا کا مسوڑھا زخمی ہو گیا۔ عین اسی وقت اینڈریا نے محسوس کیا کہ کال واضح طور پر سانس لے رہا ہے۔

”بہت عقل ہے تیری کھوپڑی میں...... بہت دلیر ہے تو؟“ کونی نے کینہ توز نظروں سے لزا کو گھورا۔

”یونیورسٹی سے نکلے کتنے سال ہو گئے...... تجھے اب بھی شک ہے؟“ عالم بدحالی میں بھی لزا نے مضحکہ اُڑایا۔ ”اب میری بہن کے ہاتھ بھی کھول دے تاکہ میں تجھے میگ کا پتا بتا دوں۔“

"نہیں، ابھی نہیں۔" یہ کہہ کر کونی غیر متوقع طور پر باہر نکل گئی۔

"اٹھو کال، اٹھو، جلدی کرو...... اٹھ جاؤ...... خدا کے لیے اٹھو۔" اینڈریا، کال کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہٹ سن کر وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ کونی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کونی کے ہاتھ میں جیری کین تھا۔ اینڈریا کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ پیٹرول کا کین تھا۔

کونی نے کین کھول کر الٹا کیا اور لزا پیٹرول میں نہا گئی۔

"اینڈی وعدہ کرو...... تم نہیں بتاؤ گی...... تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا۔" لزا سسک اٹھی۔ آنکھوں سے آنسو نہیں لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ چہرے پر خوفِ مرگ دور دور نہ تھا۔ اینڈریا کے اعصاب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ یہ کیسی آزمائش ہے، سزا ہے، امتحان ہے...... اتنا کڑا امتحان...... یہ تو جان لے لے گا۔ لزا کی تمام حسیات آنکھوں میں منتقل ہو چکی تھیں۔ آنکھوں میں التجا تھی، فریاد تھی، ایک ہی سوال تھا، ایک ہی آرزو تھی...... نہ بتانا...... اینڈی نہ بتانا...... یہ کیسا وعدہ ہے؟ جان مانگی ہوتی تو دے دیتی......

وہ کیسے وعدہ کرے۔ کیسی کشمکش ہے...... کشمکش بیم و رجا نے اینڈریا کے اعصاب کو لاکھوں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا۔ تابِ غم حد سے بڑھ گئی۔ آشفتگیٔ دل سے نڈھال وہ سانس روکے کھڑی تھی۔

"مت بتانا۔" یہ دل و جاں تجھ پر نثار۔

"لزا۔" ہر وعدۂ فردا کو حقیقت جانوں...... تلخابۂ زیست بھی گوارا کرلوں...... مگر یہ وعدہ کیسے کرلوں؟

"مت بتانا۔" لزا کی فریاد دل کی گہرائی سے نکلی۔

اینڈریا تڑپ اٹھی، کونی نے دیا سلائی سلگائی......

کوئی لمحہ جاتا تھا، اینڈری نے منہ کھولا۔ لزا کی آنکھوں میں اذیت کا سمندر سونامی بن کے اچھلا۔ "اینڈی، نہ بتا۔" اس نے سرگوشی کی۔

سلگتی دیا سلائی انگلیوں سے نکل رہی تھی۔ موک کی درندگی سے بھرپور غراہٹ گونجی، وہ اُڑتا ہوا اندر آیا تھا۔ کونی کی چیخ بلند ہوئی۔ دیا سلائی گری...... اس نے پسٹل سنبھالا۔ فائر ہوا...... موک، کونی سے ٹکرایا اور دھما کا سن کر پلٹ کر باہر نکل گیا۔ اس غیر متوقع حملے کی وجہ سے دیا سلائی پیٹرول میں بھیگی لزا سے دو فٹ دور گری...... خود کونی لزا پر گرتے گرتے بچی، پھر وہ بکتی بھونکتی کتے کے پیچھے گئی۔

کیبن کے اندر صورتِ حال حد درجہ نازک تھی۔ لزا جتنا دور ہو سکتی تھی، آگ سے دور ہو گئی۔ اینڈریا، کال کو آوازیں دے رہی تھی۔ اس مرتبہ اس نے واضح طور پر کال کا ہاتھ ہلتے دیکھ لیا تھا۔

کونی پھر اندر آئی۔ اس کا غصہ، اشتعال کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے دیا سلائی سلگائی۔ لزا کو دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ وہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ کونی سود و زیاں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

"بتاتی ہوں۔" اینڈریا نے لرزتی آواز میں بتایا کہ میگ کونی سے کتنے قریب ہے اور لیب بکس کہاں ہیں۔

لزا سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اینڈریا کا جگر خون ہو گیا۔

"کیا بکواس ہے؟" کونی کو یقین نہ آیا۔ اینڈریا خاموش تھی۔ سیلِ رواں اس کی آنکھوں سے بھی بہہ رہا تھا۔ کونی نے دونوں بہنوں کو دیکھا اور دیا سلائی بجھا کر لزا کے بیگ پر جھپٹی۔

ذرا سی دیر میں اس نے دیگر اشیا کے نیچے سے میگ برآمد کر لیا۔ اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ کونی پاگلوں کے مانند قہقہے لگا رہی تھی۔ فالتو چیزیں الگ کر کے اس نے بیگ میں رکھ کر مضبوطی سے باندھا اور فیتے بغلوں سے گزار کر بیگ پشت پر رکھ لیا۔ پھر دیا سلائی سلگائی۔ اینڈریا اور لزا کو کوئی شک نہیں تھا کہ خبث باطن کونی کیا کرنے جا رہی ہے۔ اینڈریا اس اثنا میں اکڑوں بیٹھ چکی تھی۔ اس کے سینے میں بھی جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی یہ ایک دشوار مرحلہ تھا۔ کیونکہ وہ کامیاب ہوئی، خود اسے پتا نہ تھا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کونی سے ٹکرائی...... بندھے ہاتھ پیروں سے وہ کیا کر سکتی تھی...... بس اتنا ہوا کہ جلتی دیا سلائی پھر لزا کو چھونے میں ناکام رہی۔

"موک...... موک......" وہ چلائی۔ کونی نے لڑکھڑا کر پسٹل سنبھالا اور اینڈریا کی جانب رخ کیا۔ عقب سے کُتّے کی غراہٹ سنائی دی۔ کونی گھومی اور بوکھلا کر فائر کر دیا۔ موک پھر بچ گیا اور کونی نے راہِ فرار اختیار کی۔ وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔

☆☆☆

اینڈریا چند ساعت کے لیے ٹراما کی کیفیت میں چلی گئی۔ کیبن کے حالات ایسے تھے کہ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ اینڈریا کا مضبوط بدن اور ناقابلِ شکست حوصلہ جلد ہی لوٹ آیا۔ اس نے لزا کو دیکھا، لیکن دھوئیں کا مرغولا حائل ہو گیا۔ "کال!" وہ چیخی، بائیں جانب چاروں ہاتھ پیروں پر اس نے کال کو رینگتے دیکھا۔ اس کے منہ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ کیا کال نے لزا کو بچا لیا ہے؟

"جلدی، کال جلدی کرو۔" آگ تیزی سے بھڑکنے لگی۔

کال کا سر ڈول رہا تھا۔ جیسے تیسے اس نے اینڈریا کی بندشیں کاٹ ڈالیں۔ اینڈریا اچھلی اور جھکی جھکی دروازے کی جانب گئی۔ کال ساتھ نہیں تھا۔ اینڈریا نے مڑ کے دیکھا۔ وہ وہیں پر لیٹا تھا۔ آگ اور دھوئیں نے اس کی سنبھلتی ہوئی حالت کو پھر ابتر کر دیا تھا۔ اس کے جوتوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اینڈریا نے اپنے پارکا کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر آگ سے بچتی بچاتی، سنک تک پہنچی۔

اس نے نلکے پورے کھول کر چھوڑ دیے۔ کپڑے کا ٹکڑا تربہ تر کر کے اس نے اپنا لباس بھی گیلا کر لیا۔ سنک کے پاس اسے تولیا بھی مل گیا۔ اسے بھی بھگو کر وہ واپس پلٹی۔

اس نے گیلے کپڑے کال کے پیروں اور ٹانگوں پر لپیٹ دیے۔ کال کا ایک ہاتھ پکڑ کر اس نے زور لگایا اور اپنی گردن میں حمائل کر دیا۔

"ہمت کرو، چلو...... جلدی کرو۔"

کال لڑکھڑاتی چال کے ساتھ، اینڈریا کے سہارے رینگ رہا تھا۔ دونوں کے ناک اور حلق میں دھواں گھس رہا تھا۔ چاروں طرف شعلے بھڑک رہے تھے۔

کال نے لڑکھڑا کر ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دیا۔

"انشورنس ایجنٹ، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔" اینڈریا نے سانس روک کر زور لگایا۔ اس کے پھیپھڑے جل رہے تھے۔

گرتے پڑتے وہ دونوں کیبن سے محفوظ فاصلے پر آ کر برف پر لیٹ گئے۔

کیبن اچانک آگ کے بڑے سے گولے میں تبدیل ہو گیا۔ دھوئیں کا کالا بادل آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ اینڈریا نے اتنے فاصلے پر برف کی موجودگی میں حدت محسوس کی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ فاصلے پر لزا نظر آئی، جہاں کال نے اسے کیبن سے نکال کر چھوڑا تھا۔ لزا کے قریب موک بیٹھا تھا۔ کتا بھی اداس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کسی حیوانی حس نے بتا دیا تھا کہ مالکان مصیبت میں ہیں۔

وہ اٹھ کر لزا کی طرف بھاگی۔ آگ، دھواں اور گولی نے لزا کی حالت نازک کر دی تھی۔ وہ اپنے حوصلے کے بل پر ہوش میں تھی۔

اینڈریا گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "لزا نہیں مر سکتی۔" اینڈریا رو پڑی۔

"اینڈی۔" لزا نے کمزور آواز میں کہا۔

"ہم سب ٹھیک ہو جائیں گے۔" اینڈریا نے لرزتی آواز میں کہا۔

"میں لاج میں جا کر ریڈیو پر پیغام دیتی ہوں...... وہاں سے برفانی گاڑی بھی مل جائے گی۔" اینڈریا نے کہا۔

"رکو۔" لزا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "پہلے ایک اور کام کرنا ہے۔"

"لزا وقت نہیں ہے، ہمیں اسپتال جانا ہے۔"

"پلیز...... کونی کو روک لو......"

"لزا، وقت نہیں ہے۔" اینڈریا کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

"بہت وقت ہے...... تم کونی کو روک لو تو تمہاری بہن زندہ رہے گی۔" لزا کو بات کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ "وہ تھامس کا خواب تھا۔ ہمارا خواب تھا...... دنیا کو میگ کی ضرورت ہے۔ میگ دنیا کی فلاح کے لیے ہے......" لزا کھانسنے لگی۔

اینڈریا نے اسے سہارا دیا۔ "حرکت مت کرو لٹل ماسٹر۔"

"میگ میری جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ میگ دنیا میں ہر کسی کے کام آئے گا۔"

"مم...... میں...... تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔" اینڈریا بلک اٹھی......

"تمہیں اسے روکنا ہے۔" لزا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"میں نہیں کر سکتی۔" اینڈریا پسینے میں نہا گئی۔

"میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔" لزا نے آنکھیں موند لیں۔ "کبھی بھی نہیں...... تم سے نفرت کروں گی...... ہمیشہ نفرت کرتی رہوں گی۔"

"نہیں۔" اینڈریا کو لگا کہ دماغ کی نسیں چٹخ جائیں گی۔

"ٹھیک ہے روک لوں گی اس حرافہ کو۔" اینڈریا کی آواز میں آگ ہی آگ تھی۔ لزا نے آنکھیں کھول دیں۔

"میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کیا؟" لزا نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میرے واپس آنے تک زندہ رہنا، پھر

اسپتال......"

"منظور۔"

اینڈریا نے اپنے فالتو کپڑے پھاڑ کر اس کے زخم میں بھرے کمر کے گرد چوڑی پٹی لپیٹی، دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ نگاہیں روح میں اتر رہی جارہی تھیں۔ اینڈریا نے جھک کر لزا کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

کال کی حالت اینڈریا کے اندازے سے زیادہ خراب تھی۔ تاہم مرد ہونے کے ناتے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ کونی کے پیچھے روانہ ہونے سے پہلے دونوں نے مل کر احتیاط سے لزا کو لاج میں منتقل کیا۔ وہاں کال نے بہ آسانی ضروری ادویات بھی ڈھونڈ لی تھیں۔ لزا کی جانب سے اینڈریا نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ لیکن دوسری جانب مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ لاج میں موجود ریڈیوز، کونی جاتے جاتے ناکارہ کرگئی تھی۔

"فکر مت کرو۔" کال نے اسے حوصلہ دیا۔ "تمہارا دیا ہوا نوٹ، بگ جو نے میرے حوالے کردیا تھا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ خیال نہ رکھ سکا کہ کونی میرے پیچھے ہے۔ بہرحال احتیاطاً بگ جو سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر ہم مقررہ مدت میں واپس نہ آئیں تو وہ فوراً میڈیکل ٹیم کے ساتھ روانہ ہوجائے۔

اینڈریا کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات ابھرے۔ تاہم وہ سوچ رہی تھی کہ لزا کتنی دیر وقت نکال سکے گی۔ کئی باتیں لزا کے حق میں چلی گئی تھیں۔ اول وہ جلنے سے بچ گئی تھی، دوم لاج میں تھی، الٹی سیدھی مرہم پٹی کے ساتھ دوائیاں بھی مل گئی تھیں۔ چہارم بگ جو کی آمد کے امکانات بھی تھے۔ لیکن خود اینڈریا کو سب سے زیادہ بھروسا جس چیز پر تھا وہ خود لزا کے وعدے پر تھا۔ لزا اوپر سے جتنی نازک اور حسین نظر آتی تھی۔ اندر سے اتنی ہی مضبوط اور باحوصلہ تھی۔ یعنی گیند اینڈریا کے کورٹ میں تھی۔ اب اسے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا۔

اینڈریا نے گھڑی دیکھی۔ 8:43 اس نے اسکارف، ہیٹ، گلوز اور اسنو سوٹ کے ساتھ ایمرجنسی پیک رکھا۔ کال نے راستے سے متعلق ضروری نشانیاں اینڈریا کو ذہن نشین کرادی تھیں۔ چاکلیٹ، خشک پھل، نقشہ، چاقو اور موم بتیاں اکٹھی کرنے کے بعد کچھ سوچ کر اس نے کال کی گن بھی مستعار لے لی۔

"گڈ لک۔" کال نے کہا۔

"تھینکس۔" اینڈریا نے اس کا زخمی ہاتھ دھیرے سے دبایا۔

☆☆☆

دو میل بڑھنے کے بعد اینڈریا کو احساس ہوا کہ موک بھی پیچھے آرہا ہے۔ موک چھوٹے سے دھبے کے مانند عقب میں نظر آرہا تھا۔ وقت بچانے کے لیے اس نے نقشے کے مطابق شارٹ کٹ لیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اینڈریا نے ماحول کا جائزہ لیا۔ افق پر سیاہ بادل مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے، ہوا تیز تھی۔ لگتا تھا، اس کا دل کسی نے فریزر میں جما دیا ہے۔ کونی ایسے علاقوں میں استعمال ہونے والی مخصوص ڈبل کیبن جیپ میں تھی۔ طوفان کے آثار واضح ہوتے جارہے تھے۔ کل تک وہ خوف زدہ تھی۔ تاہم آج وہ پُراعتماد تھی کہ ایسے حالات کو اپنے حق میں کیسے استعمال کرے گی۔

بالآخر وہ جمے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ منجمد دریا کے نقش و نگار کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے برف کی مضبوطی کو جانچا۔ اسے کال کی بات یاد آئی کہ اس موسم میں دریا کی یہ حالت سات ٹن وزنی ٹرک کو سنبھال سکتی ہے۔ اینڈریا نے مشین منجمد دریا میں اتار دی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی، اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا۔

کونی کی جیپ کو جنوب کی سمت میں ہونا چاہیے تھا۔ اینڈریا نے آنکھیں سکیڑ کر گھورا لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دریا پار کرنے میں اسے دس منٹ لگے تھے۔ وہ کچھ وقت مزید بچانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب پہاڑی پر جاکر جنگل سے گزرنے کے بجائے اس نے بغور نقشہ نکال کر دیکھا۔ تاہم اس کا پہاڑی پر جانا ناگزیر تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر اس نے مشین ڈھلوان پر چڑھا دی۔ خطرہ مول لیتے ہوئے اینڈریا نے رفتار بڑھا دی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے اطراف میں قوتِ بصارت کو آزمایا۔ چھوٹا سا گرے رنگ کا دھبا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ موک تھا۔ کونی کی گاڑی کی جھلک بھی نظر نہیں آئی۔ معاً کوئی شے ہلتی نظر آئی اور اینڈریا کے اعصاب تن گئے۔ وہ شے دریا کے متوازی حرکت کررہی تھی۔ کون ہے؟ کونی یا موک؟ حجم بتا رہا تھا کہ وہ کونی تھی۔ اینڈریا کو یقین نہیں آیا کہ وہ کونی سے آگے کیونکر آگئی تھی۔

کامیابی کے احساس نے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ اس نے ایک آسان زاویہ منتخب کرکے واپس پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ رفتار تیز تھی۔ کئی جگہ برفانی

گاڑی بے قابو ہوچلی تھی۔ اینڈریا نے خود کو سمجھایا اور رفتار معتدل کردی۔ راستے بدل بدل کر وہ اس انداز میں نیچے پہنچی کہ منجمد دریا پر کونی سے آگے تھی۔

اینڈریا نے مڑ کر دیکھا۔ کونی تقریباً ایک میل پیچھے تھی۔ اینڈریا پہاڑی کی اوٹ میں دریا کنارے برج کی طرف مشین بھگا رہی تھی۔ برج کے قریب، اینڈریا نے ایسے مقام پر مشین کو بند کیا کہ وہاں پہنچنے پر کونی آخری سیکنڈ میں ہی مشین کو دیکھ پاتی۔ چابیاں، اینڈریا نے جیب میں رکھیں اور تیزی سے بھاگ دوڑ کر شاخیں اکٹھی کرکے مشین پر ڈال دیں۔

اس مقام پر جمے ہوئے دریا کی سطح کمزور تھی۔ کہیں کہیں یخ پانی بھی نظر آرہا تھا۔ کونی کی گاڑی کی آواز اینڈریا کی سماعت کو چھونے لگی۔ اس نے دیوانہ وار چھپنے کے لیے جگہ تلاش کی۔ دیر ہوگئی تھی۔ وہ درختوں میں نہیں جا سکتی تھی۔ اس طرح وہ کونی کی نظر میں آجاتی۔ وہ دریا کے کنارے پڑے ہوئے وزنی درخت کے تنے کی آڑ میں لیٹ گئی۔

جیپ تیز رفتاری سے سر پر پہنچ گئی تھی۔ بڑے نازک لمحات تھے۔ اینڈریا سامنے آکر ونڈ شیلڈ کو نشانہ بناتی تو خود بھی زد میں آسکتی تھی۔ تمام خدشات کو بالائے طاق رکھ کر اس نے فیصلہ کرلیا۔

کونی کی جیپ زن سے گزری اور اینڈریا گن دونوں ہاتھوں میں سنبھالتی ہوئی اچھل کر باہر آئی۔ دونوں ٹانگیں پھیلا کر اس نے ہاتھ سیدھے کیے اور پے در پے کئی گولیاں چلائیں۔ اسے نہیں پتا کہ کون سی گولی نشانے پر لگی...... تاہم ونڈ شیلڈ چکنا چور ہوگیا۔ جیپ دائیں بائیں لہرائی اور سیدھی دریا کی سمت گئی۔ اینڈریا فائر کرتے ہی دوڑ پڑی تھی۔ اس نے ہراساں نظروں سے جیپ کو دریا کی سمت بڑھتے دیکھا۔

کونی ناگہانی افتاد سے حواس باختہ ہوچکی تھی اور بھاری گاڑی کو سنبھالنے کے لیے اسٹیئرنگ کے ساتھ زور آزمائی کررہی تھی۔ اس کی گردن پر خراش سے خون بہہ رہا تھا۔

طوفانی بادلوں کی یلغار روشنی کا گلا گھونٹنے میں مصروف تھی۔ اینڈریا نے دیکھا کہ جیپ مدہوش رقاص کے مانند جھومتی ہوئی دریا کے کنارے سے ٹکرائی۔ عقبی پہیے خلا میں لٹک گئے، اینڈریا قریب پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیونگ سائڈ کا شیشہ پھسلتا ہوا نیچے گیا اور کونی کا خوف زدہ چہرہ نمودار ہوا۔ جیپ کے وزنی انجن نے عقبی رخ سے جیپ کو گرنے سے روکا ہوا تھا۔ بہرحال صورتِ حال خطرناک تھی۔ کونی یا پروفیسر گرو اب تک اینڈریا کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ وہ احتیاط سے دروازہ کھول کر سلوموشن میں جیپ سے باہر آگئی۔

معاً اس کی نظر ہتھیار بدست اینڈریا پر پڑی۔ تاثرات نے حیرت اور غصے کا اظہار کیا۔

"ہاتھ اٹھا کر ادھر پتھر پر بیٹھ جاؤ۔" اینڈریا نے نفرت سے حکم صادر کیا۔

"بھسم ہونا پسند نہیں تھا...... اس لیے یہاں دریا میں جم کے مرنے چلی آئیں۔" کونی کا جواب غیر متوقع تھا۔

ردِعمل میں اینڈریا نے اس کے قدموں کے قریب فائر کیا۔ برف اُڑی...... دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا تھا۔ اینڈریا، کونی کی تیزی سے اٹھتی ہوئی ٹانگ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ کونی کو ایک بزدل اور سست عورت خیال کرتی تھی۔ اسے وہ منظر بھی یاد تھا جب کونی کی موجودگی میں اسے اغوا کیا جارہا تھا...... یقیناً کونی اس سازش کا حصہ تھی۔

اینڈریا نے حتی الامکان سرعت سے اندازاً اس کی ہوا میں لپکتی ٹانگ پر فائر کیا۔ کلک...... گن خالی تھی۔ اسے ٹھیک یاد نہیں تھا کہ جیپ کے ونڈ شیلڈ پر اس نے کتنی گولیاں برسائی تھیں۔ کچھ بھی تھا گن خالی تھی۔ کلک کی آواز کے ساتھ ہی کونی کی ٹانگ اینڈریا کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ گن ہاتھ سے نکل گئی، کونی بھی جان گئی تھی کہ گن بیکار ہوچکی ہے۔

اینڈریا کے انگ انگ میں بجلیاں سرایت کرگئیں۔ کونی کو اپنی گن نکالنے کا موقع دینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اینڈریا کی زوردار فلائنگ کک کونی کے سینے پر پڑی اور وہ چیخ مارتی ہوئی الٹ کر گری۔ کونی کے ابتدائی اعتماد میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ وہ اغوا کے وقت بھی اینڈریا کی مردوں کے ساتھ دیوانہ وار کشمکش دیکھ چکی تھی۔ کونی کی ترجیح تھی کہ وہ گن نکال لے۔

اینڈریا نے بروقت اسے دبوچ لیا۔ دونوں جنگلی بلیوں کے مانند گتھم گتھا ہوگئیں۔ عجیب منظر تھا۔ کونی کو احساس ہوگیا تھا کہ ہتھیار کے بغیر وہ اینڈریا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اطراف سے بے نیاز دونوں یہاں وہاں لڑھک رہی تھیں۔

وہ پتھر تھا یا برف کا ٹکڑا...... کونی کو اس سے غرض نہیں تھی۔ اس کی قسمت یاوری کرگئی۔ بلا تامل وہ ٹھوس ٹکڑا ہاتھ آتے ہی اسے اینڈریا کے سر پر بجایا۔ آسمان پر تیرتے سیاہ بادل گویا اینڈریا کے دماغ میں اتر آئے۔ سر کے ایک جانب سے خون پھوٹ پڑا۔ اینڈریا نے سر جھٹک کر نظر کے

سامنے تنی ہوئی سیاہ چادر کا پردہ چاک کیا اور دھندلی آنکھوں سے بدفطرت کونی کو دیکھا، جو اپنی گن نکال چکی تھی۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ تاہم صورتِ حال قابو میں آتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اینڈریا کی جانب اس نے مردانہ قسم کی گالی لڑھکائی۔ اینڈریا کی نظر پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔ مایوسی کا زہریلا سانپ اس کے ذہن میں سرسرایا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ دونوں جس مقام پر بلیوں کی طرح الجھی تھیں۔ اب وہاں نہیں تھیں۔ اگرچہ عجیب زاویے سے اٹکی ہوئی کونی کی جیپ اب بھی جیسے انگلی پر ٹنگی تھی۔ کونی فتح کے نشے میں سرشار، اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ وہ عین دریا کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جہاں کنارہ نہ صرف شکستہ تھا بلکہ جما ہوا دریا، کنارے سے بمشکل ایک فٹ نیچے رہ گیا تھا۔ اس کا ٹھوس انجماد واضح طور پر مشکوک تھا۔ منجمد حالت نے دریا کی سطح کو یکساں نہیں رہنے دیا تھا۔

کونی نے قہقہہ بلند کیا۔ جواب میں اینڈریا طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نے کونی کو الجھن میں ڈال دیا۔

''خواب دیکھ رہی ہو، اب بھی؟''

''خواب نہیں حقیقت......'' اینڈریا نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''چھوڑنا مت موک!'' اینڈریا کا اشارہ کونی کی پشت کی جانب تھا۔ اس کی آواز میں واضح دھمکی پوشیدہ تھی۔

کونی ''موک'' کا نام سن کر ہڑبڑا کر پلٹی، لڑکھڑائی...... ایک پیر پھسلا...... عقب میں کوئی نہیں تھا۔ تاہم وہ سنبھل نہ سکی اور پشت کے بل دریا میں گری لیکن گرتے گرتے اس نے فائر جھونک مارا تھا۔ گولی نامعلوم سمت پرواز کر گئی۔ اینڈریا نے خود کو گرا دیا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اضطراری طور پر یہی خیال آیا کہ پتھروں کے ذریعے چاند ماری کی جائے۔

اسی اثنا میں اس نے کونی کو مغلظات بکتے ہوئے اٹھتے دیکھا۔ آسمان میں بجلی کڑکی، لمحہ بھر کے لیے تیز روشنی پھیل گئی۔ اینڈریا زمین سے چپک گئی۔ کونی نے گن سیدھی کی۔ دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ اینڈریا نے سر اٹھایا۔ کونی کا قد کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گر کے جہاں کھڑی ہوئی...... وہاں سے برف چیخ رہی تھی اور سرد پانی ابل رہا تھا۔ کونی پانی میں جا رہی تھی۔ اس نے گن پھینک کر جان بچانے کی کوشش کی اور لیٹ کر ہاتھ پیر پھیلا لیے۔ اس طرح وزن منقسم ہو گیا اور اس کے ڈوبنے کی رفتار تھم گئی۔ تاہم وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اطراف میں جابجا پانی پھوٹنا شروع ہو گیا تھا۔

''اینڈریا، مجھے بچا لو...... سب کچھ تم لے لو...... پلیز میری جان بچاؤ......'' اس کی لرزتی ہوئی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔

اینڈریا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سرد نظروں سے کونی کو گھورتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرد پانی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ آناً فاناً وہ برف کے مجسمے میں ڈھل چکی تھی۔ یہ مجسمہ ہلکورے لیتا برف کی پتلی تہ کے نیچے محوِ سفر ہو گیا۔ اینڈریا برف کی تہ کے نیچے اس کے نیلے چہرے اور کھلی آنکھوں کو دیکھتی چلی گئی۔ آگے برف کی تہ پھر دبیز ہونے لگی اور برفانی مجسمہ نظر آنا بند ہو گیا۔ ''ولفل سسٹر، میں نے وعدہ پورا کر دیا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

اینڈریا کو معاً شدید تھکن اور ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ سرد ہوائیں، نیم اندھیرا، حدِ نگاہ پانچ چھ فٹ تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ سرد ہواؤں کے باعث سر سے خون زیادہ نہیں بہہ پایا تھا۔ کونی کے دلخراش انجام پر اسے ماشہ بھر قلق محسوس نہیں ہوا تھا۔

اینڈریا کو جیپ اور مشین تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اندازے سے برفانی مشین کی جانب گئی۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ جیپ میں موجود اشیا زیادہ اہم تھیں، جن کے باعث یہ جان لیوا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ کئی لوگ جس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اینڈریا نے خدشہ محسوس کیا کہ موسم کے تیور مزید بگڑے تو کونی کی لٹکتی ہوئی جیپ کسی بھی وقت دریا میں جا گرے گی۔

وہ محتاط انداز میں دھیمی چال سے جیپ تک پہنچ گئی۔ ہواؤں کا رخ جانچ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب سے جیپ میں داخل ہوئی۔ میگ اور لیب ورک پسنجر سیٹ پر تھے۔ میگ اب بھی لزا کے رک سیک میں تھا۔ اینڈریا پوری طرح جیپ میں نہیں گھسی تھی بلکہ اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے، جیپ سے باہر تھیں۔ رک سیک اور لیب بکس قابو کر کے وہ الٹی رینگتی ہوئی باہر آ گئی۔

اینڈریا نے گھڑی دیکھی۔ لیک اتیج جانا ممکن نہیں تھا۔ اس موسم میں وہاں جانے میں بہت وقت صرف ہو جاتا۔ اسے سیدھا لزا کے پاس جانا چاہیے۔ اوقات کار اشارہ کر رہے تھے کہ بگ جو، ریسکیو کے لیے روانہ ہو چکا ہو گا۔ یعنی واضح طور پر اینڈریا کو جلد از جلد واپس ہننگ لاج

پہنچنا چاہیے تھا۔

خراب موسم کے باعث پیدا ہونے والی دھند اور تاریکی نے اسے مضطرب کر دیا۔ سب سے پہلے وہ برفانی مشین تک پہنچی۔ رخ بدل کر مشین اسٹارٹ کی اور تمام بتیاں روشن کر دیں۔ آسمان کی طرف دیکھا اور چابی گھما کر انجن خاموش کر دیا۔ بہرحال موک کی رہنمائی اس کی مشکل کو آسان کر دیتی۔

''موک...... موک...... ک...... ک......'' دونوں ہاتھوں سے منہ پر بھونپو بنا کر اس نے چلّانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کا گلا بیٹھ گیا۔ مایوسی نے شعور کی سطح پر دستک دی اور اسی وقت موک کی مخصوص غراہٹ سنائی دی۔

''تھینک یو، گاڈ۔''

☆☆☆
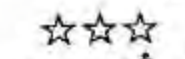
برفانی مشین کی روشنی میں اینڈریا نے فلنٹ کی لاج کے قریب گہما گہمی دیکھ لی...... وہ مشین روکتے روکتے کود پڑی...... سب سے پہلے اس کی نظر فلنٹ پر پڑی۔ وہ بلاارادہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ جیسے وہ ڈوبنے سے بچنا چاہ رہی ہو۔ اینڈریا نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی کہانی سنائی۔ پھر سوال کیا۔

''لزا......'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں سوال مکمل نہ کر سکی۔

''وہ ٹھیک ہے۔'' فلنٹ نے اینڈریا کا سر سہلایا۔ وہ اسے لزا کے قریب لے گیا۔ اینڈریا نے لاج کے باہر ایک ہیلی کاپٹر اور سیسنا ائرکرافٹ دیکھ لیا تھا۔ کال اور اس کے باپ پر بھی اس کی نگاہ گئی۔ ڈیمار کو بھی حاضر تھی۔

فلنٹ اور اینڈریا کی تمام توجہ لزا پر مرکوز تھی۔

''ہائے، سسٹر۔'' اینڈریا نے نرمی سے کہا۔ ''میں ہوں اور مائیک بھی...... کچھ مت بولنا۔''

لزا، تمام کی تمام روئی اور پٹیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف انگلیوں کی پوریں نظر آ رہی تھیں۔

''میں تمہارے لیے کچھ لے کر آئی ہوں۔'' اینڈریا نے میگ کو ایک جانب سے لزا کی پوروں سے مس کیا۔

''مم، مجھے...... یقین...... ن...... تھا۔'' لزا بمشکل بولی۔

''تم خاموش رہو۔ میں نے وعدہ پورا کر دیا۔ کونی کو بھی روک دیا۔ یہ اور بات کہ وہ خود اپنے ہاتھوں ماری گئی۔''

بعدازاں ائرکرافٹ کے ذریعے لزا کو فیئر بنک اسپتال منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

جولیا میکال، لزا، اینڈریا اور فلنٹ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ خوش گپیوں کے ساتھ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ برف، آگ اور خون کا بھیانک خواب اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ الاسکا سے نکلنے کے باوجود کونی کا تیسرا شوہر اسکاٹ گرفتار ہو چکا تھا۔ لزا نے میک، ڈیانا اور ٹیسا کو بھی مدعو کیا تھا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر والٹر وہاں موجود تھا جس نے اینڈریا کو اغوا شدہ مقام سے اپنے گاؤں پہنچایا تھا۔ مزید دو شخصیات میں سارجنٹ پیکاٹی اور ڈیمار کو شامل تھے۔

اگر کوئی نہیں تھا تو وہ تھا کال پیکاٹی؟ اینڈریا حیران پریشان تھی کہ کال وہاں کیوں نہیں ہے؟

اس نے کئی بار سوالیہ نگاہ لزا پر ڈالی، لیکن وہ آنکھ چرا گئی۔

ڈائننگ روم سے نکل کر وہ گارڈن میں آ گئے۔ یہ وسیع قطعۂ اراضی تھا جس کے اختتام پر چھوٹے جہاز کے اترنے کے لیے لینڈنگ پٹی موجود تھی۔ میک کا وہاں مزید رکنے کا ارادہ نہ تھا، وہ اپنی مصروفیت بتا کر اور شکریے کے الفاظ کے ساتھ ٹیک آف کر گیا۔

اینڈریا کی آنکھوں میں سوال کے بجائے اب شکوہ نظر آ رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟ بغیر اجازت گھسا چلا آ رہا ہے؟'' لزا نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔

اینڈریا نے سر ہلاتے ہوئے فضا میں دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے ائرکرافٹ نے لینڈنگ پٹی کو چھو لیا۔

''وہ کسی مشکل میں ہوگا۔'' اینڈریا نے اظہارِ خیال کیا۔

لزا نے معنی خیز نظروں سے بہن کو دیکھا اور کہا۔

''ہاں، شاید اسے کوئی تکلیف ہے۔''

''تکلیف؟ کون ہے وہ؟''

''کال...... کال پیکاٹی۔''

''لزا...... لزا کی بچی......'' وہاں موجود افراد کو نظرانداز کر کے وہ لزا پر جھپٹی...... دونوں بچپن کی طرح گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ فضا میں فلک شگاف قہقہے گونج رہے تھے۔

کال، ائرکرافٹ سے نکل کر سبزہ زار کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ موک بھی تھا۔ اینڈریا کی نظر اس پر تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ لزا اور دوسرے افراد وہاں سے کھسک چکے ہیں۔

''ہے، بوائے۔'' کال ایک گھٹنے پر بیٹھ کر موک کی گردن سہلانے لگا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو وہ ہم سے بات کرنے آئے گی؟'' کال، اینڈریا پر نظر مار کر پھر موک سے باتیں

کرنے لگا۔

''وہ گڈبائے کہے بغیر چلی گئی تھی۔'' کال نے کہا۔

''سوری۔'' اینڈریا نے نظریں چرائیں۔

''میں باقاعدہ خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ پروپرلی۔'' اینڈریا نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں دوبارہ تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے بارے میں میرے احساسات کیا ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے احساسات میرے بارے میں کیا ہیں...... شاید میں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔'' اس نے چند قدم اور بڑھائے اور اینڈریا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اینڈریا کی آنکھیں بند ہوگئیں...... بہت نازک سا بوسہ تھا۔ کال پیچھے ہٹ گیا۔ وہ لرز اٹھی۔

''گڈبائے، اینڈی۔''

اینڈریا پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر اسے ائرکرافٹ کی طرف جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ میری شکست چاہتا ہے یا کوئی امتحان باقی ہے؟ ''کیسے کٹے گی زندگی تیرے خیال کے بغیر؟'' لیکن وہ یہ سوال نہ کرسکی۔ ایک قدم بڑھایا اور تھم گئی۔ لمحے ابھی شمار میں ہیں دل تیرے انتظار میں ہے...... وہ جہاز کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ذرا سی بات ہے روک لینا...... ذرا سی بات بھی کب اپنے اختیار میں ہے...... نہ چھوڑا اپنے مریضوں کو، کوئی شوق کا مارا ابھی قطار میں ہے۔ وحشت نہیں...... قرار نہیں...... انتظار ہے...... مگر خود پر اختیار نہیں۔ اینڈریا نے پھر ایک قدم بڑھایا۔

کال ائرکرافٹ میں داخل ہوگیا۔ اینڈریا کے لب وا ہوئے، کوئی آواز نہ نکلی۔

''موک...... موک......'' کال نے آواز لگائی۔

موک درمیان میں پھنسا تھا۔ کبھی دائیں دیکھتا،، کبھی بائیں...... پھر یک دم دوڑ کر اچھلا اور کال کی گود میں چلا گیا۔ شاید اینڈریا کی غیر موجودگی میں کال نے اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا تھا۔

سیسنا کا انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ سینے میں دل گویا پھڑپھڑا اٹھا۔ کال پری فلائٹ چیکنگ میں مصروف تھا اور اینڈریا کو گومگو کی کیفیت نے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ پھر ائرکرافٹ حرکت پذیر ہوا۔ کیا ہار گئی میں ہر بازی...... کیا نہیں خبر تجھے کہ کیسے ہاری...... کال نے آخری بار اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور سیسنا نے گھومنا شروع کیا۔

جسم وجان میں طوفان اٹھا، کوئی شے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئی...... بندھن ٹوٹے...... ضبط ہار گیا اور وہ دوڑ پڑی۔

''کال...... کال......''

''اوہ گاڈ، وہ مجھے سن لے، مجھے دیکھ لے۔'' اینڈریا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ سیسنا نے زمین چھوڑ دی۔

''رک جاؤ، کال...... رک جاؤ......'' کال نے آخری سیکنڈ میں اینڈریا کو دیکھا، مسکرا کے ہاتھ ہلایا پھر مشینی پرندہ تیزی سے غائب ہوتا چلا گیا۔

اینڈریا جہاں تھی، وہیں بیٹھ گئی۔

اینڈریا بوجھل دل کے ساتھ بمشکل اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑی ہوئی۔ ایک بار آسمان کی جانب بھیگی نگاہ ڈالی اور جیسے عالمِ بے خودی میں اندرونِ خانہ پلٹ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن کسی سے بات کیے بغیر وہ سیدھی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ دوسرے دن لزا اس کی خواب گاہ میں آئی۔ ''کیا بات ہے، اینڈی؟''

''کچھ نہیں...... آؤ بیٹھ جاؤ۔'' اینڈریا خود پر قابو پانے کی جدوجہد کررہی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی، اور وہ کھل گیا۔ جولیا میکال اندر آگئی۔

''فون ہے؟'' ماں نے اطلاع دی۔

''میرا؟'' لزا نے سوال کیا۔

''نہیں، اینڈی کا۔''

''کہاں سے؟'' اینڈریا نے سوال کیا۔

''الاسکا۔''

''الاسکا؟'' اینڈریا نے حیرت سے سوال کیا، کون ہو سکتا ہے۔ جولیا باہر نکل گئی تھی۔ اینڈریا بھی اٹھ گئی۔

''ہیلو۔'' اس نے ریسیور اٹھایا۔

''میرے ائرکرافٹ کے پیچھے بھاگنے کا ایک ہی مطلب میری سمجھ میں آیا ہے کہ تم اگلے ہفتے میرے اور موک کے ساتھ ڈنر کرنا چاہتی ہو؟''

الفاظ تھے گویا امرت تھے...... جو اس کے دل میں اترتے چلے گئے اور چہرے پر گلابوں کی سی سرخی پھیلتی چلی گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں تازگی کی ایک لطیف سی لہر سرایت کرگئی ہو۔ اس کے ایک ایک لفظ سے اپنائیت جھلک رہی تھی...... ایسی اپنائیت جس کے لیے وہ ہمیشہ سے ترستی رہی تھی۔ سنے ہوئے الفاظ کا مفہوم واضح ہوتے ہی اس کے رخسار تمتما اٹھے اور اس نے خاموش ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

گرانڈ فادر کلاک

سلیم انور

منصوبہ بندی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس کا ہر داؤ بہت بروقت ہے... مگر لمحوں کا معمولی سا الٹ پھیر پوری بازی کو پلٹ دیتا ہے...

چیزوں کی ترتیب سے مجرم کے سراغ تک کا ڈرامائی کلائمکس...

اس وسیع وعریض لیونگ روم کی آرائش سے امارت کا اظہار ہورہا تھا۔ لیکن سام کسلر کی لاش کے گرد... منڈلاتے ہوئے ہومی سائڈ کے عملے نے اس تاثر کو بری طرح زائل کردیا تھا۔

''لگتا ہے کہ آلۂ قتل آتشدان کے انگارے کریدنے والی آہنی سلاخ ہے، کوئی۔'' میرے پارٹنر سراغ رساں ڈیپی ڈیٹن نے کہا۔ ''اور قتل کا جواز یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے شیشے کے دروازے والے ایک بک شیلف کی جانب اشارہ

کیا جس کے دروازے پر لگا ہوا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تالا زبردستی توڑا گیا ہے۔ دروازے کا شیشہ ٹوٹ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا اور بک شیلف کے چار میں سے دو شیلف بالکل خالی پڑے تھے۔

میں ماربل کے فرش پر بکھری ہوئی شیشے کی کرچیوں سے قدم بچاتا ہوا بک شیلف کے نزدیک چلا آیا۔

بک شیلف کے برابر میں قدیم لکڑی کے بنے ہوئے عمودی خانے میں موجود گرانڈ فادر کلاک نے آٹھ کا گجر بجایا تو میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ آج جمعرات کا دن تھا اور مجھے یہ ایک طویل دن محسوس ہو رہا تھا۔ ”شاید اس کی منگیتر کو معلوم ہوگا کہ اس شیلف کے ان طاقوں میں کیا رکھا ہوا تھا؟“ میں نے اپنے پارٹنر سے کہا۔

ہم سام کسلر کی منگیتر کو ایک سپاہی کی نگرانی میں کچن میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ گہرے بھورے رنگ کے بالوں والی ایک دلکش عورت تھی جس کی عمر تیس برس سے کچھ اوپر رہی ہوگی۔ وہ عمر میں سام کسلر سے کئی سال چھوٹی تھی۔ اس کا نام ایلین مورگن تھا اور بیس منٹ قبل سام کسلر کی لاش اسی نے دریافت کی تھی۔

”سام کے سکوں کا ذخیرہ ان طاقوں میں رکھا ہوا تھا۔“ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا۔ ”مجھے سکوں کے بارے میں معلومات نہیں لیکن سام کا کہنا تھا وہ خاصے قیمتی اور نادر نوعیت کے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ مسٹر کسلر یہاں تنہا رہتے تھے۔“ میں نے اپنے اندازے سے کہا۔ ”لیکن یہ جگہ جس طرح صاف ستھری ہے اور ترتیب میں دکھائی دے رہی ہے تو مجھے یقین ہے کہ انہیں کسی کی خدمات حاصل رہی ہوں گی۔“

ایلین مورگن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”سام نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور باہر کے گھریلو کام کاج کے لیے ایک آدمی بھی موجود تھا جسے آج ہی اس نے ملازمت سے برخاست کر دیا تھا۔“

”ملازمت سے برخاست کر دیا تھا؟“ ڈینی نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، وہ آدمی...... وہ گرانڈ فادر کلاک آج صبح ہی لے کر آیا تھا اور پھر...... اس نے زبردستی میرا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کی بے حد گھٹیا حرکت تھی۔“ یہ کہتے ہوئے ایلین نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنے رخسار پر بہتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔

”اس آدمی کا نام، پتا اور فون نمبر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کا نام ہف کیسل ہے اور اس کا پتا اور فون نمبر اس ایڈریس بک میں موجود ہونا چاہیے جو ریفریجریٹر کے برابر کی دراز میں رکھی ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دراز کی جانب بڑھ گئی۔ ابھی وہ دراز ٹٹول رہی تھی کہ مکان کے سامنے کے حصے سے کسی کے رونے کی آواز آنے لگی۔

ڈینی اور میں اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔

”لگتا ہے کہ وہ ایلما دی ایکٹریس ہے۔“ ایلین مورگن نے کہا۔

”یہ کون ہے؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”سام کی بیٹی۔ خود کو ایکٹریس کہتی ہے لیکن کبھی کہیں کام کرتی نظر نہیں آتی۔ سام کے بیٹے گریگ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اس جہاں کا سست ترین آدمی ہے۔ مجھے قطعی حیرانی نہیں ہوگی اگر ان میں سے کسی ایک نے بے چارے سام کو قتل کیا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی جب گزشتہ اتوار کو سام نے ہماری شادی کے منصوبے کا اعلان کیا تھا اور پھر وہ دونوں اشتعال میں آگئے تھے جب سام نے ان سے کہا کہ اب وہ آئندہ انہیں کوئی رقم نہیں دے گا۔“

یہ سن کر میری اور ڈینی کی نظریں بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب اٹھ گئیں۔ مشتبہ افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

”ڈینی۔“ میں نے اپنے پارٹنر سے کہا۔ ”تم مس ایلین مورگن کے پاس ٹھہرو اور اس سے ہف کیسل کا پتا اور فون نمبر لے لو۔ میں سام کی بیٹی سے بات کرتا ہوں۔“

میں نے ایلما کسلر کو لیونگ روم میں موجود پایا۔ وہ اپنے باپ کی لاش کے نزدیک ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ گرو ورنامی ایک باوردی پولیس افسر نے ایلما کا ایک بازو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ پولیس افسر بولا۔ ”سوری، ڈیٹکٹو، یہ عورت مجھے اور آفیسر ریوز کو جل دے کر کسی طرح اندر آگھسی تھی۔“

”وہ کہاں ہے؟“ ایلما کسلر نے میری جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کون کہاں ہے، میڈم؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے باپ کی قاتل! ایلین مورگن!“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک آواز

نے مجھے تیزی سے گھومنے پر مجبور کر دیا۔

ایلین مورگن کچن سے نکل کر تیزی سے ایلما کی جانب لپک رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور ڈینی نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

”اوہ، اسے مت روکو۔“ ایلما چلّانے لگی۔ ”میں اسے ہینڈل کر سکتی ہوں۔ میں......“

”تم اپنے جذبات کو قابو میں رکھو اور خاموش رہو۔“ میں نے غراتے ہوئے ایلما سے کہا۔

”لیکن اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے! میں جب آج صبح یہاں آئی تھی تو میں نے اسے گیراج میں ہف کیسل کے ساتھ ہیجانی انداز میں بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”میں اس کے ساتھ بوس و کنار نہیں کر رہی تھی۔“ ایلین نے چیختے ہوئے صفائی پیش کی۔ ”اس وحشی نے مجھے پکڑ لیا تھا۔“

”ہوں!“ ایلما نے حقارت سے کہا۔ ”جب وہ گرانڈ فادر کلاک کو کھینچ کر اندر لا رہا تھا تو میں نے تمہاری نظریں بھانپ لی تھیں کہ تم کن ستائشی نگاہوں سے اس کے کسرتی جسم اور اس کے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔“

اتنے میں آفیسر ریوز دروازے میں آیا اور مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا۔

”ایک آدمی جو خود کو مردہ شخص کا بیٹا کہہ رہا ہے، باہر موجود ہے۔“ اس نے مجھے بتایا۔

”اسے وہیں روکو، ہم آرہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

پھر میں واپس اندر آگیا۔ میں نے آفیسر گرو ور سے کہا کہ وہ دونوں خواتین کو کچن میں لے جائے۔ ساتھ ہی ان خواتین کو تنبیہ کی۔ ”اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی گڑبڑ کی تو میں اور میرا پارٹنر اس کے ساتھ نہایت سختی کے ساتھ پیش آئیں گے۔“

جب ہم بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے تو میرے پارٹنر ڈینی نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“

”مقتول کا بیٹا باہر آیا ہوا ہے۔“

ڈینی کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکل گئی۔ ”ملزم نمبر چار!“

”ہاں۔“ میں نے اس کی تائید میں کہا۔

جب ہم بیرونی دروازے پر پہنچے تو میں نے ڈینی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے ہف کیسل کا پتا اور فون نمبر لے لیا؟“

آمر

کہتے ہیں ایک جنرل اپنی حجامت کے بارے میں بہت وہمی تھے۔ ایک ہی حجام سے بال کٹواتے تھے۔ مارشل لا لگانے کے بعد بھی انہوں نے اپنے پرانے حجام کو پاس بلالیا۔ کچھ سال گزر گئے تو بال کاٹتے وقت حجام نے عجیب و غریب گفتگو کرنا شروع کر دی۔ کبھی کہتا۔ ”جناب! آپ الیکشن کب کروا رہے ہیں؟“ کبھی پوچھتا۔ ”جناب! عوام سڑکوں پر کیوں نکل رہے ہیں؟“ کبھی سوال کرتا۔ ”جناب! آپ مارشل لا کب ختم کریں گے؟“ ایک دو دفعہ تو جنرل نے ہوں، ہاں کر کے جواب دیا مگر جب حجام کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ حجام ضرور کسی سیاسی پارٹی کا ایجنٹ ہے۔ حجام کو گرفتار کرا دیا گیا۔ خوب مار پیٹ کے بعد اسے پھر جنرل کے سامنے لایا گیا تو جنرل نے پوچھا۔ ”ہاں! اب بتاؤ تم کس سیاسی پارٹی کے ایجنٹ ہو؟“

حجام نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”جناب میری دس پشتوں میں کسی نے سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ میں کسی سیاسی پارٹی کا ایجنٹ کیوں بنوں گا؟“

جنرل نے پوچھا۔ ”تو پھر تم بال کاٹتے وقت عوام، سیاست، الیکشن اور جمہوریت کی باتیں کیوں کرتے ہو؟“

حجام نے کہا۔ ”وہ اس لیے جناب! میں عوام اور جمہوریت کا نام لیتا ہوں تو فوراً آپ کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں، مجھے کاٹنے میں آسانی رہتی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دکھاتے ہوئے کہا جس پر ہف کیسل کا پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

ہم باہر آئے تو لمبے چکنے بالوں والے گریگ کسلر کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے لانبے بالوں کی ایک لٹ اپنی آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ماجرا ہے؟ میرے والد کہاں ہیں؟“

”وہ مر چکے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مر چکے ہیں، کیسے؟“

”کسی نے آتشدان کی آہنی سلاخ سے ان کی کھوپڑی پر ضرب لگا کر انہیں قتل کر دیا ہے اور وہ ان کے سکوں کے ذخیرے کو بھی چرا کر لے گیا ہے۔“

”سکوں کا ذخیرہ؟ اوہ ہاں! وہی جو گرانڈ فادر کلاک کے برابر میں موجود شیشے کے کیس میں رکھے ہوئے تھے۔“ وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حرکت اسی کی ہوگی۔“

”اسی کی؟“ ڈینی نے کہا۔ ”تمہارا مطلب تمہاری

بہن سے ہے؟"

"یقیناً نہیں۔" گریگ نے بے ساختہ کہا۔ "میرا اشارہ مردوں کو آسامی بنا کر رقم اینٹھنے والی اس عورت ایلین مورگن کی جانب ہے۔"

"تم نے اپنے باپ سے آخری بار ملاقات کب کی تھی؟" میں نے گریگ کسلر نے پوچھا۔

"اوں، میں اتوار کے روز یہاں آیا تھا جب انہوں نے ایلین کے ساتھ اپنی منگنی کا اعلان کیا تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اس اعلان پر کسی اچھے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"میں کیوں کرتا؟ وہ عمر کے لحاظ سے میرے باپ سے تقریباً نصف عمر کی ہے۔" گریگ کسلر نے کہا۔ "اور وہ صرف اس کی دولت کے پیچھے ہے۔"

"اور میں نے سنا ہے کہ تم دونوں بہن بھائی بھی اس کی دولت کے پیچھے ہو۔" میرے پارٹنر ڈینی نے کہا۔

اس بات پر گریگ کا چہرہ تمتما گیا۔

"کیا تم ہف کیسل کو جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کون؟ اوہ، تمہاری مراد اس لمبے چوڑے شخص سے ہے جو میرے ڈیڈی کے گھریلو امور کے باہر کے کام کاج کیا کرتا تھا؟ نہیں، حقیقت میں، میں اس سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ میری اس سے صرف ایک دو مرتبہ ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کیوں؟ کیا وہ کسی طرح اس معاملے میں ملوث ہو سکتا ہے؟ کیا تمہارے خیال میں وہ......"

اتنے میں بیرونی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور میڈیکل ایگزامنر اور اس کا عملہ سام کسلر کی لاش اور اپنے سازوسامان کے ساتھ باہر نکلتے دکھائی دیے۔ ایلین مورگن، ایلما کسلر اور آفیسر گرودر اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔

"یہ عورتیں گھر سے باہر آنا چاہتی تھیں۔" آفیسر گرودر نے .... مجھ سے کہا۔ "کیا تم لوگ انہیں مزید پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے......" میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے ڈینی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ہم دونوں اس گروپ سے کئی فٹ کے فاصلے پر دور چلے گئے۔

"کیا بات ہے، کونی؟" ڈینی نے پوچھا۔

"میں کسی ایک کو پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

یہ سن کر ڈینی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ "پھر تو صرف بیٹا ہی باقی رہ جاتا ہے۔ ہاں اگر تمہاری مراد ہف کیسل کو تفتیش کے لیے اٹھانے کے لیے ہے تو یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ملازمت سے برطرفی اس کے اشتعال کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ وجہ بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن میں اس بارے میں پُریقین ہوں کہ یہ جرم سام کسلر کے بیٹے نے کیا ہے۔ یاد ہے کہ اس نے کیا کہا تھا جب میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کے سکوں کا ذخیرہ چرا لیا گیا ہے؟"

"یقیناً یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شرط لگا سکتا ہے کہ قاتل ایلین مورگن ہے۔"

"ہاں، لیکن اس کے علاوہ اور کیا کہا تھا؟"

"اور کیا کہا تھا؟" ڈینی نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔ "تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میرا مطلب ہے اس نے سکوں کے ذخیرے اور مکان میں ان کی لوکیشن کے بارے میں کیا کہا تھا؟"

"ہوں، کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا۔ ہاں کچھ ایسا کہا تھا، اوہ، تمہارا مطلب سکوں کے اس ذخیرے سے ہے جو گرانڈ فادر کلاک کے برابر میں موجود شیشے کے شیلف میں رکھے ہوئے تھے۔" ڈینی نے یہ کہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ "تو پھر کیا ہوا؟ یہ بات اسے خطاوار تو نہیں ٹھہراتی۔"

"لیکن یہی بات اسے مجرم ٹھہرا رہی ہے، ڈینی۔ گریگ نے کہا تھا کہ وہ گزشتہ اتوار کے بعد سے اس گھر میں نہیں آیا تھا۔ تو پھر اسے یہ کیونکر علم تھا کہ گرانڈ فادر کلاک اس شیشے کے شیلف کے برابر رکھا ہوا تھا جس میں سکوں کا ذخیرہ موجود تھا...... جبکہ گرانڈ فادر کلاک آج صبح جمعرات کو یہاں لایا گیا تھا؟"

ڈینی نے یہ سن کر تیوریاں چڑھا لیں، ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اپنی ہتھکڑیاں نکال لیں۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ یقیناً آج اس گھر میں آیا تھا۔"

ہم نے گریگ کسلر کو قتل کے شبہے میں گرفتار کر لیا۔ بعد کی تحقیقات میں بک شیلف کے دروازے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی ایک کرچی اس کے ایک جوتے کے تلے میں سے اور چوری کیے ہوئے سکے اس کے اپارٹمنٹ سے بازیافت ہو گئے۔ بالآخر گریگ کسلر کو اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑ گیا۔

لب شناس

ارشد بیگ

شاعر فرما گئے کہ گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے... مگر یہاں مجرم کے ہاتھوں میں دم بھی ہے... خم بھی ہے... لہجے بولتے ہیں اور لبوں کی جنبش سے مفہوم بھانپ لینے والے لب شناس مجرم کو کھوج ہی لیتے ہیں...

شاطرانہ چال چلنے والے اور شاطروں کا پیچھا کرنے والے سراغرساں کا ٹکراؤ...

"تمہارے لیے ایک دلچسپ کیس لایا ہوں، باس۔" سارجنٹ کونرائے نے لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ سے کہا۔

"کیا کیس ہے؟"

"ایک گواہ ہے جو گزشتہ روز ایک پارک میں تھا اور اُس نے ایک قتل ہوتے دیکھا۔ وہ جتنی جلد ہو سکتا تھا، ہمارے پاس آ گیا اور اس نے اس واردات کی رپورٹ کر دی۔ ہم نے اس کی رپورٹ کے مطابق چیک کیا اور ہمیں لاش مل گئی۔"

"جب وہ قتل ہو رہا تھا تو اس وقت اس نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟" لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے پوچھا۔

"وہ اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ بہرا ہے۔"

"اوہ۔"

"وہ صرف اشاروں کی زبان میں اظہار کر سکتا ہے اور ہمیں ایسے کسی شخص کی ضرورت ہے جو اس کے اشاروں کی زبان سمجھ سکتا ہو۔ البتہ اسے لب شناسی آتی ہے اور وہ ہونٹوں کی جنبش سے بات سمجھ لیتا ہے۔" سارجنٹ کونرائے نے بتایا۔

"اس کی کہانی کیا ہے؟" لیفٹیننٹ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ پارک میں سے گزر رہا تھا اور شارٹ کٹ کے لیے اس نے جھاڑیوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ اس سے قبل کہ وہ کھلے حصے میں پہنچتا، اس نے ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے دو آدمیوں کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ ان سے اس حد تک قریب تھا کہ ان کے لبوں کی جنبش سے مفہوم سمجھ سکتا تھا۔

"ان میں سے ایک آدمی دوسرے آدمی کے سینے میں اپنی انگلی چبھو رہا تھا اور اَپ سیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، مجھے کل تک رقم چاہیے ورنہ تمہاری فیملی میں سے کوئی ناخوش گوار حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔

"جس شخص کے سینے میں وہ انگلی چبھو رہا تھا، وہ مزید کچھ وقت کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن پہلے شخص نے اسے مہلت دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ تب دوسرے آدمی نے ایک چاقو نکالا اور پہلے شخص کے سینے میں کئی وار کیے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔"

"کیا ہمارے گواہ نے حملہ آور کا بہ خوبی جائزہ لے لیا تھا؟" لیفٹیننٹ نے جاننا چاہا۔

"نہیں، حملہ آور نے ایک ہُڈ پہنا ہوا تھا اور سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ رات کا وقت تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے پہچان لے کہ وہ کون ہے۔ لیکن ہمارے گواہ کا کہنا ہے کہ اس کا اسپینش لہجہ نمایاں تھا۔"

"مقتول کون ہے؟"

"بگ بینی بارتھیلو۔"

"بینی دی بکی؟"

سارجنٹ کونزائے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے اس بارے میں کوئی پیش رفت کی؟"

"ہاں، ہم اس کے ٹھکانے پر گئے تھے اور اس کا ریکارڈ لے آئے ہیں۔ اس کے تین اسپینش کلائنٹس ہیں۔"

"انہیں پکڑ لاؤ۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"ہم تم سے ایک قدم آگے ہیں، باس۔" سارجنٹ نے کہا۔ "وہ تینوں کمرا نمبر چار میں موجود ہیں۔"

لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے ان تینوں کو کمرا نمبر چار میں ایک میز کے گرد موجود پایا۔

لیفٹیننٹ نے سارجنٹ کی دی ہوئی فہرست نکالی اور ان تینوں سے مخاطب ہوا۔ "کارلوس ویگا؟"

مونچھوں والے ایک پستہ قد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم بگ بینی بارتھیلو کے مقروض تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں، اس ماہ گھڑ دوڑ میں قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔" کارلوس ویگا نے کہا۔ اس کا اسپینش لہجہ نمایاں تھا۔ "میں نے اس ماہ کے آخر تک اس کا قرض لوٹانے کی مہلت لے لی ہے۔"

"تھامس ڈیگو؟" میں نے کہا۔

ایک لحیم شحیم شخص نے اپنا ہاتھ اوپر کر دیا۔

"اس میں لکھا ہے کہ تم بگ بینی بارتھیلو کے چند ہزار ڈالرز کے مقروض ہو؟"

تھامس ڈیگو نے شانے اُچکا دیے۔ "یہ کوئی بڑی ڈیل نہیں ہے۔ میں یہ رقم واپس جیت لوں گا۔ میں نے فٹ بال کی جن ٹیموں کو چنا ہے، وہ آج کل مقابل ٹیموں کو شکست دینے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ لیکن حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں اپنی منتخب کردہ ٹیموں کی جانب سے پُرامید ہوں۔"

اس شخص کا تلفظ کارلوس ویگا کے مانند نہیں تھا۔

"اور تم رکارڈو گومیز ہو۔" لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے آخری آدمی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری داستان کیا ہے؟"

رکارڈو گومیز مسکرا دیا۔ اس کا سنہری دانت چمکنے لگا۔

"میں نے چند باکسنگ میچوں پر رقم لگائی تھی۔ میں ان کے بارے میں یقینی طور پر پُرامید تھا۔ لیکن میرے خیال میں وہ پہلے سے طے شدہ میچز تھے۔"

کارلوس ویگا کی طرح رکارڈو گومیز کا تلفظ بھی بھاری تھا۔

"اوکے، تم سب اس وقت خود کو بری سمجھو...... کم از کم بگ بینی بارتھیلو کے معاملے میں۔" لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے کہا۔ "اسے گزشتہ شب چاقو گھونپ کر مار دیا گیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ رات دس بجے کے لگ بھگ تم سب کہاں تھے؟"

وہ تینوں یہ سن کر حیرت زدہ دکھائی دینے لگے۔

"میں گھر پر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔" کارلوس ویگا نے بتایا۔ "میری بیوی اور بچے کوئی اینی میٹڈ فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے۔"

"میں بوڈیگا بار میں تھا۔" تھامس ڈیگو نے کہا۔ "میں وہاں عقبی کمرے میں بڑی اسکرین کے ٹی وی پر فٹ بال کا گیم دیکھ رہا تھا۔"

"اور میں اپنی گرل فرینڈ کے گھر پر تھا۔" رکارڈو گومیز نے کہا۔ "لیکن کیا تم یہ بات میری بیوی سے راز میں رکھو گے؟"

لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے شانے اُچکا دیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"کیا میں اپنے گواہ کو لے آؤں تاکہ وہ ان میں سے کسی ایک کو بطور قاتل شناخت کر سکے؟" سارجنٹ کونزائے نے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے میں جانتا ہوں کہ بینی دی بکی کو کس نے قتل کیا ہے۔" لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے جواب دیا۔

سارجنٹ کونزائے یہ سن کر چونک پڑا۔ "تو پھر قاتل کون ہے؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"جو شخص اس جرم کا چشم دید گواہ ہے وہ لب شناس تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی شخص چاہے وہ لب شناسی کے معاملے میں کتنا ہی مہارت کا حامل کیوں نہ ہو، یہ ہرگز نہیں بتا سکتا کہ کسی کے تلفظ کی ادائی کا انداز کیا ہے...... مطلب یہ کہ اس کا لہجہ انگریزی ہے یا امریکن، فرانسیسی ہے یا اطالوی، عربی ہے یا اسپینش۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا!"

سارجنٹ کونزائے ششدر رہ گیا۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا گواہ خود بینی دی بکی کے کلائنٹس میں سے ایک تھا اور اسی نے بگ بینی کو قتل کیا ہے۔ پھر خود کو اس الزام سے بری الذمہ قرار دینے کی خاطر اس نے اسپینش لہجے والے قاتل کی کہانی گھڑی تھی۔" لیفٹیننٹ وینٹ ورتھ نے کہا۔ "اب جاؤ اور اس لب شناس گواہ کو حراست میں لے لو۔"

◆◆◆

انوکھی واردات

جمال دستی

کچھ جگہیں اپنے ماحول اور جغرافیہ کے لحاظ سے پُراسرار مشہور ہو جاتی ہیں... اور بعض علاقے... قصبے عجیب نوعیت کی وارداتوں سے شہرت حاصل کر لیتے ہیں... ایک ایسے ہی علاقے سے تعلق رکھنے والی کہانی کے پراسرار پیچ و خم... وہاں لوگ آئے اور ان کے جانے کے بعد واقعات کی بازگشت لوگوں کے ذہنوں میں گونجتی رہتی... نہ ختم ہونے والے سلسلے کی کڑیاں جرم اور مجرم کی گتھیاں سلجھ ہی نہ سکیں...

انوکھے انداز میں وارداتیں کرنے والے ذہین شخص کی کارگزاری۔

اس کہانی کی ابتدا اس طرح ہوئی جب لوئیس فاکس نامی شخص نے موسم گرما گزارنے کے لیے وارنرز پوائنٹ پر واقع ٹمکر کا مکان کرائے پر لیا، دیکھا جائے تو وہ مکان ایک شخص کے لیے بہت بڑا تھا لیکن ہوم ٹمکر کے وارثوں نے اکلوتے شخص کو یہ مکان کرائے پر دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جسے اس کے آباؤ اجداد نے انیس سو تیس میں بڑے چاؤ سے تعمیر کروایا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ وال اسٹریٹ پر کاروبار کرتے ہوئے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اب یہی مکان ان کے وارثوں کے لیے آمدنی کا واحد ذریعہ رہ گیا تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں یہاں سیاحوں کی آمدورفت بڑھ جاتی اور ہر ہفتے نئے کرائے دار اپنی رہائش کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہوتے تھے۔ اس لیے مالک مکان نے یہی مناسب سمجھا کہ چھٹیوں پر آنے والے طالب علموں کو ایک ہفتے کے لیے مکان دینے سے بہتر ہے کہ اس میں کوئی شخص پورا موسم گرما گزارے۔ ویسے بھی یہ طالب علم سمجھتے تھے کہ انہیں مادر پدر آزادی مل گئی ہے۔ وہ ہنگامہ خیز پارٹیاں کرتے اور رات بھر اودھم مچاتے رہتے۔ گھر کا کوڑا کرکٹ قریبی میدان میں پھینک دیتے اور ان کی وجہ سے علاقے کے مستقل مکینوں کا سکون غارت ہو جاتا جبکہ لوئیس فاکس کے آجانے سے ٹکر کے وارثوں نے سکون کا سانس لیا۔ البتہ اس نے پراپرٹی ایجنٹ سے شرماتے ہوئے درخواست کی کہ کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر اس کے پس منظر کے بارے میں چھان بین نہ کی جائے جس کے عوض وہ کرائے میں مزید دس فیصد اضافہ کر سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ پراپرٹی ایجنٹ اسے کوئی جواب دیتا اور بتاتا کہ قانون کے تحت اس کے ماضی کے بارے میں جاننا کیوں ضروری ہے، مالکِ مکان نے لوئیس سے کرائے کی مد میں نقد رقم وصول کر کے اسے گھر کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

”اب تم سے لیبر ڈے کے بعد ملاقات ہوگی۔“

لوئیس نے گردن ہلائی اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ میرا وعدہ ہے کہ جب مکان خالی کروں گا تو یہ تمہیں بہترین حالت میں ملے گا۔“

کچھ دن تک معاملات پُرسکون انداز میں چلتے رہے اور لوئیس کی معمول کی آمدورفت کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی نیلے رنگ کی فورڈ اسکارٹ کار تھی جس میں بیٹھ کر وہ ہارڈ ویئر کی دکان یا منی مارٹ تک جاتا۔ البتہ وہ کبھی پوسٹ آفس یا ٹاؤن ہال نہیں گیا۔ وہ ورزش کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور اسے اکثر واکر جھیل کے گرد چکر کھاتی کچی سڑک پر دوڑتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ ریاست کی کئی جھیلوں سے زیادہ بڑی تھی۔ پوٹر روڈ پر رہنے والی ایک ویٹرس پولی ڈینشن کا کہنا تھا کہ لوئیس دیکھنے میں تیس اور چالیس کے درمیان لگتا تھا جبکہ کائل ٹکر کے خیال میں وہ پچپن اور ساٹھ کے بیچ بیچ تھا۔ کائل نے ہی اسے ٹکر ہاؤس کی چابیاں دی تھیں۔

لیکن سب اس بات پر متفق تھے کہ اسے سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھنا ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ وہ عام طور پر سیاہ نیکر، موزے اور جاگرز پہنے ہوئے ہوتا۔ اس کے علاوہ جسم پر کوئی اور کپڑا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور سر کے بال سیاہ رنگے ہوئے تھے جبکہ ٹانگوں اور پیٹ پر زخم کے نشانات بڑے واضح تھے۔ وہ کبھی کسی خاص راستے پر نہیں دوڑتا تھا۔ کبھی وہ پوٹر روڈ کے کنارے بنے ہوئے بڑے گھروں اور کاٹیجز کے سامنے سے گزرتا تو کبھی پرتھ ہاربر روڈ کے اطراف میں واقع تنگ اور کچی گلیوں میں چلا جاتا جہاں خستہ حال کاٹیجز اور موبائل ہومز تھے جو گزشتہ تیس سال سے اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔

اسے کشتی رانی کا بھی شوق تھا۔ وہ اکثر جھیل کے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی کشتی میں دور تک چلا جاتا اور بڑی مہارت کے ساتھ جھیل کی سطح میں دھنسے ہوئے بڑے بڑے پتھروں اور درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنوں سے کشتی کو بچاتا ہوا آگے نکل جاتا۔ اس کے گلے میں ایک دوربین لٹکی ہوئی ہوتی تھی اور اسے کئی مرتبہ جھیل میں تیرتی ہوئی مرغابیوں پر نظر مارتے دیکھا گیا۔

اس کے معمولات سے واقف ہو جانے کے باوجود قصبے کے لوگوں کو یہ تجسس ضرور تھا کہ وہ کون ہے۔ یہاں کیوں آیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ بلیئر مکینن نامی ایک میٹر ریڈر نے بتایا کہ ایک روز جب اس کا ٹکر ہاؤس کے پاس سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ لوئیس عقبی صحن میں بیٹھا بڑے انہماک سے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی لکھاری ہے جبکہ ٹریسی کین جس کی بیٹی کم گھر گھر جا کر بیکری کا سامان فروخت کیا کرتی تھی۔ اس نے واکر ڈائنر میں بیٹھے گاہکوں کو بتایا کہ لوئیس غالباً کوئی مصور ہے کیونکہ اسے جھیل کے کنارے ایک بڑے سے ایزل پر لکیریں کھینچتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

غرض یہ کہ وہ کوئی مصور تھا یا اسکول ٹیچر یا لکھاری جو گرمی کی چھٹیاں گزارنے یہاں آیا ہو لیکن شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ بڑی تیزی سے قصبے کے لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ شاید یہ اس کی پُرکشش اور سحر انگیز شخصیت کا کرشمہ تھا ورنہ اس قصبے کے لوگوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ان کا پڑوسی گزر اوقات کے لیے کیا کام کرتا ہے اور اگر کوئی شخص یہاں آنے کے بعد اپنا بیشتر وقت گھر میں گزارے تو یہ اس کا اپنا معاملہ ہے۔ ماضی میں بھی ایسے کئی لوگ یہاں آتے رہے جن میں ایک نام کرٹ ڈنسن کا ہے جو بیس سال پہلے اس قصبے میں آیا تھا لیکن شاید ہی کسی

نے اسے گھر سے باہر آتے دیکھا ہو۔ یہاں تک کہ وہ ٹاؤن میٹنگ میں بھی شریک نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ایک مثال ڈونا گارڈنر کی ہے جس کے پاس اکیس بلیاں تھیں اور وہ انہی میں مگن رہا کرتی تھی۔ ایک اور دلچسپ شخصیت بلی وارن کی تھی جس نے کبھی اپنے سر کے بال کٹوائے اور نہ ہی شیو بنوائی لیکن یہ سب ان کے ذاتی معاملات تھے اور کسی کو اس سے غرض نہ تھی۔

اپنے کام سے کام رکھنا اس قصبے والوں کا پہلا اصول تھا۔ البتہ گپ شپ کرنے کی آزادی تھی اور بعض اوقات اس کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی۔ میموریل ڈے کے اختتام پر لوئیس نے کچھ ایسا کام دکھایا جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ اصل بات تو کوئی نہیں جانتا لیکن جو کچھ معلوم ہوا، اس کے مطابق اس واقعے کا تعلق لوئیس کے پڑوسی زیک جورڈن سے تھا۔ یہ پوری کہانی پام ہیلر نے بتائی جو مس واکر ڈائنر میں کام کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔ ”ایک دن زیک میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ باہر سے آئے ہوئے کالج کے ایک گروپ کے لڑکے اپنی کشتی کھاڑی میں باندھ کر اس میں سوار ہو جاتے اور سارا دن اودھم مچاتے ہیں۔ موسیقی کا شور، اونچی آواز میں چلانا، جھیل میں چھلانگیں لگانا، ان سب کی وجہ سے اس کی بیوی میرین کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ ویسے بھی یہ غالباً ان کا یہاں پر آخری موسم گرما ہے۔ زیک اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا چنانچہ وہ اپنی چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر ان کے پاس گیا اور کہا کہ وہ اپنی کشتی وہاں سے ہٹا لیں کیونکہ اس شور شرابے سے اس کی بیمار بیوی کے آرام میں خلل پڑ رہا ہے لیکن ان لڑکوں نے نہ صرف اس کا مذاق اڑایا بلکہ اس پر جملے بھی کسے اور بے چارہ زیک آنسو بہاتا واپس آگیا۔

پھر کیا ہوا؟ یہ وہ سوال تھا جو لوگ بار بار پوچھ رہے تھے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ہیلر نے کہا۔ ”کسی طرح لوئیس کو یہ بات معلوم ہو گئی اور ایک دن وہ اپنی کشتی چلاتا ہوا ان لڑکوں کے پاس گیا اور نہ جانے کیا بات کی کہ وہ اپنی کشتی وہاں سے لے گئے۔ میرے خیال میں اس نے انہیں کوئی خطرناک دھمکی دی ہوگی۔“

لوئیس نے ان لڑکوں سے کیا کہا؟ اس بارے میں متضاد باتیں سننے میں آتی رہیں۔ کیرن شیلڈن کا کہنا تھا۔ ”سنا ہے کہ لوئیس نے ان لڑکوں کو خوفناک نتائج کی دھمکی دی اور کہا کہ اس وقت کشتی پر ان کی تعداد سات ہے اور اگر وہ فوری طور پر یہاں سے نہیں گئے تو بعد میں صرف چھ ہی اپنے گھر جا سکیں گے۔“ جتنے منہ اتنی باتیں۔ پیٹ مولی گن نے انکشاف کیا کہ لوئیس اپنے ساتھ ایک چھوٹا کولر لے گیا تھا۔ اس نے ان لڑکوں سے کہا کہ اگر وہ یہاں سے نہ گئے تو ان کے بجائے وہ خود ہی چلا جائے گا اور اپنے ساتھ یہ کولر بھی لے جائے گا جس میں کسی کا سر رکھا ہوگا۔ پولی بین نے ایک اور ہی کہانی سنائی۔ اس کے خیال میں سب لوگ غلط کہہ رہے تھے۔ لوئیس نے ان لڑکوں کو بین فرینکلن کا واسطہ دیا اور انہیں نرمی سے یہ جگہ چھوڑنے کے لیے کہا۔ وہ لڑکے بہت متاثر ہوئے اور چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

درحقیقت اس طرح کی تشدد آمیز دھمکیوں سے واکر پونڈ کے رہنے والے پریشان نہیں ہوتے تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا پُرامن قصبہ تھا جہاں شاذ و نادر ہی کوئی تنازعہ جنم لیتا۔ اسی لیے وہاں پولیس کی نفری برائے نام تھی۔ زیادہ تر تنازعات مکا بازی کے بل پر طے کر لیے جاتے ورنہ پنچایت سے رجوع کیا جاتا لیکن لوئیس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ اس واقعے کے بعد لوگ اس کی ذات میں مزید دلچسپی لینے لگے۔ خاص طور پر وہ غیر شادی شدہ عورتوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسی عورتوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہ ہو سکی لیکن بعد میں ہونے والی تحقیقات کے نتیجے میں ایک ریاستی سینیٹر جس کے نیوہیمپشائر پولیس میں گہرے تعلقات تھے۔ اس نے انکشاف کیا کہ اس موسم گرما کے دوران لوئیس نے کم از کم ایک درجن خواتین سے تعلقات استوار کیے۔

ہر عورت نے اس کے بارے میں مختلف باتیں بتائیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ وہ بوسٹن سے آیا تھا۔ کوئی لاس اینجلس اور کوئی کسی دوسری جگہ کا نام لیتی تھی۔ اسی طرح اس کے پیشے کے بارے میں بھی مختلف باتیں کہی گئیں۔ کسی کے خیال میں وہ جز وقتی فٹ بال کا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ کوئی اس کا پیشہ اکاؤنٹنٹ بتاتی تھی اور کوئی اسے کالج میں شاعری پڑھانے والا استاد کہتی تھی۔ اس نے ہر عورت کو اپنے بارے میں مختلف کہانی سنائی تھی اور ویسے بھی وہ عورتیں اس کی قربت میں اتنی مگن تھیں کہ انہوں نے اس کے پس منظر کے بارے میں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ شادی شدہ تھا، رنڈوا یا طلاق یافتہ لیکن ایک بات پر سب متفق تھیں کہ وہ بہت شائستہ اور مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ شب بسری کرنے والی عورت کو دوسری صبح ناشتا بنا کر بھی دیتا تھا۔ فورڈ ماڈل ایجنسی میں کام کرنے والی عورت

نے تحقیقاتی ٹیم کو بتایا، وہ بے حد مہذب اور خوش اخلاق تھا۔ اس کے دانت سفید موتیوں کی طرح چمکتے تھے اور ناخن انتہائی نفاست سے تراشا تھا۔ وہ میری بات غور سے سنتا اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ یہاں کے گنواروں سے بدرجہا بہتر تھا۔''

اسے کھانا بنانے میں بھی بڑی مہارت تھی۔ اس کا انکشاف کشتی والے واقعے کے ایک دو ہفتے بعد ہوا جب واکر پونڈ والنٹیئر فائر ڈپارٹمنٹ نے فنڈ جمع کرنے کے لیے ڈنر کا اہتمام کیا جس میں شرکت کی فیس پانچ ڈالر فی کس تھی۔ لوئیس فاکس اس ڈنر کے لیے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی سور کے گوشت کی دو ڈشیں لے کر آیا۔ اس نے انتہائی نفاست سے اس کے ٹکڑے بنائے اور حاضرین میں تقسیم کردیے۔ وہ ڈش اتنی لذیذ تھی کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ کئی عورتوں نے اس سے ترکیب معلوم کرنا چاہی لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے یہ ترکیب اپنے خاندان سے ورثے میں ملی ہے اور اس کے نزدیک یہ ایک راز ہے جسے وہ کسی قیمت پر ظاہر نہیں کرسکتا۔

یہ ڈنر فائر ڈپارٹمنٹ کے مشینری یارڈ میں ہوا تھا جہاں سے وقتی طور پر تمام گاڑیاں اور مشینیں ہٹا کر فولڈنگ کرسیاں اور میزیں لگا دی گئی تھیں۔ لوئیس فاکس بڑی بے تکلفی سے مہمانوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ اس نے خاکی پتلون، سرخ گالف قمیص اور ایک ایپرن پہن رکھا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ عورتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ سب اس کے گن گا رہی تھیں۔ ساٹھ سالہ گریسی بولٹن کا کہنا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اس شخص کو اغوا کر کے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں کوئی اسے تلاش نہ کر سکے۔ اس جملے پر اردگرد بیٹھی ہوئی عورتوں نے زوردار قہقہہ لگایا جس پر اس کا شوہر بھی چونک گیا لیکن گریسی نے کوئی خوب صورت بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔

کھانا ختم ہونے کے بعد لوئیس وہیں ٹھہرا رہا اور اس نے سامان سمیٹنے میں انتظامیہ کے لوگوں کی مدد کی۔ میزیں صاف کر کے انہیں فولڈ کیا اور ایک کونے میں ان کا ڈھیر لگا دیا۔ اسی طرح کرسیاں بھی ہٹا دی گئیں پھر اس نے فرش کی صفائی اور برتن دھونے میں ہاتھ بٹایا۔ جب سارا کام ختم ہو گیا تو اس نے فائر ڈپارٹمنٹ کے چیف جارج ڈیمر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ وہاں عملے کے لوگ اور ان کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ ان کے سامنے جو بات ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔

لوئیس نے فائر چیف سے کہا۔ ''میں فائر ڈپارٹمنٹ میں شمولیت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔''

جارج ڈیمر گزشتہ پندرہ سال سے چیف کے عہدے پر فائز تھا اور غالباً ڈنر میں آنے سے پہلے اس نے دو جام بھی چڑھائے تھے۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے لوئیس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر کیوں؟''

''مجھے یہ جگہ اور جھیل پسند آئی ہے۔ اب میں یہیں رہ کر لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہیں آگ بجھانے کا کچھ تجربہ ہے؟''

''ہاں، بہت۔'' لوئیس نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے پہلے کہاں کام کر چکے ہو؟''

''کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ بس اِدھر اُدھر کام کرتا رہا ہوں۔''

جارج کی پتلیاں سکڑ گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہاں مستقل قیام کرو گے؟''

''نہیں۔'' لوئیس نے قدرے توقف سے کہا۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار ہچکچاہٹ کا شکار ہوا تھا اور وہ اپنے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

جارج نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مجھے افسوس ہے۔ یہاں ملازمت کرنے کے لیے قصبے کا شہری ہونا لازمی ہے۔ کسی کرائے دار یا عارضی طور پر قیام کرنے والے کو ملازمت نہیں دی جاسکتی۔''

وہاں موجود لوگوں نے دیکھا کہ لوئیس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا ہے اور اس پر سختی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ کئی لوگوں کو ڈر ہوا کہ کہیں لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آجائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لوئیس نے مایوسی سے سر ہلایا اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اگلے روز کچھ رضا کار فائر فائٹرز جو لیفٹیننٹ اور کیپٹن کے اعزازی عہدوں پر فائز تھے۔ وہ جارج کے پاس گئے اور پوچھا کہ اس نے لوئیس کے معاملے میں اتنی سختی کیوں دکھائی۔ ٹرے بوگنز نے کہا کہ صرف ایک موسم گرما کے لیے یہ ڈپارٹمنٹ کسی فاضل شخص کی خدمات حاصل کرسکتا ہے کیونکہ سیزن میں یہاں آنے والے سیاح عموماً ایک یا دو کاٹیجز میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ایک اور رضا کار کیلی اسمتھ نے کہا کہ ہمارے بیشتر رضا کاروں کے پیٹ بڑھے ہوئے ہیں اور وہ کام کے

دوران مستعدی نہیں دکھا سکتے۔ بہتر ہوگا کہ ہم ایک ایسے آدمی کی خدمات حاصل کرلیں جو بہ آسانی ہوس پائپ اور دیگر سامان لے جاسکے۔ ٹومی لیسن نے نکتہ اٹھایا کہ ہمارے بیشتر رضا کار قصبے سے باہر کام پر جاتے ہیں اور بعض اوقات ہنگامی صورتِ حال میں انہیں اسٹیشن پہنچنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ لوئیس فاکس جو کوئی بھی ہے لیکن کم از کم وہ اسی قصبے میں رہتا ہے۔

جارج نے غصے میں آکر اپنا انگوٹھا فضا میں لہرایا اور کہا۔ ''میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں اور اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو بے شک فائر کمیشن سے رجوع کر سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہ خوشی تمہارے استعفے قبول کرلیں گے جو تم ان کا فیصلہ سننے کے بعد مایوسی کے عالم میں دو گے۔''

یہ سُن کر سب کی زبان بند ہو گئی اور وہ چپ چاپ وہاں سے چلے گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ والنٹیئر فائر ڈپارٹمنٹ کو چلانے والے کمیشن کے پانچوں ارکان جارج کے قریبی یا دور کے رشتے دار تھے اور اس کی شکایت کرنے کا مطلب اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا تھا گو کہ وہ سب رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے اور انہیں اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا بلکہ انہیں اپنے فارغ وقت میں ہی اس کام کی تربیت اور مشقیں کرنا ہوتی تھیں لیکن واکر پونڈ جیسے چھوٹے قصبے میں رضا کار فائر فائٹر بننا باعثِ فخر تھا اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوگ سماج کا اہم حصہ ہیں اور ہمیشہ لوگوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ تر لوگ بھی دوسرے سرکاری اہلکاروں کی نسبت فائر فائٹرز سے محبت کرتے تھے ورنہ کوئی سرکاری افسر، پولیس کا سپاہی یا بلڈنگ انسپکٹر کسی کے دروازے پر آجاتا تو گھر کے مکین پریشان ہو جاتے تھے۔

اس معاملے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن لوئیس فاکس خاموش نہیں بیٹھا اور اس کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ فائر اسٹیشن میں ہونے والی تقریب کو کئی دن گزر چکے تھے لیکن لوئیس کی لائی ہوئی خوش ذائقہ ڈش کا چرچا اب بھی ہوتا رہتا تھا۔ اس تقریب کے دو روز بعد وہ ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ریڈیو شیک گیا اور وہاں سے اس نے ایک فائر اسکینر حاصل کیا۔ چند روز بعد جون کی ایک گرم صبح کو کاؤنٹی ڈسپیچ نے کیٹ کی پہاڑی پر جھاڑیوں میں آگ لگنے کی اطلاع دی جس پر ڈپارٹمنٹ نے فوری کارروائی کی اور دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد آگ پر قابو پا لیا گیا۔

آگ بجھانے والے رضا کار اور جارج ڈیمر فائر اسٹیشن واپس آئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لوئیس فاکس، آئس ٹی، آئس کافی اور دو درجن ڈونٹس کے ساتھ ان کا انتظار کررہا تھا۔ ان رضا کاروں میں دو خوب صورت لڑکیاں بھی تھیں جنہیں لوئیس نے اپنے ہاتھ سے وہ چیزیں پیش کیں۔ سب لوگ اس خاطر مدارات سے بہت متاثر ہوئے اور کسی نے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ وہ کس حیثیت میں یہ سب کچھ کررہا ہے۔ انہوں نے مزے لے کر اِن اشیائے خورونوش پر ہاتھ صاف کیا اور لوئیس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ لوئیس نے سامان اتارنے اور ٹرکوں کو صاف کرنے میں بھی عملے کی مدد کی۔

کچھ رضا کاروں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جارج سے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے کہا لیکن پرانے امریکیوں کی طرح جو کبھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے، اس نے کہا۔ ''اگر وہ جائداد ٹیکس ادا کرنا شروع کردے تو ہمارے محکمے میں شمولیت اختیار کرسکتا ہے۔ ڈنکن ڈونٹس سے کی گئی خریداری کی رسید کافی نہیں۔''

موسم گرما میں واکر پونڈ کے اردگرد تمام موٹیل اور کاٹیجز سیاحوں سے بھرے ہوئے تھے جس کی وجہ سے آئے دن کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور ہوتا اور فائر ڈپارٹمنٹ کی مصروفیت بھی بڑھ جاتی۔ کبھی کوئی کار درخت سے ٹکرا جاتی تو کہیں سے آتشزدگی کی اطلاع آجاتی۔ اس لیے رضا کاروں کو ہر وقت مستعد رہنا ہوتا تھا کیونکہ حادثات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے نزدیک دن اور رات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انہیں رات کے دو بجے بھی جائے حادثہ پر پہنچنا پڑا لیکن بڑی عجیب بات یہ تھی کہ وہ جب بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر اسٹیشن واپس آتے تو لوئیس ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود ہوتا۔ وہ انہیں چائے کافی اور بسکٹ وغیرہ فراہم کرتا اور سامان اتارنے کے ساتھ ساتھ صفائی میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتا۔

لوئیس نے اپنی خدمت سے ڈپارٹمنٹ کے مزید رضا کاروں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں اور وہ جارج پر زور دینے لگے کہ اسے اصولوں سے چمٹے رہنے کے بجائے لوئیس کے لیے کچھ کرنا چاہیے لیکن ایک مرتبہ پھر اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے تربیتی سیشن کے دوران رضا کاروں سے کہا۔ ''وہ شخص محض اپنی غرض کے لیے ہم سے چمٹا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے رضا کار کی وردی پہننے اور بیج لگانے کا اعزاز حاصل ہو جائے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم میرے الفاظ لکھ لو۔ ایک دن وہ پھر آئے گا اور اپنی خدمات کے

عوض ہمارے محکمے میں شامل ہونے کی درخواست کرے گا لیکن میں اسے صاف جواب دے دوں گا کہ ہم اسے اپنے یہاں ملازمت نہیں دے سکتے۔''

لیکن وہ دن کبھی نہیں آیا۔ لوئیس اپنی بساط کے مطابق آگ بجھانے والے رضا کاروں کی خدمت کرتا رہا۔ وہ اب بھی مقامی عورتوں کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا۔ فائر اسٹیشن میں ہونے والے ڈنر کے بعد وہ ان کے لیے دو مرتبہ لذیذ اور چٹخارے دار گوشت کے پارچے بنا کر لایا کیونکہ اس کی یہ ڈش بہت مقبول تھی۔ اس لیے وہ دونوں بار زیادہ مقدار میں یہ پارچے بنا کر لایا تھا لیکن ان کی تمام کوششوں کے باوجود اس نے اس ڈش کو بنانے کی ترکیب نہیں بتائی۔

اگست میں دو ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے لوگوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا گو کہ عادت کے مطابق انہوں نے ان پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن گفتگو کے لیے ایک موضوع ہاتھ آ گیا۔ پہلی بات یہ ہوئی کہ میسا چوسٹس سے ایک شخص چیلسی میں رہنے والے دو افراد کی تلاش میں یہاں آیا۔ وہ چند ہفتے قبل تعطیلات گزارنے واکر پونڈ آئے تھے اور انہیں ایک مقامی شخص نے اس وقت دھمکی دی جب وہ اپنی چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر سیر و تفریح کر رہے تھے۔ دونوں لڑکوں ٹونی اور اینڈری نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بار پھر واکر پونڈ آ کر اس مقامی شخص کو سبق پڑھائیں گے لیکن وہ دونوں چیلسی واپس نہیں پہنچے۔ ان کے گھر والوں نے پولیس سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے اسے محض ایک گمشدگی کا کیس سمجھ کر رپورٹ درج کر لی کیونکہ اس میں انہیں کسی جرم کی علامت نظر نہیں آئی۔ پولیس کی کارروائی سے مایوس ہو کر ان لوگوں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے قصبے میں آ کر مقامی لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لیا اور بالآخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ٹونی اور اینڈری نیو ہیمپشائر جاتے ہوئے یا پھر وہاں پہنچ کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پرائیویٹ سراغ رساں کی قصبے میں آمد لوگوں میں چہ میگوئیوں کا سبب بن سکتی تھی تو ایسا بالکل نہیں ہوا۔ زیادہ تر لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہنستا مسکراتا اور خوش اخلاق لوئیس فاکس جو اس موسمِ گرما میں قصبے کے لوگوں کے لیے اتنا کچھ کر رہا تھا، اس کا ان لڑکوں کی گمشدگی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور جو لوگ اس کے برعکس سوچ رہے تھے، انہوں نے بھی بظاہر اپنی زبان بند رکھی۔

اس سراغ رساں کے جانے کے ایک ہفتے بعد کونی ڈیمنٹ چھٹیاں گزارنے گھر واپس آئی جو افغانستان میں امریکی فوج کے ساتھ نرس کے طور پر کام کر رہی تھی۔ جہاں اس کا زیادہ وقت زندگی بچانے اور زخموں کی مرہم پٹی کرنے میں گزرتا تھا۔ وہ جنگ کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی تھی اور طویل رخصت پر تھی۔ وہ دیکھتی کہ لوئیس فاکس ہر روز صبح کے وقت لمبی جاگنگ پر جاتا ہے۔ ایک روز صبح کے وقت وہ مس واکر ڈائنر میں ناشتا کرنے گئی تو وہاں کچھ لوگ بیٹھے لوئیس فاکس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے گن گا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔ اس عمر میں بھی وہ اتنی لمبی دوڑ لگا لیتا ہے۔''

کونی نے بلیک کافی میں چینی ملاتے ہوئے کہا۔ ''اس دوڑنے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔''

وہاں بیٹھے ہوئے ایک اور شخص نے کہا۔ ''کونی، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جن لوگوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے، وہ عموماً ایک یا دو راستوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی رفتار کو بہتر بنانے کے علاوہ دوسرے لوگوں سے موازنہ بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ شخص کسی ایک سمت میں نہیں بلکہ جھیل کے اطراف میں ہر کچی اور پکی سڑک پر چکر لگاتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ کسی شے یا کسی شخص کی تلاش میں ہے۔''

کچھ لوگوں نے مزید سوالات کیے لیکن کونی نے اس بحث میں الجھنے سے انکار کر دیا اور ناشتا ختم کر کے وہاں سے چلی گئی۔ اس نے بقیہ وقت گھومنے پھرنے، تیراکی اور ڈھیر ساری کتابیں پڑھنے میں گزار دیا۔ اگست کا مہینا ختم ہوا تو گرمی کی شدت میں بھی کمی واقع ہو گئی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے کونی کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

وہ ٹیلی فون کال واکر پونڈ فائر ڈپارٹمنٹ میں ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب ایک بج کر دو منٹ پر آئی۔ جس میں بتایا گیا کہ اولسن روڈ کے اختتام پر واقع ایک مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ فون کرنے والی رتھ گیرسن تھی جسے دیر تک جاگنے کی عادت تھی اور جن کے چند گھونٹ لیے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کیونکہ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے وہ فون کال خودکار نظام کے ذریعے بیس میل دور کاؤنٹی ڈسپیچر کو چلی گئی جس نے ریڈیو کے ذریعے فائر ڈپارٹمنٹ کے اراکین کو تیار رہنے کا سگنل دے دیا۔

رات کے اس پہر زیادہ تر رضا کار اپنے بستر میں گہری نیند سو رہے تھے یا سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ سگنل ملتے ہی وہ سب اپنی گاڑیوں کی طرف لپکے اور سائرن بجاتے فائر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے افراتفری کے عالم میں اپنی گاڑیاں کھڑی کیں اور فائر اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑے لیکن ایک رضا کار ہیری پیرسن جو اولسن روڈ کے دوسرے سرے پر رہتا تھا، اس نے اپنا سامان سنبھالا، بوٹ پہنے اور سر پر ہیلمٹ رکھ کر فائر اسٹیشن جانے کے بجائے براہِ راست متاثرہ جگہ جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب وہ تنگ اور اونچی نیچی کچی سڑک پر اپنی پک اپ لاتے ہوئے وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ نارنجی رنگ کے شعلے آسمان کی طرف بلند ہو رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے پک اپ روکی اور ریڈیو کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو پیغام دیا۔ ''جلدی پہنچو، یہ کرٹ ڈنسن کا مکان ہے اور پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔''

وہ واقعی کرٹ ڈنسن کا مکان تھا جس میں اوپری منزل کے علاوہ ایک بالاخانہ اور تہ خانہ بھی تھا۔ پہلی منزل پر چار کمرے تھے۔ جب ہیری نے پیغام بھیجا، اس وقت تمام کھڑکیوں اور بیرونی دروازے سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ہیری اپنی پک اپ سے باہر نکلا اور ہیجانی کیفیت میں جلتے ہوئے مکان کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا ہوا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنا ریڈیو نکالا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ''جلدی پہنچو۔ یہاں بہت بڑی آگ لگی ہے۔''

ڈپارٹمنٹ کے چیف جارج ڈیمر نے غصے سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنا منہ بند رکھو، ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت تو ہم ایک گاڑی کو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کیونکہ جب فائر اسٹیشن کا عملہ وہاں پہنچا اور .... انہوں نے آگ بجھانے والی گاڑیوں کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو ان میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی صرف وہی نہیں بلکہ سامان لے جانے والے ٹرک اور ایمبولینس گاڑیوں کے ٹائروں کی بھی ہوا نکلی ہوئی تھی اور ایک دو نہیں بلکہ پورے سولہ ٹائر زمین سے لگے ہوئے تھے۔ کسی نے صرف ہوا ہی نہیں نکالی بلکہ ہر ٹائر میں کیلیں بھی لگا دی گئی تھیں تاکہ فوری طور پر ان میں ہوا بھر کر قابلِ استعمال نہ بنایا جا سکے۔ اب یہ گاڑیاں کئی دنوں تک کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔

فوری طور پر ٹیلی فون کال اور ریڈیو پیغامات کے ذریعے کاؤنٹی ڈسپیچر کو اس صورتِ حال کے بارے میں بتایا گیا جس نے واکر پونڈ کے قریبی تین قصبوں کے والنٹیئر فائر ڈپارٹمنٹ کو جائے وقوعہ پر پہنچنے کی ہدایت کی لیکن اس میں اچھی خاصی تاخیر ہو سکتی تھی کیونکہ اس وقت تمام رضا کار لڑکے اور لڑکیاں گہری نیند سو رہے تھے۔ انہیں تیار ہونے، فائر اسٹیشن پہنچنے اور آگ بجھانے والی گاڑیوں کو اسٹارٹ کرنے میں کافی وقت لگ جاتا۔ اس کے بعد ہی وہ متاثرہ عمارت تک پہنچ پاتے اور تب تک وہ راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

جس وقت یہ ساری کارروائی ہو رہی تھی تو واکر پونڈ کے رضا کار اپنے پڑوسیوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے۔ فائر اسٹیشن کا چیف جارج ڈیمر جس نے گزشتہ پچاس سالوں میں کسی نئی ٹیکنالوجی کو قبول کرنے کے بجائے ہمیشہ روایتی طریقوں پر انحصار کیا۔ اس وقت بھی اس صورتِ حال سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی ہنگامی حالت میں اس کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ اس نے کارل سیلوکی سے کہا کہ وہ اپنا ہیوی ڈیوٹی فورڈ ٹرک ورک شاپ کے قریب لے آئے پھر وہ سب عقبی حصے میں جمع ہوئے جہاں ایک موبائل پمپ دوسری مشینوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ یہ پمپ کسی وقفے کے بغیر ایک منٹ میں پانچ سو گیلن پانی پھینک سکتا تھا۔ اس پمپ کو فروخت کرنے والے سیلز مین نے ہدایت کی تھی کہ اس کے وزن اور سائز کے پیشِ نظر اسے ہمیشہ ایک کرین کی مدد سے اٹھایا جائے لیکن یہ وقت ان ہدایات پر عمل کرنے کا نہیں تھا اور نہ ہی اتنی رات گئے کہیں سے کرین مل سکتی تھی چنانچہ چیف نے پانچ طاقتور لڑکوں اور ایک لڑکی کا انتخاب کیا۔ یہ لڑکی کیل سمز مشغلے کے طور پر بھاری وزن اٹھایا کرتی تھی۔ ان سب نے مل کر وہ وزنی پمپ اٹھایا اور اسے کارل کے ٹرک میں رکھ دیا۔ چند ایک سیکنڈ بعد ہی وہ ٹرک فائر فائٹرز کو لے کر اولسن روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

کرٹ ڈنسن کے مکان پر پہنچ کر عملہ نیچے اترا اور وہ سب تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ انہی چھ توانا افراد نے ٹرک پر سے پمپ اتارا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، اسے جھیل کے قریب لے گئے جبکہ دوسرے افراد نے تین انچ قطر کا پائپ اتارا جس کے ایک سرے پر چھلنی لگی ہوئی تھی اور اسے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا۔ پمپ کی موٹر اسٹارٹ کی گئی اور پانچ منٹ بعد کرٹ کے مکان پر پانی کی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تیز بوچھاڑ پڑنے لگی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ آگ پر قابو پایا جاتا، مکان کی چھت زمین بوس ہو گئی۔

دس منٹ بعد قریبی قصبے سے پہلا فائر ٹرک وہاں پہنچا تاکہ آگ بجھانے میں ان کی مدد کر سکے لیکن یہ اعزاز واکر پونڈ فائر ڈپارٹمنٹ کے رضاکاروں کو ہی ملا کہ وہ سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچے اور پمپ کے ذریعے آگ کے شعلوں پر پانی ڈالنے کی کوشش کی جبکہ ان کی ساری مشینری ناکارہ بنادی گئی تھی۔

دو گھنٹے بعد فائر ڈپارٹمنٹ کا ریاستی سربراہ وہاں پہنچا۔ اس وقت تک لکڑی کے جلے ہوئے شہتیر، گھر میں رکھی ہوئی خاکستر اشیا، یہاں تک کہ قرب و جوار کے درخت بھی پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بیڈروم کے ملبے سے کرٹ ڈنسن کی جلی ہوئی لاش بھی برآمد ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دلچسپ انکشافات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد اتوار کی صبح جب مایوس رضاکار فائر اسٹیشن واپس آئے تو وہاں ان کے استقبال کے لیے چند عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا جبکہ اس سے پہلے ہمیشہ لوئیس فاکس، چائے کافی اور ڈونٹس سے ان کی تواضع کیا کرتا تھا۔ کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تاکہ سب سے پہلے یہ بات کس نے کہی لیکن یہ ریکارڈ کا حصہ ہے کہ کچھ دیر بعد ہی مقامی پولیس کو ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی جسے سنتے ہی سب لوگ لوئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑے۔ جن میں پولیس والے اور رضاکار فائر فائٹرز شامل تھے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ وہ سب سے پہلے وہاں پہنچ جائے لیکن ان سے پہلے ہی گھر کی صفائی کرنے والی ماں اور بیٹی وہاں موجود تھیں اور انہوں نے اسی وقت مکر ہاؤس کی صفائی ختم کی تھی۔

وہاں لوئیس فاکس موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کا سامان اور ذاتی استعمال سے متعلق کوئی چیز نظر آئی۔ یہاں تک کہ فالتو اشیا بھی ہٹا دی گئی تھیں۔ بعد میں پولیس اور ایف بی آئی کے سراغ رسانوں نے مولی گرین اور اس کی بیٹی سے پوچھ کچھ کی تو ان دونوں نے ایک ہی کہانی سنائی کہ لوئیس فاکس نے پہلے ہی یہ انتظام کر لیا تھا کہ وہ دونوں اتوار کی صبح آکر گھر کی اچھی طرح صفائی کر دیں۔

"دلچسپ بات یہ ہے۔" مولی نے بعد میں اپنے دوستوں کو بتایا۔ "جب ہم وہاں پہنچے تو گھر بالکل صاف پڑا ہوا تھا۔ وہ ہمیں اتوار کی صبح آنے کے لیے دہرا معاوضہ دیا کرتا تھا۔ اس بار اس نے سہ گنا معاوضہ دیا تاکہ ہم اچھی طرح گھر کی دھلائی، ویکیوم کلینگ اور پالشنگ کریں۔"

گرینگ ہال میں ہونے والی ماہانہ میٹنگ کے دوران کسی نے مولی سے پوچھا کہ کیا لوئیس نے اسے نقد ادائیگی کی تھی تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ ٹیکس گوشوارہ بھرتے وقت اس رقم کو ظاہر کر دے گی۔"

لوئیس فاکس کی پُراسرار گمشدگی کے بعد پولیس اور ایف بی آئی نے اس کا ماضی کھنگالنا شروع کر دیا لیکن اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ یہاں تک کہ قصبے کے لوگوں میں سے کسی کو اس کی گاڑی کا نمبر بھی یاد نہیں تھا اور جب نیوہیمپشائر کے مقامی دفتر سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہاں اس کی کوئی تصویر بھی دستیاب نہیں تھی۔ اسی طرح اس کے گھر سے ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا جس کی مدد سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتیں۔ مثلاً سر کے بال، کپڑے یا انگلیوں کے نشانات، کیونکہ مولی اور اس کی بیٹی نے پورے گھر کی اچھی طرح صفائی کر دی تھی۔ البتہ مکان کی چابی ضرور مل گئی جو وہ مقررہ وقت سے دو ہفتے پہلے جاتے وقت چھوڑ گیا تھا۔

آتش زدگی کے دو ہفتے بعد منتخب ارکان کے بورڈ کے چیئرمین بڈ ہیتیکر نے بوسٹن گلوب نیوز پیپر کو بتایا۔ "ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی بھوت تھا، ایک نرم اور شائستہ مزاج بھوت۔ اس کے باوجود وہ ایک بھوت ہی تھا۔"

اس کے بعد بھی مختلف کہانیاں گردش کرتی رہیں۔ فائر ڈپارٹمنٹ کے ریاستی سربراہ نے کرٹ ڈنسن کے مکان پر ایک ہفتہ گزارا۔ اس کا تجربہ کہتا تھا کہ یہ آگ جان کر لگائی گئی تھی لیکن ایسا کوئی سراغ یا ثبوت نہیں ملا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ آتش زنی کی کارروائی تھی۔ جب واقعات کی کڑیاں ملائی گئیں تو آتش زنی کی کہانی حقیقت معلوم ہونے لگی۔ عین موقع پر آگ بجھانے والی گاڑیوں کو ناکارہ بنا دینا اور ایک پُراسرار شخص کا مکان کرائے پر لے کر رہنا اور مقررہ پروگرام سے دو ہفتے پہلے عین اس روز قصبے سے چلے جانا جب آتش زنی کا واقعہ پیش آیا۔ یہ سب اشارے لوئیس کی طرف جا رہے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے کرٹ ڈنسن سے کیا عداوت تھی کہ اس کے گھر کو آگ لگا دی۔

اس عقدہ کو ایف بی آئی سے وابستہ ہونے والے ایک نئے افسر نے حل کیا جب اس نے کرٹ ڈنسن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور بخدا وہ بھی بھوت ہی نکلا۔ قصبے کے لوگ اس کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ ایک عمر رسیدہ شریف شخص تھا جو کئی سال پہلے اس

قصبے میں آکر بس گیا تھا۔ وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتا اور لوگوں نے اسے صرف اپنے ٹرک میں گیس بھروانے یا سودا سلف لانے کے لیے ہی کہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنے تمام واجبات باقاعدگی سے ادا کرتا تھا لیکن کبھی کسی میٹنگ یا تقریب میں نہیں گیا۔ کچھ لوگ اسے تارک الدنیا سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ جیسی زندگی گزارنا چاہتا ہے وہی ٹھیک ہے، کم از کم اس کی ذات سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔

لیکن جب ایف بی آئی افسر نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے اسی طرح مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جو لوئیس فاکس کے معاملے میں ہوئی تھی۔ اس نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی کسی دفتر میں اس کا کوئی ریکارڈ اور فائل موجود تھی۔ تاہم انہیں اس کی جھلسی ہوئی کھوپڑی اور دانت ضرور مل گئے۔ جب اس کے دانتوں کا ریکارڈ چیک کیا گیا تو ایک حیرت انگیز حقیقت سامنے آئی، وہ کرٹ ڈنسن نہیں تھا۔

اس کی شناخت مارکو پیٹرووک کے نام سے ہوئی جو ایک جنگی مجرم تھا اور گزشتہ بیس سال سے اس کی تلاش جاری تھی۔ اس نے بوسنیا کی جنگ میں حصہ لیا اور وہ اس پیرا ملٹری گروپ کا انچارج تھا جسے گندے کاموں میں مہارت حاصل تھی۔ یہ ایسے کارنامے تھے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانا اخبارات کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی، اخبارات اور ٹیلی وژن رپورٹرز کے غول نے واکر پونڈ پر چڑھائی کر دی۔ وہ آگ بجھانے والے رضاکاروں، منتخب نمائندوں، پولیس افسروں اور ان لوگوں سے بھی سوالات کر رہے تھے جنہوں نے صرف ہفتے کا آخری دن ہی واکر پونڈ میں گزارا تھا۔ ان سب نے کم و بیش ایک ہی کہانی سنائی۔ ایک پُراسرار قاتل واکر پونڈ آیا۔ اس نے مقامی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے ساتھ ساتھ فائر ڈپارٹمنٹ میں دوست بنائے اور اندازہ لگا لیا کہ آگ لگنے کی اطلاع ملنے پر انہیں کارروائی کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے اور فائر اسٹیشن میں کس طرح داخل ہوا جاتا ہے۔ اس نے کئی ہفتے تک جھیل کے اردگرد دوڑ لگائی جب تک کہ اسے جنگی مجرم کے ٹھکانے کا پتا نہیں چل گیا۔

لیکن لوئیس فاکس کون تھا؟ اس بارے میں متضاد رائے پائی جاتی ہیں۔ البتہ سی آئی اے سے لے کر ایم 16 اور یورپ کی خفیہ ایجنسیاں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ کوئی ایسا شخص تھا جو اپنے ہم وطنوں پر ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینے آیا تھا جن کے خاندان آج بھی بوسنیا میں اپنے پیاروں کا ماتم کر رہے ہیں۔

موسم گرما ختم ہو گیا اور سیاحوں نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا لیکن لوئیس فاکس کی پراسرار شخصیت کا معما حل نہ ہو سکا پھر ایک اور الجھن پیدا ہو گئی جس نے واکر پونڈ کے معصوم لوگوں کو پریشان کر دیا۔ اگلے تین ہفتوں کے دوران وہ پُراسرار لفافے ملنا شروع ہوئے جو کی ویسٹ، کینساس سٹی، ڈیٹرائٹ اور دوسرے شہروں یا قصبوں سے پوسٹ کیے گئے تھے۔ ہر لفافے میں ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے پانچ سو ڈالر کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ لفافے پر کوئی تحریر نہیں تھی اور ان لفافوں پر واکر پونڈ فائر ڈپارٹمنٹ کا پتا لکھا ہوا تھا جبکہ اصولاً یہ لفافے ڈپارٹمنٹ کے چیف جارج ڈیمر کے نام بھیجے جانے چاہیے تھے۔ اس سے لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ لوئیس فاکس خواہ کوئی بھی ہو لیکن وہ ابھی تک اپنے دل میں جارج کے خلاف بغض رکھتا تھا کیونکہ اس نے اسے فائر ڈپارٹمنٹ کے عملے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

بہت جلد ان لفافوں سے اتنی رقم جمع ہو گئی کہ اس سے آگ بجھانے والی گاڑیوں کے لیے نئے ٹائر خریدے جا سکیں گو کہ اسٹیٹ پولیس اور ایف بی آئی نے اس فنڈ کو منجمد کرنے کی کوشش کی لیکن قصبے کی انتظامیہ اور اس کے وکیلوں نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ان وکیلوں میں سپریم کورٹ کا ایک ریٹائرڈ جج بھی شامل تھا۔ ان وکیلوں نے جو موقف اختیار کیا، اس کے مطابق اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا کہ یہ رقم لوئیس فاکس نے بھیجی تھی۔ اس طرح نہ صرف نئے ٹائر خرید لیے گئے بلکہ ہنگامی مصارف کے لیے بھی اچھی خاصی رقم بچ گئی۔

لیکن آخری موصول ہونے والے لفافے میں سے رقم کے بجائے ایک کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ نکلا جس پر سؤر کے گوشت کے پارچے پکانے کی ترکیب درج تھی۔ اس طرح لوگوں کا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ لفافے بھیجنے والا لوئیس فاکس ہی تھا پھر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ بہت سی عورتوں نے اس ترکیب کے مطابق یہ گوشت پکانے کی کوشش کی لیکن وہ ذائقہ نہ آ سکا جو لوئیس فاکس کی بنائی ہوئی ڈش میں ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا معما ہے جو کبھی حل نہ ہو سکا لیکن قصبے کے لوگ اس کا تذکرہ بڑے شوق سے کرتے رہے۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

گیارہویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا۔ مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

ایک لہو رنگ اور
دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ''غلطی'' کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راستے گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا، اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بچی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ''بلیک میلنگ'' سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا سرنگ جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر ساتا جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا اور ..... سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آ گیا۔ جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جس فقرے کا میں نے ذکر کیا ہے، اس کا مطلب کچھ اس طرح سے تھا۔ با کا مطلب ''اب'' اور روجات کا مطلب ''تاجور'' تھا۔ الٹا لکھا ہوا پورا فقرہ اس طرح سے تھا۔ بارو جات اک ہیھ چھک انزک وہ اگ۔ حرفوں کو سیدھا کر کے پڑھا جاتا تو مطلب یہ تھا...... اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہوگا۔ اگلا فقرہ تھا، ہم نے پیسے پکڑے ہوئے ہیں۔ ہم ذمے دار ہیں۔

یہ سارا خط ہی عجیب و غریب تھا۔ تحریر اس طرح تھی۔

''ماسٹر صاحب! آپ بہت لیٹ ہو۔ مجبور ہو کر خط لکھنا پڑا۔ آپ کو پتا ہی ہے ادھر میری طرف حالات زیادہ ٹھیک نہیں...... مولوی کی بیٹی زینب اسلام آباد کے اسپتال میں ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان نہیں۔ وہ تو جب چاند گڑھی آئے تو کچھ ہو سکتا ہے۔ اب تاجور کا بھی کچھ کرنا ہو گا۔ ہم نے پیسے پکڑے ہوئے ہیں، ہم ذمے دار ہیں۔ اسحاق خبیث تو اب تاجو کے معاملے میں ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ پرسوں بھی لورو سے فون آیا ہے۔ بڑے صاحب اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ کم از کم ایک لڑکی تو ہمیں فوراً بھیجنی پڑے گی، باقیوں کے لیے ٹائم مل سکتا ہے۔ تم اپنی والی لڑکی کی خوراک تھوڑی بڑھا دو۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب دو تین ہفتے میں تیار ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہوا تو رقم تو ڈوبے گی ہی، یہ نہ ہو کہ بڑے لوگوں کی دشمنی بھی مول لینی پڑے۔ باقی سجاولے کی طرف سے بےفکر رہو۔ اس معاملے میں وہ بالکل بھی شامل نہیں ہے، یہ بس ہمارا اور تمہارا معاملہ ہے......'' (خط کی آخری دو تین سطریں غائب تھیں کیونکہ کاغذ پھٹ گیا تھا)

تاجور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً وہ خط کے مندرجات جاننا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی خط پڑھنے کی خواہش کر سکتی تھی...... اور خط میں اس کا نام موجود تھا۔ مجھے تھوڑی سی اداکاری کرنا پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ خط کے حوالے سے مجھ سے کوئی بات کرتی، میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔ ''فیض بُلا رہا ہے۔ میں ابھی آیا۔''

خط کو جیب میں ڈالتا ہوا، میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا۔ دو تین ہفتے میں لڑکی تیار ہو سکتی ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا اسے بھی زینب کی طرح زہر دے کر کسی کام کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور تیار ہونے کے بعد اسے ''لورو'' نامی جگہ پر کس بڑے صاحب کے حوالے کیا جاتا تھا۔ کیا وہ کوئی جرائم پیشہ تھا یا عیاش امیرزادہ تھا؟ یا کچھ اور؟ اس سارے خط میں ایک بات دلچسپ تھی اور اہم بھی۔ جس طرح کی جدوجہد ہم کر رہے تھے اس میں یہ ہمارے بہت کام آ سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ایک کھلی لڑائی کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ لڑائی میں اپنے دشمن کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا اور اسے کمزور کرنا بھی حکمتِ عملی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے چاند گڑھی میں، میں یہ حکمتِ عملی بڑے اچھے طریقے سے استعمال کر چکا تھا۔ میں نے عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ کو لڑا کر ان کا زور نمایاں حد تک کم کر دیا تھا۔ اب صورتِ حال کچھ ایسی بن رہی تھی کہ عالمگیر اور سجاول کے درمیان بھی دراڑ پیدا کی جا سکتی تھی اور اس کا موقع اس خط کے اندر ہی موجود تھا۔ یقیناً یہ خط عالمگیر کی طرف سے کسی ماسٹر صاحب کو بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں عالمگیر نے تحریر کروایا تھا کہ یہ معاملہ دوسرے معاملوں سے الگ ہے اور اس کی سجاول کو کچھ خبر نہیں۔ سجاول کو بیگانگی کے انداز میں ''سجاولا'' لکھا گیا تھا۔

میں فیض سے ملنے کا بہانہ کر کے کمرے سے نکلا تھا۔ باہر نکلا تو فیض سے ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ بےدھیانی میں اپنی برف جیسی سفید مونچھوں کو سہلاتا میری طرف ہی آ رہا تھا۔ چہرے پر پریشانی تھی، مجھے دیکھ کر یہ پریشانی اور بڑھ گئی، افسردہ انداز میں بولا۔ ''میں تمہاری ٹانگ کا حال پوچھنے آ رہا تھا...... اب کیسی ہے چوٹ؟''

''زیادہ گہرا کٹ نہیں تھا، اب ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''شاہ زیب! تم اپنے لیے مشکلیں بڑھا رہے ہو۔ اس سے بڑھ کر بےوقوفی کیا ہو گی کہ تم چھوٹے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو اور ایک ایسی بےتکی بات کر رہے ہو جو تمہاری زندگی ختم کر سکتی ہے۔''

یقیناً فیض وہی بات کہہ رہا تھا جو یہاں پر ہر ایک کی گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ یعنی میرا باقرے بگھیاڑ کو ہرانا اور پھر چھوٹے سردار کو لڑنے کا چیلنج......

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میری نگاہ دور ایک منظر پر پڑی۔ کچھ افراد ایک شخص کو کھینچتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ میں لے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ رسی سے پشت پر بندھے تھے اور پاؤں میں بھی رسی کی بیڑی نما بندش تھی۔

میں نے فیض سے پوچھا۔ ''یہ وہی ملنگ ہے جسے کل پکڑا گیا تھا؟''

فیض نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ''آج یہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔''

''کیا مطلب؟ کیا کیا تھا اس نے؟''

''جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فیض محمد نے کہا پھر مجھے کل رات والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ ''اس کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات سجاول کے ساتھیوں اور مسلح ملنگوں میں ٹھیک ٹھاک رن پڑا ہے۔ جب ملنگوں نے اوپر سڑک کے قریب حملہ کیا، درختوں میں صرف چار بندے موجود تھے۔ ملنگوں نے ایک کو مار دیا، ایک کو پکڑ لیا اور دو کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گئے۔ اتنی دیر میں یہاں نیچے ڈیرے پر بھی خبر ہو گئی اور فی الفور کمک وہاں پہنچ گئی۔ ملنگوں کو بالکل امید نہیں تھی کہ یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں اور ایک دم اتنے زیادہ مسلح افراد سے ان کا سامنا ہو جائے گا۔ ایک بار پھر زبردست فائرنگ شروع ہوئی۔ ملنگوں نے ایک دو منٹ مزاحمت کی پھر ایک لاش چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ دو کو پکڑ لیا گیا۔ ان میں ایک وہی ملنگنی تھی جسے میں نے کل شب شرابی ڈکیتوں کے نرغے میں دیکھا تھا۔ دوسرا یہ شخص اصغر نامی تھا۔ اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی تھی۔ شروع میں جب سجاول کے ساتھی پسپا ہو گئے تھے، اس نے پکڑے جانے والے ڈکیت پر تشدد کیا، پہلے گولیاں چلا کر اس کے گھٹنے توڑے، پھر اس کے منہ میں پستول رکھ کر گولی چلا دی۔ (وہ اس سے باقی ساتھیوں اور ہمارے بارے میں پوچھ رہا تھا) اب اس سنگین جرم کے پاداش میں اسے سزا دی جا رہی تھی۔ درمیانی عمر کی ملنگنی اب ڈکیتوں کے حوالے تھی اور یقیناً اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہونا تھا۔

''اب کیا کریں گے اس ملنگ کے ساتھ؟'' میں نے فیض سے پوچھا۔

''پھانسی۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ چل کر دیکھ لو، اگر دیکھنا ہے تو؟''

میں فیض کے ساتھ ان چٹانوں کی طرف چل دیا جن کی اوٹ میں سجاول کے مسلح ساتھی جمع ہو رہے تھے۔ وسیع و عریض احاطے کے ساتھ یہ ایک چھوٹا سا احاطہ خود بخود بن گیا تھا۔ دو طرف اونچی نکیلی چٹانیں تھیں، تیسری طرف وہ بلند درخت تھے جن پر مچانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کم و بیش تیس افراد جمع تھے۔ ایک اونچے درخت پر رسے کا پھندا جھول رہا تھا۔ قریب ہی ایک سیاہ گھوڑا بھی کھڑا تھا۔ ایک چبوترا نما ہموار چٹان پر سجاول آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اس کے اردگرد مسلح افراد موجود تھے۔ باقی دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ سجاول کے قریب ہی مجھے اس کا دستِ راست باقر بگھیاڑ بھی کھڑا نظر آیا۔ یہاں زیادہ تر افراد شلوار قمیص میں دکھائی دیتے تھے مگر باقر اجین اور جیکٹ وغیرہ پہنتا تھا۔ اس نے حسبِ توقع کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا۔ باقرے کا رنگ، اس کے گھونگرالے بال، اس کا قد کاٹھ...... تقریباً سب کچھ عبدالرحیم سے ملتا تھا، اور یہی مشابہت تھی جو عبدالرحیم کی بدنصیبی بن گئی تھی۔ باقرے کو دیکھ کر میرے اندر طیش کی بلند لہر سی اٹھ جاتی تھی۔ یہی شخص تھا جسے قانون سے بچانے کے لیے جواں سال رحیم کی زندگی چھینی گئی تھی۔

جس ملنگ کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا، وہ ابھی تک لمبے نیلے چولے میں تھا دیگر ملنگوں کی طرح اس کے بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے گلے میں لکڑی کی رنگ برنگی مالائیں، سورج کی روپہلی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ اس کی یقیناً خاصی مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی اور ناک سوجی ہوئی تھی۔ اس کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی سجاول وغیرہ کی منت سماجت کرنے لگتا، کبھی اپنے پیر و مرشد کا نام لیتا تھا۔ پھانسی کا پھندا اپنے سامنے دیکھ کر اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو اس قیامت خیز رات میں دیکھا تھا جب ''ملنگی ڈیرے'' کے اندرونی حصے میں میرا اور پردے والی سرکار کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ جب میں ملنگی ڈیرے کی غلام گردشوں سے گزرتا خاص الخاص حصے کی طرف جا رہا تھا، میں نے ایک پہرے دار کو ایک جوان ماتحت عورت سے چھیڑ خانی کرتے دیکھا تھا۔ غالباً یہ وہی شخص تھا۔

دفعتاً مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ ملنگ اپنے پیر و مرشد کا نام تو لے رہا تھا مگر کسی اور انداز سے۔ وہ اسے پکار نہیں رہا تھا بلکہ اس کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ وہ کراہنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''پردے والی سرکار کمینی تھی، جھوٹی تھی، دغاباز تھی، وہ حرام کاری کرتی تھی...... وہ اپنے پیو کی ناجائز اولاد تھی۔''

میں حیران رہ گیا۔ میں نے سرگوشی میں فیض سے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ تو پردے والی سرکار کا چیلا ہے۔''

فیض نے طنز سے کہا۔ ''تم نے سنا نہیں ہوا، ڈنڈا پیر، سب کا پیر۔ اب یہ ڈنڈے پیر کا چیلا ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر ساری مریدی شریدی بھول گیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ان لوگوں نے اس سے کہا ہے کہ جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے فراڈیے پیر کو گالیاں دو۔ یہ دے رہا ہے لیکن جان پھر بھی نہیں بچے گی۔''

اور پھر چند منٹ بعد وہی کچھ ہوا۔ اصغر کی بیڑی کھولی گئی۔ سجاول کے ہرکارے اس کے رونے چلانے کی پروا کیے بغیر اسے گھسیٹتے ہوئے، سیاہ گھوڑے کے پاس لے گئے۔ اُسے زبردستی گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ تین چار افراد نے اسے تھامے رکھا۔ ایک نے درخت پر چڑھ کر رسے کا پھندا اصغر کی گردن میں ڈال دیا۔ وہ آخری وقت تک سجاول کو پکارتا رہا۔ اس سے جان بخشی کی التجائیں کرتا رہا۔ مگر سجاول اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ پھندا اصغر کی گردن کے گرد اچھی طرح کسا گیا تو سب سجاول کی طرف دیکھنے لگے۔ سجاول کی مونچھوں تلے ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک شخص نے گھوڑے کو چھڑی رسید کی۔ وہ تیزی سے آگے نکلا اور اصغر ایک جھٹکے کے ساتھ رسے سے جھول گیا۔ اس کے جسم میں چند سیکنڈ کے لیے شدید تڑپ نمودار ہوئی پھر وہ بے جان سا ہو کر ہوا میں لہرانے لگا۔

تماشائیوں نے اس منظر میں تھوڑی بہت دلچسپی تو لی مگر ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایسے سنگین تماشوں کے عادی ہیں۔ چند ایک نے ہوائی فائر کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ سجاول ایک ادھیڑ عمر شخص کو تسلی دینے میں مصروف تھا۔ فیض کی زبانی مجھے پتا چلا کہ یہ شخص اس بندے کا ماموں ہے جو کل رات اصغر نامی اس ملنگ کے پستول سے ہلاک ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اصغر نے پہلے اس کے گھٹنے توڑے تھے پھر اس کے منہ میں پستول رکھ کر فائر کیا، گولی اس کی کھوپڑی توڑ کر نکل گئی۔

اصغر کی لاش درخت پر سے اتار لی گئی اور بے پروائی سے زمین پر پھینک دی گئی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا تو اسے دبائے جانے کے لیے گڑھا تیار کیا جا چکا تھا۔ نجانے اس طرح کے کتنے گڑھے اس پتھریلی زمین میں موجود تھے۔ کتنی بار پھانسی کا پھندا تیار ہوا تھا، کتنی بار گولیوں کی باڑ پر سجاول کے ''مجرموں'' کے جسم اچھلے تھے۔ ان لوگوں کے اپنے اصول، ضابطے تھے، اپنا قانون اور اپنی سزائیں۔

ایک شخص مردہ اصغر کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ سجاول اب یہاں سے اٹھ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ اچانک ایک آواز نے سب کو چونکا دیا۔ یہ آواز اصغر کی لاش پر جھکے ہوئے فیض محمد کی تھی۔ اس نے کچھ کہا تھا پھر وہ اصغر کو ہلانے جلانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اس کی گردن کو گھما پھرا کر دیکھا۔ تب اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے شخص نے اصغر کے پپوٹے الٹے اور آنکھوں کا جائزہ لیا۔

فیض نے بلند آواز سے کہا۔ ''چھوٹے سردار! مجھے لگتا ہے، یہ ابھی زندہ ہے۔''

سردار کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی۔ وہ چبوترے سے اتر کر بے حرکت جسم کے قریب پہنچ۔ قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ فیض نے دونوں ہاتھوں سے اصغر کے سینے کو زور زور سے دبانا شروع کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد سب نے حیرت سے دیکھا کہ اصغر کے جسم میں حرکت نمودار ہو گئی۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب حیران تھے۔ کسی نے اسے اٹھا کر نیم دراز کیا۔ کسی نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

اگلے تین چار منٹ میں یہ ثابت ہو گیا کہ پھانسی پانے کے باوجود اصغر ابھی زندہ ہے۔ اس کی چربی دار گردن خاصی مضبوط تھی پھر شاید اس کے وزن کے حساب سے رسے کی لمبائی کم تھی، یا ایسی ہی کوئی اور وجہ تھی۔ اس کی سانس اور دھڑکن رک نہیں سکی تھی۔

ہجوم زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کچھ لوگ شاید اب اس بات کے خواہش مند نظر آ رہے تھے کہ اگر یہ شخص پھانسی لگنے کے باوجود بچ گیا ہے تو پھر اس کی سزا معاف کر دی جائے۔ مختلف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اصغر کو اب اس درخت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا تھا جس کی شاخ سے اسے پھانسی دی گئی تھی۔ وہ نیم جان تھا، اٹک اٹک کر سانس لے رہا تھا، آنکھیں بند تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ دوبارہ بے ہوش ہو جائے گا۔

سجاول نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ زیرِ لب مسکرایا پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ ''تم لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کیا ہونا چاہیے اس کے ساتھ؟''

سب خاموش تھے۔ جو آٹھ دس افراد اب ملنگ اصغر کی جان بخشی کے حامی نظر آتے تھے، ان میں فیض محمد بھی شامل تھا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''چھوٹے سردار! آپ

جو فیصلہ کریں گے وہی اچھا ہوگا۔''

''پھر بھی تمہاری رائے کیا ہے؟''

فیض محمد نے ذرا توقف سے کہا۔ ''پھاہے لگانے کی سزا (پھانسی) تو اسے بالکل برحق ہوئی ہے سردار...... لیکن اب یہ بچ گیا ہے، شاید اس کا کچھ دانہ پانی ابھی باقی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو اس کی ''موت کی سزا'' معاف کر کے...... اسے کوئی اور سزا دے دی جائے۔''

سردار سجاول نے چند سیکنڈ تک اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے چھوا۔ طائرانہ نظر اردگرد کھڑے لوگوں پر ڈالی۔ محسوس ہوا کہ وہ کوئی نرمی کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹیک بدستور درخت سے لگی ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا مگر لگتا تھا کہ سب کچھ سن رہا ہے۔ اچانک دو دفعہ دھماکے سے گولی چلی۔ اصغر کا جسم دو بار اچھلا اور پھر پشت کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ سجاول کے ہاتھ میں اس کا نائن ایم ایم پستول نظر آ رہا تھا۔

مجمع پر کچھ دیر کے لیے سکتہ سا طاری رہا مگر پھر سب نارمل ہو گئے۔ سردار سجاول نے پستول دوبارہ ہولسٹر میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''کل جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کے بعد یہ معافی کے لائق نہیں تھا۔''

تب وہ اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف مڑا۔ جو کل رات مرنے والے شخص کا ماموں بتایا جا رہا تھا۔ سجاول نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟''

''بالکل ٹھیک چھوٹے سردار۔'' ادھیڑ عمر شخص نے جوش سے کہا پھر آگے بڑھ کر مردہ اصغر کی لاش پر تھوک دیا۔

ایک دم چھاؤں سی ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے سجاول کی سنگ دلی دیکھ کر سورج نے بھی بدلی میں منہ چھپا لیا ہے۔

☆☆☆

خفیہ خط، عبدالرحیم نے کئی روز تک اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رکھا تھا، عبدالرحیم کے بعد اب میں نے یہ خط نیفے میں اڑس لیا تھا۔ تاجور نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ اس خط میں کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بس اوپر کی تین چار سطریں ہی پڑھ سکا ہوں۔

''تو اب باقی بھی پڑھ لیں۔'' وہ اپنے لحاف میں گھستے ہوئے بولی۔

''خط ہوگا تو پڑھوں گا نا۔''

''کیا مطلب؟''

''خط فیض محمد نے لے لیا، بلکہ سمجھو چھین لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مجھے اصطبل کے پاس پڑا ہوا ملا ہے۔ اسے شک ہو رہا ہے کہ یہ خط کل پکڑے جانے والے ''ملنگ جوڑے'' کے لباس میں سے گرا ہے۔ اب وہ اس پر مغز کھپانے میں مصروف ہے۔''

تاجور میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ پتلیوں میں لالٹین کی لو کا عکس تھا۔ لٹیں خم کھا کر بائیں رخسار اور ٹھوڑی کو چھو رہی تھیں۔ یہ لٹیں جیسے اس کے بے مثال چہرے کے عشق میں مبتلا تھیں اور گاہے گاہے جھک کر اس کے رخساروں، ناک اور ٹھوڑی کو بوسے دیتی رہتی تھیں۔ وہ بولی۔ ''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے شاہ زیب کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اس پردے میں سے آپ تو مجھے دیکھ سکتے ہیں لیکن میں آپ کو بالکل نہیں دیکھ پاتی، کسی وقت، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اپنے ہیں لیکن کسی وقت یوں لگتا ہے کہ آپ بہت غیر ہیں...... بہت زیادہ غیر ہیں۔ آپ کے چہرے کے پیچھے کوئی اور چہرہ ہے، جسے دیکھنا بھی میرے لیے محال ہے۔''

''تمہارے واہموں کا علاج میں کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔'' میں نے نیچے چٹائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے ابھی تک اپنے روزگار کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ آپ باہر کے ملک میں کیا کرتے رہے ہیں؟''

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ بچپن سے باکسنگ اور جوڈو کراٹے وغیرہ کا شوق تھا، بعد میں اسی شوق کو آگے بڑھایا اور پیشہ بنا لیا۔ اس کو MMA یعنی مکس مارشل آرٹ کہتے ہیں۔ یورپ میں اس سے اچھے خاصے پیسے بن جاتے ہیں۔''

''لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔ آپ نے ملنگی ڈیرے پر جس طرح بڑے پیر کو مارا۔ اس کے چیلوں پر فائرنگ کر کے ان کو مارا...... اور اس سے بھی پہلے چاند گڑھی میں جس طرح سجاول کے لوگوں سے ٹکر لی...... صرف ایک کھلاڑی تو اس طرح کے کام نہیں کر سکتا۔''

''بات تمہاری جان اور عزت کی حفاظت کی ہوگی تو میں اس سے بڑھ کر بھی کروں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ بولی۔ ''شاید آپ سمجھتے ہوں کہ اس طرح میری نظر میں آپ کا قد کاٹھ بڑھ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یقین کریں جب میں ان باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے آپ سے خوف آنے لگتا ہے......''

اچانک ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ کہیں پاس سے دھما دھم کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ کوئی عورت بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ سبز چولے والی وہی ملنگنی تھی جسے کل پکڑا گیا تھا۔ وہ نیم عریاں تھی اور چلا رہی تھی۔ دو افراد اس کے پیچھے بھاگے اور اسے پکڑ لیا۔ ایک اور ٹارچ بردار بھی آ گیا۔ تینوں نے مل کر اسے بمشکل اٹھایا۔ وہ انہیں ماں بہن کی گالیاں دے رہی تھی پھر اس نے ایک کے منہ پر تھوکا اور اول فول بولنے لگی۔ یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ شاید اسے زبردستی شراب پلائی گئی ہے۔ اس بے وقوف عورت کی حماقت پر افسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً وہ اپنی اندھی عقیدت اور جوش کے ہاتھوں ان ڈکیتوں کے ہتھے چڑھی تھی اور اس مصیبت کا شکار ہوئی تھی۔

تاجور نے بھی کھڑکی سے اس منظر کی تھوڑی سی جھلک دیکھی تھی۔ شکر ہے کہ احاطے میں ناکافی روشنی کے سبب وہ پھٹے لباس والی عورت کو بطور ملنگنی پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اگر وہ پہچان لیتی تو سوال جواب کا ایک اور طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور عقب سے بے خبر رہے۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ پتا نہیں کس وقت گوشت کی پہاڑی ماؤ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ جب تک ہم اسے پلٹ کر دیکھتے وہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی دیکھ چکی تھی۔ شکر تھا کہ اس وقت چٹائی پر سرہانہ اور کمبل وغیرہ نہیں پڑا تھا، ورنہ وہ جان جاتی کہ میں اور تاجور اب بھی اکیلے سو رہے ہیں۔

''یہ چٹائی کیوں بچھا رکھی ہے بچڑے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کھانا ادھر کھا لیتے ہیں نا۔'' میں نے فوراً بات بنائی۔

''ہاں کھانا اکٹھے کھایا کرو اور ایک ہی تھالی وچ کھایا کرو۔ اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔'' ماؤ نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماؤ کے ہاتھ میں کچھ فریم شدہ تصویریں تھیں، بولی۔ ''یہ دیکھو میں نے شہر سے منگوائی ہیں تمہارے لیے۔ تم دونوں کے لیے۔ یہ کمرے میں ہوں گی تو تمہارے لیے بہت چنگا ہوگا۔''

یہ چھوٹے بچوں کی تصویریں تھیں۔ بالکل ننھے منے پیارے پیارے بچے۔ ماؤ بولی۔ ''ان کو دیواروں پر لگاؤ۔ سویرے تک یہ لگ جانی چاہئیں، کھل کھلا کے۔''

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے فدا ہو جانے والی مصنوعی نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں جلد سے جلد تیری بیوی کی گود بھرائی کی رسم ہو۔ یقین کرو مجھے اتنی خوشی ہوگی کہ میں بتا نہیں سکتی کھل کھلا کے۔''

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ تاجور کا شیشے سا شفاف چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ (اور جب وہ سرخ ہوتا تھا تو کمال کر دیتا تھا) وہ خود کو بمشکل چپ رکھے ہوئے تھی۔ ماؤ نے اپنے ڈیڑھ کلو وزنی ہاتھ سے تاجور کے سر پر پیار دیا اور اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے واپس چلی گئی۔

''بچے تو واقعی پیارے ہیں۔'' میں نے فریم شدہ تصویروں کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

''پلیز چپ رہیں۔'' تاجور نے روہانسی آواز میں کہا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ یقیناً یہاں کا سنگین ماحول اس پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔

☆☆☆

میں اور سجاول بند کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سجاول نے حسبِ عادت سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک کش لیا اور بولا۔ ''دو دن پورے ہو گئے ہیں اب کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''کون سا فیصلہ؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا، تمہیں سب کے سامنے اعلان کرنا ہوگا کہ تم نے جوش میں آ کر وہ بات کہہ دی تھی۔ تم مجھ سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور اپنی کہی ہوئی بات پر شرمندہ ہو۔''

''اور میں نے بھی تم سے کہہ دیا تھا کہ میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' میں نے پرسوں کی طرح اپنا تاؤ دلانے والا انداز برقرار رکھا۔ ''ہاں، اس وقت میں تمہارے بس میں ہوں۔ تم جو سلوک چاہو مجھ سے کر سکتے ہو۔''

سجاول کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں تھوڑا سا جان لو......''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں...... اور میں کافی کچھ جان بھی چکا ہوں۔ بلکہ یہ سمجھو کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد ہی میرے اندر تم سے دو دو ہاتھ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا جانتے ہو، اور کیسے؟''

میں نے فیض کا نام لیے بغیر وہ سب کچھ بتا دیا جو چند

روز پہلے مجھے معلوم ہوا تھا۔ وہی خداداد صلاحیت والی بات، جو ہر نسل کے پہلوٹی کے بیٹے میں آتی تھی...... اور اسی طرح کی دیگر باتیں جن میں سے زیادہ تر پر مجھے بالکل یقین نہیں تھا۔

اس نے نشست سے ٹیک لگالی، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اس کے باوجود میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں سوچنے کا ایک اور موقع دینا چاہتا ہوں۔''

''مگر میں یہ موقع لینا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، جو سانپ نکلنا ہے جلد نکل آئے۔''

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''نکلے گا سانپ...... اور تمہیں ڈسے گا بھی۔ مگر ذرا چھری کے نیچے سانس لے لو تو اچھا ہے، پرسوں تک اور سوچ لو۔''

''چلو...... ٹھیک ہے لیکن پرسوں میں بھی ایک چھوٹی سی شرط رکھوں گا۔''

''کیسی شرط؟''

''جس طرح تم میرا فائدہ سوچ رہے ہو۔ میں بھی تمہارا فائدہ سوچ رہا ہوں۔ کوئی ایسی شرط نہیں ہوگی جسے تم مان نہ سکو۔''

پتا نہیں کیوں سجاول کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ میں نے اسے لڑائی کا چیلنج دیا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اور میرے چیلنج کو اہمیت دینے پر مجبور تھا۔ میں نے اس کے بہترین بندے (باقرے) کو دھول چٹائی تھی۔

میں اس کے سامنے سینہ تان کر بیٹھا تھا۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ میں کچھ دیر اور یہاں بیٹھا رہا تو وہ مجھ پر پل پڑے گا۔ وہ پھنکارا۔ ''ٹھیک ہے، اب جاؤ یہاں سے......''

میرے دل میں بھی اس کے لیے کوئی گلزار نہیں مہک رہا تھا۔ اس نے جس بے دردی سے رحیم کو گاڑی تلے کچلا تھا اور پھر جس سفاکی سے ملنگ اصغر کی جان لی تھی، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس کی مٹی میں دور دور تک انسانیت کا نشان نہیں۔

میں باہر نکلا تو دور احاطے کی دوسری جانب جھگڑے کے آثار نظر آئے۔ چھوٹے چشمے کے قریب پہلوان حشمت کی کوٹھڑی کے باہر جمگھٹا سا تھا۔ میں قریب پہنچا تو وڈے سردار اعظم کو بپھرا ہوا پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی اور وہ پہلوان حشمت کو کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا۔ فیض محمد اور فخرو وغیرہ نے اعظم کو سنبھالا ہوا تھا۔ پہلوان کے چہرے پر جیسے ہلدی پھری ہوئی تھی مگر ایک گال پر سرخ مرچوں کا رنگ تھا۔ غالباً یہاں اعظم کا جھانپڑ وغیرہ پڑا تھا۔ پہلوان ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ اب لگتا تھا کہ طوفان گزر چکا ہے۔ گالیاں بکتا ہوا سردار اعظم واپس جارہا تھا۔ اس کی بھاری آواز گونج رہی تھی، تیرے دونوں گٹے توڑ دوں گا...... موٹے، کمینے ہاتھی دو چار دن میں کڑی نگینہ ٹھیک نہ ہوئی تو تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا۔''

یقیناً یہ وہی ہڈی پچی یکی کرنے والا معاملہ تھا۔ فیض اور دیگر افراد نشے میں چور اعظم کو سنبھالتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے جارہے تھے، جب اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑگئی۔ اترا ہوا طوفان ایک بار پھر لہریں مارنے لگا۔ اس نے اپنے چوڑے چکلے جسم کو اشتعال آمیز حرکت دی اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگیا۔ لاٹھی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اوئے، ادھر آتو...... ادھر آ میرے پاس۔''

میں تو وہیں کھڑا رہا لیکن وہ زمین کو پاؤں کے نیچے کوٹتا ہوا میری طرف آگیا۔ لپک کر اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے منہ سے ولایتی شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ کیا سن رہا ہوں میں...... کیا سن رہا ہوں؟''

''کیا ہوا سردار؟'' میں نے پوچھا۔

''اوئے بدبختا...... تو نے سجاول کو لڑائی کا چیلنج دیا ہے؟ اوئے تیری اوقات کیا ہے۔ تو ہتھ جوڑی کرے گا سجاول سے؟ تیرا تو میں ملیدہ بناؤں گا اپنے پاؤں کے نیچے...... مار مار کر تیری یہ ستھن (شلوار) گیلی نہ کردوں تو اعظم نام نہیں میرا۔''

اس نے میرے پیٹ پر لات رسید کرنا چاہی لیکن توازن کھو کر فخرو پر گرا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فخرو نے اس کو بمشکل سنبھالا۔ ایک بھڑک مار کر وہ پھر میری طرف آیا۔ دو گھونسے میرے سینے پر رسید کیے۔ تیسرے گھونسے سے میں نے خود کو بچالیا۔ اس نے مجھے اڑنگا لگا کر گرانے کی کوشش کی اور گرا خود ہی۔

وہ گالیاں بکنے لگا۔ اسی دوران میں سجاول بھی لپکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اعظم نے اب ایک کارندے کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی تھی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔ سجاول نے آکر اسے سنبھال لیا۔ ''کیا ہوا بھائیا...... کیوں شور مچارہے ہو؟''

''میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ہے کیا چیز، یہ تم سے لڑنے کی بات کرتا ہے، میں اسے اتنا ماروں گا...... ابھی

ماروں گا۔''

سجاول نے بھائی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور طیش سے بولا۔ ''کیا کرتے ہو بھائیا! آہستہ بولو۔ ماں سن لے گی تو نیا بکھیڑا کھڑا ہوجائے گا۔''

ماں یعنی ماؤ کے ذکر پر بحیم شحیم اعظم ذرا ٹھنڈا پڑا۔ اتنی سی کسرت سے ہی اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ سجاول نے غصیلے لہجے میں اعظم کو کچھ سرزنش مزید کی، پھر اس کے ہاتھ سے رائفل لے کر کارندے کو واپس کردی۔ فیض کو اشارہ کیا وہ اسے یہاں سے لے جائے۔

فیض اور دیگر افراد اعظم کو دوسری طرف لے گئے۔ وہ مسلسل بک بک کررہا تھا۔ گاہے بگاہے گندی گالیاں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے اس خبیث شخص کی طرف سے دھڑکا ہی رہتا تھا۔ یہ جاناں کو بے حد غلیظ نظروں سے دیکھتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے چھاپنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔ میں جاناں کو دیکھنے اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ یہاں پتھروں کے چوکور بلاکس کو جوڑ کر نو دس فٹ اونچے کمرے بنائے گئے تھے۔ چھتیں لکڑی کی تھیں۔ یہ کمرے باہر سے خستہ حال لیکن اندر سے سجے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سجاوٹ لوٹ مار کی اشیا سے ہی تھی۔ میں ماؤ سے مل کر جاناں کو دیکھنا چاہتا تھا، پتا چلا کہ جاناں کو پھر ہلکا پھلکا بخار ہے اور وہ سوئی ہوئی ہے۔ تاہم آفت جاں مائی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح چست پتلون والے توبہ شکن ڈریس میں تھی۔ بوائے کٹ بال منتشر تھے۔ ایک گرم شال سے بس اس نے اپنے کندھے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی اور کھینچ کر کمرے میں لے گئی۔ میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر بولی۔ ''شاہ زیب! یہ کیا تماشا لگا رہے ہو تم؟ لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش حواس میں نہیں ہو۔ تم نے چاچو سے ''ہتھ جوڑی'' مانگی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس میں اتنا طوفان اٹھانے والی کیا بات ہے؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''طوفان اٹھانے والی بات ہے۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''تمہیں کچھ پتا نہیں، تم نے اپنی بے وقوفی سے چاچو کو بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ وہ تم سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن تم نے اسے سب کے سامنے چیلنج کیا ہے۔''

''تو اس میں کیا ہے؟ وہ یہ چیلنج قبول کرلے۔''

''وہ لڑنے پر آیا تو مار ڈالے گا تمہیں۔ تم اس کی مار کھا کر زندہ نہیں رہو گے۔ ڈیئر جانو! میں تم کو کھونا نہیں چاہتی۔ بڑی مشکلوں سے کوئی ڈھنگ کا بندہ ملا ہے مجھے۔''

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

''تم سجاول کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ ایک عام آدمی ہے۔ میرے لیے تو عام آدمی ہے۔''

''وہ عام آدمی ہوگا لیکن لڑائی کے معاملے میں نہیں ہے۔ اس پر ہاتھ ہے۔''

''ہاتھ ہے؟ کیا مطلب؟''

وہ سنسنی خیز انداز میں بولی۔ ''اس خاندان کے بزرگ، جو کئی سو سال پہلے مرگئے تھے، ان کی روحوں کا سایہ ہے اس پر۔ اس لیے وہ کسی سے مات نہیں کھاسکتا۔ تم ولایت پلٹ ہو۔ شاید ان باتوں پر یقین نہ کرو لیکن یہ ایسا ہی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ سجاول سے لڑنا، روحوں سے لڑنے کے برابر ہے؟''

''نہیں، ایسی بات بھی نہیں لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ چاچو کے مکے میں کوئی خاص طاقت ہے۔ اس سے گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ چاچو نے آخری بار کوئی ڈیڑھ سال پہلے ملاکھڑا کھیلنے والے ایک سندھی پہلوان کو مارا تھا۔ وہ پہلا مکا تو سہہ گیا تھا مگر دوسرے میں اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور میں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا۔ اس بات کو مذاق نہ سمجھو۔''

''میں تم سے اس بارے میں بحث کرنا نہیں چاہتا...... لیکن جو کچھ بھی ہے یہ زور آزمائی کا معاملہ ہوگا۔ اس میں کسی کا مرنا یا کسی کو مارنا ضروری تو نہیں۔''

''لڑائی کے دوران میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر چاچو طیش میں بہہ گیا تو پھر تمہاری جان نہیں بچے گی اور میں یہ بھی نہیں ہونے دوں گی۔ ڈیئر جانو! تمہیں میری لاش سے گزر کر ایسا کرنا ہوگا۔'' وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ آنکھوں میں پختہ ارادے کی جھلک تھی۔

میں نے ذرا توقف کرکے کہا۔ ''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وہ فوراً بولی۔ ''تم سب کے سامنے اعلان کردو کہ تم نے یہ بات غلطی سے کہہ دی۔ تم کو چھوٹے سردار کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا ہے اور تم ان سے لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔''

اس سے ملتی جلتی بات خود سجاول بھی کرچکا تھا۔ جوں جوں ایسی باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، میرے

تجسس اور شوق میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے جسم میں ایک ترنگ سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے جب کبھی بھی اپنے لیے کوئی اچھا حریف دیکھا تھا، میری یہی کیفیت ہوئی تھی۔

بہر حال میں اس موقع پر شعلہ صفت مانی سے کوئی لمبی چوڑی بحث کر کے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اگر تم کہتی ہو تو میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں تمہارے چاچو سے ڈر گیا ہوں۔ میں اس سے کہیں بھی اور کسی بھی وقت دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”تم سوچنے کی بات کر رہے ہو۔ ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرو...... ورنہ تمہاری میری زبردست لڑائی ہو جائے گی اور پھر یہ لڑائی میرے تمہارے تک نہیں رہے گی۔ بات بڑی دور تک جائے گی۔“

اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے نرم رویہ اختیار کیا۔ ”اچھا بابا...... اچھا، جو تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔“

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے اسے باور کرا دیا کہ اس کی کوشش سے میری سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور میں صرف اس کی خاطر، اس مہم جوئی سے پیچھے ہٹنے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں۔ وہ خوش ہو گئی۔ اس نے اوندھے لیٹ کر میری گود میں سر رکھا اور ٹانگیں موڑ کر مجھے اپنے پاؤں کے تلوے دکھائے جو نیچے سے سرخ ہو رہے تھے۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے لیے ڈانس سیکھ رہی ہوں۔ پاؤں فرش پر مار مار کر یہ حال ہو گیا ہے۔“

میں نے دل پر جبر کر کے اس کے تلوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر اس نے اپنے ہونٹوں کو میرے چہرے سے ہم کلام کیا۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک پہاڑی ندی کی طرح ہو جاتی تھی، جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو بہالے جانا چاہتی ہو (مجھے ملنگی ڈیرے والا لڑکا رضوان ٹی یاد آگیا اور ڈاکٹر ارم بھی۔ ڈاکٹر ارم بھی تو اسی طرح رضوان کو اپنی ”اندھا دھند محبت“ کے گھیرے میں رکھتی تھی۔ بہر حال میرے اور رضوان کے معاملے میں فرق تھا۔ میں اپنی ضرورت کے لیے جان بوجھ کر مانی کو خود پر مسلط ہونے دے رہا تھا۔ میرے ذہن نے ڈاکٹر ارم کے بارے میں سوچا۔ پتا نہیں اب وہ جنونی کہاں اور کس حال میں تھی)

چند سیکنڈ بعد مانی پیچھے ہٹی اور شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ”یہ تمہارا منہ ہے کہ ریگ مال ہے۔ شیو کیوں نہیں کرتے ہو؟“

”تمہارے چاچو کا قیدی ہوں۔ قیدیوں کو ایسے ناز نخروں کے لیے ٹائم کہاں ملتا ہے۔“ میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

”لیکن تم میرے ہونے والے ”وہ“ بھی تو ہو۔ میں تمہیں ”چم چم“ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ٹھہرو، میرے پاس ہے شیو کا سامان۔“

وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور الماری کے ایک خانے میں سے پوری ”شیونگ کٹ“ نکال لائی۔ اس نے مجھے نیم دراز کیا۔ میرے ساتھ لگ کر بلکہ مجھ پر لد کر بیٹھ گئی اور میری ٹھوڑی پر کریم لگا کر برش سے جھاگ بنانے لگی۔ اس نے ریزر کے بجائے استرا نکالا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”او، یہ کیا کر رہی ہو۔ گردن کٹ گئی تو میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔ پیچھے ہٹاؤ اسے۔“

”میں تو اسی سے کروں گی اور دیکھنا کیسی چم چماتی مکھڑی نکل آئے گی میرے ڈیئر جانو کی۔“

”بالکل نہیں۔“

”دیکھو، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ مجھے کسی کام سے روکو گے تو میں رکوں گی نہیں۔ میں لڑکی ہوں ذرا اور ٹائپ کی۔ میں شور کروں گی اور ماؤ کو پتا چل گیا تا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو انہیں بے ہوش ہوتے ذرا دیر نہیں لگے گی۔“

”انہیں ایسے بھی بے ہوش ہوتے دیر نہیں لگے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”میری چھاتی پر چڑھ کر جب تم میری گردن پر استرا چلا رہی ہوگی، تو بھی وہ دیکھ کر بے ہوش ہی ہوں گی اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بس آنے ہی والی ہیں۔“

تھوڑی سی تکرار کے بعد اس نے استرا ایک طرف رکھ دیا۔ اور ”ریزر“ سے شیو بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے وارننگ بھی دے رہی تھی کہ اگر میں نے لڑائی کا چیلنج واپس لینے کے حوالے سے اپنا وعدہ توڑا تو پھر وہ واقعی استرا گردن پر رکھے گی اور یہ اس کی اپنی گردن بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ یہاں تک نوبت نہیں آئے گی۔

یہ بے معنی باتیں تھیں۔ اندر خانے میں سجاول سے لڑنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ مجھے اس فیصلے سے ہرگز پیچھے

نہیں ہٹنا تھا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ اس پہاڑی ویرانے میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کمرے میں گیس لیمپ کی روشنی تھی اور انگیٹھی کی حرارت بھی۔ میں اور سجاول ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سجاول کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی کی انگشتری کو گھمایا اور بولا۔ ”اب کیا فیصلہ ہے تمہارا؟“

”وہی جو پہلے دن تھا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے اٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن سگریٹ سلگایا نہیں۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”کب لڑنا چاہو گے؟“

”جب تم چاہو۔ اگر آج چاہو تو میں آج بھی تیار ہوں۔“

”خالی ہاتھ یا ہتھیار کے ساتھ؟“

”میرے خیال میں خالی ہاتھ بہتر رہے گا۔“

”خالی ہاتھ بھی ہم میں سے کسی کی موت ہو سکتی ہے۔“

”ڈرا رہے ہو؟“

”نہیں، بتا رہا ہوں۔“

”ہاں مجھے پتا چلا تھا کہ لڑائی شروع ہونے کے بعد تمہیں روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم حریف کی جان بھی لے سکتے ہو۔“

وہ ہنکارا۔ ”لے سکتا ہوں اور دے بھی سکتا ہوں۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ بہر حال اب تمہیں سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اب اس امتحان کا کوئی نتیجہ نکالنا پڑے گا۔ بتاؤ کب لڑنا چاہتے ہو؟ تین دن بعد ٹھیک رہے گا۔ اتوار کے روز؟“

”جیسے تم مناسب سمجھو، لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا، میری بھی ایک چھوٹی سی شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں چاہتا ہوں، یہ لڑائی بس ہم دونوں کے درمیان ہو۔ کوئی اور دیکھنے والا وہاں موجود نہ ہو۔“

”اس کا مطلب؟“

”جس کمرے میں میری اور باقر کی لڑائی ہوئی تھی، اسی کمرے میں ہم دونوں اکیلے لڑیں گے۔ جو جیتے گا وہ باہر آکر اپنی جیت کا اعلان کر دے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”بس، یہ میری خواہش ہے۔ میں تم سے بالکل اکیلے میں لڑنا چاہتا ہوں۔“

”یہ بات تمہارے حق میں نہیں جاتی۔“ سجاول زہریلے لہجے میں بولا۔ ”کوئی بچانے والا نہیں ہوگا تمہیں۔“

”تو میں کب کہتا ہوں کہ بچنا چاہتا ہوں۔ شاید تمہیں اپنے بچاؤ کا خیال ہے۔“ میں نے بھی زہر خند لہجہ اختیار کیا۔

اس کا سینہ پھول گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلیں، بولا۔ ”اب جاؤ یہاں سے۔“

”میری شرط منظور ہے تمہیں؟“

”ہاں، ہر شرط منظور ہے۔ اب دفع ہو جاؤ۔“ آخری الفاظ اس نے تقریباً چنگھاڑ کر ادا کیے۔

میں اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے سلام کیے بغیر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اگلے روز پہلوان حشمت کچھ مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ وڈے سردار اعظم کی منظورِ نظر نگینہ کی ہڈی ٹھیک بیٹھ گئی ہے اور اس کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے اسے مبارک دی۔ پورا فقرہ تو اس طرح ہونا چاہیے تھا...... ”وڈے سردار کی لاٹھی سے تمہارے دونوں ٹخنے بچ گئے ہیں، تمہیں مبارک ہو۔“

پہلوان نے بھی فوراً وہی موضوع چھیڑا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ بولا۔ ”مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آوت۔ تم مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں، آ بیل مل کر کریں آہ و زاریاں۔ تم سردار کو لڑائی کا چیلنج دے رہے ہو اور جہاں تلک مجھے پتا چلا ہے وہ ایک خطرناک شخص ہے۔ باقر سے جیت کر تمہاری اچھی خاصی عزت بن گئی تھی۔ اب تم نے یہ پنگا لے لیا ہے۔ یہ تو ٹھنڈے دودھ سے پوتوں کو نہلانے والی بات ہے۔“ پہلوان نے افسوس سے سر ہلایا۔

”پہلوان جی، آپ نے پھر دو محاورے جوڑ دیے۔ ایک محاورہ ہے ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارنا اور دوسرا ہے دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ آپ جان کر ایسا کرتے ہیں یا یہ ہو جاتا ہے۔“

”یار بال کی کھال مت اتارا کرو، جو تمہاری اردو ہے وہ بھی میں اچھی طرح جانت ہوں۔ تم واقعی گونگے ہوتے تو بہتر تھا۔ اصل بات سے دھیان ہٹا دیت ہو۔ میں

لڑائی کی بات کر رہا تھا۔ اگر سردار سے مارا ماری میں تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے یا ویسے ہی تمہیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟“

”پہلوان جی، زندگی تو ایسے ہی چلتی رہتی ہے، کسی ایک کے زخمی ہونے یا وفات پا جانے سے پہیا رک نہیں جاتا۔ باقی آپ مجھے اتنا بھی انڈر اسٹیمیٹ نہ کرو۔ سردار جب میدان میں آئے گا تو اسے ایک زبردست حریف ملے گا۔“

”اگر تم جیت گئے تو پھر کیا ہووے گا؟ سردار کے لیے تو یہ بڑی شرمندگی کا مقام ہووے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو کیا منہ دکھاوے گا؟“

”یہ اس کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غیرت کھا کر مجھے ہی سردار بنا دے۔ پھر سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔“

”اتنے بھی خوش فہم نہ بنو۔ ایک بار کسی تمہارے جیسے کے لیے ہی میں نے ایک قطعہ کہا تھا۔

بے وجہ کسی سے لڑا ناہیں کرتے
جوش میں آ کر مسئلہ کھڑا ناہیں کرتے
اک بار کمان سے جو تیر نکل جاتے ہیں
وہ پھر سے کمان میں وڑا ناہیں کرتے۔“

وہ داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”شعر تو اچھے ہیں، لیکن آخر میں آپ نے اس میں پھر پنجابی ٹھوک دی ہے۔ یہ ”وڑا“ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

”وڑا کا مطلب ہووت ہے، داخل ہونا۔ یعنی جو تیر کمان سے نکل جاوت ہے وہ واپس اس میں داخل ناہیں ہو سکتا۔“

”سبحان اللہ...... سبحان اللہ! کیا نکتہ نکالا ہے آپ نے۔ لیکن میں نے سردار کو جو چیلنج دیا ہے، وہ جوش میں آ کر نہیں دیا۔ سوچ سمجھ کر دیا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں اس بندے کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”خود پر اعتماد اچھی بات ہے بھیا۔ لیکن جب اعتماد حد سے بڑھ جاوت ہے تو الٹے بانس بریلی کو ہو جاوت ہیں۔ باقر سے جیت کر تم کچھ زیادہ ہی بپھر گئے ہو۔ تم نے اب تک ولایت میں ہی لڑائی بھڑائی کی ہو گی۔ وہاں کی لڑائی اور یہاں کی مار کٹائی میں بہت فرق ہے۔ لیکن تمہارا وہی حال ہے کہ بندر کیا جانے آنگن ٹیڑھا۔ یہ سردار بھی مجھے پرانی طرز کی لڑائی کا ماہر لگت ہے۔ اس لڑائی کے اپنے داؤ پیچ ہووت ہیں۔ میں اس بارے میں کافی کچھ جانت ہوں۔“

”تو پھر کچھ بتاؤ نا پہلوان جی۔“

”کب پروگرام بنایا ہے تم نے اس بے وقوفی کا؟“

”اتوار کے دن۔“

”دو ڈھائی روز میں کیا ہو سکت ہے۔ پھر بھی اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں کچھ موٹی موٹی باتیں بتا سکت ہوں۔ تمہیں جب بھی ٹائم ملے آ جایا کرو۔“

”چلیں، اب تو آیا ہوا ہوں، کچھ بتا دیں۔“

اگلے دس پندرہ منٹ کافی دلچسپ رہے۔ پہلوان حشمت راہی جس طرح شاعری میں خود کو مرزا غالب سمجھتا تھا اسی طرح پہلوانی میں بھی رستم ہند سے کم نہیں تھا۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، اور مجھے کافی کرتب سکھائے۔ مقامی طرز کی زور آزمائی میں جو الفاظ استعمال ہوتے تھے، ان کی تفصیل بھی پہلوان نے مجھے سمجھائی اور ان داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ بھی کیا...... جیسے لانگڑی، دھوبی پٹکا، قینچی، سیدھی اور پٹھی وغیرہ۔ میں پہلوان کی دل شکنی کیسے کر سکتا تھا، جو کچھ وہ بتاتا رہا، میں پوری سنجیدگی اور دلچسپی سے سیکھتا رہا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ سب کچھ تو جوڈو کی الف ب میں بھی شامل ہے، اور میں ان چیزوں سے کافی آگے ہوں۔ درحقیقت وہ MMA کے ایک یورپی چیمپئن کو بالکل ابتدائی گر سکھا رہا تھا۔ مجھے اس کی سادگی اور اپنائیت اچھی لگ رہی تھی اور یہی چیز زیادہ اہم تھی۔ ایک دو بار مجھے بتاتے بتاتے وہ خود گر پڑا اور اس نے خفت مٹانے کے لیے اپنے اس گرنے کو اپنے داؤ کا حصہ بتایا۔ میں نے شد و مد سے سر ہلا کر اس کی بات تسلیم کی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مزیدار اور مخلص شخص تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن دوپہر کے وقت تک اس لڑائی کا خوب چرچا رہا جو متوقع طور پر میرے اور سردار سجاول کے درمیان ہونے والی تھی۔ زیادہ تر لوگ مجھے ترحم آمیز نظروں سے ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے نزدیک میں بس ایک چلتی پھرتی لاش تھا۔ بہرحال دوپہر کے بعد میں نے احاطے میں ایک شامیانہ لگتے ہوئے دیکھا، شامیانے میں ایک طرف اسٹیج بنایا گیا تھا اور گیس کے ہنڈولے بھی لٹکائے جا رہے تھے۔ میں نے فیض محمد سے پوچھا۔ ”یہ کیا تیاری ہے؟“

وہ بولا۔ ”چھوٹے سردار کے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ایک دو روز یہاں رہیں گے۔“

”لیکن وہ...... میرا اور سجاول والا معاملہ......؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہاری کوئی نیکی کام آئی ہے۔ تمہارا برا وقت کچھ دیر کے لیے ٹل گیا ہے۔“

”لیکن آ کون رہا ہے؟“

”یہ تو چھوٹا سردار ہی جانتا ہے۔“ فیض نے بات گول کی اور شامیانے کی طرف چلا گیا۔ یہاں دو تین دیگیں بھی جھلک دکھا رہی تھیں۔ احاطے کی صفائی وغیرہ بھی ہو رہی تھی۔ مجھے گوشت بھونے جانے کی خوشبو آئی اور میرے علم کے مطابق یہ ہرن کے گوشت کی خوشبو تھی۔

فیض سے آٹھ دس منٹ بعد ہی دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ پہلوان حشمت بھی دکھائی دے رہا تھا۔ پہلوان حشمت کو ہمارے ساتھ والے ایک اسٹور روم میں ٹھہرا دیا گیا۔

میں نے فیض سے پوچھا۔ ”اب اس کو کس سزا میں یہاں بند کر رہے ہو؟“

فیض بولا۔ ”سزا نہیں، احتیاط ہے اور یہ احتیاط تمہارے اور تاجور کے لیے بھی ہے۔ چھوٹے سردار کا حکم ہے کہ اگلے دو تین روز تک تم بھی پہلوان کی طرح اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔“

”وہ کس خوشی میں؟“

”اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“ فیض نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہارا وہ چاند گڑھی والا دشمن عالمگیر ضمانت پر رہا ہو گیا ہے اور موج میلے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ سردار سجاول نہیں چاہتا کہ تم اس کے سامنے آؤ۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ فیض کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ عالمگیر ضمانت پر رہا ہو کر یہاں آ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے ساتھ اس کا دستِ راست اسحاقا بھی ہو اور اسحاقا خود کو تاجور کا دعویدار سمجھتا تھا۔ سجاول مجھے اور تاجور کو عالمگیر وغیرہ کی نظر سے بچانا چاہ رہا تھا۔ اگر عالمگیر مجھے اور تاجور کو اس سے مانگ لیتا تو سجاول کی ماں یہ کبھی برداشت نہ کرتی۔ وہ تو اپنے دیوانے پن میں مجھے تقریباً تقریباً مانی کا خاوند ہی سمجھ چکی تھی۔ عالمگیر کی ضمانت پر رہائی اور یہاں آمد کا سن کر میرے خون کی گردش بڑھ گئی۔ وہ خبیث سو فیصد مولوی فدا کا قاتل تھا مگر قانون ٹھوس ثبوت مانگتا تھا اور ٹھوس ثبوت جو مؤذن عبدالرحیم کی شکل میں تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔

شام کے فوراً بعد ہی مجھے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی میں سے عالمگیر کے درشن ہو گئے۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے سجاول کے پہلو میں چلتا شامیانے کی طرف جا رہا تھا۔ سجاول کے کسی کارندے نے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈال دیا تھا۔ ایسا ہی ہار ایک اور شخص کے گلے میں بھی نظر آ رہا تھا اور یہ وہی بدفطرت اسحاق عرف ساقا تھا۔ جس نے چاند گڑھی میں تاجور اور اس کے گھر والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ڈھول پر چوٹ پڑ رہی تھی اور تین چار افراد بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ یہ سب کے سب پیگ لگائے ہوئے تھے اور ترنگ میں تھے۔ شامیانے میں سریلے قہقہے گونج رہے تھے اور گھونگروؤں کی چھنا چھن تھی۔ یقیناً یہ وہ طوائفیں تھیں، جنہیں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر شہر سے یہاں لایا گیا تھا اور اب انہیں دو تین راتوں تک یہاں اپنے قدردانوں کا ”دل بہلاوا“ کرنا تھا۔

میں دل ہی دل میں ماؤ کے ”دیوانے پن“ کو داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ اگر ماؤ والی مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً سجاول نے مجھے اور تاجور کو اپنے زمیندار دوست کے حوالے کر دینا تھا۔ وہ غرض کا بندہ تھا۔ اگر اس کی غرض نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی آنکھوں کے سامنے میرے ٹکڑے کروانے اور تاجور کو بے آبرو کرانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتا۔

بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو پورے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے کھانا کھایا گیا پھر شامیانے میں محفل نشاط شروع ہو گئی۔ رقاصائیں لوفر اردو اور پنجابی گانوں پر ناچ رہی تھیں۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے مگر ان کی آوازیں تو ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے، شاہ زیب! میرا سر پھٹ جائے گا۔“ تاجور نے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ جس طرح پی پلا رہے ہیں، ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان میں سے زیادہ تر نے لمبا لیٹ جانا ہے۔“

”مگر یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں شاہ زیب! انہوں نے آج ہمارے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ پہلوان حشمت کو بھی ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا ہے۔“

”شاید یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے مہمانوں کے سامنے نہ آئیں۔“

''ایسا کیوں چاہتے ہیں یہ لوگ؟ کہیں مہمانوں کا تعلق ہمارے چاند گڑھی سے تو نہیں؟''

تاجور کی قیافہ شناسی حیران کن تھی۔ میں نے اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگایا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کی جان کا سب سے بڑا دشمن اس کا منگیتر ساقا یہاں آن موجود ہوا ہے، اور اس کے ساتھ خطرناک عالمگیر بھی جیل کی چند روزہ ہوا کھانے کے بعد اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

راگ رنگ اور لوفر گانوں والی محفل اپنے عروج پر پہنچی تو پٹاخے چھوٹنے شروع ہو گئے اور کسی ٹن ڈکیت نے آتش بازی شروع کر دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ شامیانے کے پاس سے چلائی گئی ایک ہوائی ہمارے کمروں کے قریب رکھے بھوسے کے ڈھیر پر گری اور آناً فاناً شعلوں کی سرخی نمودار ہونے لگی۔ سچ کہتے ہیں کبھی کبھی انتہا کی بدمستی و خرمستی کا نتیجہ انتہا کی پریشانی کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم جن کمروں میں تھے، ان کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکڑیوں اور دروازوں نے آگ پکڑ لی۔ ہمارے والے کمرے میں بھی حدت بڑھ گئی اور دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ آگ لگنے کے فوراً بعد شامیانے میں دادِ عیش دیتے ہوئے لوگ محفل چھوڑ کر آگ کا تماشا دیکھنے نکل آئے۔ تاجور چلّا رہی تھی۔ ''شاہ زیب! مجھے باہر نکالو۔ میری سانس بند ہو رہی ہے۔'' (دھوئیں سے بچنے کے لیے میں نے اپنا منہ سر بستر کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا)

میں نے دھڑا دھڑ دروازہ کوٹنا شروع کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ ابھی تک آگ سے محفوظ تھا۔ مگر شعلے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جس وقت میں اپنے کندھے کی ضربوں سے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا، مصیبت آسان ہو گئی، فیض محمد کے بری طرح کھانسنے کی آواز آئی۔ کھانسنے کے ساتھ ساتھ وہ دروازے کے قفل میں چابی گھما رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد ہم آتش زدہ کمرے سے باہر تھے۔ تاجور دھوئیں کے سبب اس بری طرح کھانس رہی تھی کہ لگتا تھا اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے یا وہ بے ہوش ہو جائے گی۔

ان نازک گھڑیوں میں بھی مجھے یہ بات یاد رہی کہ اردگرد موجود لوگوں کو تاجور کی صورت نظر نہیں آنی چاہیے۔ ان لوگوں میں عالمگیر اور ساقا بھی موجود ہو سکتے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ تو دھوئیں سے بچنے کے لیے چادر میں لپیٹ رکھا تھا، مگر تاجور نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی اوڑھنی سے ہی اس کا چہرہ چھپا دیا۔ وہ افراتفری میں کچھ چھپ سکا، کچھ نہیں۔

سجاول کے تین چار کارندوں نے ہمیں اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا تھا۔ ہم بُری طرح کھانستے اور جھک کر بھاگتے ہوئے آتشزدگی والی جگہ سے آگے نکل آئے۔ کچھ دیگر افراد بھی ہماری ہی طرح .... کھانس رہے تھے اور ابکائیاں لے رہے تھے۔ ایک پہرے دار فرش پر بے سدھ پڑا تھا، اس کے لباس کا دو تہائی حصہ جل چکا تھا اور اسے عریاں کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ آگ نے تیزی سے پھیل کر قریب کے تین چار کمروں اور دو سائبانوں کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔

سجاول کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''چشمے کی طرف سے پانی لاؤ۔''

ایک دوسری آواز اُبھری۔ ''ڈرموں میں بھی پانی ہے، جلدی کرو۔''

سجاول کے کارندے پوری کوشش کر رہے تھے کہ آگ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اچانک میرے پورے جسم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلوان کا خیال آیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ والے کمرے میں بند تھا۔

تاجور کو ایک ستون کے ساتھ بٹھا کر میں نے پھر آگ سے متاثرہ حصے کی طرف لپکنا چاہا مگر فیض محمد نے مجھے تھام لیا۔ ''نہیں شاہ زیب، وہ تمہارا یار پہلوان نکل آیا ہے۔ بے ہوش ہے لیکن بالکل بچ گیا ہے۔''

میں نے تاجور کو دیکھا۔ وہ بھی بالکل محفوظ رہی تھی مگر دھوئیں کی مار نے اسے نیم جان کر رکھا تھا۔ میں نے دور ماؤ کو دیکھا۔ وہ مست ہتھنی کی طرح بھاگتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر فاصلے سے ہی دونوں ہاتھ پھیلا لیے۔ ''ہائے میرا بچڑا۔'' اس نے نعرہ بلند کیا اور آ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ مجھے یقین تھا آج پھر تین چار کالے بکروں کی قربانی ہو کر رہے گی۔

بدمستی کے سبب لگی ہوئی اس آگ میں تین کمرے اور دو سائبان جل کر خاکستر ہو گئے۔ دو بندے جان سے گئے۔ تین چار زخمی ہوئے۔ ایک خچر کے علاوہ دو بھینسیں بھی لقمۂ اجل بنیں۔ تاجور کو ماؤ اور مائی کے پاس چھوڑ کر میں پہلوان کی خبر گیری کے لیے گیا۔ وہ عارضی طور پر فیض محمد کے کمرے میں ہی لیٹا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔

فیض محمد نے بتایا۔ ''یہ تم دونوں سے پہلے ہی اپنے کمرے سے نکل گیا تھا۔ کمرے میں دھواں بھرا تو اس نے دروازے کو ٹکریں ماریں۔ دروازے کی کنڈی کمزور تھی اکھڑ گئی اور یہ باہر نکل آیا۔''

''مگر بے ہوش کیسے ہوا؟''

''لگتا ہے کہ اس میں خدا ترسی ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ ایک بندہ ساتھ والے کمرے میں پھنسا ہوا تھا، اس کی آوازیں سن کر یہ پھر اندر کو لپک گیا۔ وہ بندہ تو صحیح سلامت باہر آ گیا لیکن یہ دم گھٹنے سے بے ہوش ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ آگ سے بچا رہا۔ بعد میں اسے بھی نکال لیا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''دل کا بڑا اچھا بندہ ہے، یہاں بھی تو اسی لیے پھنسا ہے کہ کسی کی مدد کر رہا تھا۔''

سارا جشن سوگواری کی کیفیت میں بدل گیا تھا۔ اگلے روز مرنے والے ایک شخص کی تدفین ہوئی، دوسرے کی لاش کسی نامعلوم مقام پر بھیج دی گئی۔ آگ میں گھرنے اور سینے میں دھواں بھرنے سے تاجور کی طبیعت خراب تھی۔ وہ الٹیاں کرتی رہی تھی۔ ماؤ کا دماغ بس ایک ہی طرف کام کرتا تھا۔ وہ ان الٹیوں کو بھی کسی اور نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کمرے میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں بھی بیڈ موجود تھا۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہو گا جب سردار سجاول نے مجھے پھر اپنے پاس طلب کیا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا اور کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھ پر انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''کل رات گڑبڑ ہو گئی ہے، عالمگیر نے تاجور کو دیکھ لیا ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد تم دونوں کمرے سے نکلے تو اس کی نظر تاجور پر پڑ گئی۔''

''میں نے تو کافی احتیاط کی تھی۔'' میں نے کہا۔

سجاول نے حسبِ عادت سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو اپنی طرف سے کوشش کی تھی کہ تم دونوں عالمگیر کی نظر میں نہ آؤ...... لیکن اب وہ جان گیا ہے کہ تم دونوں یہاں ہو، اب کچھ کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے ایک اور کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''عالمگیر سے پرانا دوستانہ ہے۔ میں اس سے اپنے تعلقات نہیں بگاڑ سکتا اور میں نے تم سے یہ بات کہی بھی تھی۔''

''کون سی بات؟''

''میں نے کہا تھا کہ اگر عالمگیر اور اس کا یار جیل سے باہر آ گئے اور انہوں نے تاجور کو مانگا تو تمہیں اس کو دینا پڑے گا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا۔ عالمگیر اور ساقے نے تاجور کو یہاں دیکھ لیا تھا اور اب اسے سجاول سے مانگ رہے تھے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' سجاول نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''تم جانتے ہو سجاول، وہ میری بیوی ہے...... اور میں اسے بہت چاہتا ہوں۔''

''کیا کالج کے منڈوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ محبت، یہ عشق معشوقی، یہ سب بیکار لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ عورت مزہ لینے والی چیز ہے، اور بس۔ تم نے بھی اس کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ مزہ کیا ہے۔ اب کوئی اور دیکھ لو۔ بلکہ میں خود انتظام کر دیتا ہوں تمہارے لیے۔ جہاں تک خاوند بیوی والی بات ہے، وہ بھی میں چنگی طرح جانتا ہوں۔ تم نے تاجور کو بھگایا ہے، پتا نہیں کس کالے چور کے سامنے نکاح کیا ہے تم نے، اور کیا بھی ہے یا نہیں۔''

''وہ میری بیوی ہے سجاول۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''تو کیا بیوی کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ طلاق نہیں دی جا سکتی؟'' وہ گرج کر بولا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''یہی ہو گا۔ آرام سے مان جاؤ گے تو اچھا ہے، ورنہ ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں گی۔''

''لیکن تمہاری والدہ کا کیا بنے گا؟ وہ تو ہر صورت مجھے داماد بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' میں نے پینترا بدلا۔

''میں صرف تاجور کی بات کر رہا ہوں، تمہاری نہیں۔ تم ہمارے پاس ہی رہو گے اور یقیناً مانی کے شوہر بھی بنو گے۔ میں نے عالمگیر کو اپنی مجبوری بتا دی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اور اس معاملے کا کیا ہو گا جو تمہاری والدہ کے دماغ میں سمایا ہوا ہے، یعنی تاجور امید سے ہو گی اور حمل میں اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے گی، جس کے بعد میں مانی کا شوہر بنوں گا۔ تمہارے پیر و سائیں نے یہی فرمایا ہوا ہے۔''

''تم پریشان کیوں ہوتے ہو، یہ ہمارے سوچنے کی باتیں ہیں۔''

''پھر بھی، اس کا کیا حل نکالو گے؟''

وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''جب وہ تمہاری منہ بولی بیوی یہاں سے دفع ہو جائے گی تو ہم ماں جی کو بتا سکتے ہیں کہ وہ امید سے تھی اور اس کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔'' سجاول کی آنکھوں میں عیارانہ چمک تھی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تاجور کو عالمگیر اور ساقے کے حوالے کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ بالکل جیسے وہ کوئی نایاب رائفل یا خوب صورت جانور اپنے ایک ساتھی سے لے کر دوسرے ساتھی کو دے دیتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! میں تاجور کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ہر قیمت چکانے کو تیار ہوں۔''

''زبان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی شاہی! اور میں عالمگیر کو زبان دے چکا ہوں۔ تم ایک دو راتوں کے لیے اس کڑی کے ساتھ اور ''دل پشوری'' کر لو، پھر تمہیں اس کو میرے حوالے کرنا ہو گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

وہ میرے لیے بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ سجاول نے جو باتیں کہی تھیں، وہ انگاروں کی طرح میرے سینے میں دہک رہی تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے رازداں فیض محمد سے بھی بات کی تھی، اس نے بھی یہی بتایا تھا کہ آتش زدگی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہوا ہے، ورنہ شاید کہ میری اور تاجور کی یہاں موجودگی کا علم عالمگیر وغیرہ کو نہ ہوتا اور وہ دو دن یہاں موج میلہ کر کے واپس چلے جاتے۔ اب چونکہ راز کھل گیا تھا، اس لیے سجاول نے دوستی کا بھرم رکھنے کے لیے عالمگیر کے سامنے بہانہ بنایا تھا کہ کل رات جشن کے بعد وہ خود ہی مجھے اور تاجور کو اس کے (عالمگیر کے) سامنے لانے والا تھا، یعنی یہ ایک طرح سے عالمگیر اور ساقے کے لیے سرپرائز ہوتا۔

صورتِ حال سنگین تھی۔ سجاول جیسے بے رحم اور پتھریلے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا لیکن میرے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا موجود تھا اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ کام کرے گا۔ میں نے اس پتے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سجاول، زمیندار عالمگیر کو اپنا دوست و ہمنوا قرار دیتا تھا۔ وہ دونوں مل کر چاند گڑھی اور ارد گرد کے علاقے میں دہشت پھیلا رہے تھے۔ لوگوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کرتا جا رہے تھے لیکن ایک دوسرا معاملہ ایسا بھی تھا جس میں عالمگیر تنہا پرواز کر رہا تھا اور اس معاملے کی سجاول کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ کم از کم اس ''خط'' سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

میں نے اپنی شلوار کے نیفے میں سے وہی مڑا تڑا خط نکالا جو عبدالرحیم کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا اور جس کا عقدہ تاجور نے کھولا تھا۔ اس خط میں عالمگیر نے سجاول کو نفرت کے انداز میں سجاولا لکھوایا تھا اور اس خط کے الفاظ میں کسی گہری سازش کے تار و پود تھے۔ کسی ''بڑے صاحب'' کی بات تھی، اور ایک لڑکی کے لیے قریباً کروڑ روپے کی رقم کا ذکر تھا۔ اس طرح کی کئی اور ناقابلِ فہم باتیں تھیں۔ میں دیر تک اس خط کو دیکھتا رہا، پھر حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

سجاول کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ خط اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ عالمگیر نے ہی لکھوایا ہے؟''

''یہ عالمگیر کے منشی کی لکھائی ہے سجاول، اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عالمگیر نے نہیں لکھوایا تو تم میری گردن اتروا دینا، میں اپنا خون تمہیں ابھی معاف کر دیتا ہوں۔''

اس نے اٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگایا پھر دوبارہ اپنی رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ صبح نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ عالمگیر، ساقا اور بڑے بڑے پگڑوں والے مہمان ابھی تک سو رہے تھے۔ شاید یہ رات کو پیتے پلاتے رہنے کا اثر تھا۔ سجاول نے کھڑکی سے باہر چٹانوں کے پیچھے سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے۔ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے؟''

''ابھی تک تو یہی پتا چل رہا ہے کہ جس طرح مولوی فدا کی بیٹی کو کھانے میں تھوڑا تھوڑا زہر دیا جاتا رہا ہے، اسی طرح ایک دو اور لڑکیوں کو بھی دیا جا رہا ہے۔ اس طرح ان کو کہیں فروخت کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔''

''اور خریدنے والا وہ ''بڑا صاحب'' ہے؟''

''بالکل...... اور یہ بڑا صاحب کوئی چھوٹی موٹی قیمت ادا نہیں کر رہا۔ یہ کروڑوں کا معاملہ ہے۔''

سجاول کی آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی۔ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے خط پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔ ''اس میں کسی لوروتا می جگہ کا ذکر ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ''بڑا صاحب'' وہیں پایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جگہ چاند گڑھی کے آس پاس ہی کہیں ہو۔''

''لیکن زیادہ آس پاس نہیں ہو گی۔ خط کے لفظوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''خیر، اس کا پتا تو چل جائے گا۔'' سجاول نے

جبڑے بھینچ کر کہا۔ ''میں نے اس کے تاثرات دیکھے۔ میرا قیاس درست تھا کہ وہ عالمگیر کے منشی کے بارے میں سوچ رہا ہے، جس نے یہ خط لکھا ہے۔ اس منشی کو رازداری سے پکڑ کر یہاں لے آنا، سجاول جیسے بندے کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ بہرحال میں صبح سویرے کی اس بات چیت سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ پورا ہو رہا تھا۔ سجاول اور عالمگیر کے تعلق میں ایک دراڑ نمودار ہوگئی تھی اور ہر گزرنے والے پل کے ساتھ یہ دراڑ پھیل رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! یہ ایک بڑا سنہری موقع ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو کوئی بہت موٹی اسامی ہمارے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ میں ڈنمارک میں ایک ایسے ترک سے ملا تھا جو خود کو زہریلے سانپوں سے ڈسواتا تھا۔ اس کا جسم اس طرح کا ہوگیا تھا کہ اس پر عام زہر اثر ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس ترک سے رابطہ کر کے اسے یہاں بھی بلا سکتے ہیں......''

میں بات کر رہا تھا اور سجاول کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں بڑھتی جارہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نرمی کی جھلک تھی۔ بہرحال میں جانتا تھا کہ اس نرمی کے پیچھے ''مشترکہ مفاد'' چھپا ہوا ہے۔ ورنہ سجاول جیسے لوگ کسی کو رحم کی نظر سے کم ہی دیکھتے ہیں۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

میں نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے تو یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیوی کو عالمگیر کے حوالے کرنے کا فیصلہ واپس لے لو۔''

''یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس بارے میں سوچتا ہوں۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو کوئی اور شرط نہیں، اگر میں اور تاجور یہاں حفاظت سے رہ سکیں، تو پھر تم جو کہو گے، میں کروں گا۔''

''اور وہ جو تم نے مجھ سے ہتھ جوڑی مانگ رکھی ہے...... اس معاملے کا کیا ہوگا؟''

''وہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔ ہاں، ہم اس کو کچھ آگے کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اس کا کوئی حل بھی نکل آئے۔'' میں نے اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی۔ (پھر بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ اپنا چیلنج واپس لے کر معافی مانگوں گا)

اتنے میں کسی قریبی کمرے سے عالمگیر کے کھانسنے کی آواز آنا شروع ہوگئی۔ وہ جاگ گیا تھا۔ ہمیں اپنی گفتگو منقطع کرنا پڑی۔ وہ خط سجاول نے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں تاجور کے پاس واپس آگیا۔ تاجور آشزدگی کے بعد سے گم صم سی تھی۔ گاہے بگاہے اس کا دل بھی متلانے لگتا تھا۔

اگلی صبح بڑے عجیب طریقے سے طلوع ہوئی۔ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چٹائی پر سے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ ماؤ صبح سویرے ہمارے کمرے کے معائنے کے لیے آدھمکی ہے۔ میں نے تاجور کو جگانا چاہا مگر وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں نے سمجھا، شاید وہ غسل خانے میں ہو۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ غسل خانے کے دو دروازے تھے، باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے چپٹی ناک والا فخرو کھڑا تھا۔ بولا۔ ''گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''لگتا ہے کہ...... آپ کی بیوی...... کہیں چلی گئی ہے۔ یہاں کہیں بھی نظر نہیں آرہی۔ وہ اختری بھی غائب ہے۔''

''کیا بک رہے ہو۔'' میں اسے دھکا دیتے ہوئے باہر نکل آیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے احاطے اور طویل برآمدے میں افراتفری نظر آئی۔ مسلح افراد حرکت کر رہے تھے۔ برآمدے کے آخری سرے پر سجاول پریشان سا کھڑا تھا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا عالمگیر بھی اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ مجھے اپنا سر بھاری اور چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے بابے فیض سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کہاں ہے تاجور؟''

اس سے پہلے کہ فیض کچھ کہتا، بیرونی گیٹ کی طرف سے ایک پہرے دار کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

ہم تیزی سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ کی طرف گئے۔ دیگر افراد کی طرح سجاول اور عالمگیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ گیٹ کے پاس پتھروں کے پیچھے دو پہرے دار بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے قریب ہی حقہ اور قہوے کے پیالے وغیرہ پڑے تھے۔

''لگتا ہے کہ یہ قہوہ پینے سے بے ہوش ہوئے ہیں۔'' سجاول نے موقع دیکھنے کے بعد اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اور رات کو قہوہ تو اختری ہی بنا کر ان لوگوں کو دیتی ہے۔'' فخرو نے کہا۔

''اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ حرام زادی...... اختری کے ساتھ یہاں سے بھاگی ہے؟'' وڈا سردار اعظم بولا۔

''دیکھنے میں تو یہی لگ رہا ہے جی۔'' فیض نے کہا۔ اس کے چہرے سے شدید پریشانی عیاں تھی۔

میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ ابھی کچھ بھی واضح نہیں تھا، لیکن اگر تاجور کے گم ہونے میں سجاول یا پھر عالمگیر وغیرہ کا ہاتھ تھا تو پھر یہاں ایک قیامت برپا ہوسکتی تھی۔ ابھی ان لوگوں نے میرا صرف ایک روپ دیکھا تھا۔

میری نظر اسحاق عرف ساتے پر پڑی۔ وہ عالمگیر کے پہلو میں کھڑا تھا اور میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہاں یہ ہمارا پہلا آمنا سامنا تھا۔ ساتے کی آنکھوں میں میرے لیے شدید رقابت اور جلن تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا تمسخر بھی تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ بڑے گھنے نکلے ہو تم۔ دین محمد کا گونگا ملازم بن کر ہم سب کو الو بنایا...... اور نمک حرامی کرتے ہوئے اس کی دھی کو لے اڑے۔ ممکن تھا کہ وہ واقعی مجھ سے کوئی تلخ ترش بات بھی کر گزرتا، لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا۔

اتنے میں ماؤ بھی جھومتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ ''ہائے ربا! یہ کیا ہوگیا۔ مجھے پہلے ہی اس کڑی کی آنکھ میں سؤر کا بال نظر آتا تھا۔ کس کے ساتھ بھاگی ہے؟ کیا لے کر بھاگی ہے، میرا ابجڑ اتو ٹھیک ہے نا۔''

وہ میری طرف لپکنا چاہ رہی تھی مگر سجاول نے اسے راستے میں روک لیا اور سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گیا۔

میں نے تاجور کے دل کی گہرائیوں میں جھانکا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے اس سارے معاملے میں کوئی چکر لگ رہا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں صبر کا مظاہرہ کروں اور تھوڑا انتظار کروں۔ ہوسکتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر سامنے آتی...... اور میں نے واقعی انتظار کیا اور خود کو سنبھالتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا سر بدستور بھاری تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے سجاول کی شکل دوبارہ نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں شاہی، تاجور کا پتا چل گیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' میں بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا اور مجھے کمرے کے عقبی دروازے سے نکالتا ہوا ان شکستہ زینوں کی طرف لے آیا جو تہ خانے میں اترتے تھے۔ اسی تہ خانے کے ایک کمرے میں مؤذن عبدالرحیم بند رہا تھا۔ سجاول نے جیب سے چابی نکال کر بڑے دروازے کا تالا کھولا۔ سامنے کمرے کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا، اسے باہر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ کھڑکی کی گرل میں سے، مجھے جو پہلی صورت دکھائی دی، وہ اختری ہی کی تھی پھر مجھے تاجور نظر آئی۔ وہ فرشی بستر پر دراز تھی اور نیم غنودگی میں دکھائی دیتی تھی۔ میرا سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے بھر گیا۔

سجاول نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ یہاں بالکل خیریت سے ہے، اختری اس کے پاس ہے۔ اس کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی میں تھوڑی دیر میں یہاں پہنچا دوں گا۔''

''اس ڈرامے کا مطلب؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تھوڑا بہت تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ میں عالمگیر سے بگاڑنا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف تمہاری ''بات'' رکھنا بھی ضروری ہے، ہم اس کڑی کو خود سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں...... اور ان مجبوریوں کی وجہ سے درمیانی رستہ نکالنا پڑا۔''

بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عالمگیر کو مطمئن کرنے کے لیے سجاول نے بڑی رازداری سے تاجور کے فرار کا ڈراما رچایا تھا۔ مجھ سمیت سجاول کے دیگر ساتھی بھی اس ڈرامے سے بالکل بے خبر تھے، یہی وجہ تھی کہ سچویشن میں حقیقت کا رنگ بھر گیا تھا۔ اختری اور فخرو کے علاوہ صرف ایک اور کارندے کو اس صورتِ حال کی خبر تھی۔ اس واقعے سے سجاول کی بے پناہ عیاری کا پتا بھی چلتا تھا۔ سجاول کی بات سے معلوم ہوا کہ ہمارے رات کے کھانے میں نشہ آور دوا ملائی گئی تھی۔ یہی دوا بعدازاں دو پہرے داروں کے قہوے میں بھی ملائی گئی مگر یہ زیادہ مقدار میں ملائی گئی اور وہ اب تک بے ہوش تھے۔ ہمارے کمرے کے غسل خانے کا دوسرا دروازہ باہر سے چابی لگا کر کھولا گیا اور تاجور کو بڑی احتیاط سے نکال کر تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ تب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

سجاول نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اب اس معاملے کو نبھانا ہوگا۔ یہی ظاہر کرنا ہوگا جیسے تاجور واقعی لاپتا ہوگئی ہے اور ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کم ازکم جب تک عالمگیر یہاں ہے ہمیں یہ ایکٹنگ کرنی پڑے گی۔''

''اور یہ کب تک یہاں ہیں؟''

’’شاید، ایک یا دو دن۔‘‘

مجھے کچھ ضروری باتیں سمجھانے کے بعد سجاول واپس چلا گیا۔ میں وہیں اختری اور تاجور کے پاس موجود رہا۔ اختری کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے آرہا تھا اور مجھے قدرے حیران بھی کررہا تھا۔ اس کی موٹی شال کے نیچے ہولسٹر موجود تھا اور اس میں باقاعدہ پستول لگا ہوا تھا۔ ایک زنانہ پہرے دار کی طرح وہ بالکل چوکس نظر آتی تھی۔ اس کے گلے میں ایک تسبیح بھی ہوتی تھی جو اس کے مذہبی رجحان کا پتا دیتی تھی۔ وہ غالباً سجاول کے وفادار ترین ملازموں میں سے تھی۔

تاجور نے اب کسمسانا شروع کردیا تھا۔ وہ مچی مچی آنکھوں سے اپنے قرب و جوار کو دیکھ رہی تھی پھر جیسے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ غنیمت تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی ورنہ ممکن تھا کہ وہ چلانا شروع کردیتی۔

’’ہم کہاں ہیں؟‘‘ وہ بلند آواز سے بولی۔

’’کہیں نہیں...... بس کمرا بدلا ہے۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی اور اپنے ساتھ لگایا۔

’’لیکن...... میں یہاں...... کیسے پہنچی؟‘‘

میں نے اختری کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مطمح نظر سمجھتی ہوئی باہر چلی گئی اور کسی پہرے دار کی طرح تہ خانے کے بیرونی دروازے پر کھڑی ہوگئی۔

میں نے تاجور کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے واپس بٹھایا۔ وہ اپنی پیشانی کو مسل رہی تھی۔ یقیناً میری طرح اس کا سر بھی ابھی تک ٹرینکولائزر کے اثر سے چکرا رہا تھا۔ میں نے پہلے اپنی باتوں سے اس کا خوف کم کیا پھر اسے بتایا کہ یہاں سب ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا قیافہ درست تھا۔ چاند گڑھی کے دو بندے یہاں موجود ہیں اور ہمیں ان سے چھپانے کے لیے ہی کمرے تک محدود کیا گیا تھا مگر بعد میں آگ لگنے کی وجہ سے ہماری موجودگی راز نہ رہ سکی اور ان بندوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔

’’کون بندے تھے وہ؟‘‘ تاجور نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے تاجور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’عالمگیر اور تمہارا منگیتر اسحاق......‘‘ تاجور کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ’’لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو کہ اب یہ بلا ٹل گئی ہے۔ وہ دونوں خبیث ایک آدھ دن تک یہاں سے واپس جارہے ہیں۔‘‘

’’ہم...... مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں۔ پتا نہیں...... یہاں کیا کیا کچھ ہورہا ہے۔ آپ سب کچھ چھپا رہے ہیں۔‘‘

’’اگر کسی وقت چھپاتا ہوں تو ہم دونوں کی بہتری کے لیے ہی چھپاتا ہوں مگر اس وقت میں جو کہہ رہا ہوں سو فیصد درست ہے۔‘‘

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے بتایا کہ سجاول نے عالمگیر اور اسحاق کو یہاں سے خالی ہاتھ لوٹانے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی ہے اور وہ کیونکر یہاں اس تہ خانے میں موجود ہے۔

ساری بات سننے اور میرے سمجھانے بجھانے کے بعد اس کی ڈھارس کچھ بندھ گئی، لیکن وہ اس بات پر پریشان تھی کہ اسے یہاں اختری کے ساتھ اکیلا رہنا پڑے گا۔

میں نے کہا۔ ’’ایسا صرف ایک یا دو دن کے لیے ہو گا۔ پھر وہ دونوں یہاں سے دفان ہوجائیں گے، ہم اپنے والے کمرے میں واپس چلے جائیں گے۔‘‘

’’کچھ بھی ہے۔ میں رات کو یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ کسی صورت نہیں۔‘‘ وہ روہانسی ہوگئی۔

آتشزدگی اور اس سے پہلے کے پے درپے واقعات نے اسے کافی سہما دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ’’چلو ٹھیک ہے۔ ابھی تو دن چڑھا ہے۔ میں اس سلسلے میں سجاول سے بات کرتا ہوں۔‘‘

مجبوری تھی ورنہ میں اسے عالمگیر اور اسحاق کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہ بتاتا۔ ان کی موجودگی نے اسے خاصا خوف زدہ کردیا تھا۔ میں نے اسے دودھ پلانا چاہا لیکن اس نے صاف انکار کردیا، جیسے اسے ڈر ہو کہ یہاں کھانے پینے کی ہر چیز میں کچھ نہ کچھ ملا دیا گیا ہوگا۔

شام تک اس تہ خانے میں ضرورت اور استعمال کی کافی اشیا پہنچا دی گئیں۔ جگہ کو اختری نے اچھی طرح صاف ستھرا کردیا۔ اگلا سارا دن بھی سجاول کے کارندے اردگرد کے علاقے میں تاجور اور اختری کو ’’تلاش‘‘ کرتے رہے۔ دو تین مشکوک افراد کو پکڑ کر ڈیرے پر بھی لایا گیا۔ یہ سب کچھ عالمگیر کو دکھانے کے لیے تھا۔ اب معلوم نہیں کہ عالمگیر کو اس صورت حال پر کس حد تک یقین آیا تھا۔ بہرحال ایک دفعہ وہ اور اسحاق خود بھی گھوڑوں پر سوار ہوکر وڈے سردار اعظم کے ساتھ کہیں گئے اور ناکام واپس آئے۔

دوسرے روز رات کو سجاول کے یہ دونوں منحوس مہمان یہاں سے دفع ہوگئے اور میں نے سکھ کی سانس لی۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ اب مجھے سارا دن تاجور سے دور

نہیں رہنا پڑے گا اور ہم اپنے پہلے والے کمرے میں واپس آجائیں گے تو یہ غلط ثابت ہوا۔ سجاول نے مجھ سے کہا کہ اب جو کچھ ہوگیا ہے اس کے مطابق ہی چلنا بہتر رہے گا۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ تاجور کے یہاں ہونے کا بھید کسی طرح کھل جائے۔ یعنی تاجور کو اب اختری کے ساتھ تہ خانے میں ہی رہنا تھا اور میں رات دس بجے کے بعد رازداری سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

یہاں موجود لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں باقرا بگھیاڑ، سردار اعظم اور دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ میں ان کے نزدیک ایک ایسا شوہر تھا جس کی بیوی اسے سوتا چھوڑ کر فرار ہوگئی تھی اور اب وہ اپنے نصیب کو رو رہا تھا۔ شاید دو چار کی آنکھوں میں ہمدردی بھی ہوگی لیکن زیادہ کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ ایک اور طرح کا تمسخر بھی ان آنکھوں میں موجود تھا اور شاید اس کا تعلق میری دوسری ’’حماقت‘‘ سے تھا۔ یعنی میں نے سردار سجاول جیسے ناقابلِ شکست بندے کو لڑائی کا چیلنج دے ڈالا تھا۔ حقیقت میں دیکھا جاتا تو یہ دونوں باتیں...... حماقتوں کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ نہ تاجور کہیں فرار ہوئی تھی اور نہ سجاول کو ہتھ جوڑی کا چیلنج دے کر میں نے کوئی ناقص کام کیا تھا۔ ہاں، یہ لوگ اسے ناقص یا غلط سمجھتے تھے تو یہ ان کی اپنی رائے تھی۔

کل سے ماؤ مسلسل مجھ سے رابطے کی کوشش کررہی تھی۔ میں اب تک بچتا رہا تھا مگر پھر مجھے جانا پڑا۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا اور آنسو بہانے لگی۔ ’’نہ میرے بچڑے! تو کوئی بات اپنے دل سے نہ لگا۔ میں بات کرتی ہوں کھل کھلا کے۔ وہ مرن جوگی تیرے لائق ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں کس گندی موری کی اینٹ چوبارے چڑھنا چاہتی تھی۔ اب دیکھنا میں کتنے چاسے کھل کھلا کے تیرا ویاہ کرتی ہوں۔ ایسا جشن مناؤں گی کہ لوگ سو سال تک بھول نہیں سکیں گے۔‘‘

میں نے بمشکل خود کو اس سے چھڑایا۔ ’’آپ نے بلایا تھا مجھ کو؟‘‘

’’بس تجھے ذرا تسلی دینی تھی۔ تو اس چنڈال کی بالکل بھی پروا نہ کر۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب وہ مل بھی جائے نا، تو اس کو دو لاتیں مار کر دفع کردے یہاں سے۔‘‘

میں سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ’’اور وہ مانی بھی ملنا چاہ رہی تھی تجھ سے ذرا باتیں شاتیں کر کے تیرا دل لگانا چاہ رہی تھی۔ اس نے کبھی کوئی شے پکائی نہیں، لیکن آج اس نے بریانی بنائی ہے تیرے لیے۔ ہوسکتا ہے کہ زیادہ چنگی نہ بنی ہو پر تو اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف شریف کردینا۔ مظفرآباد سے بوندی کے اصلی لڈو بھی منگوائے ہیں اس نے خاص تیرے لیے۔ سمجھو ہر ویلے تیرے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہے۔‘‘

میں اندر پہنچا تو مانی بنی ٹھنی نظر آئی۔ آج اس نے مشرقی لباس پہنا تھا مگر چونکہ وہ پرکٹی کبوتری تھی اس لیے کچھ زیادہ نہیں جچ رہی تھی۔ اس کا جسم جیسے اس شریفانہ لباس کے اندر سے بھی اپنے غیر شریفانہ عزائم ظاہر کررہا تھا۔ اس نے حسبِ معمول مجھے بانہوں میں لے کر گرما گرم استقبال کیا۔ کچھ ہی دیر بعد بریانی اور لڈو وغیرہ بھی میز پر نظر آنے لگے۔ وہ بڑے نخرے سے بولی۔ ’’میں نے اپنے ہاتھوں سے بریانی بنائی ہے تمہارے لیے۔ خاص دیسی ککڑ کی ہے اور گھی بھی دیسی۔ ولایت کے کھانے کھا کھا کر تم بالکل ولایتی مرغ بن چکے ہو۔‘‘

میں نے بریانی چکھی۔ وہ واقعی عبرت ناک تھی۔ کچے گوشت اور لہسن کی تیز بو آرہی تھی۔ چاول بھی آدھے کچے آدھے پکے تھے۔ میں نے بمشکل چند لقمے گلے سے اتارے۔ ’’یہ دعوت کس سلسلے میں ہے؟‘‘ میں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ میرا انداز بھانپ گئی۔ کہنے لگی۔ ’’یہ مت سمجھو کہ میں تمہاری بیوی کے بھاگ جانے کی خوشی منا رہی ہوں۔‘‘

’’تو پھر کس چیز کی خوشی ہے یہ؟‘‘

’’اس چیز کی کہ تم نے میری بات مان لی میرے ڈیئر جانو۔ تم چاچو سے ہتھ جوڑی والے خطرناک ارادے سے باز آگئے۔ سچ، وہ بہت بڑی بے وقوفی کررہے تھے تم۔‘‘

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ ارادہ تو وہیں کا وہیں ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوا ہے۔

اس نے باداموں والے لڈو کی پلیٹ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ’’لو کھاؤ تھوڑا سا۔ ذائقہ بدل جائے گا۔‘‘

’’نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔‘‘ میں نے پلیٹ ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا اور ادا سے میرے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ’’لگتا ہے، اسی دغاباز کی یاد ستا رہی ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے وہ دغاباز نہ ہو۔ کوئی سازش ہوئی ہو اس کے ساتھ۔‘‘

''بس تم اسی طرح سوچتے رہنا اور اپنے دل کو تسلی دیتے رہنا۔ میں تو کہتی ہوں ایک دو دن میں ختم کرو اس کا سوگ اور نارمل ہو جاؤ۔ وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھی۔ ماؤ تو کہتی ہیں کہ مجھے پہلے دن ہی اس کی آنکھ میں سُور کا بال نظر آ گیا تھا۔ ایسی عورت تو مل بھی جائے تو اس کے منہ پر تھوک دینا چاہیے۔ چھوڑو اس کو۔ زندگی بڑی پیاری ہے۔''

اس نے انگڑائی لے کر میرے سامنے پھیلتے ہوئے کہا۔ دل تو یہی چاہا کہ اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بدکردار عورت کے منہ پر تھوک دوں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو تھوک یقیناً مانی کے منہ پر ہی آتا اور اس کے فوراً بعد یہاں بہت کچھ تہس نہس ہو جاتا کیونکہ ماؤ کا بلڈ پریشر جمپ لگا کر ساتویں آسمان کو چھو جاتا اور اس کے فوراً بعد ہی وہ دھڑ کر کے گرتی اور بے ہوش ہو جاتی۔

حسبِ توقع و اندیشہ مانی ایک بار پھر خرمستیوں پر اتر آئی۔ وہ جیسے مجھے اپنا زرخرید سمجھے ہوئے تھی اور اس زعم میں تھی کہ اپنے چاچو اور اپنی دادی کے ڈراوے سے وہ مجھے اپنا مطیع رکھ سکتی ہے۔ میں بھی اس کی اس بھول کو رفع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس آفتِ جان سے میرے کچھ مفادات تھے۔ میں نے اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے اس کا سر تکیے سے ٹکایا اور کہا۔ ''جاناں کا کیا حال ہے؟''

وہ تنک کر بولی۔ ''دیکھو، جب میرے ساتھ ہوتے ہو تو پھر میرے ساتھ ہی رہا کرو۔ جاناں ٹھیک ہے، اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہے۔''

''کئی دن سے اسے دیکھا نہیں، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''زیادہ اداس ہو گئے ہو تو رات کو اسے بھیج دوں تمہارے کمرے میں؟'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''دیکھو، بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو، میں نے اسے تمہاری حفاظت میں دے رکھا ہے، اس کی خیر خیریت پوچھنے کا تو حق ہے نا مجھے۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تو کر لو اپنا حق استعمال...... وہ ساتھ والے کمرے میں ہے۔ میں جا رہی ہوں ماؤ کے پاس۔''

وہ تیور دکھا رہی تھی۔ میں نے اسے پھر بانہوں میں بھر کر اس کا سر تکیے پر رکھا۔ اس کے جسم میں جیسے کوئی پارا مچلتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو میرے چہرے سے اور ناخنوں کو میرے جسم سے برسرِ پیکار کر دیا۔ اگر اس کی خرانٹ دادی جلد از جلد اسے کسی مرد کے پلے باندھنا چاہ رہی تھی تو ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔

دفعتاً ایک مدھم آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ نسوانی آواز کسی قریبی کمرے سے آئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کراہتی ہوئی سی آواز جاناں کی ہے۔ شاید اس نے کسی ملازمہ کو یا پھر مانی کو ہی پکارا تھا۔

میں مانی سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر مدھم آواز ابھری۔ ''اف...... ہائے اللہ۔''

میں نے کہا۔ ''تم تو کہہ رہی تھیں کہ جاناں سو رہی ہے۔ کیا ہوا ہے اسے مجھے تو لگ رہا ہے، وہ زخمی ہے۔''

''نن...... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے اسے دوسرے تیسرے روز بخار ہو جاتا ہے۔''

''بے وقوف نہ بناؤ۔ یہ بخار کی ہائے ہائے نہیں ہے۔ اسے کوئی چوٹ لگی ہے شاید۔'' میں نے اٹھ کر اس کمرے کی طرف جانا چاہا جدھر سے آواز آئی تھی۔

مانی کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''اچھا زیادہ پھوں پھاں نہ کرو۔ بیٹھو، میں تمہیں بتاتی ہوں۔''

میں بیٹھ گیا۔ اس نے تیزی سے وہسکی کا ایک جام بنا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور بولی۔ ''شام کے بعد تھوڑی گڑبڑ ہو گئی تھی لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جاناں بالکل ٹھیک ہے ڈیئر۔ بس ماتھے پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ پٹی شٹی کر دی ہے۔ ایک دو دن میں زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کس نے لگایا ہے یہ زخم؟ تمہارے شرابی باپ نے نا؟''

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''یہ بھی اپنی مرضی کرتی ہے نا۔ میں نے پچاس دفعہ کہا ہے، چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ملازم موجود ہیں۔ خود باہر نہ نکلا کر۔ اس کے دماغ میں یہ بات آتی نہیں۔ تھوڑے سے جوٹھے برتن لے کر چشمے کی طرف چلی گئی۔ وہاں کہیں ابا بھی تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ نشے میں کتنا گر جاتا ہے......'' مانی کے چہرے پر اپنے باپ کے لیے نفرت کی یلغار ہو گئی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کے باپ وڈے سردار اعظم نے جاناں کو اکیلے دیکھا، تو اس پر جھپٹ پڑا۔ ایسے موقعوں پر اس کا رویہ جھاڑیوں میں دبکے کسی شکاری جانور جیسا ہی ہوتا تھا۔ جسے صرف شکار اور اپنی بھوک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جاناں کا شور سن کر مانی چشمے کی طرف

بھاگی۔ اس دوران میں بابا فیض اور اس کا ایک ساتھی بھی پہنچ گئے۔ ان سب نے بمشکل جاناں کو اعظم کے پنجۂ ستم سے چھڑایا۔ پھر بھی اس نے اس کی پیشانی پر پستول کا بٹ مار کر زخمی کر دیا۔ یہ زخم شاید اس زخم کے بدلے میں تھا جو کچھ عرصہ پہلے جاناں نے محفلِ نشاط سے فرار ہوتے وقت گروہ کے ایک رکن فخرو کے چہرے پر لگایا تھا۔ (یہ واقعہ چاند گڑھی سے کچھ فاصلے پر جنگل میں پیش آیا تھا)

مانی کی زبانی ساری بات سن کر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں جاناں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں جاناں سر پر خون آلود پٹی باندھے لیٹی تھی۔ اس کی دودھیا گردن پر بھی گہری خراشیں تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اسے بے لباس کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ کراہنے اور بولنے کے بعد وہ پھر سو گئی تھی۔ مانی نے بتایا کہ اسے سکون بخش دوا دی ہے۔ جاناں کی حالت بظاہر تسلی بخش ہی لگتی تھی۔ زخم بھی زیادہ سنگین نہیں تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور مانی والے کمرے میں واپس آ گیا۔

اچانک مانی نے پوچھا۔ ''یہ یاسر کون ہے؟''

میں چونک گیا اور سوالیہ نظروں سے مانی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''تم جانتے ہی ہو، اسے کئی دن بخار رہا ہے۔ بخار کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے تین چار دفعہ کسی یاسر کا نام لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ نیند میں یاسر کو یاد کر رہی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ یاسر نام کے بندے سے اس کا کوئی چکر رہا ہے۔''

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''مگر تم کچھ نہ کچھ تو ضرور جانتے ہو گے اس کے بارے میں۔ ایسے ہی تو اس کے بارے میں اتنے فکرمند نہیں رہتے ہو۔'' اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ہے نا بس انسانی ہمدردی...... لیکن تمہیں انسانی ہمدردی کا کیا پتا۔ تم ڈکیت لوگ ہو اور صرف لوٹ مار ہی جانتے ہو۔''

اس نے مصنوعی غصہ دکھایا اور مجھے گرا کر میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ''چلو، ایسے ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔'' اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ کچھ دیر زبردست دھینگا مشتی ہوئی۔ آخر میں نے اسے جکڑ لیا، وہ بری طرح ہانپی ہوئی تھی اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اب بس کرو۔ ابھی تمہاری ماؤ آ جائے گی۔''

اس نے میری پسلیوں میں زور سے کہنی رسید کی اور الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے میں نے اس سے ایک دوبار پوچھا بھی ہے مگر اس نے بتایا کچھ نہیں۔ بات گول کر گئی ہے مگر مجھے پتا ہے، وہ یاسر نام کا بندہ ہے ضرور۔ ہو سکتا ہے یہ وہی ہو جس نے اسے چاچو سجاول کے بندوں سے بچا کر کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچایا تھا......''

بظاہر میں مانی سے باتیں کر رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ یہ میں ہی تھا جس نے ''یاسر بھائی'' کے روپ میں جاناں کی مدد کی تھی، اور اس وقت کی تھی جب وہ ایک کھوہ میں چھپی ہوئی، سوکھے نان پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہی تھی اور کسی بھی وقت موت یا بے آبروئی کا شکار ہونے والی تھی۔ میں نے اسے اس جنگل سے نکال کر حفاظت سے رام پیاری تک پہنچایا تھا اور وہاں بھی ہر طرح سے اسے تحفظ دیا تھا۔ یقیناً جاناں نے رام پیاری سے بھی یاسر بھائی کی دلیری اور خدا ترسی کی باتیں سنی تھیں، اب شاید اس نے اپنے ذہن میں یاسر بھائی کو ہیرو بنا رکھا تھا اور یہ امید لگائے ہوئے تھی کہ وہ یہاں بھی اس کی مدد کو پہنچے گا۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ ''یاسر بھائی'' اب بھی اس کے آس پاس موجود ہے اور واقعی اس کی مدد بھی کر رہا ہے۔

اچانک کچھ آوازوں نے ہمیں بری طرح چونکایا۔ یہ احاطے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پہلے سجاول زور سے بولا، پھر اس کے بڑے بھائی اعظم کے گرجنے برسنے کی صدائیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا، جھگڑا ہو گیا ہے، میں تیزی سے باہر نکلا۔ جب میں احاطے میں پہنچا تو کئی افراد جمع تھے جن میں اعظم بھی تھا۔ بہرحال سجاول وہاں سے جا چکا تھا۔ اعظم ہاتھ لہرا رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ ''میں دیکھ لوں گا تجھ کو تو کتنی بڑی توپ ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ کل کے لونڈے تک تو مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ ان سے تو نمٹ نہیں سکتا اور چڑھائی کرتا ہے ہم پر......''

اتنے میں ماؤ بھی بدحواس ہتھنی کی طرح جھومتی ہوئی موقع پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اعظم کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ مزید بپھر گیا۔ ''ماؤ! بتا دے اپنے اس لاڈلے کو۔ اگر وہ یہاں کا تھانے دار بنے گا تو میں تیرے سامنے اس کی ٹانگیں چیر دوں گا۔ اس نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ ہر کڑی اس کی ہمشیرہ ہے چاچی تائی ہے۔ خود گل چھرے

اڑاتا ہے اور دوجوں پر پابندیاں لگاتا ہے۔“

مجھے چند سیکنڈ میں ساری صورتِ حال سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ اسی واقعے کا شاخسانہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے چشمے کی طرف جاناں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یقیناً سجاول نے اسی حوالے سے بڑے بھائی کی سرزنش کی تھی اور وہ بپھر گیا تھا۔ اب اس خیال سے کہ اعظم کے ساتھ کچھ زیادہ بدتمیزی نہ ہو جائے سجاول تو یہاں سے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا اور اعظم یہاں کھڑا بڑکیں مار رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس کی باتوں کی کوئی اتنی اہمیت نہیں تھی، تاہم اسے بدتمیزی سے روکنے کے لیے ماؤ بار بار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ رہی تھی اور اسے اندر کی طرف کھینچ رہی تھی۔

اعظم نے سب کے سامنے ہی قمیص کے نیچے سے وہسکی کا ادھا نکال کر منہ سے لگایا اور کئی گھونٹ لینے کے بعد بوتل کو پتھریلی زمین پر پٹخ کر توڑ دیا۔ تب اس نے اپنی کمر میں اڑسا ہوا کوئی ایک فٹ لمبا چھرا کھینچ لیا اور یہ ظاہر کرنے لگا کہ وہ اپنی جان لے لے گا۔

ماؤ نے دوہائی دی۔ ”روکو اس کو؟“

کئی افراد نے آگے بڑھ کر وڈے سردار کو تھام لیا۔ دو بندوں نے اس کا چھرے والا ہاتھ جکڑ لیا۔ لگتا تھا کہ یہاں اس طرح کے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ چھرا اعظم کے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ وہ سجاول کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔ سجاول کے ساتھی اس شرابی سردار کو سنبھالتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے گئے۔ یقیناً ماؤ کو اسے سنبھالنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ فیض محمد نے بتایا تھا کہ ایسے موقعوں کے لیے کوئی ایک ایسی طوائف سنبھال کر رکھی جاتی ہے جو نسبتاً دلکش ہوتی ہے اور اس سے پہلے اعظم کے ہاتھ بھی نہیں لگی ہوتی۔ وہ اس میں الجھ جاتا ہے اور یوں اگلے روز صبح تک یہ بلا ٹل جاتی ہے۔ اگر پوری طرح نہ بھی ٹلے تو اس کی سنگینی اور خطرناکی کم ہو جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں ابھی تک وہ ”لونڈے والا“ فقرہ گونج رہا تھا۔ اعظم نے کہا تھا۔ کل کے لونڈے تک تو تجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً میرے بارے میں ہی کہے گئے تھے۔ یہاں اور کس کو جرأت تھی کہ سجاول کو آنکھیں دکھا سکتا یا اس کی شان میں کسی طرح کی کوئی گستاخی کر سکتا۔

جاناں کے زخمی ہونے کی وجہ سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اسے اعظم کی طرف سے ہر وقت خطرہ تھا۔ وہ خود بھی کسی وقت ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی کا مظاہرہ کر جاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا اور مانی نے بھی سمجھایا تھا کہ وہ اکیلی احاطے میں نہ نکلا کرے لیکن وہ نکلی اور اعظم کی زد میں آئی۔ اس نے اسی طرح گاؤں میں بھی کیا تھا۔ میں نے رام پیاری کے پاس اسے بڑی محفوظ پناہ دلائی تھی اور تاکید کی تھی کہ وہ شہر جانے کے لیے جلدی نہ کرے مگر وہ نکل کھڑی ہوئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ سجاول کے ہرکاروں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ خود مصیبت کا شکار ہوئی اور ساتھ میں پہلوان حشمت بھی پھنس کر یہاں پہنچ گیا۔

ابھی رات کے ساڑھے نو ہوئے تھے۔ تاجور کے پاس تہ خانے میں جانے کے لیے ابھی مجھے مزید آدھ گھنٹا انتظار کرنا تھا۔ انتظار کا یہ وقت میں کتنی مشکل سے کاٹتا تھا، کچھ مجھے ہی معلوم تھا۔ جو کچھ بھی کرتا تھا، دھیان اسی کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بھی پل پل گن کر انتظار کرتی تھی۔ بے شک اختری سارا دن اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھی مگر رات کو جب میں اس کے پاس پہنچتا تھا تو اس کا چہرہ بتا دیتا تھا کہ پچھلے بارہ چودہ گھنٹے اس نے کس طرح گزارے ہیں۔

سرد رات کا سناٹا گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کہرے نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ احاطے میں اور رہائشی کمروں کے اندر اب مکمل خاموشی تھی۔ میں نے انگیٹھی بجھا دی اور لالٹین کی لو بہت نیچی کر دی۔ گرم چادر اوڑھ کر میں تہ خانے میں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب دروازے پر دھم دستک سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا، سامنے فیض محمد کھڑا تھا۔ ”چھوٹے سردار تمہیں بُلا رہے ہیں۔ کوئی بات کرنی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس وقت؟“

”ہاں ابھی۔“

میرا ذہن فوراً خط والے معاملے اور عالمگیر کے منشی کی طرف چلا گیا۔ میرا قیافہ تھا کہ بہت جلد عالمگیر کے منشی یا کسی اور خاص آدمی کو چاندگڑھی سے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا جائے گا اور پھر اس سے اس خط کے تانے بانے کا پتا چلایا جائے گا۔ عین ممکن تھا کہ یہ وہی معاملہ ہو لیکن فی الوقت مجھے تاجور کو بھی دیکھنا تھا۔

میں نے فیض محمد سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ سردار سے کہو میں آدھے پونے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔“

فیض محمد کی تیوری چڑھ گئی۔ درشت لہجے میں بولا۔ ”ابھی چلو تم، سردار پریشان ہے۔ اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں، تم اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔“

”اب کیا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جو کچھ کر چکے ہو، وہ کچھ کم نہیں ہے۔“ فیض نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”چلو آؤ، سردار ابھی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”معاملہ کیا ہے؟“ میں نے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں پتا۔ تم بس چلو اور مزید کوئی بے وقوفی نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔“

کچھ ہی دیر بعد میں ایک بار پھر سردار سجاول کے کمرے میں بڑے سائز کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ چہرہ انگاروں کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی جھگڑے والا معاملہ ہے جو دو ڈھائی گھنٹے پہلے اعظم اور سجاول کے درمیان ہوا ہے۔

سجاول نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی امتحان میں ڈالا ہے۔ یہ تمہاری ہی نحوست ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

”اب سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر گیا ہے۔ اب باقی ساری باتیں چھوڑ کر تمہیں پہلے مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے پڑیں گے۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

میں سمجھ گیا کہ سجاول کو وہ ”لونڈے“ والی بات لڑ گئی ہے جو کچھ دیر پہلے اعظم نے چنگھاڑتے ہوئے کہی تھی اور یقینی بات تھی کہ یہ بات سجاول کے دیگر ساتھیوں اور کارندوں میں بھی گردش کر رہی ہو گی۔ باقر کو چت کرنے کے بعد میں نے سجاول کو لڑائی کا کھلم کھلا چیلنج دیا تھا اور اب اس بات کو کافی دن گزر چکے تھے۔

میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ہر وقت تیار ہوں۔ تم نے ہی کہا تھا، پہلے یہ خط والا معاملہ دیکھتے ہیں۔“

اس نے خط کو اور خط والے معاملے کو ایک غلیظ گالی دی اور پھنکارا۔ ”پہلے اپنی گندی اوقات کا پتا کر لو...... پھر اگر بولنے کے قابل ہو گے تو تم سے پوچھ لوں گا کہ کس مرض کی دوا ہو۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ تم سے ہتھ جوڑی کرنے والا بچتا ہی کم ہے۔ اگر میرا ابھی قصہ تمام ہو گیا تو ہمارے مشترکہ پروگرام کا کیا بنے گا۔ ہم نے تو بڑے صاحب تک

پہنچنا تھا اور کھوج لگاتا تھا کہ وہاں یہ کروڑوں کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں؟''

وہ نہایت زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب کچھ ہو جائے گا اور تمہارے بغیر بھی ہو جائے گا۔ کوئی ایسے آسمان سے نہیں اترے ہوئے ہو تم...... تمہارے جیسے بہت بھوتنی کے اپنی ٹانگ کے نیچے سے گزار دیے ہیں میں نے۔''

وہ غصے سے پھٹا پڑ رہا تھا اور لگتا تھا کہ اب مجھے براہِ راست گندی گالیوں کی زد میں لے آئے گا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں معاملہ کافی گڑبڑ ہو چکا ہے اور اس کی وجہ وہی میرا کھلم کھلا چیلنج ہے (بعدازاں میرا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ پتا چلا کہ سجاول کے ساتھیوں میں سخت بے چینی ہے بلکہ ان میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک گروپ اس بات پر سخت برہم ہے کہ میں نے سردار سے علی الاعلان ہتھ جوڑی مانگی ہے اور کئی دن گزرنے کے باوجود سینہ تان کر یہاں دندنا رہا ہوں)

میں نے بہتر سمجھا کہ سجاول کے سامنے سے اٹھ جاؤں۔ ورنہ ہماری گفتگو جس رخ پر جارہی تھی یہاں ابھی کوئی مارا ماری شروع ہو سکتی تھی۔ میں اٹھا تو سجاول نے گرج کر کہا۔ ''بیٹھو ابھی۔''

میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے لال بھبوکے چہرے کے ساتھ اپنا قیمتی سیل فون اٹھایا اور کسی سے رابطہ کر کے بولا۔ ''آجاؤ۔''

ایک منٹ کے اندر اندر دو مسلح افراد اندر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہیوی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کے ساتھ چپٹی ناک والا فخرو بھی تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے بھی یقیناً ریوالور یا پستول موجود تھا۔ رائفلوں کا رخ میری طرف تھا اور دونوں رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تھی۔

''تلاشی لو اس کی۔'' سجاول نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔

دونوں رائفل برداروں نے ماہرانہ انداز میں مجھے زد میں لے لیا تھا۔ فخرو آگے بڑھا اور مشاقی سے میری تلاشی لی۔ جیکٹ اتروائی۔ شلوار قمیص کو اچھی طرح کھنگالا۔

''خط کا باقی حصہ کہاں ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''باقی حصہ کوئی نہیں ہے۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا ٹکڑا ہو گا لیکن وہ میرے پاس نہیں آیا۔''

''اس کی شلوار اتار کر شلوار کے نیفے میں دیکھو۔'' سجاول نے فخرو کو حکم دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ وہی کرے گا جو کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے خود ہی شلوار جسم سے علیحدہ کر دی۔ اب میں کرتے اور انڈرویئر میں کھڑا تھا۔ فخرو نے اچھی طرح نیفے کی جانچ کی۔ سجاول کے اشارے پر شلوار مجھے واپس کر دی گئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پہن لی۔

اس نے مسلح افراد کو فخرو سمیت باہر بھیج دیا۔ میں کھڑا تھا، وہ اسی طرح پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تفتیشی لہجے میں بولا۔ ''اور کیا جانتے ہو اس چکر کے بارے میں؟''

''کون سا چکر؟''

''میں اس خط کی بات کر رہا ہوں اور تمہارے اس پیو ''بڑے صاحب'' کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ پھنکارا۔

''مجھے جو کچھ پتا تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔''

اس نے مجھے گالی دی تو میں نے کہا۔ ''گالی نہ نکالو۔ یہ ہیجڑوں والا کام کر رہے ہو۔ کل میدان میں مجھے گرالو، پھر جو جی چاہے سلوک کرنا۔''

وہ خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے لگ بھگ ہو گا۔ اگر میں چاہتا تو اس کے پستول نکالنے سے پہلے اسے چھاپنے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا تھا مگر میں جب بھی کوئی اس قسم کی بات سوچتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے تاجور کی بے مثال صورت آجاتی تھی۔ وہ معصوم آنکھیں، وہ دلکش رخسار، وہ گلاب کی نرم پتیوں جیسے ہونٹ، جو ذرا سی پریشانی سے بے ساختہ کپکپا اٹھتے تھے۔ کوئی ایسی بات تھی اس کی نسوانیت میں جس کی کشش کو لفظوں میں بیان کرنا کم از کم میرے لیے تو ناممکن تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ کبھی کبھی عورت، آدمی کو کمزور بھی کر دیتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر خدانخواستہ میری وجہ سے تاجور کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ بھی کرنا پڑ جائے گا۔ اور اگر خاتمہ نہ ہو سکا تو یہ زندگی موت سے بدتر ہو گی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی بے قراری سے اس نے کمرے کے دو چکر لگائے، پھر میری طرف دیکھے بغیر کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں ابھی تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

میں اٹھ کر باہر آگیا۔ دونوں مسلح افراد مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں واپس کمرے میں آیا تو ہر چیز کو الٹ پلٹ پایا، کمرے میں موجود لحاف اور تکیے تک کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ یقیناً میری غیر موجودگی میں سجاول کے بندوں نے کمرے کی بھرپور تلاشی لی تھی۔ شاید وہ خط کا باقی حصہ ڈھونڈنا چاہتے تھے، اس کے علاوہ بھی انہیں کوئی کام کی شے ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے ان کی ایسی کوئی امید بر نہیں آئی ہو گی۔

یکایک میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا کہ اسے بھی پریشان کیا گیا ہو۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ میں جانتا تھا وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ گرم چادر اوڑھ کر میں کمرے سے نکلا اور ایک تنگ راہداری سے گزر کر سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ لیکن آج یہاں ایک پٹھان پہرے دار موجود تھا۔ یقیناً یہ سجاول کا کوئی خاص الخاص کارندہ ہی رہا ہو گا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ یہ انہی مہمانوں میں سے ہے جو بڑے بڑے پگڑ باندھے رہتے تھے اور شاذ و نادر ہی بات کرتے تھے۔ ان میں سے قریباً ہر ایک کی ناک غیر معمولی طور پر اونچی تھی اور آنکھوں میں عقابی چمک دکھائی دیتی تھی۔

''خو تم آگے نہیں جا سکتا۔'' چوکیدار نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟'' میں نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تین چار تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا، اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھ جاتی، کہیں اندر سے اختری کے بولنے کی آواز آنے لگی۔ الفاظ صاف سنائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے اندر آنے دیا جائے۔

پہرے دار نے اپنی واسکٹ میں سے سیل فون نکالا اور ایک گوشے میں جا کر کسی کو کال میں مصروف ہو گیا۔ جو الفاظ میری سماعت تک پہنچے ان سے یہی پتا چلا کہ وہ سجاول سے بات کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ادب سے جھک کر فون بند کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''خو ام دروازہ کھول دیتا ہے لیکن تم صرف دس منٹ اندر رہ سکتا ہے۔''

''اچھا...... دروازہ کھولو۔'' میں نے تحکم سے کہا۔

اس نے مجھے قہرناک نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازے کا لاک کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ یہاں دوسرا دروازہ تھا۔ تاہم اس کی چابی اختری کے پاس موجود تھی۔ میں نے سلاخ دار کھڑکی میں سے تاجور کی صورت دیکھی اور فوراً سمجھ گیا کہ اس سے بھی پوچھ گچھ کی گئی ہے اور شاید تلاشی وغیرہ بھی لی گئی ہے۔

آج اختری کے تیور بھی کچھ بدلے بدلے نظر آتے تھے۔ وہ مسلسل مجھے سخت نظروں سے گھور رہی تھی۔ تاجور میرے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔ ''مجھ سے بڑی بدتمیزی کی ہے اس نے۔'' تاجور کا اشارہ اختری کی طرف تھا۔

میں نے دیکھا، اس کمرے میں بھی سامان وغیرہ الٹ پلٹ کیا گیا تھا۔ استعمال کی تمام اشیا اور کپڑے وغیرہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ اختری نے ہی کیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''میں حکم کی بندی ہوں۔ سردار کے حکم پر اپنی جان بھی لے سکتی ہوں۔ دوسرے تو پھر دوسرے ہیں۔''

وہ کسی سپاہن کی طرح سینہ تان کر کھڑی تھی۔ خاصے مضبوط اور گٹھے ہوئے بدن کی تھی۔ یقیناً اسلحہ چلانا بھی بخوبی جانتی تھی۔ اس کی کمر سے بندھا ہوا پستول اس امر کی نشاندہی کرتا تھا۔ ایک دو دن پہلے تک وہ مجھ سے اپنائیت بھرے لہجے میں بات کرتی تھی لیکن آج سب کچھ بدلا ہوا تھا۔

''کیا کہا ہے تم نے تاجور کو؟'' میں نے پُرطیش لہجے میں اختری سے پوچھا۔ میرے لہجے سے وہ ذرا ٹھٹک گئی مگر اس کی تن فن برقرار رہی، بولی۔ ''صرف تلاشی لی ہے، کمرے کی...... اور اس کی۔ اپنی تلاشی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے تو وہ کرنا تھا جو اوپر سے کہا گیا تھا۔''

''تم نے مارا ہے اسے؟'' میں نے بپھر کر پوچھا۔

''بالکل نہیں...... پوچھ لو اس سے۔ تت...... تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ پوچھ لو۔'' وہ ہکلائی (باقر کی ٹھکائی کے بعد سے یہاں میرا دبدبہ سا ہو گیا تھا)

تاجور میرے اور اختری کے درمیان آگئی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میں اختری کو مار نہ بیٹھوں۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''چھوڑو شاہ زیب، دفع کرو۔''

اختری صورتِ حال دیکھ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ تاجور نے مجھے نیچے گدیلے پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اختری نے صرف زبانی کلامی بدتمیزی کی اور آخر میں پستول کا ڈراوا دیا۔ وہ اس سے اسی خط کے ٹکڑے کے بارے میں پوچھتی رہی جو الٹے حرفوں سے لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ تاجور، ''بڑے صاحب'' اور لوردو نامی جگہ کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ تاجور کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا، وہ کیا بتاتی۔ (لوردو کو خط میں الٹ کر ''ودرول'' لکھا گیا تھا)

وہ بس آنسو بہا رہی تھی اور جیسے خود میں سمٹتی چلی جارہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو بڑی مضبوطی سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے ان لوگوں کے تیور بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔ مجھے پتا چل رہا ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔''

''میں نے کہا ہے نا تاجور، میں تمہیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زیب! اگر میرے ساتھ...... کچھ ہونے لگے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دینا۔''

میرا کلیجا کٹ کر رہ گیا۔ تاجور کو اس مایوسی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنا میرے لیے بہت کٹھن تھا۔ میں زندگی میں بہت سخت مرحلوں سے گزرا تھا۔ جسمانی اور ذہنی درد کی انتہا کو چھو کر دیکھا تھا۔ میرا دل توڑا گیا تھا اور میں نے بھی دل توڑے تھے، میں ان گنت مرتبہ موت کی وادی سے گزرا تھا اور دوسروں کو بھی اس وادی سے گزارا تھا۔ میں نے لاشیں دیکھی تھیں اور لاشوں پر روتے لوگ دیکھے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ حالات کی سفاکی دیکھ کر خود اپنے اوپر رحم آیا تھا اور آنکھوں میں نمی جاگی تھی لیکن اتنا کرب میں نے کبھی محسوس نہیں کیا، جتنا چاند گڑھی کی اس سادہ و روشن چہرہ لڑکی کو اشک بار دیکھ کر کیا۔

میں نے بے پناہ جذب کے ساتھ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور سچے دل کے ساتھ بے حد و حساب محبت سے اس کے کانوں میں ایسی سرگوشیاں کیں، جنہوں نے اس کا خوف کسی حد تک کم کر دیا۔

میں زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکا۔ مجھے اوپر اپنے کمرے میں واپس آنا پڑا۔ تاجور کے بغیر یہ کمرا بالکل ویران اور اجاڑ محسوس ہوتا تھا۔ ماؤ نے یہاں بچوں کی جو تصویریں لگوائی تھیں، وہ مجھے اچھی لگتی تھیں اور میں ان کے حوالے سے تاجور کو چھیڑتا تھا لیکن اب ان تصویروں پر بھی نگاہ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں بہت دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں یہ بات تو کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سجاول کو جدی پشتی کوئی خاص صلاحیت ملی ہے اور اس صلاحیت کے زور پر وہ اپنے مقابل آنے والے ہر شہ زور کو زیر کر لیتا ہے۔ جہاں تک میں نے اب تک دیکھا تھا وہ صرف ڈکیت ہی نہیں تھا ایک نہایت لالچی اور سفاک شخص بھی تھا۔ اگر بالفرض محال اس میں کوئی انہونی صلاحیت ہوتی تو وہ یوں چپ نہ بیٹھا رہتا۔ اس کا بے دریغ استعمال کرتا۔ اب تک نہ جانے کتنے لوگ اس کے دستِ ستم کا شکار ہو چکے ہوتے اور کتنی گردنیں اس کے گھونسے سے ٹوٹ چکی ہوتیں۔ مانی نے مجھے باتوں میں بتایا تھا کہ آخری بار اس کا چاچو قریباً ڈیڑھ برس پہلے ایک سندھی پہلوان سے لڑا تھا اور مانی اس خونی لڑائی کی چشم دید گواہ تھی۔ شاید اس طرح کی دو چار لڑائیاں اس نے اور لڑی ہوں۔

اگر واقعی وہ لڑائی بھڑائی کے فن میں خاص مہارت اور صلاحیت رکھتا تھا تو پھر اس کا استعمال کیوں نہیں کرتا تھا۔ مجھے تو یہ سارا کوئی ڈراما ہی لگتا تھا۔

صبح سویرے میں نے ایک پالکی دیکھی۔ ایسی پالکیاں پرانے زمانے میں خواتین کو لانے، لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی پالکی میں یقیناً عورتیں ہی تھیں۔ میں نے قریب کھڑے فیض محمد سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ماؤ اور ان کی پوتی۔'' پوتی سے فیض کی مراد یقیناً مانی ہی تھی۔

''کہاں جارہے ہیں یہ؟''

''ٹھیک سے پتا نہیں، لیکن شاید کل شام تک آجائیں گے۔'' فیض محمد نے قدرے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔''

''میری وجہ سے؟''

''یہ اس ہتھ جوڑی کی تیاری ہے، جو کل دوپہر تمہارے اور سردار سجاول کے درمیان ہونی ہے۔ سردار سجاول نہیں چاہتا کہ دونوں عورتوں کو خاص طور سے ماؤ کو اس کا پتا چلے۔ اس لیے دونوں کو بہانے سے دو دن کے لیے باہر بھیجا جارہا ہے۔''

میرے سینے میں دھڑکن کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ فیصلہ کن گھڑیاں قریب آرہی ہیں۔ میں پالکی کو دیکھتا رہا۔ وہ آٹھ کہاروں کے کندھوں پر آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی چٹانوں کے عقب میں اوجھل ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی مچانوں میں بیٹھے درجنوں پہرے دار مؤدب انداز میں کھڑے ہوگئے تھے یا انہوں نے اپنی گردنیں جھکا لی تھیں۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کہاں ہوگا یہ مقابلہ؟''

''یہیں، اس احاطے کے بیچوں بیچ۔ یہاں موجود سب لوگ دیکھ سکیں گے۔''

''لیکن میں نے تو سجاول کے سامنے شرط رکھی تھی۔ میں نے کہا تھا......''

''تم نے کہا تھا کہ ہتھ جوڑی کمرے کے اندر ہوگی۔'' فیض نے میری بات کاٹ کر تلخ انداز میں کہا۔ ''سردار نے تمہاری یہ شرط نامنظور کی ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن فیض محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا اور بپھرے انداز میں بولا۔ ''خواہ مخواہ زبان چلا کر اپنی بدبختی اور نہ بڑھاؤ۔ جو کچھ کر چکے ہو، اسی کو بھگت لو تو بڑی بات ہے۔''

وہ جیسے غم و غصے میں پاؤں پٹختا ہوا اپنے رہائشی کمرے کی طرف چلا گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سیدھا سردار سجاول کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ بند کمرے میں لڑنے کا وعدہ کر کے کیوں مکر گیا ہے مگر پھر اس کے پاس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ کل سے اتنا بپھرا ہوا تھا کہ اس سے بات کرنا ہی فضول تھا۔ میرا ذہن ایک بار پھر فیض محمد کی طرف منتقل ہو گیا۔ فیض محمد کا رویہ میرے ساتھ شروع سے ہی ہمدردانہ تھا، لیکن اب وہ بتدریج مجھ سے ناراض ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس ناراضی کی سب سے اہم وجہ یقیناً یہ ہتھ جوڑی والا معاملہ ہی تھا۔

میرا دل چاہا کہ فیض محمد کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کروں۔ آج موسم ابر آلود تھا۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ احاطے میں چہل پہل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مچانوں والے بھی اپنی مچانوں میں بند ہو کر بیٹھے تھے۔ میں فیض محمد کے کمرے کی طرف گیا تو راستے میں پہلوان حشمت پر نظر پڑی۔ اسے یہاں دو تین مریض مل گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک جواں سال لڑکے کی کلائی کو الٹے سیدھے مروڑے دے رہا تھا اور مالش کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ لڑکا بڑے کمرے میں ہونے والی کسی پریکٹس لڑائی میں زخمی ہوا ہے یا شاید یہ کسی واردات کا نتیجہ ہو۔

پہلوان کے ساتھ دور ہی سے علیک سلیک کرتا ہوا میں بابے فیض کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ کھدر کا پھول دار لحاف اس نے اپنی کمر تک کھینچ رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، وہ جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں اندر آ کر بڑی آہستگی سے اس کے قریب موڑھے پر بیٹھ گیا اور اس کو پتا ہی نہیں چلا۔ جب میں نے اپنا ہاتھ لحاف کے اندر گھسا کر اس کی پنڈلی پر رکھا تو وہ بُری طرح چونک گیا۔ ''اوئے، تم یہاں؟'' اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے بڑی محبت سے اس کی پنڈلیاں دبانا شروع کر دیں۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ مجھ سے کیا کہے اور کیا نہیں۔

میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں آپ میرا بھلا چاہتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ نے کئی بار مجھے اس ہتھ جوڑی والے معاملے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بزرگوار! کہتے ہیں نہ کہ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے اور شاید یہاں بھی خدا کو یہی منظور تھا۔ اب بات اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اسے یہاں سے واپس لانا ممکن نہیں، آپ اس کے لیے مجھے معاف کر دیں اور دعا کریں کہ یہ سب کچھ اچھے طریقے سے شروع ہو کر اچھے طریقے سے ہی ختم ہو جائے۔''

''اچھے طریقے سے ہی ختم ہوگا۔'' فیض نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کل دو ڈھائی بجے تمہاری لاش پڑی ہوگی وہاں چارپائی پر...... یا پھر ہمیشہ کے لیے لولے لنگڑے ہو کر رہ جاؤ گے۔''

''آپ سب لوگ لڑائی سے پہلے ہی لڑائی کا فیصلہ کر کے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ ہم جانتے ہیں چھوٹے سردار کو، تم نہیں جانتے ہو۔'' بابے فیض نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ کمرا گونج اٹھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے جھٹکا دے کر میرے ہاتھوں کو اپنی پنڈلیوں سے دور کر دیا۔ وہ طیش سے کانپ رہا تھا۔

''جاؤ یہاں سے۔'' وہ کچھ دیر بعد دوبارہ گر جا اور سر پھر سے تکیے پر رکھ دیا۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اپنے ہاتھ پھر سے لحاف میں داخل کر دیے اور فیض کی بوڑھی لیکن سڈول پنڈلیاں دبانے لگا۔

فیض کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے معذرت کی اور اپنائیت کی گفتگو کرتا رہا۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور یخ بستہ جھکڑ کھڑکیوں، دروازوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

فیض نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم دلیر ہو اور لڑنا بھڑنا بھی بہت چنگی طرح جانتے ہو۔ تم نے باقر جیسے لڑکے کو

آسانی سے نیچا دکھایا ہے پر...... یہ سردار سجاول عام بندہ نہیں ہے۔ اس پر ہاتھ ہے......''

یہ ہاتھ والی بات اس سے پہلے مانی بھی کہہ چکی تھی۔ اس نے قبیلے کے مرے ہوئے بزرگوں کی توجہ کا ذکر کیا تھا۔

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاتھ سے تمہارا کیا مطلب ہے چاچا؟''

''قبیلے کے بڑوں کا سایہ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سردار کے آس پاس رہتے ہیں اور جب وہ کسی سے لڑتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتے ہیں۔''

''اور تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

باہر سرد ہواؤں نے طوفانی شکل اختیار کر لی تھی۔ درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے، کھڑکیوں اور دروازوں میں پُرہول تھرتھراہٹ تھی۔ فیض نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

''کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ خاص طور سے پڑھے لکھے لوگ ان پر یقین نہیں کر پاتے مگر ان کے یقین نہ کرنے سے وہ باتیں جھوٹ تو نہیں ہو جاتیں۔ بندے کی عقل اتنی نہیں ہے کہ وہ ہر بات کی تہ تک پہنچ سکے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ سجاول جب لڑ رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی طاقت کے بجائے کسی اور کی طاقت استعمال کر رہا ہوتا ہے؟''

''نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہا۔ مگر جب وہ لڑتا ہے تو ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر نظریں جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی آگ ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں کہ اس کے سامنے آنے والا، آدھی لڑائی تو اسے دیکھ کر ہی ہار جاتا ہے۔ سردار وادیِ سون کے ایک پرانے لڑاکو (جنگجو) قبیلے کا بندہ ہے۔ اس قبیلے کی ہر نسل میں ایک نہ ایک بندہ ایسا ضرور پیدا ہوتا ہے جس پر اس کے پرکھوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

میں نے اپنے طنز کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ''ہاتھ'' ہر وقت رہتا ہے یا کبھی کبھی آتا ہے؟''

بابے فیض نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''کوئی رسم ہے جسے یہ لوگ لڑنے سے پہلے ادا کرتے ہیں۔ میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اس رسم کے بعد یہ لوگ مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔''

''کیسی رسم؟''

بابا فیض پہلے تو گول مول بات کرتا رہا لیکن جب میں نے کسی صورت جان نہیں چھوڑی تو اس نے حقے کا ایک طویل کش لے کر چلم پر اپنا ہاتھ سینکا اور کھڑکی سے باہر سر پٹختی ہواؤں کو دیکھ کر بولا۔ ''شاید تمہیں یہ باتیں عجیب لگیں گی مگر جو کچھ مجھے معلوم ہے، اس قبیلے کے پرانے لوگ سون کی گھاٹیوں میں رہنے والے ''باگھ'' کو بہادری اور دہشت کا نشان سمجھتے تھے۔ یہی باگھ (تیندوا یا شیر) اب تک کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے۔ اب وہ اس کی پوجا تو نہیں کرتے مگر اس سے کچھ خاص باتیں ضرور نتھی کرتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ میں جس رسم کی بات کر رہا ہوں، اس میں کچھ اور انوکھی باتوں کے علاوہ باگھ کے سوکھے ہوئے جگر کا نام بھی لیا جاتا ہے۔''

''سوکھا ہوا جگر؟''

''ہاں...... اس جگر کو اس طرح سکھایا جاتا ہے کہ وہ محفوظ ہو جاتا ہے پھر اس کو گرم پانی میں ڈال کر تازہ کر لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اصل نسل کے گھوڑے کا کچا بچہ......''

''کچا بچہ...... یہ کیا چیز ہے؟''

''چار مہینے کا حمل...... گھوڑی کا پیٹ چیر کر بچہ نکالا جاتا ہے۔ بچہ بھی کیا ہوتا ہے، گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بہت پرانی شراب ہوتی ہے ان لوگوں کے پاس۔ اسے تین بار آگ دکھائی گئی ہوتی ہے۔ وہ دور سے آگ پکڑ سکتی ہے۔''

''چاچا فیض، مجھے تمہاری باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''خود میری سمجھ میں بھی یہ باتیں پوری طرح نہیں آتیں۔ بس ان کا تعلق اس رسم سے ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟''

''آج سے بہت سال پہلے، جب سجاول کا باپ زندہ تھا۔ میں نے اتفاق سے اس کی اور سجاول کی کچھ باتیں سنی تھیں۔ اگر ساری باتیں سن سکتا تو شاید کچھ اور بھی پتا چل جاتا لیکن اتنا پتا تو ضرور چل گیا کہ سجاول جب خاص موقع پر کسی سے کوئی خاص لڑائی لڑتا ہے تو پھر لڑائی سے پہلے یہ رسم بھی ہوتی ہے۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، آج بھی یہ رسم ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل رات ہو چکی ہو، یا اس سے بھی پہلے......'' فیض نے الجھے ہوئے

انداز میں کہا۔

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ بس تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی رہیں اور سردی ہڈیوں کے گودے میں گھستی رہی۔

فیض نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”شاہ زیب! بات یہ نہیں کہ وہ رسم کیا ہے اور اس کا اثر سردار سجاول پر کیا ہوتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ وہ لڑائی کے وقت بالکل دوسرے روپ میں آجاتا ہے یا یوں کہہ لو کہ اپنے ہوش حواس میں نہیں رہتا۔ میں تمہیں بالکل سچ بات بتا رہا ہوں۔ اس سے لڑنے والے کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے سردار سجاول کی کم از کم ایسی چار لڑائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں، ایسی ایک لڑائی کوئی ڈیڑھ سال پہلے یہیں پر ایک ملاکھڑا کھیلنے والے پہلوان سے ہوئی تھی۔“

اس کے بعد فیض نے وہی تفصیل بتائی جو میں اس سے پہلے مہناز عرف مانی سے بھی سن چکا تھا۔ وہی سجاول کا مہلک ترین وار جو ایک گھونسے کی صورت میں ہوتا تھا اور مدمقابل کی گردن توڑ دیتا تھا۔

ایک دم فیض نے چونک کر کہا۔ ”شاید اس لڑائی کی ایک فلم بھی ہے......“

”فلم؟“

”ہاں...... وہی جو آج کل منڈے موبائل پر موی وغیرہ بناتے ہیں۔ ایک منڈا صادق محمد ہے۔ شاید اس کے پاس یہ موی ہو گی۔ سال ڈیڑھ سال پہلے بنائی تھی اس نے۔ اگر تم چاہو تو میں پتا کرتا ہوں۔“

میرے اندر شدید تجسس جاگ چکا تھا۔ میں نے فیض سے کہا کہ وہ پتا کرے۔ فیض کمبل لپیٹ کر اور ٹوپی اوڑھ کر باہر نکل گیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، وہ تیز ہواؤں میں چلتا ان مچانوں کی طرف گیا تھا جنہوں نے چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر کامیابی کی جھلک تھی اور ہاتھ میں ایک سیل فون۔

دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد وہ میرے قریب لحاف میں بیٹھ گیا اور بولا۔ ”شاہ زیب! دیکھو، میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہو رہی ہیں، وہ صرف ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں، میرے بھروسے کو خراب نہ کرنا۔“

میں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ جان جا سکتی ہے لیکن میری وجہ سے اس پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

فیض نے کہا۔ ”یہ اپنے علاقے کا بڑا مشہور پہلوان تھا۔ کوئی آٹھ نو سال پہلے کی بات ہے جب لاہور میں بسنت کی رات اس کے چاچے کا جھگڑا سردار سجاول سے ہوا، ایک طوائف کو اپنے ساتھ لے جانے کا معاملہ تھا۔ سجاول نے برسٹ مار کر پہلوان کے چاچے کو ہیرا منڈی کے چوک میں مار ڈالا تھا۔ بعد میں پہلوان نے بدلے کی بات کرنا شروع کر دی۔ آخر وہ یہاں ڈیرے تک آگیا۔ وہ اپنے ساتھ خیر پور سے بہت سے آگو (سرکردہ) لوگ بھی لایا تھا۔ اس نے سجاول سے ہتھ جوڑی مانگی۔ یعنی دو بدو لڑنے کا کہا۔ لمبی کہانی ہے۔ بہرحال اس فلم میں تمہیں اس لڑائی کے کچھ سین نظر آئیں گے۔“ فیض نے کہا اور موبائل میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے آواز بہت دھیمی کر کے وڈیو کو پلے کیا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی چھوٹا احاطہ تھا جہاں چند دن پہلے ایک ملنگ کو پھانسی دی گئی تھی۔ یہاں کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے پہلوان کو دیکھا۔ وہ غیر معمولی طور پر گرانڈیل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ قد سات فٹ کے قریب ہے۔ شانے چوڑے اور ٹانگیں درخت کے تنوں جیسی تھیں۔ وہ بس ایک شلوار میں تھا۔ سجاول دراز قد ہونے کے باوجود اس کے سامنے کوتاہ قامت نظر آتا تھا۔ سجاول نے اس وڈیو میں جانگیا پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک جاتا تھا اور اس میں ایک بیلٹ سی لگی ہوئی تھی۔ دونوں میں خوفناک لڑائی ہو رہی تھی۔ پہلوان بھی اپنے فن میں طاق نظر آتا تھا۔ دوسری طرف سجاول کا غیظ و غضب بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وڈیو کی کوالٹی اتنی اچھی نہیں تھی۔ کیمرا بھی بری طرح ہل رہا تھا۔ اس کے باوجود نظر آتا تھا کہ سجاول کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ سرخ انگارے فٹ ہو گئے ہیں۔ پہلوان کے کسی وار سے سجاول کا نچلا ہونٹ کٹ کر لٹک چکا تھا۔ دوسری طرف پہلوان کی ایک آنکھ بھی سوج کر تقریباً بند ہو چکی تھی۔ دونوں کے جسموں پر کئی گہری چوٹیں تھیں۔ یہ وڈیو کلپ بمشکل چار پانچ منٹ کا تھا...... اور کہیں کہیں وڈیو کا سلسلہ ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ بہرحال اس کلپ میں دو ہیبت ناک گھونسے جن میں سے ایک کو تو گرانڈیل پہلوان سہہ گیا مگر دوسرے نے اس کی توانا گردن توڑ ڈالی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پتھریلی زمین پر گرا۔ تماشائی مسلسل سجاول کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس آخری مرحلے پر انہوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہوائی فائرنگ کی آوازیں آئیں پھر وڈیو کلپ ایک دم ختم ہو گیا۔

میں نے اس کلپ کو چار پانچ دفعہ پلے کیا اور سجاول کے لڑنے کی تکنیک کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس میں کوئی خاص تکنیک تھی ہی نہیں۔ بس جو کچھ نظر آتا تھا وہ اس کا بے پناہ غیظ و غضب ہی تھا۔ وہ جیسے اپنے سامنے والی ہر شے کو کچل دینا اور روند ڈالنا چاہتا تھا۔ اس چار پانچ منٹ کی لڑائی میں اس نے اپنا خوفناک دایاں مکا کئی بار استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور آخر اوپر تلے دو گھونسے مارنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے اس باریکی پر غور کیا کہ وہ اپنے اس گھونسے کا استعمال کب اور کیسے کرتا ہے۔ یہ وڈیو کلپ دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کل لڑائی ہونے کی صورت میں میرا سامنا ایک خوفناک اور انوکھے حریف سے ہونے والا ہے جو لڑائی کے وقت واقعی کسی خاص اثر میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

وہ ایک یخ بستہ اور پُرشور رات تھی۔ یہ شور صرف شوریدہ سر ہواؤں کا تھا جو جنگل سے سائیں سائیں کرتے گزرتی تھیں اور چٹانوں سے سر ٹکراتی تھیں۔ تاجور حسبِ معمول نیچے تہ خانے میں تھی اور میں اوپر کمرے میں تنہا تھا۔ سینے میں میٹھا میٹھا جوش بھی تھا اور ایک عجیب و غریب تجسس بھی۔ باگھ کا سوکھا ہوا جگر، عربی گھوڑی کے پیٹ سے نکلنے والا کچے گوشت کا لوتھڑا...... اور کوئی ایسی قدیم شراب جو دور ہی سے آگ پکڑ لیتی تھی...... کیا یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں یا ان میں کوئی اصلیت بھی تھی۔ کوئی جادو ٹونا، کوئی نفسیاتی عمل جو سجاول کے اندر کی قوتوں کو ابھار دیتا تھا اور اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی تھیں؟

اچانک ہوا کے کسی تیز جھونکے نے بند کھڑکی کے پٹ زوردار آواز سے کھول دیے اور کمرا جیسے چند لمحوں میں ٹھنڈ سے بھر گیا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کیے تو ساتھ والے کمرے کا روشن دان دھماکے سے کھل گیا اور ہوائیں فراٹے بھرتی ہوئی اندر داخل ہونے لگیں۔ میں اس دوسرے کمرے میں پہنچا اور ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر روشن دان بند کیا۔ روشن دان بند کرتے ہوئے میری نگاہ احاطے کی ایک چٹان پر پڑی، مجھے شک گزرا کہ وہاں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس طوفانی سردی میں وہاں کون ہو سکتا تھا۔ درمیانی فاصلہ تیس پینتیس میٹر تھا۔ درست اندازہ لگانا مشکل تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہاں کوئی ہے۔

تجسس تو میرے اندر پہلے ہی بیدار تھا۔ میں نے جوتی پہنی، جیکٹ پہنی اور احتیاط سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں ہوائیں برچھی کی طرح جسم پر لگیں۔ میں

احتیاط سے ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا احاطے کی اس نکیلی چٹان کی طرف بڑھا۔ ایک ستون کی اوٹ سے دیکھا اور رگوں میں خون سنسنا گیا۔ مجھ سے قریباً پندرہ میٹر کے فاصلے پر ایک شخص آلتی پالتی مارے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا جسم عریاں تھا۔ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ یہ سجاول کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کیا وہ کوئی وظیفہ کر رہا تھا یا پھر کل کی لڑائی کے لیے یہاں کوئی مشق وغیرہ کرنے والا تھا۔ اس کا اسٹائل ایسا تھا جیسے یوگا کے لیے بیٹھا ہو۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی کہ وہ سجاول ہی ہے۔ اس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہیں تھا۔ خون منجمد کر دینے والی ہوا میں وہ چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے زیریں جسم پر ایک لنگی سی لپیٹی اور اس ہال کمرے کی طرف چل دیا جہاں چھرے بازی اور دست بدست لڑائی کی مشقیں ہوتی تھیں۔ وہاں دیواروں پر قدیم ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ سجاول کے پرانے بزرگوں کی پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔

سجاول نے ہال کمرے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ پھر سے بند ہونے کی مدھم آواز آئی۔ میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ ذہن میں وہی رسم والی بات پوری شدت سے گونجی۔ کیا یہ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کا ذکر آج صبح فیض محمد نے کیا تھا۔ کوئی رسم، کوئی عمل؟

میرے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ واپس کمرے میں چلا جاتا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتا۔ نیند تو فی الحال ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دبے قدموں سے ہال کمرے کی جانب بڑھا۔ حسیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں ایک تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چپک کر چلتا ہوا آگے گیا اور پھر دوڑ کر ہال کمرے کی دیوار سے لگ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اردگرد مچانوں پر بیٹھے ہوئے پہرے دار مجھے دیکھ نہیں پائے ہوں گے۔ ویسے بھی تند و تیز طوفانی جھکڑوں نے مچان نشینوں کو دبک کر بیٹھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ میں ایک چھجے سے لٹک کر ایک روشن دان تک پہنچا اور پھر روشن دان کے چوکھٹے کے سہارے چھت پر چلا گیا۔ روشن دان میں شیشے کے بجائے لکڑی کا تختہ تھا اور یہ تختہ اندر سے بند تھا۔ چھت پر اوندھے لیٹ کر میں نے دیگر روشن دانوں کا جائزہ بھی لیا، لیکن سب اندر سے بند تھے اور ان میں شیشے کے بجائے لکڑی کے تختے تھے جو اندر سے ہی کھولے جاسکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تھے۔ ہال کے اندر جانے یا جھانکنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آڑ میں میری نظر چھت کی چمنی پر پڑی، چمنی کے اوپر ٹین کی چادر کا مخروطی ڈھکن تھا۔ اس جھونپڑی نما ڈھکن کو پیچوں کے ذریعے کسا گیا تھا۔ مجھے قریب ہی لوہے کی ایک پتری پڑی ہوئی مل گئی۔ میں نے کوشش کی اور چار میں سے تین پیچ کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ چوتھا پیچ کھولے بغیر ہی میں نے ڈھکنا ایک طرف کھسکا دیا۔ تھوڑی بہت آواز پیدا ہوئی لیکن ہواؤں کے شور میں اس آواز کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اب میرے سامنے چمنی کا خلا تھا، جو قریباً ڈھائی فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا رہا ہوگا۔ میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں رسک لوں اور آواز پیدا کیے بغیر اس خلا کے ذریعے نیچے اترنے کی کوشش کروں۔ خلا نیم گرم تو ضرور تھا مگر اس میں تپش نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نیچے آگ وغیرہ نہیں۔ شاید چند گھنٹے پہلے آگ جلائی گئی ہو۔ میں خلا ... میں داخل ہوا اور چمنی کا جھونپڑی نما ڈھکنا، جو ٹین کا بنا ہوا تھا پھر سے خلا ... کے اوپر ٹکا دیا تاکہ تیز ہوا اندر داخل نہ ہو۔ نیچے اترنے کے لیے سخت مہارت اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے بازو اور ٹانگیں پوری کھول لیں تاکہ نیچے گرنے سے محفوظ رہوں۔ پھر خود کو آہستہ آہستہ ڈھیل دیتا ہوا نیچے کو کھسکنے لگا۔ کہنیاں اور گھٹنے شدید رگڑ کا شکار ہو رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ چمنی کی اندرونی کالک نے میرے ہاتھ پاؤں اور کپڑے بُری طرح کالے کردیے ہیں تاہم تاریکی کے سبب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ چھت کی بلندی کافی تھی۔ مجھے نیچے پہنچنے کے لیے کم و بیش 18 فٹ کا مشکل فاصلہ طے کرنا پڑا۔ یہ میرا بے پناہ تجسس ہی تھا جس نے مجھے اس دشوار کام پر آمادہ کیا۔

آخر مجھے آتشدان اور ہال کمرے کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کوئی غیر معمولی آہٹ نیچے موجود سجاول کو چوکنا کرسکتی تھی۔ ایک ایک انچ کھسک کر میں آتش دان میں اُتر گیا۔ یہاں بجھے ہوئے انگارے تھے اور راکھ تھی۔ دور ہال کمرے کے ایک گوشے میں روشنی نظر آئی۔ یہ دو بڑے سائز کی موم بتیاں تھیں۔ مادر زاد برہنہ سردار سجاول اس روشنی کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ اس کی سفید لنگی ایک طرف پڑی تھی۔ باقی سارا ہال تاریکی میں تھا اور آتش دان بھی اسی تاریکی کا حصہ تھا۔ اس آتش دان کے بالکل قریب آئے بغیر سجاول مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ موم بتیوں کے قریب ایک دیگچی رکھی تھی۔ دیگچی سے اٹھنے والی بھاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں گرم پانی یا کوئی اور سیال ہے۔ پاس ہی زرد رنگ کا ایک بڑا شاپر رکھا تھا جس کو اوپر سے گرہ لگائی گئی تھی۔ کمرے میں عجیب طرح کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی، جیسے سڑا ہوا گوشت یا پنیر ہو۔

میں ہر صورتِ حال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ خطرات سے کھیلنے کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے، اور دیر ہوئی یہ مزہ میرے منہ کو لگ چکا تھا۔ اگلے قریباً پندرہ منٹ میں، میں نے جو کچھ دیکھا وہ میری زندگی کا ایک یادگار تجربہ تھا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کیونکہ اس میں کراہت ہے اور بیزاری بھی۔ ان پندرہ منٹ میں وہ سب کچھ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا جو صبح فیض نے بتایا تھا اور جس پر فیض کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پورا یقین نہیں تھا۔ میں نے گرم پانی والی دیگچی میں سے سجاول کو کوئی چیز نکالتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً یہ کسی جانور کا جگر ہی تھا جسے گرم پانی میں ڈال کر نارمل حالت میں لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہال کمرے میں جو بو تھی وہ اسی بوسیدہ گوشت سے اٹھ رہی تھی۔ سجاول نے دانتوں سے نوچ نوچ کر اس گوشت کو کھایا۔ تاہم اسے کھاتے ہوئے اسے بار بار ابکائی آئی اور چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوئے۔ تب اس نے زرد رنگ کا شاپر کھولا۔ اس میں سے جو چیز نکلی وہ تازہ گوشت کا ایک خونچکاں لوتھڑا تھا اور یقیناً یہ وہی ”نامکمل زندگی“ تھی جسے کسی اصیل گھوڑی کے پیٹ سے برآمد کیا گیا تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں سجاول نے جو کچھ اس لوتھڑے کے ساتھ کیا وہ قابلِ نفرت تھا۔ کپڑے کی پوٹلی میں ڈال کر اسے ایک ہاون دستے کے ساتھ کوٹا گیا اور نچوڑ کر اس کی رطوبت نکالی گئی۔ ایک بڑا گلاس اس رطوبت سے دو تہائی بھر گیا تو اس میں وہ سہ آتشہ شراب ملائی گئی جس کا تذکرہ فیض محمد نے کیا تھا۔ تب سجاول اپنے جدِّامجد کی پینٹنگ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ گلاس کے مکروہ محلول کو پینے کے لیے بھی سجاول کو کئی جتن کرنے پڑے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بمشکل اپنی قے روکے ہوئے تھا۔

آخر میں سجاول پر عجیب سی لرزش طاری ہوگئی۔ اس کا بدن جیسے اینٹھ رہا تھا۔ وہ لیٹ گیا اور نہایت بے قراری میں کروٹیں لینے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ تھوڑی دیر میں آتشدان کی طرف آئے گا اور آگ وغیرہ سلگانے کی کوشش کرے گا۔ اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا جاتا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ دھیرے دھیرے اوپر کو سرکنے لگا۔

دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ جو کچھ میں ہال کمرے کے اندر دیکھ کر آیا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ بے شمار ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے استعمال سے وقتی طور پر انسان کے اندر غیر معمولی جسمانی یا ذہنی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ منشیات، ٹرینکولائزرز اور دیگر مسکن اشیا ان میں شامل ہیں لیکن یہ اضافی توانائیاں محدود مدت کے لیے ہوتی ہیں۔ کسی کا اثر چند گھنٹے ہوتا ہے، کسی کا ایک یا دو دن، بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو زیادہ دنوں تک اثر پذیر رہتی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ جسمانی کے علاوہ نفسیاتی بھی لگ رہا تھا۔ شاید سائیکالوجی یا پیراسائیکالوجی کا کوئی معاملہ۔

اس رات میں آخری پہر تک جاگتا رہا۔ چمنی کی کالک والے کپڑے میں نے تبدیل کر لیے تھے اور منہ ہاتھ دھولیا تھا۔ میں نے کل کے معرکے کے لیے خود کو ذہنی طور پر یکسو اور جسمانی طور پر تیار کیا۔ اس کے لیے میں نے کمرے کو اندر سے بند کیا۔ لالٹین کی لو بہت نیچی کر دی اور کچھ ورزشیں کیں۔ ان ورزشوں اور مشقوں نے جہاں میرے جسم کو تیار کیا وہاں مجھے ماضی قریب کے دن بھی یاد کرا دیے، جب میں نے انگلینڈ میں MMA کے تین اہم ترین مقابلے کیے تھے۔ ایک طرح سے یہ میرے آخری مقابلے تھے۔ وہ تیاری اور ہوتی تھی، وہ ماحول جدا ہوتا تھا۔ دنیا کے نہایت مہنگے کوچز جو دنوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے نہایت بھاری معاوضے لیتے تھے۔ بہترین جمز، جدید ترین مشینیں اور سہولیات۔ جسمانی توانائی کے لیے نایاب سپلیمنٹس اور ڈائٹس۔

یہاں وہ سب کچھ نہیں تھا۔ بس ایک تاریک کمرا تھا جس میں بمشکل دس ضرب بارہ فٹ کی خالی جگہ موجود تھی۔ مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے کسی بھرپور ٹریننگ اور لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ران کا زخم تو ٹھیک ہو چکا تھا مگر کندھے کی چوٹ ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ بس ایک جذبہ تھا، بس ایک چہرہ تھا، فقط ایک معصوم دیہاتی مسکراہٹ تھی، جس نے مجھے ہر امتحان سے گزرنے کا حوصلہ دے رکھا تھا، میں جو کچھ کر رہا تھا، جو کچھ سوچ رہا تھا، اور جو کچھ سوچنا چاہتا تھا، اس کا مقصد تاجور کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ کیا تھی؟ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں آتا کہ کاش میں کوئی شاعر ہوتا۔ میں اس کے نہایت سادہ اور نہایت دلکش حسن کو لفظوں میں بیان کر سکتا۔ یا کوئی مصور جو اس کی شایانِ شان تصویر بنا سکتا، یا پھر کوئی سنگ تراش، جسے بے پناہ خوب صورتیوں کو مجسم کرنے کا فن آتا۔

میں موجودہ حالات کے بارے میں سوچتا رہا اور میرے اندر کی کیفیت کچھ اور سی ہو گئی۔ ہال کمرے میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ پریشان کن تھا۔ میرا اندر سے جیسے آواز ابھری ”شاہ زیب! یہاں کچھ انوکھا ہے اور یہ ایسا انوکھا پن ہے جس سے تمہارا واسطہ آج تک نہیں پڑا، سوچ لو۔“

فوراً ہی دوسری آواز ابھری۔ ”جو کچھ بھی ہے، وہ محبت اور ہمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تم کوئی عام شخص نہیں ہو۔ تم نے مشکل ترین حریفوں کو زیر کیا ہے۔ مت بھولو کہ تم پروفیشنل ہو...... چیمپئن ہو۔ اگر تم ایسے انوکھے حریف سے نہیں لڑو گے تو اور کون لڑے گا۔ تمہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“

پہلی آواز نے کہا۔ ”چیمپئن ہونا اور بات ہے، جنونی ہونا اور بات...... اور یہ شخص جنونی ہے۔ اس کے خون میں نسل در نسل کسی ”قاتل جارحیت“ نے گھات لگا رکھی ہے۔“

دوسری آواز نے کہا۔ ”جو کچھ بھی ہے لیکن اس نے لڑنا تو اپنے انہی دو ہاتھوں اور دو پاؤں سے ہے۔ تمہاری غیر معمولی مہارت اور برداشت اس کے ہر حربے کو ناکام بنا سکتی ہے۔ اس کا جنون تمہارے SKILL کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔“

میں کھڑکی میں آ بیٹھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ دل میں عجیب بے قراری سی تھی۔ کل خبر نہیں کیا ہونے والا تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو تاجور کا کیا بنتا۔ اور یہی خیال تھا جو مجھے منفی انداز میں سوچنے ہی نہیں دے رہا تھا، کہا جاتا ہے کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر گھمسان کے رن میں ایک افسر نے اپنے سپاہی سے کہا تھا، ہمیں کچھ پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ سپاہی اشک بار اور پُرجوش لہجے میں بولا تھا۔ میں پیچھے کیسے ہٹوں سر! پیچھے تو لاہور ہے۔

وہ جذبے کی ایک اعلیٰ ترین مثال تھی۔ میری مثال چھوٹی تھی لیکن اس سے ملتی جلتی تھی۔ میں بھی پیچھے کیسے ہٹ سکتا تھا اور شکست کا کیسے سوچ سکتا تھا۔ میرے پیچھے تاجور تھی۔

یخ بستہ رات کے سناٹے میں ایک آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ یہ اس ملنگنی کی آواز تھی جسے یہ لوگ چند روز پہلے پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ وہ ہوش میں ہوتی تو گالیاں بکتی تھی لیکن رات کو یہ لوگ اسے زبردستی شراب پلا دیتے تھے۔ نشے میں آنے کے بعد یہ بلند آواز میں ہنستی تھی۔ الٹے سیدھے گیت بھی گاتی تھی اور خود سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو میٹھی میٹھی گالیاں بھی دیتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ بات صرف چھیڑ چھاڑ تک ہی نہیں رہتی تھی۔ درمیانی عمر کی یہ ملنگنی ان لوگوں کے لیے ایک کھلونا تھی اور وہ اس سے کھیلتے تھے۔ یہاں چند طرح دار طوائفیں بھی موجود تھیں مگر وہ اعظم جاہ اور سجاول کے قریبی ساتھیوں کی دل بستگی کے لیے تھیں۔ چھوٹے درجے کے کارندوں کے حصے میں یقیناً اس ملنگنی جیسی عورتیں ہی آتی تھیں۔

ملنگنی کی آواز سن کر پتا نہیں کیوں میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ میں ڈنمارک میں تھا۔ ایک بھلا مانس اور کام سے کام رکھنے والا لڑکا۔ آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنے تھے اور یہ ارمان تھا کہ اپنی ماں کی شبانہ روز دعاؤں کو اثر دوں گا۔ وہ ساری خوشیاں اور کامیابیاں ان کی جھولی میں ڈالوں گا جس کی وہ مجھ سے امید رکھتی ہیں۔ میں ان کی آس بھری نگاہوں کا اکلوتا مرکز تھا لیکن پھر وہ واقعہ ہوا تھا جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں کے چنگل سے بچاتے بچاتے میں خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ جن لڑکوں کو میں عام مشٹنڈے سمجھا تھا اور ان سے ٹکر لی تھی، وہ تو ایک بہت بڑے گینگ کے لوگ ہیں اور ایک خلقت اس گینگ کے نام سے کانپتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں ایک شخص کچھ زیادہ ہی زخمی ہو گیا تھا اور اسپتال جا پہنچا تھا۔ اس صورتِ حال کی خبر والد صاحب کے ایک ڈینش دوست کو ہوئی تو اس نے والد کو بتایا کہ ٹیکساری گینگ کے لوگ مجھے بہ آسانی معاف نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو گھنٹوں کے اندر ان کے سرغنہ جان ڈیرک کی طرف سے میرے لیے بلاوا آ جائے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کے بلانے سے پہلے ہم خود ہی اس کے ٹھکانے پر چلے جائیں اور میں اس سے معافی مانگ لوں...... اور اگر کوئی ہرجانہ بھی دینا پڑے تو دے دوں۔

والد صاحب نے ایک اور مقامی معزز شخص کو اپنے ساتھ لیا اور ہم جان ڈیرک کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ میں اندر سے لرز رہا تھا۔ والد صاحب اور ان کے دوست ایلوس کی شکل بھی دیدنی تھی۔ جان ڈیرک کے اسسٹنٹ نے ہمیں قریباً دو گھنٹے دفتر سے باہر انتظار میں بٹھائے رکھا۔ پھر یہ کہہ دیا کہ ڈیرک صاحب کسی ضروری کام سے نکل گئے ہیں ہم کل آئیں۔

ہم اگلے دن پہنچے۔ اگلے دن بھی طویل انتظار کے بعد ہمیں شرفِ باریابی ملا۔ جن غنڈوں سے میری لڑائی ہوئی تھی وہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جبکہ میں، میرے والد اور ان کے دوست کھڑے تھے۔ جان ڈیرک نے مجھے غصیلی نظروں سے گھورا اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”یہاں میرے دفتر میں کیا لینے آئے ہو۔ تم نے سنا ہو گا کہ بہترین انصاف وہ ہوتا ہے جو اس جگہ پر ہو جہاں جرم ہوا تھا۔ اگر معافی مانگنا ہے یا سزا پانی ہے تو وہیں پر جاؤ جہاں پر بدمعاش بنے تھے۔“

والد نے منت سماجت کی مگر وہ لوگ ہمیں وہیں لے آئے جہاں میرا جھگڑا ہوا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی تین چار بندوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میرے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا۔ آخر ارد گرد کے لوگوں نے میری جان چھڑائی۔

”اب اگر طبیعت چاہ رہی ہے تو معافی مانگ لو۔“ ایک انڈین غنڈے سری کانت نے کہا۔

میری جگہ والد نے معافی مانگی اور میری جان چھوٹی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرے لیے حکم صادر ہوا۔ ”تم دوبارہ اس ایونیو (سڑک) پر نظر نہیں آؤ گے۔ اگر آؤ گے تو خود ذمے دار ہو گے۔“

میں نے والد اور والدہ کے کہنے پر سب کچھ برداشت کیا تھا لیکن یہ مستقل توہین مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس بازار میں میرے کئی دوست تھے، ملنے جلنے والے تھے۔ آخر ایک دن میں نے والد سے کہہ دیا۔ ”یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں ان کو مار دوں گا یا خود مر جاؤں گا۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں اس سڑک سے نہ گزروں تو پھر یہ فلیٹ ہی چھوڑ دیں۔“

والد بھی دیکھ رہے تھے کہ میں مسلسل اذیت کا شکار ہوں۔ مجھے اپنی یونیورسٹی جانے کے لیے روزانہ کوئی آٹھ کلو میٹر کا اضافی سفر کرنا پڑ رہا تھا اور بات صرف سفر ہی کی نہیں تھی۔

آخر انہوں نے فلیٹ چھوڑ دیا اور ہم نے ایک دوسرے علاقے میں رہائش اختیار کر لی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد کی بات ہے وہ بہار کی ایک سہانی صبح تھی۔ میں اپنی یونیورسٹی کی دوست ڈیزی کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ ہم ویک اینڈ پر لانگ رائڈ کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ سڑک سنسان تھی اور اطراف میں درخت تھے۔ ایک بڑی جیپ نے ہمیں اوورٹیک کیا اور کچھ آگے جا کر رک گئی۔

اندر سے وہی ٹیکساری گینگ کے چار پانچ لڑکے نکلے۔ انہوں نے پہلے تو ہمیں چاکلیٹس پیش کیں پھر بدتمیزی پر اُتر آئے۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو بھائی، اب بات ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ہم معافی بھی مانگ چکے ہیں۔''

ان کا سرغنہ بولا۔ ''معافی کے وقت ہم چاروں تو موجود تھے لیکن یہ ہمارا پانچواں دوست موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی اس سے بھی معافی مانگنا باقی ہے۔''

''آپ لوگ مجھے دیوار سے لگا رہے ہو۔'' میں نے کہا تھا۔

''دیوار سے نہیں لگا رہے، صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا یہ پانچواں دوست ابھی تک تمہاری معافی سے محروم ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

سرغنہ سری کانت بولا۔ ''زبانی کلامی کے بجائے ہم عملی معافی پر وشواش رکھتے ہیں۔ اپنی اس گرل فرینڈ کو ہمارے پانچویں ساتھی کے حوالے کر دو۔ ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اسے بیان کرنے سے زخموں کے منہ کھلیں گے اور سینہ چھلنی ہوگا۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر مجھے باندھ دیا اور جیپ کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔ میری دوست ڈیزی قریباً دو گھنٹے ان کی دسترس میں رہی۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

اس روز کے بعد میں نے کبھی ڈیزی کی شکل نہیں دیکھی۔ یقیناً وہ خود بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا تھا۔ میں نے اس ٹولے کے سرغنہ سری کانت کو ایک نائٹ کلب میں گھیر کر اتنا مارا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور انتڑیاں کٹ گئی تھیں۔ اس واقعے کے بعد میں کوپن ہیگن میں ہی رہا تھا اور پولیس تفتیش کا سامنا کیا تھا، میں نے نائٹ کلب میں جو کچھ کیا تھا، وہ ڈیزی والے واقعے کا ردِعمل تھا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی تھی۔ چھ ماہ بعد جب میں جیل سے نکلا تو میرا کیریئر تقریباً تباہ ہو چکا تھا اور میں ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ والد مجھ سے منہ موڑ چکے تھے۔ ماں دکھ کی چکی میں پس رہی تھی۔ میں نے پہلے گلیوں میں دنگا فساد کیا، کہیں مارا، کہیں مار کھائی۔ پھر ماں کے بے حد اصرار پر میں نے اپنا رخ کچھ بدلا۔ میرا رجحان MMA یعنی مکس مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا۔ میں نے خود کو سرتاپا اس خطرناک کھیل میں کھپا دیا۔ میں نے خود کو ایک مکمل کھلاڑی بنانے کی کوشش کی مگر ابھی ایک اور واقعہ تھا جو مجھے مارا ماری کی اس دنیا میں کچھ اور آگے لے جانے والا تھا۔ مجھے ''رنگ'' سے باہر بھی لڑنا تھا اور بڑے بُرے طریقے سے لڑنا تھا۔

اچانک کسی کمرے سے ایک بار پھر ملنگنی کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ نشے میں تھی اور اپنے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کو بددعائیں دے رہی تھی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ملنگنی کو یہاں آئے ہوئے اب آٹھ دس دن ہو چلے تھے۔ ملنگوں کے دو بندے جان سے بھی گئے تھے، مگر انہوں نے دوبارہ اس علاقے کا رخ نہیں کیا تھا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ ملنگی ڈیرا تباہ ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پردے والی سرکار کا دستِ راست کرنالی بھی کہیں چھپتا پھرتا ہو۔

دوسری طرف پولیس نے بھی اس طرف آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ مقامی پولیس میں سجاول گینگ کے خاص دوست موجود ہیں، جن کی وجہ سے یہ جگہ سجاول اور اس کے ساتھیوں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔

سرد ہوا کے تھپیڑے مسلسل کھڑکیوں، دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے کسی تند و تیز جھونکے کے ساتھ موسیقی کی آواز بھی کانوں میں پڑتی تھی۔ یہ آواز اعظم جاہ کے رہائشی حصے کی طرف سے آ رہی تھی۔ کسی شب بیدار جانور کی طرح یہ شخص دن کو سوتا تھا اور رات کا اکثر حصہ جاگ کر گزارتا تھا۔ گھنگروؤں کی چھن چھن بتا رہی تھی کہ اس وقت بھی اس نے محفل طرب سجائی ہوئی ہے اور ناچنے والیاں اس کی رات کو رنگین کر رہی ہیں۔ کل شام میں نے دو بنے سنورے ہیجڑے بھی دیکھے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ بھی اس محفل کا حصہ رہے ہوں گے۔ رات کے اس پہر بُھنے ہوئے گوشت کی خوشبو آ رہی تھی۔

پہاڑوں کی گود میں اس ویران جنگل کے درمیان یہ بڑی انوکھی رات تھی، میں کھڑکی سے لگا بیٹھا رہا اور برفیلی ہواؤں کے شور میں جھومتے اور لہراتے درختوں کو دیکھتا رہا۔

ذہن ایک بار پھر آہستہ آہستہ ماضی کی طرف پلٹ گیا۔ یورپ میں گزرے روز و شب آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ میں مکس مارشل آرٹ کی راہ پر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے اندر ایک آگ تھی۔ وہی آگ جو ایک کمزور اور شریف شخص کے اندر اس وقت بھڑکتی ہے جب وہ مسلسل ذلت سہتا ہے۔ میں نے پہلے کاؤنٹی کی سطح پر مقابلوں میں حصہ لیا پھر مزید آگے بڑھا۔ کوپن ہیگن میں میری پہچان بن گئی۔ میں نے داڑھی رکھ لی تھی، بال اتنے بڑھا لیے تھے کہ کندھوں تک پہنچتے تھے۔ اس فیلڈ میں میرا ایک ترک دوست مامون تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑا سینئر تھا۔ اس کے ساتھ میری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ ایک لیڈی باکسر انیتا سے مامون کی گہری دوستی تھی۔ ایک طرح سے دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ ان دونوں کا سپنا تھا کہ ان کا اپنا ایک شاندار جمنازیم اور فائٹنگ رنگ ہو۔ اس کے لیے دونوں نے سخت محنت کی تھی۔ تھوڑا تھوڑا سرمایہ جمع کر کے جمنازیم کی بنیاد رکھ دی تھی اور اب اسے مکمل کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہے تھے۔

رنگ کے اندر میری اور مامون کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم دونوں جیسے یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ ہر دکھ سکھ کے ساتھی اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔ لیکن ظالم ماضی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ٹیکساری گینگ کے لوگ مسلسل میرے درپے تھے۔ ایک دو بار ان سے میری جھڑپ بھی ہوئی جس کی میں نے پولیس میں باقاعدہ رپورٹ کی۔ میں ایک کھلاڑی تھا اور صرف کھلاڑی رہنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ صرف مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہونا ہی کافی نہیں ہے، دنیا کے اس جنگل میں ایسے درندے بھی ہیں جو آپ کے مارشل آرٹ وغیرہ کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں اور بغیر نام پتا پوچھے آپ کو چیر پھاڑ سکتے ہیں۔

اس دن جمنازیم کے ورزشی پورشن کا افتتاح ہونا تھا، مامون اور انیتا خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مامون نے میرے سینے پر گھونسا مارتے ہوئے کہا تھا۔ ''شاہ زیب، صبح دس بجے تمہیں پہنچ جانا ہے وہاں۔ ورنہ تیری میری ''فل کونٹیکٹ'' فائٹ ہو جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''صبح دس بجے وہاں میں نے جھاڑو پھیرنا ہے؟ افتتاح تو شام چار بجے ہے۔''

''کر رہے ہو نا وہی پوستیوں والی بات۔ بھئی سو طرح کے کام ہیں۔ اور کیا آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ جناب مہمان نہیں میزبان ہیں۔''

انیتا نے اپنے خوب صورت سنہری بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''آج میں بالکل مامون کی ہمنوا ہوں۔ کہو تو میں ساڑھے نو بجے خود گاڑی لے کر آ جاؤں

گی۔“

”نہیں بھئی نہیں۔ میں خود ہی آ جاؤں گا۔ یہ بڑا کمینہ ہے، شک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جو سچے عاشق ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

مامون مجھ پر جھپٹا اور ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ پہلے اس نے مجھے نیچے گرایا، پھر میں نے پلٹ کر اسے نیچے کیا۔ ہمارے درمیان ایسی دوستانہ دھینگا مشتیاں چلتی ہی رہتی تھیں۔ انیتا ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل ہم دونوں کو علیحدہ کیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے انیتا کی عزت کرتا تھا اور میری شدید آرزو تھی کہ وہ دونوں جلد از جلد شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔

میں یہ بات ازراہِ مذاق کہہ رہا تھا کہ اگلے روز دس بجے جمنازیم نہیں پہنچ سکوں گا۔ لیکن یہ مذاق درست ثابت ہو گیا۔ میں ایک اسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کر رہا تھا۔ ایک نمائشی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے میں ”البورگ“ گیا۔ صبح آٹھ بجے میری واپسی فلائٹ کوپن ہیگن کے لیے تھی۔ مگر شدید طوفانی موسم کے سبب یہ کینسل ہو گئی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوائے ڈپارچر لاؤنج میں بیٹھ کر طوفان کے تیور دیکھنے کے۔

لیکن ایک اور طوفان ایسا تھا جس کے تیور مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور یہ طوفان کوپن ہیگن کے اس جم میں برپا تھا جہاں مامون اور انیتا افتتاح کی ابتدائی تیاریوں کے لیے موجود تھے۔ ٹیکساری گینگ کے درندہ صفت لوگوں نے میرا کام تمام کرنے کے لیے صبح سویرے جم پر حملہ کیا۔ ان کی اطلاعات کے مطابق میں بھی وہاں موجود تھا۔ بعد میں اس اندوہناک واقعے کی جو تفصیلات معلوم ہوئیں ان سے پتا چلا کہ وہ پانچ افراد تھے جو جم کا دروازہ کھلتے ہی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اس وقت جم بالکل خالی تھا۔ ایک چوکیدار کے علاوہ صرف ایک سوئپر وہاں موجود تھا۔ یا پھر مامون اور انیتا تھے۔ حملہ آوروں نے حملہ کیا۔ مامون نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ وہ کوئی معمولی فائٹر نہیں چیمپئن تھا۔ انیتا نے بھی حتی الامکان اس کا ساتھ دیا۔ وہ یقیناً اپنا دفاع کرنے میں کامیاب رہتے لیکن پھر حملہ آوروں میں سے ایک نے گولی چلا دی۔ ایک فائر خوبرو انیتا کی پشت پر لگا اور سینے کی طرف سے نکل گیا۔ دوسرے فائر نے مامون کی ٹانگ زخمی کر دی۔ وہ جان بچانے کے لیے بالائی منزل کی طرف بھاگا۔ حملہ آور اس کے پیچھے لپکے اور اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

مارشل آرٹ ہار گیا۔ آتشیں اسلحہ اور بدمعاشی جیت گئی۔ وہ سب کچھ میرے لیے بے حد روح فرسا تھا۔ میں رنج و غم کے سمندر میں ڈوب ڈوب گیا۔ میں مر جانا اور مار دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا میرے اصل دشمن کون ہیں۔ وہی خون ریزی اور دہشت گردی کے ساجھے دار جان ڈیرک اور سری کانت کا بگ باس راہول۔ لیکن سب جانتے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ہیں۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو میری حیثیت ان بگ گینگسٹرز کے سامنے وہی تھی جو ایک بے دست و پا زخمی شخص کی بھوکے شیروں کے غول کے سامنے ہوتی ہے۔ میری پیاری ماں نے ایک بار پھر میرے قدموں میں اپنی چادر بچھا دی تھی، اور کہا تھا۔ ”شاہ بیٹے! اگر ماں کا مرا ہوا منہ دیکھنا نہیں چاہتا تو اپنے ارادے ختم کر دے۔ ہم قانونی لڑائی لڑیں گے اور مامون اور انیتا کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچائیں گے۔“

اپنی نئی فیلڈ میں، میں نے جہاں نام اور شہرت پائی تھی وہاں کافی بینک بیلنس بھی بنایا تھا۔ والد صاحب نے کہا۔ ”ہم بہترین وکیل کریں گے اور یہ مقدمہ لڑیں گے۔ یہ ڈنمارک ہے۔ قانون کی حکمرانی ہے یہاں۔“

اس خونی واقعے کے دو چشم دید گواہ تھے۔ ایک اٹالین چوکیدار رونالڈ دوسرا پارسی جمعدار جوزف۔ رونالڈ تو کھڑا نہ رہ سکا اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے مالک اور مالکن کو قتل ہوتے دیکھا ہے لیکن جوزف کھڑا رہا۔ جوزف کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ جسم پر برص کے داغ تھے۔ دیکھنے میں ایک معمولی شخص نظر آتا تھا مگر اس نے ہمت دکھائی اور عدالت میں گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ کیس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جوزف کی گواہی کی بے پناہ اہمیت ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا۔ تاہم ایک روز جان ڈیرک اور راہول کے سفاک ہرکارے اس جگہ پر بھی پہنچ گئے جہاں جوزف موجود تھا۔ انہوں نے اس گھر پر اتنی فائرنگ کی کہ کھڑکیاں، دروازے چھلنی ہو کر رہ گئے اور ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ خوش قسمتی سے پٹرولنگ پولیس پہنچ گئی اور ایک اسٹور میں دبکے ہوئے سوئپر جوزف کی جان بچ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ڈنمارک جیسے ملک میں ہونے کے باوجود مجھے یہ قانونی لڑائی جیتنے نہیں دی جائے گی۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے سنگین ارادے کے ساتھ پہلی بار قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پہلی بار ہی تھی

جب میں نے اپنی شناخت چھپا کر کوئی کارروائی کی۔ میں نے اپنا چہرہ ایک اسکائی ماسک میں چھپایا تھا۔ میرے ساتھ میرا ایک قریبی دوست بھی تھا۔ ایک طرح سے یہ میرا اور مرحوم مامون کا مشترکہ دوست تھا۔ ہم نے ایک سوئمنگ پول میں اندھا دھند فائرنگ کر کے گینگسٹر راہول بھائی کے ہندو دستِ راست گوپال ورما کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے چھ ماہ پہلے میرے جگری یار مامون اور اس کی دوست انیتا کو بے رحمی سے مارا تھا اور اس وقت مارا تھا جب وہ دونوں اپنے سپنوں کی تعبیر پانے کے بالکل قریب تھے۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ اگلے قریباً دو سال میں، میں ایک طرف تو ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے لوگوں سے بھی برسرِ پیکار رہا۔ بہت سے لوگوں کو شک تھا کہ ٹیکساری گینگ کو گاہے بگاہے سنگین مصائب سے دوچار کرنے والوں میں ہی ہوں لیکن ابھی تک ثبوت کوئی نہیں تھا۔ پھر میں کچھ عرصے کے لیے زیرِ زمین چلا گیا۔ اس روپوشی کے دوران میں بھی میں نے ایم ایم اے کی خونی فائٹس جاری رکھیں اور مارشل آرٹ کے قانونی و غیر قانونی حلقوں میں اپنی دھاک بٹھا دی۔

والد اور والدہ مجھ سے ناراض ہو چکے تھے، مگر میں جس رخ پر چل نکلا تھا وہاں سے واپسی میرے لیے ممکن نہیں تھی اور یہی دن تھے جب مجھے جان ڈیرک سے انتقام لینے کا ایک زبردست موقع ملا۔ ڈیرک کی ایک خاص محبوبہ تھی جسے فیری یعنی پری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے ڈیرک کے مزاج میں بے پناہ دخل تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ انڈر ورلڈ کے اس بے تاج بادشاہ ڈیرک سے جو چاہے کرا سکتی ہے۔ وہ بہت خوش لباس بھی مشہور تھی اور لاس اینجلس میں خوش لباسی کا کوئی بہت بڑا مقابلہ بھی جیت چکی تھی۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال تھی۔ شہزادیوں اور ملکاؤں سے بڑھ کر زندگی گزار رہی تھی۔

ایک روز میرے خاص ساتھی ناصر نے مجھے ایک خاص اطلاع دی۔ اس وقت ہم روم میں تھے اور انٹرنیٹ پر دکھائے جانے والے ایک خونریز مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ ناصر نے کہا۔ ”شاہ زیب! میرے ایک انفارمر نے بڑی چوٹی کی اطلاع دی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے سینڈ بیگ پر مکے برساتے ہوئے پوچھا تھا۔

”فیری یہاں مضافاتی علاقے کی ایک کوٹھی میں موجود ہے۔ شاید سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی ہے۔“

کوپن ہیگن سے قریباً دو ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر فیری کا یہاں موجود ہونا اچنبھے کی بات تھی اور بڑی اہم بھی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ”انفارمر الیکٹریشن کی حیثیت سے کوٹھی کے اندر گیا ہے اور اس نے معلومات لی ہیں۔ جان ڈیرک یہاں موجود نہیں۔ شاید ایک دو دن تک آئے گا۔ اندر مسلح بندوں کی تعداد بھی آٹھ دس سے زیادہ نہیں۔“ ناصر کی آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی۔

واقعی یہ قابلِ قدر موقع تھا۔ جان ڈیرک اور فیری وغیرہ کے اردگرد ہر وقت درجنوں خطرناک ترین شوٹر ہوا کرتے تھے۔ اور کوپن ہیگن میں تو ان کے اردگرد چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ اس رات ہم نے روم کے مضافاتی علاقے میں ”فنتاسی“ نامی اس عمارت پر حملہ کیا تھا۔ ہمیں توقع سے زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فیری کے محافظوں میں سے چار افراد قتل ہوئے، ایک ملازمہ بھی ماری گئی۔ میرے دو ساتھی بھی شدید زخمی ہوئے جن میں سے ایک جانبر نہ ہو سکا۔ ہم نے فیری کو اس پھولوں سے لدی ہوئی کوٹھی میں سے اٹھا لیا اور ایک اسٹیشن ویگن میں ڈال کر قریبی شہر میں لے گئے۔ یہاں ہمارا ایک خفیہ ٹھکانا موجود تھا۔ فیری واقعی بڑی طرح دار عورت تھی۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ خوش لباسی میں خود کو ملکۂ ڈنمارک سمجھتی تھی۔ شکل و صورت کی بھی اچھی تھی۔ اس کے اغوا کے دوران میں ایک غیر متوقع واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ گھمسان کی دست بدست لڑائی میں میرے چہرے کا ماسک پھٹ گیا تھا اور حریفوں میں سے دو تین افراد نے مجھے شاہ زیب کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اب میرے لیے بے حد ضروری تھا کہ میرے والد اور والدہ منظرِ عام پر نہ رہیں۔ میں نے فوراً کوپن ہیگن میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت جاری کر دیں کہ اب یہ کھلم کھلا جنگ ہو گئی ہے۔ لہٰذا میرے والدین کو فوراً سے پہلے کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اس پر فی الفور عمل ہو گیا۔

اغوا ہونے کے بعد جب فیری ہمارے خفیہ ٹھکانے پر پہنچی اور اس نے مجھے پہچانا تو بہت تن فن دکھائی۔ اس نے کسی مہارانی یا ملکہ کی طرح ہمیں جھاڑیں پلائیں اور مجھے نہایت خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔

اس نے کہا۔ ”تمہیں ٹھیک سے پتا نہیں کہ تم نے کس سے ٹکر لی ہے۔ ڈیرک تمہیں اس حال تک پہنچا دے گا کہ تم بلک بلک کر موت کی بھیک مانگو گے اور موت تمہیں ملے گی نہیں۔“

وہ جانتی نہیں تھی کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ وہ جس کو للکار رہی ہے، وہ بھی اب وہ نہیں رہا جو دو ڈھائی سال پہلے تھا۔ وہ مار دھاڑ اور بے رحمی میں اگر ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس کا رویہ دیکھ کر میرے طیش میں اضافہ ہوا۔ مجھے اپنا وہی پرانا زخم یاد آ گیا جس نے پہلے پہل مجھے خون کے آنسو رلائے تھے۔ خوش رنگ ڈیزی جسے ٹیکساری گینگ کے غنڈوں نے پامال کیا تھا، اس تلخ یاد کا ردِعمل تھا کہ میں نے نک چڑھی ”ملکۂ ڈنمارک“ کو خاکروب جوزف کے حوالے کر دیا۔ جوزف کو شراب کے سوا کوئی لت نہیں تھی (وہ ایک کڑک مرد تھا اور اس کا ثبوت یہی تھا کہ وہ جمنازیم والے واقعے کی گواہی دینے کے لیے ڈٹا رہا تھا) میں نے جوزف کو اجازت دے دی کہ اگر وہ اس کی بات نہ مانے تو وہ اس کو بھوکا رکھ سکتا ہے۔ اس سے مار پیٹ کر سکتا ہے۔ صرف دو تین ہفتے میں ہی فیری عرف ملکۂ ڈنمارک کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔ وہ میری منت سماجت پر اتر آئی کہ میں اسے اس برص زدہ پارسی سے نجات دلاؤں۔ میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ آخر وہ پھر آنکھیں دکھانے لگی اور دھمکی دی کہ وہ اپنی جان لے لے گی اور اس کا خون ٹیکساری گینگ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

میں نے کہا کہ میں نے بہت پہلے معافیاں مانگ لی تھیں۔ اب مجھے کچھ معاف نہیں کرانا۔

تیسرے دن فیری نے تیز نشہ آور گولیاں شراب میں گھول کر چڑھا لی تھیں۔ وہ جانبر نہیں ہوئی تھی اور مجھے اس کا افسوس بھی نہیں ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ محبت سے محبت پروان چڑھتی ہے۔ نفرت سے نفرت اور سفاکی سے سفاکی۔

دفعتاً مجھے اپنے خیالوں سے پھر چونکنا پڑا۔ میں ایک بار پھر ماضی کے دھندلکوں سے نکل آیا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ یہ تیز ہوا کی دستک نہیں تھی۔ میں اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فیض محمد۔“ باہر سے آواز آئی۔

حیرانی کی بات تھی کہ وہ رات کے اس پہر دروازے پر تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا۔ اس کا بوڑھا چہرہ تشویش اور دکھ کی آماجگاہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ بھی ابھی تک میری طرح جاگ رہا ہے۔

وہ میرے سامنے رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھ بجھی انگیٹھی کی راکھ کرید کر اسے تھوڑا سا گرم کیا۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر نہایت بوجھل لہجے میں بولا۔ ”شاہ زیب! بہت دیر ہو چکی ہے لیکن...... مجھے لگتا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو تمہیں اب بھی ایک موقع مل سکتا ہے۔“

”کس بات کا موقع؟“

”اپنی جان لیوا بے وقوفی کو ٹھیک کرنے کا موقع۔ تمہیں پتا نہیں...... کل تم سردار سجاول کے سامنے جا کر خود کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈالو گے۔“

”کیا اس نے مجھے ڈرانے کے لیے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟“

”اس نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں۔“ فیض دانت پیس کر بولا۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھنے کے لیے لالٹین کی لو کچھ اونچی کی اور ایک بار پھر آزردہ لہجے میں کہا۔ ”ہتھ جوڑی کی منگ واپس لے لو شاہ زیب! میں اپنی پگڑی سردار کے پاؤں میں رکھ کر اسے منا لوں گا۔“

میں نے فیض کی پگڑی پر ہاتھ پھیرا۔ ”چاچا! یہ تمہارے سر پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اب تو بس چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اب جو ہونا ہے میدان میں ہی ہونا ہے۔“

میرے مصمم ارادے نے جیسے فیض کو سرتاپا ہلا دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور اس ہال کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس میں مادرزاد برہنہ سردار سجاول آدھی رات کے بعد سے بند تھا۔ کسی کھڑکی یا روشن دان سے روشنی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ہوائیں فراٹے بھرتی ہوئی دیوہیکل درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ جیسے انہیں جڑوں سے اکھاڑ دینا چاہتی تھیں۔ دیوہیکل درختوں اور چٹانوں کے ساتھ منہ زور ہواؤں اور شوریدہ سر پانیوں کا یہ تصادم ہمیشہ سے رہا ہے۔ ہاں جب تک ڈیرک رہیں گے، شاہ زیب بھی رہیں گے...... اور یہ تصادم بھی رہے گا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

مکافات

سرور اکرام

نیکی و بدی ... ایثار و قربانی ایسی صفات ہیں جو اس کی پیشانی پر چاند کی طرح چمکتی ہیں... اس کے اعمال ہی اس کا زادِ راہ ہوتے ہیں... ایک بدطینت شخص کی کہانی جس کا اوڑھنا بچھونا صرف دولت کا حصول تھا... جھوٹ ... جعلسازی اور مکاری سے وہ ہر سچ کو غلط ثابت کر رہا تھا... مگر قدرت کا قانون نرالہ ہے...

مکافاتِ عمل کا دل گداز قصہ...... دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی پراثر تحریر

وہ ایک تھل تھل جسم والا شخص تھا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مکاری اور بے رحمی ظاہر ہوا کرتی۔ گلے میں سونے کی موٹی سی چین اور کلائی پر ایک قیمتی گھڑی۔ ایک شاندار سی گاڑی اس کے لیے اور ایک چھوٹی سی گاڑی اپنی چہیتی بیٹی کے لیے، شہر کے ایک اچھے سے علاقے میں ایک خوب صورت سا گھر۔

زندگی میں اور کیا چاہیے۔ سب ہی کچھ تھا اس کے پاس۔

اور یہ سب اس نے اپنی مکاری، عیاری اور سازشوں

سے حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھی وکیل اسے جوڑ توڑ کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔

کیسا بھی پیچیدہ کیس ہو، کتنا ہی گھناؤنا مجرم ہو۔ اس کے سائے میں آکر محفوظ ہو جاتا۔ وہ اپنی ماہرانہ چالوں سے اس کو بری کروالیا کرتا تھا۔ لیکن یونہی نہیں، بہت بھاری بھرکم فیس لے کر۔ ایسے ہی مجرموں کی بدولت آج اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کے دوسرے وکلا خواب دیکھا کرتے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا۔ اسے مجرموں کا سرپرستِ اعلیٰ کہا جاتا تھا۔ لیکن اسے ایسی باتوں کی پروا نہیں ہوتی تھی۔

وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا۔ ”میری جان، ہم اس پیشے میں خدمتِ خلق کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اپنی کمائی کے لیے آئے ہیں۔“

”لیکن یار، اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں ہوتی۔ اور یہ جن کے پاس ہوتی ہے۔ وہ بے چارے ڈی سی آفس کے باہر ٹوٹی ہوئی میز پر بیٹھ کر ٹھپے لگایا کرتے ہیں۔“

چونکہ اس کے پاس دولت تھی۔ اسی لیے دوسری برائیاں خودبخود ساتھ چلی آئی تھیں۔ جیسے شراب نوشی جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل اور سرخ رہا کرتیں یا پھر عورتوں کی صحبت۔ جس نے اس کے اندر کے انسان کو مار دیا تھا۔

اس کی زندگی میں صرف ایک اچھائی تھی اور وہ تھی اپنی بیٹی ناہید سے محبت۔ بس، اس کے سوا اور کوئی اخلاقی قدر نہیں تھی اس کے پاس۔

اس کے انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف اس کا مؤکل تھا جو کسی کلائنٹ کی خبر دے رہا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے ایک ہنکاری بھری۔ ”اب ہوں ہاں میں جواب دیتے جاؤ۔ غریب غربا میں سے ہے؟“

”نہیں۔“

”پیسے والا معلوم ہوتا ہے؟“

”جی سر۔“

”چلو بھیج دو۔“

آنے والا پچاس پچپن کا ایک خوش حال آدمی تھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی رعونت موجود تھی جو صرف اس وقت آتی ہے جب پیسوں اور اقتدار کی فراوانی ہو جائے۔

فرقان نے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ ”تشریف رکھیں جناب۔“ اس نے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آدمی لیے دیے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرقان گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس آدمی نے اپنی خاموشی توڑی۔ ”میرا نام راحت خان ہے۔ راحت انڈسٹریز کا مالک۔“

”اوہ۔“ فرقان نے ایک گہری سانس لی۔

اس آدمی کے بارے میں اس کے اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ راحت انڈسٹریز ایک بڑی کمپنی تھی۔ جس کے کئی کاروبار تھے۔ یعنی اس شخص کے پاس دولت بھی تھی اور اقتدار بھی۔

”فرمائیں سر۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ارے بھائی، میرے بیٹے کا معاملہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”بے وقوف عجیب حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ اس بار پھنس گیا۔ حالانکہ میں نے پیسے دے کر ان لوگوں کا منہ بند کرانا چاہا تھا لیکن وہی عزت اور خودداری وغیرہ کی چیز سامنے آگئی۔“

”چیز، آپ ذرا کھل کر بتائیں، کیا معاملہ ہے؟“

”بھائی، میرا بیٹا ہے نصرت۔ اس نے ایک لڑکی کو ریپ کیا ہے حالانکہ اس لڑکی کو اٹھانے میں اس کے کچھ دوست بھی اس کے ساتھ تھے لیکن ریپ اس نے کیا تھا۔“

”اوہ۔“ فرقان کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

”بے وقوف۔“ راحت نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”لڑکی نے گھر جا کر اپنے گھر والوں کو بتا دیا۔ انہوں نے ایف آئی آر کٹوا دی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو میں نے ایک لاکھ دینے کی پیشکش کی۔ لیکن لڑکی اور اس کے گھر والوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہی غریب اور اس کی عزت وغیرہ جیسے فرسودہ فلمی ڈائیلاگس۔“

”تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کی پیروی کروں اور اسے نکال لوں۔“ فرقان نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ میں اور کس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ راحت نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”کیونکہ ایسے معاملات میں آپ کی شہرت زبردست ہے۔ آپ کلائنٹس کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال لیتے ہیں۔“

فرقان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ یہ ایک بڑا کیس تھا اور بہت دنوں کے بعد ایسا کیس اس کے پاس آیا تھا۔

”جناب، آج کل اس قسم کے کیس بہت خطرناک ہو

گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”جدید ٹیکنالوجی نے سارا کام خراب کر دیا ہے۔ جیسے ڈی این اے کی رپورٹ۔ وہ صاف صاف بتا دیتی ہے کہ کس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔ اس کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ نکال دیں اس کو۔ پھر میں اس بے وقوف کو ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ یہاں رہ کر روز بروز بگڑتا جا رہا ہے۔“

”چلیں، ٹھیک ہے۔“ فرقان نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ”لیکن اس کیس پر آپ کے پچاس لاکھ تک خرچ ہوں گے۔“

”پیسوں کی پروا نہ کریں۔“ راحت نے کہا۔ ”بس اس کو کسی طرح باعزت نکلوانا ہے۔“

”وہ ہو جائے گا۔ اب ایک کام کریں۔ مجھے آپ کے بیٹے کے ان دوستوں کی فہرست چاہیے۔ ان کے مکمل ایڈریس جو اس کے ساتھ تھے۔“

”ان سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ راحت نے حیرت سے پوچھا۔

”اب یہ کیس میرے پاس ہے جناب۔“ فرقان نے کہا۔ ”اب میں اپنے طور پر کام شروع کرنے جا رہا ہوں۔ میں ایک پروفیشنل انسان ہوں۔ اپنے کلائنٹ کو بچانے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کے بیٹے کو بچانے کے لیے اس کے کسی دوست کی قربانی دینی پڑے تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں تو، مجھے کیا اعتراض ہوگا جب میرا بیٹا اس جنجال سے نکل آئے۔“

”آپ کو یہ بھی بات دوں کہ میں اپنی آدھی فیس پہلے لے لیا کرتا ہوں۔“ فرقان کے کھل کھل کرتے مکار چہرے پر اس وقت مکاری کے تاثرات اور گہرے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی اور بہت دیر سے بج رہی تھی۔ وہ ہر بار نمبر کاٹ دیا کرتی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک گھناؤنی مخلوق نجس ہستی ہے۔ اپنے آپ سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

دس بارہ دن پہلے تک سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔

ایک محبت کرنے والے شریف اور مہذب گھر میں ایک پُرسکون زندگی گزار رہی تھی، اس وقت اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح اسے نوچ کر پھینک دے گا۔ کسی کے ناپاک ہاتھ اس کو پامال کر دیں گے۔

وہ معمول کے مطابق کالج سے گھر واپس آرہی تھی۔ جب یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔

بس اسٹاپ سے گھر کا اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ اسے پیدل ہی آنا جانا پڑتا تھا۔ اس کے گھر والوں نے کئی بار اس سے کہا بھی تھا کہ وہ آنے جانے کے لیے وین لگوا لے۔ لیکن وہ گھر والوں کی کنڈیشن جانتی تھی۔ اتنی مشکلوں سے تو اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کر رہے تھے۔ اب وین کے پیسے کہاں سے لاتے۔

اس لیے اس نے بس میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کی بے شمار دشواریوں میں ایک اضافہ اور ہو گیا تھا لیکن سارہ کیا کرتی۔

سسکتی ہوئی زندگی۔ کراہتے ہوئے بوجھل رات اور دن۔ اور ان کے درمیان اس کا اپنا کومل سا لرزتا کانپتا سہما ہوا وجود۔ نگاہیں نیچے کر کے چلنے والی ایک اچھی لڑکی جس نے اپنے خانۂ دل کو صرف ایک کی یادوں سے بسا رکھا تھا اور وہ تھا اس کا محبوب شرجیل۔ وہ شرجیل کے سوا کسی اور کو نہیں جانتی تھی۔ کوئی بھی اس کے قریب نہیں آیا تھا۔

لیکن اس دن کوئی اتنے گھناؤنے طور پر اس کے قریب آگیا کہ اسے اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی۔ وہ بس اسٹاپ پر اتر کر گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے گھر کے پاس تو بہت چہل پہل رہتی تھی لیکن راستے میں سناٹا ہوتا تھا۔

اس سناٹے میں ایک بڑی سی گاڑی اچانک اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس کے بریک اتنی زور سے چرچرائے کہ وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔

اچانک دو آدمی اس گاڑی سے اُتر کر اس کے پاس آگئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹی ٹی تھی۔ اس نے ایسے بے شمار واقعات سن رکھے تھے جن میں اس طرح راستہ روک کر موبائل اور پرس وغیرہ چھین لیے جاتے ہیں۔ شاید یہ وہی لوگ ہوں۔

لیکن ان کے ارادے کچھ اور تھے۔ ”اے جلدی کر۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”جلدی بیٹھ جا گاڑی میں...... جلدی۔“

”نہیں۔“ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”تیری تو......“ ٹی ٹی والے نے اس کی کنپٹی پر ٹی ٹی رکھ دی۔ ”بیٹھ ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ وہ بے ہوش ہو کر گرنے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا

تھا۔ اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ ان لوگوں نے کس طرح اسے اٹھا کر اس گاڑی میں ڈالا تھا جس میں ایک نوجوان پہلے سے موجود تھا۔

''واہ، یہ کام دکھایا ہے تم دونوں نے۔'' گاڑی میں بیٹھے نوجوان نے شاباش دی۔

''بس اب جلدی سے نکل چلیں۔''

''جانے دو مجھے۔'' سارہ نے آواز بلند کی۔ ''کہاں لے کر جا رہے ہو۔ میں نہیں جاؤں گی۔''

''جانا تو پڑے گا۔ نصرت اپنا شکار کبھی نہیں چھوڑتا۔'' گاڑی والے نے کہا۔ ''پاگل ہو رہا ہوں تیرے پیچھے۔ پندرہ دن پہلے تیری جھلک دیکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک چین نہیں ملا ہے۔''

سارہ کو گاڑی میں لانے والے دونوں ہنس پڑے۔

''واہ استاد۔ ایسی بے قراری پہلے تو کبھی نہیں دکھائی۔''

''اس کی بات اور ہے۔'' اس نوجوان نے کہا۔ جس نے اپنا نام نصرت بتایا تھا۔ ''ایسا پیس تو برسوں بعد دیکھنے کو ملا ہے۔''

سارہ کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ گاڑی پوری رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ گاڑی وہی نصرت ڈرائیو کر رہا تھا۔

سارہ کا واسطہ یا تو اپنے کالج سے پڑتا تھا یا اپنے گھر سے یا کبھی کبھی وہ گھر والوں کے ساتھ مارکیٹ چلی جایا کرتی۔ ان راستوں کے علاوہ دوسرے راستے اس کے لیے اجنبی تھے۔ اور یہ تو بالکل غیر آباد علاقہ تھا جہاں وہ لوگ اسے لے آئے تھے۔

یہاں بہت کم مکانات بنے ہوئے تھے۔ پورا علاقہ زیرِ تعمیر تھا۔ وہ گاڑی ایک بڑے سے مکان کے گیٹ پر رکی تھی۔ وہ مکان بھی شاید حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔

اس نے گاڑی سے اترتے وقت بھی جدوجہد کی لیکن اسے زبردستی گاڑی سے اتار کر مکان کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

''اب تم دونوں باہر جاؤ۔'' نصرت نے ان دونوں سے کہا۔ وہی ان کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد سارہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے اتنی آسانی سے سرینڈر نہیں کیا تھا۔ وہ لڑتی رہی تھی۔ اس نے ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس لڑکے کا حال برا کر دیا تھا۔ لیکن کب تک۔ بالآخر وہ تھک کر نڈھال ہو گئی۔

وہ شرجیل کی امانت تھی لیکن کسی کمینے نے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

اس کے بعد وہ صرف روتی رہی تھی۔ وہ لوگ اسے اسی گاڑی میں واپس لا رہے تھے کہ ایک اور واقعہ ہوا۔ اس روڈ پر آگے جا کر پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔

''استاد! گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔'' نصرت کے ایک ساتھی نے بتایا۔ اس وقت نصرت، سارہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ گاڑی چلانے والا دوسرا تھا۔

''ہاں تو روک دو گاڑی۔''

''لیکن یہ چڑیا۔'' اس کا اشارہ سارہ کی طرف تھا۔

''اس چڑیا کے پر کٹے ہوئے ہیں۔ تم اس کی فکر مت کرو۔'' نصرت نے کہا۔ ''میں نے اس کو سنبھالا ہوا ہے۔''

اور اسی وقت بے پناہ غصے اور نفرت کی آگ سی سارہ کے بدن میں اترتی چلی گئی۔ گاڑی چلانے والے نے گاڑی روکی اور اس نے چلّانا شروع کر دیا۔ ''بچاؤ، بچاؤ مجھے۔''

پولیس والوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ ان سبھوں کو گاڑی سے اتار لیا گیا تھا۔ پولیس کا انچارج ایک باریش نیک صورت انسان تھا۔ اس نے سارہ کو ایک طرف کر دیا تھا۔ ''بیٹی، بتاؤ مجھے کیا ہوا، کون ہیں یہ؟''

سارہ کو وہ پولیس والا بہت پُرخلوص محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے جتنی دردمندی سے اسے بیٹی کہا تھا اس نے سارہ کو موم کی طرح پگھلا دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ساری کہانی سنا دی تھی۔

وہ پولیس والا غصے سے لرزنے لگا۔ اس نے نصرت کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا جبکہ اس کے ماتحت نصرت کے دونوں ساتھیوں کی ٹھکائی کر رہے تھے۔

''بیٹی۔'' پولیس والا اس کے پاس آیا۔ ''تم فون کر کے اپنے گھر والوں کو بلا لو اور اس بدبخت کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤ۔ یہ کمینے باپ کی کمینی اولادیں ہوتی ہیں۔ ان کو سزا ملنا ضروری ہوتا ہے۔''

''لیکن بابا، میں تو اب کسی کام کی نہیں رہی۔ ان کمینوں نے مجھے گندہ کر دیا ہے۔''

''نہیں بیٹا، اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟'' پولیس والے نے کہا۔ ''قصور تو اس قسم کے رئیس زادوں کا ہے جو اپنے باپ کی حرام کی دولت سے حرام زادے ہوتے جا رہے ہیں لیکن ایسے کمینوں کی شکایت ضروری ہوتی ہے۔ لڑکیاں اپنی عزت کے لیے خاموش رہ جاتی ہیں۔ پولیس تک یہ کیس پہنچ نہیں پاتا اس لیے یہ شیر ہوتے جاتے ہیں۔ تم

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہمت رکھو بیٹا۔"

"بابا...... آ...... آپ بالکل مختلف پولیس والے ہیں۔" سارہ نے کہا۔

"ہاں، ہر جگہ ایک ہی جیسے لوگ نہیں ہوتے۔"

تو اس طرح یہ بات پولیس تک، پھر سارہ کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ اخبار اور چینل والوں کو بھی اس کیس کا پتا چل گیا تھا۔

اس طرح شرجیل کو بھی معلوم ہوگیا تھا اور اب شرجیل اسے بار بار فون کیے جا رہا تھا۔

بالآخر سارہ نے اس کی کال وصول کر ہی لی۔ شرجیل بہت غصے میں تھا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں، تم میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی، تمہارے گھر والوں نے بتایا ہے کہ تم اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی ہو؟"

"ہاں، مجھے یہ بتاؤ۔ اب میں کس طرح کسی کے سامنے آؤں، کیا رکھا ہے مجھ میں؟"

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟" شرجیل نے کہا۔ "کیا تمہیں مجھ پر اور میری محبت پر بھروسا نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت ایسے حادثوں کی پروا نہیں کرتی اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ شیر جیسا جانور بھی گرفت میں آنے کے بعد بے بس ہو جاتا ہے۔ تم تو پھر بھی ایک نازک کومل سی لڑکی ہو۔"

"شرجیل۔" سارہ بُری طرح رو رہی تھی۔ "تو تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

"ارے کس بات کی معافی؟"

"یہی کہ اس حادثے کے بعد بھی میں زندہ ہوں۔ مر نہیں سکی ہوں۔"

"پلیز بے کار کی باتیں نہ کرو۔ مجھ سے ملو۔ نکل آؤ اپنے کمرے سے۔ زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ کیونکہ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور تم دیکھ لینا تمہارے ساتھ انصاف ضرور ہوگا۔ کیونکہ تم نے اپنی دلیری اور عقل مندی سے ان بدبختوں کو گرفتار کروایا ہے۔ عدالت انہیں ایسی سزا دے گی کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ تم بالکل بے داغ ہو۔ کومل ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

"شرجیل، تم میں اتنا حوصلہ کہاں سے آگیا؟"

"یہ حوصلہ تمہاری محبت نے دیا ہے جان۔"

"شرجیل! میں اس پولیس آفیسر کی شکر گزار ہوں جس نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا تھا۔"

"ہاں، اس محکمے میں ایسے اچھے لوگ موجود ہیں۔ میں ان سے مل کر ان کا شکریہ ادا کروں گا لیکن تم تو مجھ سے ملو۔"

"ہاں، ملوں گی۔"

☆☆☆

یہ کیس چلتا رہا۔

اور عدالت میں ایک عجیب تماشا ہوگیا۔ یہ تماشا تھل تھل جسم اور مکار آنکھوں والے وکیل کی عیاریوں اور سازشوں سے ممکن ہوسکا تھا۔

عدالت میں میڈیکل رپورٹ ہی کچھ اور پیش ہوگئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق راحت انڈسٹریز کے راحت خان کا بیٹا نصرت بالکل بے گناہ تھا۔

اس کہانی کا پس منظر کچھ اور تھا۔ اب سے دو مہینے پہلے کسی جگہ وہ لڑکی سارہ اور نصرت کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ایک اتفاقیہ ملاقات تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ ان کی ملاقاتیں ہر دوسرے تیسرے دن ایک کیفے ٹیریا میں ہوا کرتیں۔ جس کا نام اسٹار کیفے ٹیریا تھا۔ ان ملاقاتوں کے گواہ بہت سے لوگ تھے۔

وہ ویٹرز جو ان کو سرو کیا کرتے۔ کاؤنٹر پر بیٹھنے والا ارشاد اور ہوٹل کا منیجر ندیم۔ ان کے علاوہ نصرت نے کئی بار ایک اسٹور سے سارہ کو شاپنگ بھی کروائی تھی۔ اسٹور والے بھی اس بات کے گواہ تھے۔

پھر یہ ہوا کہ ایک دن سارہ نے نصرت سے شادی کے لیے زور دیا۔ لیکن نصرت خاموش رہا۔ انکار کر دیا۔ اس انکار اور خاموشی کی وجہ بھی سامنے آجائے گی۔

سارہ نے دھمکی دی کہ اگر اس نے بات نہیں مانی تو وہ اس کے خلاف کچھ بھی کر سکتی ہے اور آخر یہی ہوا۔ اس نے ایک دن نصرت پر زنا بالجبر کا الزام لگا دیا۔

وہ اس دن خود اپنی مرضی سے نصرت اور اس کے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی تھی۔ واپسی میں پولیس نے گاڑی کو چیک کیا تو سارہ کو ایک زبردست موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے واویلا مچانا شروع کر دی۔ اور بے چارے پولیس آفیسر نے اس کی زبردست اداکاری کو سچ سمجھتے ہوئے نصرت اور اس کے دوستوں کو گرفتار کرلیا۔

سارہ کے ساتھ زیادتی تو ہوئی تھی۔ (میڈیکل رپورٹ کے مطابق) لیکن یہ زیادتی کسی اور نے کی تھی جس کا الزام اس نے نصرت پر لگا دیا۔

جبکہ نصرت یہ سب کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ میڈیکلی ان فٹ ہے۔ یعنی وہ نامرد ہے۔ اس سلسلے میں کئی ڈاکٹرز کی میڈیکل رپورٹ بھی عدالت میں پیش کر دی گئی

اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ وہ اس کا اہل ہی نہیں ہے۔ وہ ایک مایوس نوجوان ہے۔ بس اپنے آپ کو بہلانے اور زندہ رکھنے کے لیے لڑکیوں سے دوستیاں کیا کرتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ڈاکٹرز اور ماہرین کی میڈیکل رپورٹس نے، ڈی این اے کی رپورٹ نے، کیفے ٹیریا والوں اور اسٹور والوں کی گواہیوں نے کیس کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔

اس سارے تماشے پر تیس لاکھ اور خرچ ہو گئے تھے جو وکیل فرقان نے نصرت کے باپ سے وصول کیے تھے۔ ڈاکٹرز کو جھوٹی رپورٹس بنانے کی رشوت، گواہوں کو رشوت، بھاگ دوڑ، ان سبھوں پر بیس لاکھ خرچ ہو گئے تھے جبکہ بقیہ دس لاکھ فرقان نے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔

سارہ عدالت میں چیخ چیخ کر فریاد کرتی رہ گئی لیکن فرقان کا بچھایا ہوا جال اتنا مضبوط تھا کہ کچھ بھی نہ ہوسکا۔ نصرت کو باعزت بری کر دیا گیا اور سارہ پر جرمانہ عائد کر کے اسے معافی دے دی گئی تھی۔

عدالت سے باہر راحت نے فرقان کو گلے سے لگا لیا تھا۔ "مان گئے وکیل صاحب، مان گئے، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ کمال کر کے رکھ دیا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے آپ نے۔"

"انکل۔" پاس کھڑے ہوئے نصرت نے فرقان کو مخاطب کیا۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اب میں گیا۔ لیکن جب یہ پتا چلا کہ یہ کیس آپ کے پاس ہے تو مجھے اطمینان ہوگیا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میں آپ کی شہرت سن چکا ہوں۔"

فرقان کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مکار سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

☆☆☆

شرجیل کے سامنے سارہ کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ "شرجیل تم یقین کرو، میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے اس کم بخت کو اس سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ اس کو چھوڑ دیا گیا۔"

"عدالت بھی بے قصور ہے سارہ۔" شرجیل نے کہا۔ "اس کے سامنے ثبوت ہی ایسے پیش کر دیے گئے اور یہ سارا کھیل اس خبیث وکیل کا ہے۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔ میڈیکل رپورٹس سے لے کر گواہوں تک پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے ہیں۔"

"یعنی دولت کے لیے اپنا ضمیر اپنا ایمان سب کچھ فروخت ہوسکتا ہے؟"

"ہاں سب کچھ۔ یہ ایسے ہی لوگ ہیں۔" شرجیل نے کہا۔ "لیکن تم اب لعنت بھیجو سب پر۔ یہ سمجھو کہ جو کچھ ہوا، وہ ایک بھیانک خواب تھا۔"

"اور یہ بھیانک خواب زندگی بھر میرے عذابوں میں زہر گھولتا رہے گا۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اور میری محبت تمہارے ساتھ ہے۔"

سارہ نے تشکر بھری نگاہوں سے شرجیل کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کسی اور دنیا کا باسی نظر آیا۔ ورنہ عام طور پر

ایسا کہاں ہوتا ہے۔

''سارہ، میں ایک بات کہوں؟'' شرجیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس حادثے سے پہلے تک میرا ارادہ یہ تھا کہ میں ذرا اپنے آپ کو خوب اسٹیبلش کرلوں پھر تم سے شادی کروں گا لیکن اب میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے تمہیں اپنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''شرجیل۔'' سارہ نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

☆☆☆

نصرت نے اس نوجوان کو بہت غور سے دیکھا جسے اس کا خاص دوست خان زادہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ''باس یہ بہت کام کے آدمی ہیں۔'' خان زادہ نے اپنی ایک آنکھ دبا دی۔ ''دلبر نام ہے ان کا۔''

دلبر ایک ہینڈسم اور پڑھا لکھا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر پہلے نصرت کو خان زادہ کا فون ملا تھا۔

''باس، ایک بہت زبردست بندہ ہاتھ آیا ہے۔''

''کیسا بندہ ہے؟''

''بہت کام کا ہے باس۔ اس کو بس شکار دکھا دو۔ جھپٹ کر لے آئے گا۔'' خان زادہ نے بتایا۔ ''اور وہ یہ کام کرائے پر پیسوں کے لیے کرتا ہے۔''

''اوہ، پھر تو اس سے ضرور ملواؤ۔ نام کیا ہے اس کا؟''

''دلبر۔'' خان زادہ نے بتایا۔ ''ویسے پڑھا لکھا، ہینڈسم قسم کا نوجوان ہے۔ تم ملو گے تو سوچ بھی نہیں سکو گے کہ وہ ایسے کام بھی کرسکے گا۔''

''صرف تمہید ہی باندھو گے یا اس سے ملواؤ گے بھی؟''

''آج ہی شام کو لے کر آجاؤں گا۔''

اب وہ دلبر، نصرت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور نصرت اسے بہت گہری نگاہوں سے اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ ''مسٹر دلبر! کیا تمہارا یہی نام ہے؟ یہ نام مجھ سے تو ہضم نہیں ہورہا؟''

''ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' دلبر مسکرا دیا۔ ''کیونکہ یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔''

''تو پھر تمہارا کیا نام ہے؟''

''میرا نام سلطان ہے۔'' اس نے بتایا پھر بولا۔ ''نصرت صاحب، آپ اپنے کام سے کام رکھیں گے۔ میں کون ہوں۔ میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے وحشت ہونے لگی ہے۔ غریبوں کا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا۔ ان کے ہر طرف صرف بھوک اور ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ میں اپنا بیک گراؤنڈ بھول آیا ہوں مجھے صرف پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''خوب۔'' نصرت کو اس کی باتیں دلچسپ محسوس ہورہی تھیں۔ ''اور کرتے کیا ہو؟''

''اپنے گاہک کو وہ چیز مہیا کردیتا ہوں جس کی وہ خواہش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی لڑکی۔ صرف اشارہ کردیں۔ میرے آدمی اس لڑکی کو اغوا کرکے اس جگہ پہنچا دیں گے جہاں آپ کہیں گے لیکن ایک شرط کے ساتھ۔''

''اور وہ شرط کیا ہوگی؟''

''وہ شرط یہ ہوگی کہ اس لڑکے کے پاس صرف وہی گاہک جاتا ہے جس نے یہ سودا کیا ہو۔ کسی اور کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ رات ختم ہونے کے بعد اس کو رہا کردیا جاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ ایسی شرائط نہیں ہیں جن کو نہ مانا جائے لیکن اس لڑکی کو اٹھانے کے لیے بندے کہاں سے آئیں گے؟''

''وہ میرا معاملہ ہے۔ میرے آدمی اس کام کے ماہر ہیں۔'' سلطان نے بتایا۔

''اور وہ لڑکی کون ہوگی؟''

''اتنی دیر میں آپ نے صرف یہ کام کی بات پوچھی ہے نصرت صاحب۔'' سلطان نے اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس کی تصویر دکھا دیتا ہوں۔ آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا۔''

نصرت اس لڑکی کو دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ وہ بہت خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔

''ہاں، لڑکی پسند آگئی ہے۔ اب کیا کہتے ہو؟''

''صرف ایک لاکھ۔'' سلطان نے کہا۔ ''پچاس ہزار اپنے بندوں میں بانٹ دوں گا۔ پچاس میرے کام آئیں گے۔''

☆☆☆

تھل تھل جسم اور مکار صورت وکیل کو ایک اور آسامی مل گئی تھی۔

وہ آسامی کسی کیس کے سلسلے میں اس کے پاس نہیں آئی تھی بلکہ اس کے لیے مزید کامیابیوں اور دولت کی خوش خبریاں لے کر آئی تھی۔

اقبال مند، فرقان کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر آیا تھا۔

اقبال مند ایک بہت بڑا صنعت کار، سرمایہ دار اور سیاست داں قسم کا آدمی تھا۔ فرقان کی خوش نصیبی تھی کہ وہ خود

اس کے پاس آیا تھا۔

فرقان اسے اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ویسے شہر کی اکثر بڑی محفلوں میں دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن بس سرسری سی۔

''ارے اقبال مند صاحب، آپ؟ زہے نصیب۔''

''ارے بھائی، آج ایک غرض کھینچ لائی ہے۔'' اقبال مند نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کیس سمجھ لیں۔''

''حاضر ہوں جناب، حکم دیں۔''

''بھائی، پچھلے سنڈے کو مسز اکرام کی پارٹی میں میرے بیٹے نے شاید آپ کی بیٹی کو دیکھ لیا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ بہرحال اس کے بعد سے وہ میرے پیچھے پڑگیا تھا کہ آپ کے پاس اس کا رشتہ لے کر جاؤں اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

فرقان کو ایسا لگا جیسے اچانک اس کا قد بہت بڑھ گیا ہو۔ اقبال مند جیسا آدمی اگر اس کا سمدھی بن جاتا ہے تو پھر اور کیا چاہیے۔

دولت خود فرقان نے بھی بہت سمیٹ لی تھی۔ لیکن عزت اور وقار نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی لیکن اب اس رشتے کے بعد یہ سب کچھ اس کے پاس آجاتا۔

''آپ کو میری بات بری تو نہیں لگی؟'' اقبال مند نے پوچھا۔

''ارے نہیں جناب، یہ تو میری عزت افزائی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں اس سلسلے میں فیصلہ بیٹی سے پوچھ کر ہی کرسکتا ہوں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں نے کس طرح اس کی پرورش کی ہے۔ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا لیکن میں نے صرف اس کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔''

''ہاں، یہ سب میں جانتا ہوں۔'' اقبال مند نے کہا۔ ''آپ اطمینان رکھیں، یہ ہمارے خاندان کی روایت ہے۔ ہم اپنی بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح رکھتے ہیں۔''

''جی جناب، خود آپ کی شخصیت ہی اس بات کی ضمانت ہے۔''

''تو میں امید رکھوں کہ دو تین دنوں میں آپ جواب دے دیں گے۔''

''جواب کیا ہے جناب، بس ایک رسمی کارروائی ہے۔ خانہ پری سمجھ لیں۔''

''آپ میرے بیٹے سے بھی مل لیں۔'' اقبال مند نے کہا۔ ''وہ ایک ہونہار لڑکا ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ یوکے سے تعلیم حاصل کی ہے اس نے۔''

☆☆☆

گھوڑی

بیوی نے ناشتا کرتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''سویٹی کون ہے جس کا نام آپ رات کو سوتے میں لے رہے تھے؟''

خاوند نے چونک کر کہا۔ ''سویٹی، سویٹی! ہاں یاد آیا۔ گھوڑ دوڑ میں، میں نے اسی پر شرط لگائی تھی۔ اس کا نام سویٹی ہے۔''

بیوی نے مسکرا کر کہا۔ ''اس گھوڑی کا کل دو مرتبہ ٹیلی فون آیا تھا۔''

ناہید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہورہا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اتنے دھڑلے اور اتنی بے خوفی کے ساتھ اسے کڈنیپ کرلیا ہے۔

وہ معمول کے مطابق یوگا کی کلاس لے کر گھر واپس جارہی تھی کہ راستے میں یہ سانحہ ہوگیا۔ وہ عام طور پر جب یوگا کی کلاس لینے جاتی تو اپنی گاڑی خود ہی چلاتی تھی۔

ایک تیز رفتار وین نے اس کی گاڑی کا راستہ روک لیا تھا۔ اس وین کے شیشے بلیک تھے۔ کارروائی کرنے والے یقینی پروفیشنل معلوم ہوتے تھے۔

انہوں نے ذرا سی دیر میں ناہید کو بے بس کرکے اس وین میں بٹھا دیا تھا جبکہ اس کی گاڑی وہیں رہ گئی تھی۔

وین میں ڈرائیور کے علاوہ تین آدمی اور تھے۔ ناہید نے اس قسم کی وارداتوں کے بارے میں سنا تو تھا لیکن یہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا ہے۔

اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کو اس طرح اٹھا لے جانے والوں میں سے ایک پڑھا لکھا اور خوش شکل نوجوان بھی تھا اور شاید ان سبھوں کا سرغنہ بھی تھا۔

ناہید نے اس کو مخاطب کیا۔ ''تم لوگ کون ہو؟ مجھے کیوں اٹھا کر لے جارہے ہو؟''

''میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔''

''کیوں، کیوں نہیں دے سکتے؟''

''مجھے اس کام کا معاوضہ دیا گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں اپنی مزدوری کررہا ہوں۔ اس کام کے پیسے لیے ہیں میں نے۔''

''کتنے پیسے لیے ہیں۔ میرا باپ دس گنا زیادہ دے سکتا ہے۔ چھوڑ دو مجھے۔''

''نہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تمہارے باپ سے تو کچھ اور وصول کرنا ہے۔ بس اب خاموش رہنا۔ میں تم پر کوئی سختی

نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

ناہید سہم کر رہ گئی۔

اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ راستے اگر جانے پہچانے بھی ہوتے پھر بھی اس کے ذہن پر اتنی گہری دھند چھائی ہوئی تھی کہ اسے خود اپنا ہی ہوش نہیں رہا تھا۔

ہوش اس وقت آیا جب اسے زبردستی وین سے اتار کر ایک مکان کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔

کمرا شاید ساؤنڈ پروف قسم کا تھا۔ یہاں سے اس کی چیخ و پکار بھی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اس کمرے میں آنے والا شخص وہی تھا جس کے حکم پر اسے اغوا کیا گیا تھا۔

وہ ایک وحشی اور جنونی انسان ثابت ہوا تھا۔ ناہید کے لیے وہ رات قیامت کی تھی۔ اس بے رحم رات نے اس کے ساتھ بہت بے رحمی کا برتاؤ کیا تھا۔

☆☆☆

تھل تھل جسم والا مکار صورت فرقان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

اس کے سامنے بیٹھی ہوئی اس کی بیٹی ناہید بُری طرح سسک رہی تھی۔ ایک گھنٹے پہلے اسے مکان کے گیٹ پر لا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس نے اپنے باپ کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اس پہ گزری تھی۔

فرقان بہت دیر تک دیوار سے سر ٹکراتا رہا۔ اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی چہیتی کے ساتھ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ ایک با اختیار آدمی تھا۔ دولت مند تھا لیکن اس سانحے میں نہ اس کا اختیار کام آ رہا تھا نہ اس کی دولت۔

"بیٹا۔" کچھ دیر بعد اس نے ناہید کو مخاطب کیا۔ "بیٹا جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔ بس ایک بار، ایک بار پتا چل جائے کہ وہ کون تھا جس نے تمہارے ساتھ یہ...... یہ...... برتاؤ کیا۔ میں اسے کسی بھی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔"

"لیکن کیا فائدہ بابا، میں تو...... میں تو......"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ بھول جاؤ۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو...... یاد کرو بیٹا یاد کرو کہ تمہیں کہاں لے گئے تھے۔ وہ کم بخت کیسا تھا؟"

"میں کچھ نہیں جانتی بابا، کچھ نہیں جانتی۔" ناہید پھر رونے لگی تھی۔

فرقان ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک آگ سی اس کے تن بدن میں لگی ہوئی تھی۔ کون تھا وہ، کون تھا۔ یہ سوال ایک ہتھوڑے کی طرح اس کے ذہن پر برس رہا تھا۔ برسے چلا جا رہا تھا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

فرقان نے ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "کون ہے؟"

"فرقان صاحب سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔

"ہاں بول رہا ہوں۔"

"فرقان صاحب! میں اس آدمی کا پتا بتا سکتا ہوں جس نے آپ کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

"کون ہو تم؟"

"اب یہ رہنے دیں۔ میں جو بتا رہا ہوں، وہ سن لیں اور چاہیں تو اپنی بیٹی سے اس شخص کی شناخت بھی کروا سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، کون ہے وہ...... خدا کے لیے بتاؤ۔"

"اس کا نام نصرت ہے فرقان صاحب۔ وہ راحت انڈسٹریز کے مسٹر راحت کا اکلوتا بیٹا ہے۔"

"وہ...... وہ......"

"ہاں وہی۔ لیکن یہ بہت افسوس کی بات ہے فرقان صاحب کہ آپ قانونی طور پر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ آپ ہی نے عدالت میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ میڈیکلی اَن فٹ ہے۔ پھر آپ کس منہ سے عدالت کے سامنے جائیں گے۔ کون آپ کا یقین کرے گا۔"

فرقان کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا تھا۔

ناہید روئے جا رہی تھی۔ وہ ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی تھی لیکن قدرت ماں باپ کی سزا اولاد کو دیتی ہے۔ تاکہ ماں باپ تڑپتے رہیں۔ شاید اسی کا نام مکافاتِ عمل ہے۔

لیکن نہیں۔ یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اس کہانی کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ اس پورے معاملے میں ناہید کا کیا قصور تھا؟ اس کے باپ کے جرم کی سزا اسے کیوں ملی؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نصرت کا کیا ہوگا؟

کیا وہ اور اس قسم کے دوسرے بگڑے ہوئے نوجوان اپنے باپ کی دولت کی بنیاد پر اس معاشرے میں یونہی دندناتے پھریں گے۔

کیا سب اسی طرح چلتا رہے گا یا کوئی تبدیلی بھی آئے گی؟

"میں تمہارے مستقبل میں شادی دیکھ رہی ہوں۔" قسمت کا حال بتانے والی نے کہا۔

جیف کا دل چاہا کہ وہ اس نجومی عورت سے اپنی فیس کی رقم واپس مانگ لے۔

شادی؟ وہ بھی ایک شب کے بادشاہ کی؟ کیسی مضحکہ خیز پیش گوئی ہے۔

وہ اپنی خوش قسمتی آزمانے کے لیے وینس بیچ آیا تھا۔ ہر کسی نے یہی بتایا تھا کہ وینس کی لڑکیاں آسانی سے دام میں آجاتی ہیں اور ہر کام آسانی سے نمٹانا اس کا اسٹائل تھا۔

اس نے اپنی ہتھیلی کی لکیریں اس لیے پڑھوائی تھیں کہ وہ اپنی اگلی عارضی گرل فرینڈ کو تلاش کرنے سے پیشتر صرف وقت گزارنا چاہتا تھا۔

لیکن اب ایسا لگ رہا تھا جیسے فٹ پاتھی نجومی عورت نے اس کے بارے میں صحیح پیش گوئی کی تھی۔

لیزا ساحلِ سمندر پر دھوپ سینک رہی تھی۔ اس نے نہانے کا مختصر ترین لباس پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کی ستر پوشی کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ جیف نے جان لیا تھا کہ یہی حسینہ آج کی رات اس کا خصوصی انعام ثابت ہوگی۔

"تم مجھے مکمل طور پر پسند آئے ہو۔" لیزا نے اسے ساحل پر ہی بتا دیا تھا۔ "میں حقیقت میں تمہیں زیادہ بہتر طور پر جاننا چاہتی ہوں...... بہت زیادہ بہتر طور پر۔ لیکن اس کے لیے بہت سی باتیں ضروری ہیں جو صرف اس آدمی کے ساتھ کر سکتی ہوں جس سے میں شادی کروں گی۔ میں ایک اچھی لڑکی ہوں۔"

ہاتھ کی لکیروں میں پوشیدہ قسمت کا حال جاننے والے جوڑے کا قصہ...

اپنی محبت و چاہت کو پانے کے لیے بڑے بڑے دریا ہی نہیں کبھی کبھی ایسے اچھوتے قدم بھی اٹھانے پڑتے ہیں جن کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا... مگر وہ دلیر و دلکش نازنین اپنے ارادوں و عزم میں پہاڑ تھی... اپنے محبوب کا حصول اس کی زندگی کی اولین شرط تھی...

قسمت کا حال

بابر نعیم

جیف نے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس کے رسیلے ہونٹ، اس کی خوب صورت آنکھیں۔ دلکش بدن۔ یہ سب مل کر اسے حسین تر بنا رہے تھے۔ وہ اسی وقت اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

''مجھ سے شادی کر لو۔'' وہ بے دھڑک بول پڑا۔ ''سورج کے غروب ہونے سے قبل ہی ہم میاں بیوی ہو سکتے ہیں۔''

لیزا نے اپنا جواب مسکراہٹ کی صورت میں دے دیا۔

جیف اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا۔

وہ دونوں لاس ویگاس روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹیٹو آرٹسٹ، ٹی شرٹ اسٹینڈ اور ٹیرو کارڈز سب پیچھے چھوڑ دیے جو وینس بیچ کا خاصہ تھے۔

جیف کو پہلی ڈیٹ سے ہنی مون تک پہنچنے میں صرف ساڑھے چار گھنٹے لگے تھے۔ اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل اتنی آسان ثابت ہو گی، یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

شادی کی تقریب سستی اور آسان تھی۔

''تم قبول کرتے ہو؟''

''میں کرتا ہوں۔''

''تم قبول کرتی ہو؟''

''میں بھی قبول کرتی ہوں۔''

جیف کو امید تھی کہ صبح کو اس حسینہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانا بھی اتنا ہی سستا اور آسان ثابت ہو گا۔

ہوٹل کا نام دی ہنی مونرز لاج تھا۔ کمرے میں موجود بیڈ اور اس کے تکیے دل کی شکل کے تھے۔ کمرے کا قالین اور پردے سرخ رنگ کے تھے۔ باتھ ٹب بھی سرخ رنگ کا اور گردے کی شکل کا تھا۔ کسی بھی نوبیاہتا جوڑے کے لیے اپنا ہنی مون گزارنے کے لحاظ سے یہ ایک آئیڈیل کمرا تھا۔

جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو لیزا بولی۔ ''تم اطمینان سے لیٹ جاؤ۔ میں تیار ہونے کے لیے باتھ روم جا رہی ہوں۔''

جیف نے اپنا لباس اتار دیا اور بیڈ پر لیٹ کر چادر اوڑھ لی۔

وہ انتظار کرنے لگا۔

وہ اس کے حسین سپنوں میں کھویا ہوا تھا۔

وہ انتظار کرتا رہا۔

اس کی نگاہوں میں بار بار لیزا کا گورا بدن ابھر رہا تھا۔

وہ انتظار کرتا رہا۔

وقت تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر انتظار کی لامتناہی گھڑیاں ختم ہوئیں اور لیزا باتھ روم سے نکل آئی۔

لیکن اس نے شب خوابی کا لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ نہ ہی للچا دینے والے گورے بدن کی کوئی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بالکل اسی حلیے میں تھی جس حلیے میں وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

ماسوائے اس ریوالور کے جو اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا تھا۔

''آئی ایم سوری، بے بی۔'' لیزا نے ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

''میں...... میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔'' جیف نے جواب دیا۔

''بات رقم کی نہیں ہے۔'' لیزا نے کہا۔ ''جیک امیر کبیر ہے۔''

''جیک؟''

''میرا منگیتر۔''

''تم منسوب ہو؟''

''میں چائے کی پتیوں سے قسمت کا حال جاننے کے لیے وینس آئی تھی۔ مادام زورا نے میرے مستقبل کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔''

''جیک کے ساتھ؟'' جیف نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اس نجومی عورت نے اور کیا بتایا تھا؟''

''اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری شادی کے فوراً بعد میرا پہلا شوہر مر جائے گا۔''

''جیک؟''

''نہیں، ہنی۔'' لیزا نے جواب دیا۔ ''جیک تو میری زندگی کا پیار، میری منزل ہے۔ میں اس کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''سو تم نے مجھے اپنا پہلا شوہر چنا ہے؟''

لیزا جواباً مسکرانے لگی۔

''لیکن......'' جیف ہکلانے لگا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتیں...... میں...... میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں......''

''آئی ایم سوری، بے بی۔ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں۔'' لیزا نے اپنے ریوالور کا رخ جیف کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بس آج کا دن تمہارے لیے لکی نہیں ہے۔''

اور پھر لیزا نے ٹریگر دبا دیا۔

واپسی

تنویر ریاض

فن کی دنیا سے تعلق رکھنے والے حادثات کے باوجود اپنا تعلق اس دنیا سے نہیں توڑ پاتے... وہ ایک ماہر رقاصہ تھی... اس کی شخصیت... اس کا مزاج... فن سے لگاؤ... شائقینِ فن پر اپنا سحر طاری کر دیتا تھا... تالیوں کی گونج میں اس کی آواز اور جسم کی شاعری لوگوں کو باندھ کے رکھ دیتی تھی... ایسے ہی ایک تحیّر انگیز شو نے مایۂ ناز فنکاروں کی زندگی کے تاروں کو ہلا ڈالا...

مغرب کی تہذیب اور پرستاروں کے والہانہ انداز میں لمحہ بہ لمحہ سنسنی بڑھاتی تحریر...

''آنکھیں کھولو۔ میری طرف دیکھو۔'' ایک مرد کی نامانوس آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کا پورا جسم دکھ رہا تھا لیکن درد کی لہر بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے تیز دوائیں دی جا رہی تھیں اور شاید آکسیجن بھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ وہی آواز سنی۔ ''کیا تم اپنی آنکھیں کھول سکتی ہو؟''

وہ دیکھنا چاہ رہی تھی لیکن ڈرتی تھی۔ ایک ان جانے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ بمشکل

سانس لے پا رہی تھی۔

"کیا تم مجھے اپنا نام بتا سکتی ہو؟" اس کی آواز ایسی تھی جیسے بہت سے پتھر کسی ڈھلوان سطح سے نیچے لڑھک رہے ہوں۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو تر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان نے حرکت نہیں کی۔

"پانی۔" اس نے کہا۔ اسے اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔ یہ اس کی دادی کی آواز تھی۔ وہ اس کو اسی لہجہ میں بلاتی تھیں۔ "ٹیریسا جو۔ یہاں آؤ۔"

ہاں۔ اس کا نام ٹیریسا جو تھا۔ ٹیری نہیں۔ دوست اسے ٹی جے کہا کرتے تھے۔ لیکن اس کے نام کے آخر میں کیا آتا تھا۔ وہ اس بارے میں سوچنے سے قاصر تھی۔

اس کے ہونٹوں سے ایک نلکی لگا دی گئی۔ وہ جلدی جلدی اس کے ذریعے پانی حلق میں اتارنے لگی۔ پھر اس نے اپنا منہ بند کرلیا اور پانی اس کی ٹھوڑی کو گیلا کرنے لگا کیونکہ اس کا منہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ نبض کی رفتار کے ساتھ ہی اس کا پورا چہرہ ہلنے لگتا۔

"آرام سے۔" اس آدمی نے کہا۔ "آہستہ آہستہ گھونٹ لو۔"

اس نے دوبارہ کوشش کی اور اس مرتبہ صرف اپنی زبان ہی گیلی کرسکی اور زیادہ پانی رال کی طرح بہہ گیا پھر اس نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور اسے نگل لیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہنے لگی۔ پورے جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ اس وقت کہاں ہو ٹیری؟"

ہاں، دواؤں کی مخصوص مہک اور فضا میں گونجتی دھیمی آوازوں سے جان گئی تھی کہ وہ اس وقت کسی اسپتال میں ہے۔ حالانکہ اسے اسپتال جانا کبھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن یہ تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس کی کمر میں چوٹ آئی تھی جب وہ اسکول کے زمانے میں موٹر بائیک سے گر پڑی تھی اور ایک مرتبہ شادی کے ابتدائی دنوں میں ویلس نے اسے مارا تھا لیکن ایسا درد کبھی نہیں ہوا۔

"اوہ میرے خدا۔" اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ شروع میں اسے کچھ نظر نہیں آیا پھر آہستہ آہستہ چیزیں واضح ہونے لگیں جیسے تاریک اسٹیج کے وسط میں کوئی اداکار روشنی کے ہالے میں نمودار ہو رہا ہو۔

"ٹریسی؟"

"خدا کے واسطے اسے تنہا چھوڑ دو۔" ویلس غراتے ہوئے بولا۔

اب وہ ویلس کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ سامنے والی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ اور سیاہ ٹائی لگا رکھی تھی۔ یہ اس کا سیاہ دل شوہر تھا جس سے اس نے ساری عمر محبت کی تھی۔ اس کے ساتھ سوٹ میں ملبوس ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ اب وہ دونوں ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری بیوی ہوش میں آرہی ہے مسٹر روسی۔" نیلی وردی میں ملبوس ایک نرس نے کہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ یہ مکمل ہوش میں آجائے اور ہوشیار ہوجائے۔"

"ٹیری۔ میری طرف دیکھو۔"

اس نے آہستہ سے سر گھما کر بولنے والے کی جانب دیکھا۔ وہ اس کے بستر کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پچیس اور تیس کے درمیان ہوگا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی ڈاکٹر ہے۔ لیکن اس کے گلے میں جو کارڈ لٹکا ہوا تھا اس پر اس کا نام اسمتھ لکھا ہوا تھا۔

"ٹیری......"

"میں بہت تکلیف میں ہوں ڈاکٹر۔" وہ فریاد کرتے ہوئے بولی۔ "کیا تم مجھے اس درد سے نجات دلا سکتے ہو؟"

"میں تمہارا ڈاکٹر نہیں ہوں۔" اسمتھ نے کہا اور نرس کی طرف دیکھنے لگا جس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"فی الحال ہم درد کم کرنے والی دوا نہیں دے سکتے۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں ایک ڈرپ لگائی جائے گی۔"

"تب تک میں مر جاؤں گی۔ ویلس، میرا پرس لاؤ۔"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔" اسمتھ نے کہا۔

"وہ کون؟"

"لاس ویگاس پولیس۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے پرس میں ضرورت سے زیادہ مقدار میں درد دور کرنے والی دوا آکسی کوڈین موجود تھی۔ اگر یہ زیادہ مقدار میں لی جائے تو منشیات کے زمرے میں آتی ہے۔"

"لیکن یہ دوا ڈاکٹر نے تجویز کی ہے۔" ویلس نے کہا۔ "اور اس کے پاس نسخہ موجود ہے۔"

"پھر وہ واپس کر دی جائے گی اگر انہیں اس کا

اطمینان ہوجائے۔"

"مجھے وہ ابھی چاہیے۔" ٹیری کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ "مجھے شو میں بھی جانا ہے۔"

"تمہیں وہ شو یاد ہے ٹیری۔" اسمتھ نے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔

"ٹیری، تم جانتی ہو کہ اس وقت کہاں ہو؟"

"لاس ویگاس کے کسی اسپتال میں۔"

"دراصل تم اس وقت لاس اینجلس میں ہو۔"

اس نے اسے یوں گھورا جیسے اس نے اردو بولنا شروع کر دی ہو۔ اسمتھ نے اپنا کارڈ اتار کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ لاس ویگاس پولیس کا لیفٹیننٹ جیسن اسمتھ تھا۔

"لاس اینجلس میں؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں کس طرح پہنچی؟"

"تمہارے شوہر نے ایک طیارہ چارٹر کیا تھا۔ اس کے ذریعے۔"

"لیکن کیوں؟ کب؟"

"تم چالیس گھنٹے سے بے ہوش تھیں۔" اسمتھ نے کہا۔ "تمہارے سر میں چوٹ آئی تھی پھر آپریشن......"

"بے بی، وکیل کے آنے کا انتظار کرو۔" ویلس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کے آنے تک تم کچھ نہیں کہو گی۔"

اس نے محسوس کیا کہ ویلس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے اور اس کے برابر میں کھڑا ہوا شخص بھی پولیس آفیسر ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہے۔

"اگر تم وکیل کی موجودگی میں بات کرنا چاہتی ہو تو یہ تمہارا حق ہے۔" اسمتھ نے کہا۔

"لیکن مجھے وکیل کی ضرورت کیوں پیش آئے گی؟" ٹیری نے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" اسمتھ نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "ٹیری پلیز، مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"

☆☆☆

شو شروع ہونے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ لاس ویگاس ونڈر لینڈ کا مرکزی ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں اور ہال کے دونوں جانب دیوار کے ساتھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ مجمع میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ جنہوں نے سفید جیکٹ یا دھاریوں والی قمیص اور پرانی جینز پہن رکھی تھیں۔ مجمع کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی اور وہ شو شروع ہونے کا بے صبری سے انتظار کررہے تھے پھر ایک جانب سے تالیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ جن کا دوسری جانب سے اسی انداز میں جواب دیا گیا۔ تالیوں کا شور جنگل کی آگ کی طرح بڑھتا جارہا تھا۔

پردے کے پیچھے اپنے شاندار ڈریسنگ روم میں بیٹھی ٹیری کینیڈی ان آوازوں کا شور سن رہی تھی۔ اس نے آئی لائنر لگاتے ہوئے کہا۔ "میرے شہر کے لوگ بے تاب ہورہے ہیں۔"

"میں یہاں کا مقامی نہیں لیکن میں بھی بے چینی محسوس کررہا ہوں۔" اس کے محافظ سیمون نے آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں کیسا لگ رہا ہوں؟"

"سمندر میں کھڑے پرانے بے ڈول جہاز کی طرح۔"

"کیا میں اچھا نہیں لگ رہا؟" سیمون کھسیانا ہوتے ہوئے بولا پھر اس نے راہداری میں کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی اور تیزی کے ساتھ اپنا آٹومیٹک ریوالور نکال کر دروازے میں کھڑا ہوگیا۔ دوسری دستک پر اس نے دروازہ کھولا تو وہاں اسٹیج منیجر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنا گنجا سر اندر کیا اور بولا۔ "پندرہ منٹ رہ گئے ہیں مس کینیڈی، تم تیار ہو؟"

"میں وقت پر آجاؤں گی۔" ٹیری نے کہا تو اسٹیج منیجر آگی فلمور مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ ٹیری تھوڑا سا گھبرا رہی تھی حالانکہ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی اور آخری بار تنقیدی نظروں سے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ سیمون ایک طرف آڑ میں ہوگیا۔ چیکو ایمریز اندر داخل ہوا۔ یہ ٹیری کے ٹروپ میں لیڈ ڈانسر تھا۔ اس نے چست چمڑے کی پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی اور کمر کے گرد ایک چمکدار زنجیر نما پٹی باندھ رکھی تھی۔

"اوہ میرے خدا! مجھے الٹی گنتی سے نفرت ہے۔" وہ ٹیری کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا پھر اس نے ایک ناقدانہ نظر ٹیری کے میک اپ پر ڈالی اور بولا۔ "تم بہت شاندار لگ رہی ہو۔ کیا میں اسٹیج پر تم سے آگے نکل سکتا ہوں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”اگر تم اتنے ہی خوب صورت ہوتے تو تمہیں میری جگہ دی جاتی۔“ ٹیری نے ہلکا سا طنز کرتے ہوئے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چیکو بے حد وجیہہ شخص تھا۔ لمبا قد، چوڑا جسم، بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں اور سب سے بڑھ کر اس کی دلکش مسکراہٹ جو لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں طور پر دیوانہ بناتی تھی۔

”پریشان نہ ہو لڑکی۔ تمہاری نوکری محفوظ ہے۔ میں کبھی اپنے جسم کی نمائش نہیں کرتا اور اپنے بازوؤں کو بھی کپڑوں میں چھپا کر رکھتا ہوں کیونکہ یہ حقیقی ہیں۔ اس لیے مجھے دوسرے لوگوں کی طرح انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں۔“

ٹیری اس وار پر تلملا کر رہ گئی اور جوابی حملہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمہارا اشارہ میری ساتھی لڑکیوں کی طرف ہے تو وہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور میں ان میں سے ہر ایک کو دس ہزار ڈالر معاوضہ دیتی ہوں۔ کیا تمہارے لڑکے تیار ہیں؟“

”ہاں اور گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے ہیں۔“ چیکو مسکراتے ہوئے بولا۔ ”چھ ہفتے تک دن میں دو مرتبہ ریہرسل کرنے کے بعد ہم تماشائیوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔“

”اتنا زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ لاس ویگاس کے لوگ بہت سخت ہیں۔ ویسے بھی کل سے سرٹام جونز کا شو شروع ہونے والا ہے۔“

”ممکن ہے کہ اس کا ہاؤس فل ہو جائے لیکن تمہارا تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔“ چیکو نے ٹیری کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میری بات سنو لڑکی، صرف تمہاری وجہ سے یہ مجمع اکٹھا ہوا ہے۔ تم میں بے پناہ صلاحیت ہے اور تماشائی تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور میرے لڑکوں کے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ وہ اسٹیج پر تمہارے ساتھ ہوں گے۔“

”سیدھے کھڑے رہو۔“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں چیکو کے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں پر جمی ہوئی تھیں۔

چیکو نے آگے بڑھ کر ٹیری کا ماتھا چوم لیا۔ عین اسی وقت اس کا شوہر ویلس اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر چیکو جھینپتے ہوئے بولا۔ ”آج کے شو میں یہ میری ساتھی ہے۔“

”شو شروع ہونے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔“ ویلس کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔ ”اب یہ ہنسی مذاق ختم کر کے اسٹیج پر پہنچنے کی تیاری کرو۔“

”بس میں جا ہی رہا ہوں مسٹر روسی۔“ چیکو نے آہستہ سے کہا پھر وہ تیزی سے گھوما اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم بھی آجاؤ ٹیری!“

”یہ سب کیا ہے؟“ ویلس نے ٹیری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اسے ہم جنس پرست سمجھتا تھا۔ کیا اس کی تم پر نظر ہے؟“

”احمق نہ بنو۔“ ٹیری گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”تم اس سے بھی بڑھ کر ہو اور تمہیں کمرے میں آتا دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔“

ویلس نے بازو پکڑ کر اسے کرسی سے اٹھایا۔ دونوں کے چہروں کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے دوبارہ تمہارے قریب دیکھنا نہیں چاہتا۔“

”پھر تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ ٹیری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہارے نہیں میرے پے رول پر ہے۔“

”اسے جانے دو مسٹر ویلس۔“ دروازے میں کھڑے ہوئے سیمون نے کہا۔ البتہ اس نے اپنی آواز نیچی رکھی تھی۔

ویلس نے دیو ہیکل سیمون کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی جرمن شیفرڈ کی طرح ٹیری کا وفادار ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ٹیری کا بازو چھوڑ دیا۔

”سوری بے بی۔“ اس نے کہا۔ ”افتتاحی شو کے موقع پر ہم سب تھوڑے سے پاگل ہو جاتے ہیں۔“

”میرے پاس اب کتنا وقت ہے؟“

”دس منٹ۔ اسٹیج منیجر فلمور باہر گائے لیے کھڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اس پر سواری کرو۔ مجھے پُرسکون ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔“

ٹیری کو توقع تھی کہ ویلس بحث کرے گا لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ ناقابلِ یقین شخص تھا اور اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ دونوں چھ سال سے ساتھ رہ رہے تھے۔

ویلس کے باہر جانے کے بعد ٹیری نے ایک بار پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور پنجرے میں بند بلی کے مانند نظر آ رہی تھی۔ ڈریسنگ روم کی آرائش و

زیبائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سنگار میز قیمتی اشیا سے بھری ہوئی تھی۔ کرسیوں اور صوفوں پر نیلے رنگ کا ویلوٹ چڑھا ہوا تھا جو کہ پردوں سے میچ کر رہا تھا۔ جگہ جگہ گلاب اور دوسرے پھولوں کے بوکے رکھے ہوئے تھے لیکن ٹیری کا دماغ آنے والے ایکٹ میں الجھا ہوا تھا۔ آٹھ منٹ رہ گئے تھے۔ میک اپ سے مطمئن ہو کر اس نے ایکٹ کے بارے میں سوچا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے خطرناک شو ہوگا۔ وہ ایک ماہر رقاصہ تھی اور اس نے اپنے آپ کو ایک نوعمر لڑکی کی طرح فٹ رکھا ہوا تھا۔ آج اسے ایک ایسا لباس پہن کر اسٹیج پر آنا تھا جو عام طور پر چیئر لیڈرز پہنتی ہیں۔ اس نے اپنے لیے گلابی اسکرٹ اور سویٹر کا انتخاب کیا تھا لیکن شو شروع ہونے کے پہلے ہی منٹ میں چیکو اور اس کے ساتھی ٹھگوں کے ہاتھوں اس لباس کو تار تار ہو جانا تھا۔ گو کہ وہ پوری طرح عریاں نہیں ہوتی لیکن اس کا پورا جسم تماشائیوں کے سامنے آجاتا اور ان کے لیے یہ ایک حیرت ناک منظر ہوتا کہ ایک گوری عورت کو چار کالے بدمعاشوں نے پکڑا ہوا ہے۔

ٹیری نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ سیمون بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ راہداری میں مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں اور ہال میں بجنے والی تماشائیوں کی تالیاں توپ کے گولوں کے مانند گونج رہی تھیں۔

”تمہیں آج غیر معمولی طور پر محتاط رہنا ہوگا بے بی۔“ ویلس اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”جیری برانکا یہاں آیا تھا۔ وہ ویگاس میں کنٹسی موب کا فرنٹ مین ہے۔ وہ یہاں کے دو کلب خرید چکے ہیں اور اب ان کی نظر اس جگہ پر ہے۔ انہوں نے جو پیشکش کی ہے، اسے کوئی بھی نہیں ٹھکرا سکتا۔ اس کی وجہ سے کوئی مشکل پیش آسکتی ہے۔“

”یہاں کافی سیکیورٹی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ سنبھال لیں گے۔ ہمارے انتظامات تسلی بخش ہیں۔ چیکو نے سہ پہر میں فلمور کے ساتھ جا کر سیٹ کا معائنہ کیا تھا۔“

”پھر کیا وجہ تھی کہ ایک گھنٹا پہلے فلمور پاور سپلائی چیک کر رہا تھا؟“

”کیونکہ آج افتتاحی شو ہے۔ اس لیے ہر چیز کو دو مرتبہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اب کچھ مت کہنا۔ مجھے آنے والے ایکٹ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“

”پھر تم اس بارے میں سوچو کہ چالیس فٹ کی بلندی پر ایک ایسے شخص کے ساتھ ڈانس کرنا ہے جس کا وزن آدھا ٹن ہے۔“

”ویلس۔“ ٹیری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”میں محتاط رہوں گی اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو سیکیورٹی والے سنبھال لیں گے لیکن اس وقت تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

”تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتیں۔“

”ورنہ تم کیا کر لو گے۔ مجھے مارو گے۔ میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔“

ویلس نے کہا۔ ”تم پاگل ہو گئی ہو۔“

”اس پر ہم شو کے بعد بات کریں گے۔“ ٹیری نے کہا۔ ”میں تمہیں بتاؤں گی کہ پاگل کیسے ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چکر دار زینے کی طرف بڑھی جو ڈانس پلیٹ فارم تک جا رہا تھا۔ یہ پلیٹ فارم اسٹیج سے چالیس فٹ کی بلندی پر تقریباً نظر نہ آنے والے تاروں کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔

”کنارے سے دور رہنا۔“ ویلس نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”میں ساری زندگی کنارے پر ڈانس کرتی رہی ہوں۔“ ٹیری نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے لیے دعا کرنا۔“

جواب میں ویلس نے کچھ کہا جسے ٹیری نے نہیں سنا۔ زینے پر چڑھتے ہوئے اس کی گھبراہٹ بتدریج کم ہو رہی تھی۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گھوم کر نیچے دیکھا۔ پردے کے پیچھے اسٹیج پہ سازندے تیار تھے اور گلوکار منہ ہی منہ میں اپنے گانے کے بول دہرا رہے تھے جبکہ اسٹیج کے دونوں جانب شو میں حصہ لینے والی لڑکیاں اپنے لباس اور میک اپ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ زینہ چڑھنا شروع کر دیا۔ تنگ زینے کی آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے اس کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی۔

چھ فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا پلیٹ فارم کسی جہاز کے مانند لگ رہا تھا۔ وہ حفاظتی جنگلا عبور کر کے اس پر پہنچی تو چالیس فٹ نیچے موجود تماشائیوں نے سیٹیاں اور تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر چیکو اور اس کے ساتھی سیاہ چمڑے کے لباس پہنے ہوئے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”میری بات غور سے سنو۔“ ٹیری نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کی رات کچھ ایسا کر کے دکھانا ہے کہ ہمارا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔ کیا تم لوگ تیار

ہو؟‘‘

سب نے کورس کی شکل میں جواب دیا تو چیکو بولا۔ ’’شاباش، آج کی رات تمہارے نام۔‘‘

نیچے اسٹیج پر ویلس کسی اندھے بیل کے مانند چکر لگا رہا تھا۔ آخری لمحات میں بھی اس کی ہدایات جاری تھیں۔ اسے لگا کہ ٹیری اسی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ ٹیری دونوں بازو پھیلائے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بازو بڑھا کر انگوٹھا دکھایا۔ جواب میں ویلس نے سر ہلایا اور اسٹیج کے ایک جانب چلا گیا۔

شو کا وقت ہو چکا تھا اور تماشائی دم سادھے پردہ اٹھنے کے منتظر تھے پھر اس خاموشی کو بگل کی آواز نے توڑا۔ پردہ اٹھنے کے ساتھ ہی ساز بجنا شروع ہو گئے جن میں گٹار اور ڈرم کی آواز نمایاں تھی۔ تماشائیوں نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر زوردار تالیاں بجائیں اور جب یہ شور تھما تو ویلس روسی ایک ہاتھ میں مائیکروفون سنبھالے اسٹیج کے وسط میں آیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کسی فلمی اداکار کے مانند وجیہہ نظر آ رہا تھا۔

’’خواتین و حضرات! لاس ویگاس ونڈرلینڈ اور ویلس روسی پروڈکشن کی جانب سے مس ٹیری کینیڈی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آ رہی ہے۔ براہِ کرم دل تھام کر بیٹھیے۔‘‘

ویلس کی آواز تالیوں کے شور میں دب گئی۔ اس کے ساتھ ہی بینڈ نے موٹاؤن ماما کی دھن چھیڑ دی۔ ویلس اسٹیج سے چلا گیا اور اس کی جگہ شو میں حصہ لینے والی لڑکیاں آ گئیں۔ جنہوں نے مصنوعی پر لگائے ہوئے تھے اور پانچ انچ اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے اسٹیج پر دوڑ رہی تھیں۔ ان کا شو تین منٹ جاری رہا پھر وہ اسٹیج سے ہٹ گئیں۔ اب پردہ پوری طرح ہٹ چکا تھا اور چالیس فٹ اونچا پلیٹ فارم تماشائیوں کے سامنے تھا۔ ٹیری ناچتی ہوئی سامنے آئی۔ اس کے عقب میں چار سیاہ پوش تھے۔ اس نے کراٹے کے انداز میں لات چلائی اور چیکو کی بانہوں میں جھول گئی۔ چیکو نے اس کا سویٹر پکڑا اور اسے پھاڑ کر فضا میں اچھال دیا۔

یہ منظر دیکھ کر تماشائی دم بخود رہ گئے۔ ٹیری نے جلد کے ہم رنگ لباس پہن رکھا تھا۔ اس لیے چالیس فٹ نیچے بیٹھے ہوئے لوگ یہ سمجھے کہ اس کے جسم کا بالائی حصہ لباس کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ ٹیری نے چکر کھاتے ہوئے اپنے آپ کو چیکو کی گرفت سے آزاد کرایا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے چیکو گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس کے اسکرٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ عین اسی وقت اسٹیج نے دھوکا دے دیا۔

پلیٹ فارم کے سامنے والا کونا اچانک ہی ایک جانب جھک گیا۔ پہلے چھ انچ پھر ایک فٹ اور اس کے بعد مزید ایک فٹ۔ تمام ڈانسرز لڑھکتے ہوئے حفاظتی جنگلے کی طرف آنے لگے۔ چیکو نے ٹیری کی ٹانگیں پکڑ لیں لیکن وہ اسے گرنے سے نہیں روک سکا۔ وہ دونوں پلیٹ فارم پر پھسل رہے تھے۔ چیکو کے ہاتھ پھسل کر ٹیری کی رانوں پر آ گئے۔ وہ تیزی سے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چیکو نے ٹیری کی کلائی پکڑ لی۔ وہ اسے چالیس فٹ بلندی سے گرنے سے بچانا چاہ رہا تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔

چیکو نے اپنا ایک گھٹنا ریلنگ کے گرد لپیٹ دیا تاکہ اس کا پھسلنا رک جائے لیکن اس کی چھاتی اور کندھے کنارے پر ٹکے ہوئے تھے اور وہ اپنی پوری قوت سے ٹیری کی کلائی پکڑے ہوئے تھا جو پنڈولم کی طرح فضا میں جھول رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے سارا منظر ساکت ہو گیا۔ ٹیری اتنی دہشت زدہ تھی کہ حرکت کرنا تو درکنار اس سے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ چیکو کی گرفت کمزور ہونے سے ڈر رہی تھی۔ تماشائی یہ منظر دہشت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔

چیکو نے ٹیری کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنا شروع کیا۔ اس کے جسم کی ساری قوت اس ایک ہاتھ میں سمٹ آئی تھی جس سے وہ ٹیری کو اوپر لا رہا تھا۔ اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔ ٹیری اتنا اوپر آ گئی کہ اس نے اپنے بائیں پاؤں کا اوپری حصہ ریلنگ میں پھنسا دیا۔ اس طرح اسے سہارا مل گیا اور وہ اپنے بل بوتے پر اوپر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

’’میں نے تمہیں پا لیا لڑکی۔‘‘ چیکو نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہیں نہیں کھو سکتا بے بی۔ کبھی نہیں کھو سکتا۔‘‘

دوسرے دو ڈانسرز بھی پلیٹ فارم پر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے چیکو کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ دوسرے نے ایک ہاتھ سے اس کی بیلٹ پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ سیفٹی راڈ میں پھنسا دیا تاکہ وہ اپنی جگہ پر مستحکم ہو سکے۔ نیچے ویلس پاگلوں کی طرح چلا کر اسٹیج منیجر کو احکامات دے رہا تھا جبکہ خود اس کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ چیکو نے اس شور و غوغا کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی توجہ ٹیری پر مرکوز رکھی۔ اگلا مرحلہ زیادہ خطرناک تھا۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ ٹیری کے گھٹنے کے نیچے ڈالا اور اسے پلیٹ فارم کے کنارے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ ٹیری کی رانیں پھسلتی ہوئی اس کے سینے پر آ گئیں اور وہ اس کی طرف گھوم گئی۔

’’ہم کامیاب ہو گئے۔‘‘ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ’’ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ لو۔‘‘

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کیبل کٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی پلیٹ فارم بھی نیچے آنے لگا۔ تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے۔ پلیٹ فارم سے نیچے گرنے والے ڈانسرز کی چیخیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں لیکن ٹیری کو تو چلانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ وہ چیکو سے لپٹی ہوئی عمودی حالت میں تیزی سے اسٹیج کی جانب آ رہی تھی۔

وہ جاگ گئی تھی لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ جس بستر پر لیٹی ہے وہ ہل رہا ہے۔ اسے خیال آیا کہ وہ کسی شو میں جانے کے لیے بس میں سفر کر رہی ہے۔ اسے ہمیشہ سے ہی بس میں سفر کرنا پسند تھا لیکن یہ بہت پرانی بات ہے جب وہ ایک چھوٹی بچی تھی۔ اب لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اسے آنکھیں کھولنے کی ضرورت ہے تاکہ حقیقت کا علم ہو سکے۔ یہ آواز بس کی نہیں لگتی بلکہ شاید یہ کوئی جہاز ہے شاید نہیں یقیناً وہ کسی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔

اس کے لاشعور میں کئی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ ویلس کی غصے بھری آواز پہچانتی تھی جو کسی سے بحث کر رہا تھا۔ دوسری آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔ شاید یہ چیکو ہے۔ اس نے ایک پلک جھپکائی پھر دوسری کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ اسے ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ ویلس کی حالت کافی ابتر تھی۔ اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو چکی تھی اور پوری قمیص پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ سفید یونیفارم میں ملبوس ایک شخص سے بحث کر رہا تھا جس کے کندھوں پر ایئر جنسی میڈیکل ٹیکنیشن کا بیج لگا ہوا تھا۔

’’یہ پاگل پن ہے مسٹر ویلس!‘‘ اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ’’تمہاری بیوی کا فوراً آپریشن ہونا ضروری ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں لیکن یہ آپریشن لاس ویگاس کے اسپتال میں نہیں ہو گا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ آج جو کچھ ہوا، وہ محض ایک حادثہ تھا۔ کچھ لوگ ونڈرلینڈ کو ہتھیانا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے اسٹیج منیجر کو خرید لیا تاکہ وہ ٹیری کے شو کو برباد کر سکے۔ اگر وہ لوگ اس تک پہنچ سکتے ہیں تو ویگاس کے کسی اسپتال میں ٹیری تک رسائی ان کے لیے کون سی مشکل ہے۔ اس لیے میں اسے لاس اینجلس لے جا رہا ہوں۔ لہٰذا تم اپنا منہ بند رکھو اور اسے پُرسکون رکھنے کے لیے کوئی دوا دے دو۔‘‘

’’مسٹر ویلس! میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔‘‘

ویلس نے اس کے پیٹ میں ایک گھونسا رسید کیا اور وہ گھٹنوں کے بل دہرا ہو گیا۔ ویلس غراتے ہوئے بولا۔ ’’میری بات غور سے سنو......‘‘

’’چیکو......؟‘‘ ٹیری بڑبڑائی۔

ویلس لپک کر اس کے پاس آیا اور بولا۔ ’’چیکو خیریت سے ہے۔ سبھی لوگوں کو چوٹیں آئی ہیں۔ تم بھی جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں لاس اینجلس لے جا رہا ہوں۔ وہاں بہت اچھے علاج ہیں۔ اب تم آرام کرو۔ سب ٹھیک ہے۔‘‘

ٹیری نے آنکھیں بند کر لیں لیکن درد بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے بے ہوش ہونے سے پہلے چیکو کے چہرے کی جھلک یاد آئی۔ اس کی آنکھیں کسی مجسمے کی طرح خالی تھیں اور منہ کے کونے سے خون کا جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کے اعضا ٹوٹ چکے تھے اور اس میں زندگی کی رمق باقی نہیں تھی۔ وہ مر چکا تھا اور اس میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگ بھی مر گئے ہوں۔ صرف ٹیری زندہ تھی کیونکہ چیکو نے اپنی جان پر کھیل کر اسے بچا لیا تھا۔

گویا ویلس جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ اس سے جھوٹ بولا تھا۔ ٹیری پندرہ سال کی عمر سے شوبزنس میں تھی اور اس کا واسطہ ایجنٹوں، شوہروں اور نام نہاد محبت کرنے والوں سے پڑتا رہتا تھا۔ وہ جھوٹوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی لیکن ویلس اس سے عام طور پر اپنے مجرمانہ ماضی کے بارے میں جھوٹ بولتا تھا اور اسے اس جھوٹ سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی کیونکہ ٹیری اس کے بارے میں پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بدمعاش سے شادی کر رہی ہے لیکن وہ اس کی رومان پرور طبیعت پر مرمٹی تھی۔ پھر جب ایک بکنگ ایجنٹ جس نے ٹیری سے سخت لہجے میں بات کی تھی، اپنی کار کی ڈکی میں مرا پایا گیا اور ٹیری کا پیچھا کرنے والے کو سڑک پر چاقو کا نشانہ بنایا گیا تو اسے یقین ہو گیا کہ ویلس محض ہالی ووڈ اسٹار نہیں بلکہ حقیقت میں بدمعاش ہے۔ ویلس ایک سخت مزاج شخص تھا جو ہولناک کارروائی کرنے

سے گریز نہیں کرتا تھا اور اسی لیے اس کے چہرے پر سفاکی چھائی رہتی تھی۔

ٹیری نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس تکلیف اور دہشت سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی پھر اس کی آنکھ لاس اینجلس کے اسپتال میں کھلی۔ اس کے سرہانے ایک پولیس آفیسر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی نظریں ٹیری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر اس کی آواز ٹیری کی سماعت سے ٹکرائی۔

''گویا تم پوری پرواز کے دوران بے ہوش رہیں۔'' اسمتھ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف ایک وقفے کے علاوہ جب تمہارے شوہر اور ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔''

''ہاں، یہ درست ہے۔ ویلس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کیوں ہے؟''

''تم نے فون کال نہیں سنی؟''

''کیسی کال؟''

اسمتھ نے ویلس کی طرف دیکھا پھر ٹیری سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے شوہر نے جہاز سے ڈیٹرائٹ میں مقیم ایک بدمعاش جان کینیڈی کو فون کیا تھا جو فیٹ جیک کے نام سے مشہور ہے۔''

''میں فیٹ جیک کو جانتی ہوں۔'' ٹیری نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک دفعہ اس سے ملاقات ہوئی تھی جب میں ونڈسر کے ایک کیسینو میں شو کر رہی تھی۔''

''تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں۔ ہم صرف ایک مرتبہ ملے ہیں اور بس۔''

اسمتھ نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا کہ شاید وہ اس بارے میں مزید کچھ کہے لیکن وہ خاموش رہی۔

''تمہارے شوہر نے فیٹ جیک کو ایک قتل کرنے کے لیے فون کیا تھا۔''

''کس کا قتل؟''

''آگی فلمور جو لاس ویگاس میں اسٹیج منیجر ہے۔''

''آگی؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ویلس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ شو شروع ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے کیبل کے ڈرم میں کچھ گڑبڑ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے برانکا بھی وہاں آچکا تھا۔'' ویلس کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں نے فلمور سے رابطہ کر کے اسے خرید لیا تاکہ وہ تمہارا شو خراب کر سکے اور اسی لیے تم گر پڑیں۔''

''اچھا۔'' ٹیری نے کہا۔ ''گویا ویلس نشانے پر تھا اور اس نے فون کال کرلی۔''

''یہ تمہارے شوہر کی بدقسمتی ہے کہ ایف بی آئی والے فیٹ جیک کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ کال صبح چار بجے ریکارڈ ہوئی لیکن اگلے روز تک اسے نقل نہیں کیا گیا۔ اس سے پہلے مسٹر فلمور مر چکے تھے۔ انہیں گھر کے دروازے پر گولی ماردی گئی۔''

''آگی؟'' اسے اپنی آواز فضا میں گونجتی محسوس ہوئی۔ ''اوہ میرے خدا، ویلس۔''

''پولیس کی نظر میں یہ ایک کھلا کیس ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''تمہارے شوہر کو لمبی سزا ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ عمر قید تاوقتیکہ وہ ہمارے ساتھ تعاون نہ کرے۔ ہمیں بتائے کہ وہ فیٹ جیک کے بارے میں کیا جانتا ہے اور یہ کہ فلمور کو کس نے قتل کیا۔''

''میں کسی کا نام لینے سے پہلے دو مرتبہ مرنا پسند کروں گا۔'' ویلس نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے ٹیری کے پاس لانے کا شکریہ۔'' پھر وہ ٹیری سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب تمہیں اپنے طور پر اس صورتِ حال سے نکلنا ہوگا۔ یہ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا ماضی داغ دار ہے۔ اب مجھے خود ہی اس مسئلے سے نمٹنا ہوگا۔''

اسمتھ کے اشارے پر دوسرا پولیس آفیسر ویلس کو باہر لے گیا۔ اس نے ٹیری کا بوسہ لینے یا خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

''مس کینیڈی۔'' اسمتھ نے کہنا شروع کیا۔

''گیٹ آؤٹ۔'' اس نے کہا۔

اسمتھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ وہ دروازے میں رکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے اور میں تمہارا بہت بڑا پرستار ہوں۔ اگر میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں تو......''

ٹیری نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اس کے جانے کے بعد نرس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے ایک آئینہ لے کر آؤ۔''

آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کے چہرے پر والی بال کی سلائی کی طرح ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ دونوں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور سوجی ہوئی ناک کسی آلو کی طرح لگ رہی تھی۔

وہ تین دن تک بستر پر پڑی رہی اور اس نے نرس کے علاوہ کسی اور سے ملنے سے انکار کردیا۔ وہ خالی ذہن اور خالی آنکھوں کے ساتھ چھت کو دیکھتی رہتی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس زندگی سے تو مرجانا بہتر ہے لیکن مرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ زیادہ مقدار میں دوا یا بندوق کی گولی۔ لیکن اس سے بھی ایک آسان راستہ تھا، کیوں نہ وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا دے۔ اس کے لیے پہلا تکلیف دہ مرحلہ کرسی گھسیٹ کر کھڑکی تک لے جانے کا تھا پھر کھڑکی پر چڑھنا اور چھلانگ لگانا۔ اس کا کمرا پہلی منزل پر تھا اور وہاں سے گرنا ایسا ہی تھا جیسے وہ سائیکل چلاتے ہوئے لڑھک جاتی۔ اس صورت میں مرنے کا امکان بہت کم تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ نرس سے سب سے اوپر والی منزل پر کمرے کے لیے کہے لیکن اس کا جواز کیا پیش کرے گی۔ لہٰذا اس نے وقتی طور پر مرنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

دوسری صبح اس نے پوری قوت مجتمع کر کے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور دن کی روشنی میں دوبارہ آئینہ دیکھا۔ اپنا عکس دیکھ کر اسے متلی آنے لگی۔ جسے اس نے بڑی مشکل سے روکا۔ وہ رونا چاہ رہی تھی لیکن نہیں روئی پھر اس نے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور نیم تاریک کمرے میں بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ویلس کو کسی بڑے وکیل کی ضرورت ہوگی اور اسے بھی اپنے علاج کے لیے ماہر ڈاکٹروں سے رجوع کرنا ہوگا جس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی اور اسے پیسے کمانے کا ایک ہی طریقہ آتا تھا کہ وہ واپس شوبزنس کی دنیا میں لوٹ جائے جو کہ ناممکن تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ سب سے اوپر کی منزل پر کمرا لے اور وہاں سے چھلانگ لگا دے لیکن یہ تو زندگی سے فرار ہوتا اور وہ اپنا شمار بزدلوں میں نہیں کروانا چاہ رہی تھی۔ اس نے رنگ کو فون کیا کہ وہ کسی پلاسٹک سرجن سے اسے ملوا دے۔

ڈاکٹر ایوا کلر کی عمر پچاس برس تھی۔ اس کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے جنہیں اس نے پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے ٹیری کے تباہ شدہ چہرے کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اس کا ہر زخم اور فریکچر شدید نوعیت کا ہے اور وہ باری باری ان کا علاج کرے گی۔ اس نے اسکیچ بنا کر بتایا کہ ان زخموں کو بھرنے کے لیے تمام دستیاب طریقے استعمال کیے جائیں گے جن میں سرجری، کاسمیٹکس اور وگ وغیرہ شامل تھیں۔ ڈاکٹر نے سات ہفتوں کے دوران تین آپریشن کرنے کا شیڈول دیا۔ یہ آپریشن چہرے کے تین مختلف مقامات پر ہونا تھے اور ایک زخم بھرنے کے بعد ہی دوسرا آپریشن ممکن تھا۔ اس کے بعد بحالی کا مرحلہ شروع ہوگا جو علاج جتنا ہی مشکل تھا۔ چیکو کی قربانی کی وجہ سے اس کی صرف ایک ہڈی ٹوٹی تھی اور کندھا کھسک گیا تھا لیکن تمام پٹھے اور جوڑ بری طرح ہل گئے تھے یا ان میں بل آگیا تھا۔ انہیں اپنی جگہ پر لانا بھی ایک تکلیف دہ عمل تھا اور یہ دواؤں کے بغیر ہونا تھا۔ اب یہ درد ہی اس کا ساتھی تھا۔ ان دس سالوں میں پہلی بار اس نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ اب چیکو کبھی اس کے ساتھ ڈانس نہیں کر سکے گا اور نہ ویلس اسے کام کرنے کے لیے مجبور کر سکے گا۔ یہ دونوں اس کی زندگی سے چلے گئے تھے اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔

وہ کسی کے سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ لاس ویگاس میں ہونے والا حادثہ، فلمور کا قتل اور ویلس کی گرفتاری کی خبروں کو اخبارات اور ٹی وی نے نمایاں طور پر جگہ دی تھی۔ اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر پہلے ہی اس کی تلاش میں اسپتال کے چکر لگا رہے تھے اور جب وہ یہاں سے ڈسچارج ہوتی تو وہ یقیناً اس کا پیچھا کرتے۔ اسے چھپنے کے لیے ایک جگہ چاہیے تھی، جہاں وہ اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار اور بحالی کے پروگرام پر عمل کر سکے۔ اس نے ایک نجی تربیتی کیمپ کرائے پر لے لیا جو کبھی سابق ہیوی ویٹ چیمپئن جو فریزیئر کی ملکیت تھا۔ یہ جگہ مکمل طور پر محفوظ تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ وہاں رہ رہی ہے۔ اس کے باوجود اس نے اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک ایجنسی سے اپنی ہم شکل لڑکی کی خدمات حاصل کیں اور کچھ فاصلے سے اس کی تصویریں بنوا کر نیٹ کے ذریعے لیک کردیں تاکہ لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ وہ اسپتال سے باہر آگئی ہے۔

لیکن اس کی مشکلات کم نہیں ہو رہی تھیں۔ حادثے کے دو ماہ بعد ویلس پر فردِ جرم عائد کردی گئی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے فلمور کے قتل کے لیے ایک بدمعاش کو اکسایا۔ جج نے اس کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر اسے چار سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ اسپتال میں زیرِ علاج ہونے کی وجہ سے ٹیری اس سے ملنے نہ جاسکی لیکن اس کا وکیل ویلس سے ملنے گیا اور وعدہ کیا کہ جب تک ضرورت ہوگی وہ کسی معاوضے کے بغیر اس کی جانب سے عدالت میں پیش ہوتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ویلس کی جانب طلاق کے

کاغذات بڑھا دیے۔ ویلس نے ان پر دستخط کر دیے لیکن ساتھ ہی وکیل کی ناک توڑ دی اور اسے لہولہان کر کے کانفرنس روم سے چلا گیا۔

ٹیری کا خطرناک شوہر اس کی زندگی سے جا چکا تھا اور اس کے پاس یادوں اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں بچا تھا لیکن اس کے پاس خیالوں میں غرق رہنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے لاس ویگاس میں شو کرنے کے لیے دوبارہ معاہدہ کر لیا اور اب وہ اس حادثے کے ٹھیک چھ ماہ بعد اپنا نیا شو کرنے والی تھی۔ اس کی واپسی کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ شو کے تمام ٹکٹ پہلے ہی فروخت ہو چکے تھے اور ہال میں اس کے پرستاروں کے علاوہ نقاد اور نامور شخصیات موجود تھیں۔ سر ایلٹن جون، لیڈی گاگا اور برٹنی اسپیئرز جیسے ستارے اس کی ہمت بندھانے اور حوصلہ افزائی کے لیے جمع ہو گئے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ ٹیری ناکام رہے گی۔ خود اسے بھی یہ بات معلوم تھی۔ اسے نامعلوم اندیشوں نے گھیر رکھا تھا لیکن اس رات ایسا نہیں ہوا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اسٹیج پر آئی اور اپنے مشہور گانوں پر رقص کرنے لگی۔ ہال میں موجود تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ ان کی تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں بینڈ کی آواز بھی دب کر رہ گئی۔

وہ ایک شاندار رات تھی جب ٹیری نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ باہمت کارکردگی دکھائی۔ اس دوران اس نے کئی خطرناک اسٹیپ بھی لیے لیکن دوسرے دن اخبارات اور نیٹ پر تبصرے پڑھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ٹیری کے اسٹیج سے جانے کے بعد بھی چالیس منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ انہوں نے ٹیری کی کارکردگی کو پہلے سے بہتر قرار دیا لیکن وہ جانتی تھی کہ انہوں نے مبالغہ آرائی کی ہے۔ وہ کبھی پہلے سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ حادثے سے پہلے وہ اسٹار تھی لیکن اب وہ ایک ہی رات میں آئیکون بن گئی تھی اور یہ صرف اس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا کہ شوبزنس کی تاریخ میں اس کی یادگار واپسی ہوئی۔ اب اسے اس مقام کو برقرار رکھنا تھا۔ اسی لیے وہ ہر شو کے بعد جم چلی جاتی تا کہ اگلی رات کے لیے تیاری کر سکے۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا اور درد کی ہر لہر اسے یاد دلاتی کہ اس کا کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ چیکو کے بغیر ناچنا بے مزہ ہو گیا تھا اور وہ اسے محض ایک مشق سمجھ کر نبھا رہی تھی جیسے کوئی اپنے کام پر جاتا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ شاندار واپسی کے ذریعے اسے جو توانائی ملی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی اور ایک یا دو سال بعد وہ بھی ایک عام گلوکارہ بن کر رہ جاتی لیکن اس نے وہ وقت آنے سے پہلے ہی الوداعی شو کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اسے مزید پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ جم سے باہر آئی تو اس کی نظر ایک سائے پر پڑی جو اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ وہ بلڈنگ کا چوکیدار تھا۔ ”ہائے ٹی جے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تم ہو؟“

اسے یاد آ گیا کہ ٹی جے اس کا نک نیم تھا اور اس کے اسٹاف کے لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس نے کافی عرصے سے یہ نام نہیں سنا تھا۔ اس لیے فوری طور پر نہ پہچان سکی، پھر اسے یاد آ گیا اور بولی۔ ”گرز؟“

”ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ اول گرز۔“ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”اس رات میں بھی وہاں موجود تھا۔ بس زندگی تھی جو بچ گیا۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو ٹیری؟“

”کام کر رہی ہوں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہیں معلوم نہیں؟“

”اوہ۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے شوز میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو ان دنوں کے بارے میں سوچ کر بھی تکلیف ہوتی ہے، جو کچھ تمہارے اور چیکو کے ساتھ ہوا۔ پھر فلمور بھی مارا گیا۔ میں اس وقت اسپتال میں تھا جب میں نے سنا کہ فلمور کو خریدنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ وہ پہلے ہی ایک بے قصور شخص کو سزا دے چکے تھے۔ میں ان کا دوسرا شکار بننا نہیں چاہتا تھا۔“

”بے قصور شخص؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”وہ لوگ ونڈر لینڈ خریدنا چاہ رہے تھے اور اسی لیے شو کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ اس جگہ کی قیمت گر جائے لیکن فلمور وہ شخص نہیں تھا جسے انہوں نے خریدا۔“

”ویلس نے اسے تاروں کو چھیڑتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”میں نے بھی دیکھا تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح آخری لمحات میں مشین چیک کیا کرتا تھا۔ اصل مجرم جیری برانکا ہے جو ڈانگری پہنے ہوئے وہاں آیا اور صرف ایک لمحے کے لیے کیبل ڈرم کے پاس رکا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ اس نے کیا کیا۔ مجھے شک ضرور ہوا لیکن شو شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میں خود تین مہینے اسپتال میں رہا۔“

”اور تم نے برانکا کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا؟“

”فلمور کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بعد میرے لیے خاموش رہنا بہتر تھا۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی گرز۔ اپنا خیال رکھنا۔“ ٹیری نے کہا اور جم میں واپس آ گئی۔

لیفٹیننٹ اسمتھ اپنے لیپ ٹاپ پر ایک فائل دیکھ رہا تھا جب کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ٹیری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”تم!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”ہاں، ابھی میرا باب بند نہیں ہوا۔“ ٹیری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”کچھ نہیں، میں تو صرف تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ لاس اینجلس میں تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا حالانکہ اس سے زیادہ سختی سے پیش آ سکتے تھے۔“

”کیونکہ تم پہلے ہی بہت تکلیف میں تھیں۔ بہرحال تمہارے آنے کا شکریہ لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟“

”اس حادثے کے بعد میں اتنا پریشان رہی کہ تمہاری تحقیقات کے بارے میں بھی کچھ نہ معلوم کر سکی۔ میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں، اگر تم برا نہ مناؤ......؟“

”بالکل نہیں لیکن یہ کیس بند ہو چکا ہے اور اب تو تمہارے شوہر کی سزا بھی پوری ہو گئی۔ میری خواہش ہے کہ اب وہ پُرسکون زندگی گزارے۔“

”میں یہاں ویلس کی بات کرنے نہیں آئی بلکہ اسٹیج منیجر فلمور کی وجہ سے پریشان ہوں۔ ویلس نے اسے حادثے سے پہلے کیبل سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے دیکھا تھا لہٰذا اس نے یہی سوچا کہ اسے کسی نے خرید لیا ہوگا تا کہ یہ حادثہ پیش آ جائے۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کچھ جرائم پیشہ افراد کیسینو کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔“ اسمتھ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن فلمور سے ان کے تعلق کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”اس نے بھی کسی کے سامنے یہ اعتراف نہیں کیا؟“

”ہمیں اس سے پوچھنے کا موقع ہی نہ مل سکا جب تمہارے شوہر نے ڈیٹرائٹ میں اپنے ساتھی کو فون کیا۔ اس کے آٹھ گھنٹے بعد فلمور کو قتل کر دیا گیا۔ ان کا تعلق ثابت کرنے کے لیے یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ جرائم پیشہ افراد نے اسے رشوت دی تھی۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ اسے رشوت دی گئی تھی؟ کیا وہ رقم برآمد ہو گئی؟“

”نہیں۔“ اسمتھ نے اعتراف کیا۔ ”ہم نے بہت کوشش کی۔ فلمور کی بیوی اور بچے بہت تنگی میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ وہ یہ رقم وصول کرنے سے پہلے ہی مار دیا گیا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹیری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”وہ اسٹیج منیجر تھا۔ اس لیے حادثے کی ذمے داری بھی اسی پر عائد ہوتی چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ اس کے بعد اسے ملازمت سے نکال دیا جاتا اور اسے کہیں کام نہ ملتا۔ اس

چٹکلے

☆ ایک ساٹھ سالہ شخص نے نوکری کے لیے درخواست دی۔ اس نے لکھا کہ اس کی عمر چوبیس سال، تجربہ چھتیس سال ہے۔

☆ سردار جی لندن کے ایک بال روم میں گئے۔ کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ ایک خوب رُو لڑکی بہت دلچسپی سے اس سردار کو دیکھ رہی تھی۔ سردار نے پیش قدمی کی اور پوچھا کہ کیا وہ ڈانس کرے گی۔ لڑکی اس سنسنی خیز تجربے سے فائدہ اٹھانے کے لیے جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیوں نہیں ...... بڑی خوشی سے!“ سردار جی بولے۔ ”باجی! یہ خالی کرسی میں لے لوں؟“

☆ خشک سالی خوفناک تھی۔ گاؤں والوں نے میدان میں جمع ہو کر دعا مانگنے کا فیصلہ کیا۔ پورے ہجوم میں صرف ایک نوجوان چھتری لے کر آیا جسے یقین تھا کہ دعائیں قبول ہوں گی۔

☆ ہمیں سائیکل چلانے میں دقت ہوتی ہے، موٹر سائیکل لے لی۔ مزید آرام کی طلب میں پھر کار خرید لی۔ کار کے عادی ہوئے تو توند برآمد ہونے لگی۔ اسے گھٹانے کی فکر میں ہیلتھ کلب گئے تو وہاں ورزش کے لیے ساکت سائیکل پر بٹھا دیے گئے۔ اسے کہتے ہیں لائف سائیکل!

ڈھاکا سے نہال خرم کا تحفہ

لیے وہ رقم پیشگی وصول کرنا چاہ رہا ہوگا۔"
"اگر اس میں کسی جرائم پیشہ گروہ کا ہاتھ ہے تو ممکن ہے کہ اس نے ڈر کی وجہ سے یہ کام کیا ہو۔ جو کچھ ہوا اسے دیکھتے ہوئے اس کا خوف زدہ ہونا ٹھیک ہی تھا۔ کوئی اور سوال؟"
"جیری برانکا۔" ٹیری نے کہا۔ "کیا یہ نام تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہے؟"
"یقیناً، ان دنوں وہ لاس ویگاس میں اس گروہ کا نمائندہ تھا بلکہ جہاں تک میرے علم میں ہے، وہ اب بھی یہیں ہے۔ اس نے ونڈر لینڈ خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی لیکن اس رات وہ وہاں نہیں تھا۔ ہم نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ اپنی غیر موجودگی کا ثبوت دے چکا ہے۔"
"اگر کسی نے اسے وہاں دیکھا ہو تو کیا وہ غلطی پر ہے؟"
"کسی نے اسے دیکھا تھا؟"
وہ لمحہ بھر کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ "نہیں، یہ میں نہیں جانتی۔ اس پیشکش کا کیا بنا؟"
"وہ انہوں نے واپس لے لی۔ اس گروہ کے پاس دو کیسینو ہیں۔ برانکا انہیں چلا رہا ہے۔"
"اور وہ حادثہ؟ کیا تم نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی؟"
"ایک اسکریو ڈرائیور کیبل ڈرم کے میکانزم میں گر گیا تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حادثہ تھا یا کسی نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"محض تجسس۔" ٹیری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ فلمور نے میری اور چیکو کی کیا قیمت وصول کی ہو گی۔"
"یہ ہم کبھی نہیں جان سکے۔ ہر کیس میں ایک دو خامیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ مکمل نہیں ہو پاتا۔"
"اور وہ گم شدہ رشوت کی رقم۔ وہ اسکریو ڈرائیور، ان کے بارے میں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی؟"
"میں اس پر غور کر رہا تھا لیکن ایک دوسرے کیس میں الجھ گیا۔ یقیناً وہ ایک سنگین حادثہ تھا جس نے بہت سے لوگوں کو تباہ کر دیا لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم اسٹیج پر واپس آ گئی ہو۔ اب اس واقعے کو بھول جاؤ۔ بہت سے لوگوں کو تو دوسرا موقع بھی نہیں ملتا۔"
"بہت سے لوگوں کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔"
اس نے تلخی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

پیرول پر باہر آنے کے بعد ویلس نے اپنے آپ کو بہت محدود کر لیا تھا۔ وہ اپنے موٹیل سے نکل کر قریبی کیفے تک جاتا اور وہاں کھلی فضا میں ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لیتا۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق اپنی مخصوص میز پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی کیڈی لیک کیفے کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے ٹیری کا باڈی گارڈ سیمون برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر ویلس کھڑا ہو گیا۔ ٹیری بڑے باوقار انداز میں قدم بڑھاتی اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا فلاپی ہیٹ پہن رکھا تھا جس سے اس کا نصف چہرہ چھپ گیا تھا۔
"ہائے روسی!" اس نے اس انداز میں کہا جیسے پانچ سال نہیں پانچ دن بعد مل رہی ہو۔ "کیسے ہو؟"
"ٹھیک ہوں لیکن تمہارے جیسا نہیں۔" ویلس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"
"امید ہے کہ تم میری مداخلت کا برا نہیں مناؤ گے۔" ٹیری نے کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔"
"کس لیے؟ تمہیں مجھ سے ملنے کا خیال کیوں آیا؟ یہ بتانے کے لیے کہ تم دوبارہ بڑی اسٹار بن گئی ہو اور مجھے اس وقت تمہیں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا جب تم......"
"ہم دونوں نے صحیح کیا اور اس کے لیے میں تمہیں کبھی الزام نہیں دوں گی۔"
"لیکن میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔" ویلس نے اعتراف کیا۔ "مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ تمہارے لیے لڑتا لیکن تم نے سب کچھ ختم کر دیا پھر میں جیل چلا گیا اس لیے......"
"ہم دونوں کے لیے یہی ٹھیک تھا۔" ٹیری نے اپنی بات دہرائی۔
"بظاہر تمہارے لیے یہ ٹھیک ہے۔ اب تم ایک نئی لڑکی لگ رہی ہو۔" یہ کہہ کر ویلس نے اپنا ہاتھ اس کے ہیٹ کی طرف بڑھایا اور بولا۔ "اسے اتار دو۔ میں تمہارا پورا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"نہیں۔" وہ اس کی کلائی ہٹاتے ہوئے تیزی سے بولی۔ "یہ میں نے دھوپ سے بچاؤ کے لیے پہنا ہے کیونکہ اس سے میری جلد کے مساموں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"
"تم اس طرح بھی اچھی لگ رہی ہو۔"

"تم ہمیشہ سے ہی جھوٹ بولنے میں ماہر ہو۔ شاید اس لیے کہ تمہیں اس کی بہت زیادہ پریکٹس ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے لوگوں کے سامنے آنے کے لیے میک اپ میں چالیس منٹ لگتے ہیں۔ اگر چند منٹ کے لیے دھوپ میں چلی جاؤں تو موم کے مجسمے کی طرح پگھلنے لگتی ہوں اور اگر میک اپ نہ کروں تو لوگ مجھے دیکھ کر ڈر جائیں۔"
"ہر عورت یہی سمجھتی ہے کہ وہ میک اپ کے بغیر اچھی نہیں لگے گی۔ تمہاری اسٹیج پر واپسی بڑے شاندار انداز میں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اور تم حقیقی زندگی میں ایک ہونے کی کوشش کریں۔"
"تم ایک خوب صورت شخص ہو اور میں نے ہمیشہ تمہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے لیکن اب میں بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں اور تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی بلکہ کسی کا بھی نہیں۔"
"مجھے اندازہ ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم صرف مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آئیں۔"
"ہاں، میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتی ہوں۔ جو کچھ تمہیں بتاؤں گی وہ شاید تمہیں پسند نہ آئے۔"
"میں نے چار سال جیل میں گزارے ہیں اور اب مجھ میں اتنی برداشت پیدا ہو گئی ہے کہ سب کچھ سن سکوں۔ تم بتاؤ کہ بات کیا ہے؟"
"جو کچھ تم نے کیا اس کے لیے چار سال کی سزا بہت کم تھی۔ تم نے ایک بے قصور شخص کو مروا دیا۔ اس حادثے میں فلمور کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"
"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" ویلس اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ شو کو خراب کرنا چاہ رہے تھے......"
"اور ان کا سرغنہ جیری برانکا اس رات کیسینو کی ڈانگری پہنے اسٹیج کے پیچھے موجود تھا۔ اس نے کیبل ڈرم میں ایک اسکریو ڈرائیور پھینک دیا جس کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا۔ فلمور کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ غلط وقت پر غلط جگہ کھڑا ہوا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر فلمور کے معاملے میں مجھ سے غلطی ہوئی تو میں اس کی تلافی کر دوں گا۔"
"وہ میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ اس کی بیوہ کو ہر مہینے چیک ملتا رہے گا اور وہ یہی سمجھے گی کہ یہ چیک انشورنس کمپنی بھیج رہی ہے جس کے بارے میں فلمور اسے بتانا بھول گیا تھا۔"
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
"جانتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ تم نے اپنے حصے کی سزا بھگت لی۔ اب میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتی ہوں۔"
"کیسا سودا؟"
"تم نے طیارے سے فیٹ جیک کو فون کیا تھا کہ فلمور کو ختم کر دیا جائے لیکن جیک اس وقت ڈیٹرائٹ میں تھا اور فلمور کو اس کے چند گھنٹوں بعد ہی گولی مار دی گئی۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ جیک نے لاس ویگاس میں کسی سے رابطہ کیا ہوگا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"
ویلس نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "تم کیا چاہتی ہو ٹیری؟"
"مجھے اس شخص کا نام بتا دو جو لاس ویگاس میں فیٹ جیک کے لیے کام کرتا ہے۔"

☆☆☆

جینز اور ہوڈی میں ملبوس ٹیرس ایک ایسی نوعمر لڑکی کے مانند لگ رہی تھی جو رات گئے دیر سے گھر آئی ہو۔ اسے اپنے پہچان لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس وقت وہ میک اپ کے بغیر تھی اور اس نے سر پر وگ لگائی ہوئی تھی۔ اس حلیے میں اس کی ماں بھی اسے نہیں پہچان سکتی تھی۔ وہ احتیاط سے خالی سڑک پر قدم بڑھاتی ایک نوتعمیر مکان کی طرف بڑھی اور چرائی ہوئی چابی سے دروازہ کھول لیا۔ اسے فیٹ جیک کے گن مین نے یہ چابی، مکان کا پتا اور اندر کا نقشہ بھی دیا تھا۔ اس کے پاس ایک چوری شدہ آٹومیٹک بے آواز ریوالور بھی تھا جس کا پتا نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی ماسٹر بیڈ روم میں داخل ہوئی جس پر ایک فربہ اندام شخص سوتے میں ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔
اس نے اپنی پیٹی میں سے ریوالور نکالا اور ایک طویل سانس لے کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کے سامنے چیکو اور فلمور کے چہرے گھومنے لگے پھر اسے اپنی تباہ شدہ زندگی یاد آئی۔ پانچ سال کی تکلیف اور جدوجہد کے بعد وہ دوبارہ اپنے مقام پر پہنچ سکی تھی بلاشبہ اس کی واپسی شاندار تھی جس کے بعد وہ آخرکار اس گھر اور اس کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکی لیکن یہ واپسی بالکل ذاتی نوعیت کی تھی پھر اس نے ہوڈی ہٹا کر اپنا بدنما چہرہ نمایاں کیا اور پستول کی نال سوتے ہوئے شخص کو چھبو دی۔
"آنکھیں کھولو۔" اس نے کہا۔ "میری طرف دیکھو۔"
پھر ایک ہلکی سی کلک کی آواز آئی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کی یہ واپسی بھی شاندار رہی تھی۔

آوارہ گرد

قسط 25

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

بے رحم لمحوں کی مصلوب گھڑیاں میرے یک تک وجود کا جیسے حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔

گولی کے دھاکے کے بعد ہی بشام کی آواز کا یک دم ڈوب جانا اور پھر پانی میں کسی کے گرنے یا گرانے کی چھپاکے کی بے رحم آواز نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا کہ سفاک درندوں نے بے گناہ اور معصوم بشام چھلگری کے ساتھ کیا کیا ہوگا...... ! یہ دل سوز تصور کرتے ہی کہ سے جی کوہارا کے قسائی صفت برمی ساتھی بھومک اسی کے ایما پر ایک بے گناہ کی بڑی بے رحمی سے جان لے چکا تھا، اس نے میرے پورے وجود میں ان دونوں کے خلاف نفرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ یہ دونوں درندہ صفت انسان کہلانے کے لائق نہیں تھے۔

دکھ سے میرا اندر بھر سا گیا تھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو بشام میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا اور اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کو یاد کر کے ان کا بار بار ذکر کر رہا تھا۔ ان درندوں نے اسے پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا اور شاید اس کی لاش کے ساتھ وہی کیا تھا جو ''سمندر گرد'' کیا کرتے ہیں، یعنی اس کی لاش کو سمندر برد کر دیا گیا تھا۔

اس ننگی فرعونیت پر مجھ جیسا مضبوط دل گردے کا آدمی بھی دہل کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے پشیمانی محسوس ہوئی تھی کہ میرے ہی اصرار پر اس غریب نے طلسم نور ہیرے کے سلسلے میں میرے سامنے بھی وہی کہانی دہرا دی تھی جو وہ انہیں سنا چکا تھا، جس کے باعث وہ ان کے ہتھے چڑھا تھا۔ مگر کوہارا یا اس کا بدذات گریٹ ماسٹر لولووش کو اس پر یقین نہیں آیا تھا، وہ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ بشام ان سے جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے تنہائی میں اور میرے ساتھ دوستانہ ہم آہنگی ہونے کے بعد بشام مجھے جھوٹی کہانی نہیں سنا سکتا تھا، اسی لیے ان مردودوں (لولووش اور کوہارا) کو تب ہی اس کی بات پر یقین آیا تھا، جب انہوں نے اس منحوس نکون کمرے میں کسی جگہ نصب خفیہ ٹرانسمیٹر یا ''بگ'' کے ذریعے یہ سب سنا تھا اور یہی بات بدنصیب بشام کے لیے موت کا پیغام لانے کا سبب بنی تھی۔ ظاہر ہے اب وہ ان کے لیے بے کار ہو چکا تھا۔

میں آزردہ دل سے سوچنے لگا کہ اگر ان ظالموں کو حقیقت کا پتا چل بھی چکا تھا تو پھر اس غریب بشام کو اس بیدردی سے ہلاک کرنے کیا ضرورت تھی انہیں؟ وہ اسے زندہ چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن تاتاری فطرت اور صورت سے ... قسائی دکھنے والے یہ بدھ مت قسم کے ظالم خلاصی نما برمی درندوں نے اسے نہیں بخشا۔

میں جب بھی ایسے انسانیت سوز مناظر دیکھتا تو مجھے انسانوں سے ہی نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ بے رحم بے مہر لوگ کس آسانی سے ایک جیتے جاگتے انسان کی جان لے لیتے تھے۔ انہی مناظر نے مجھے بھی سخت دل بنا دیا تھا اور... میں بھی اپنے اندر تہیہ کر لیتا تھا کہ میں ایسا کوئی بھی موقع جانے نہ دوں جب ایسے کسی سفاک درندے کی گردن میری آہنی گرفت میں آئے۔

اب ہر سو اتھاہ خاموشی سی طاری ہو گئی تھی۔ یہ منحوس بوٹ ابھی تک اپنے گمنام آبی ٹھکانے سے ٹس سے مس تک نہیں ہوئی تھی اور تازہ کاربھیانک واقعے کے بعد مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ اب (رنگون) برما کی طرف اپنا ''متوقع'' سفر بھی شروع کرے گی۔ کیونکہ انہیں اب وکرم یا سوشیلا کی تلاش ہوگی، تاکہ ان کے قبضے سے وہ نایاب و نادر طلسم نور ہیرا حاصل کیا جا سکتا۔ اس تسلی کے بعد کہ وہ ہیرا بشام کے بجائے ان دونوں بھارتیوں کے پاس [illegible] لولووش کے لیے انہیں تلاشنا کیا مشکل تھا۔

ہیڈ آفس میں یقیناً سوشیلا اور وکرم کا پورا اور تفصیلی بائیو ڈیٹا موجود ہوگا کہ وہ بھارت میں ممبئی کے کس علاقے میں رہتے ہوں گے۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آیا میرے ساتھ ہی یہ مہم انہیں نمٹانا تھی یا مجھے پہلے برما پہنچا کر لولووش کے پاس چھوڑنا انہیں مقصود ہوتا۔ اس کے لیے ضرور سے جی کوہارا کو لولووش کی طرف سے تازہ ہدایات کا انتظار ہوگا۔

سی جی بھجوانی کے ہاتھوں میری عارضی حوالگی بھی مجھے تفکر میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ میرے بہی خواہوں کو اس بدذات نے یہی کہہ کر مطلع تو کر دیا تھا کہ میں ان کے قبضے ...... میں تھا اور وہ میرے بدلے میں اپنے اہم آدمی سندرداس سکینہ کو پاکستانی انٹیلی جنس کے اداروں سے آزادی دلوانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، شاطر دماغ بھجوانی نے اپنے تئیں بڑی زرخیز چال چلی تھی۔

ملکی سطح پر میرے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوتے ہی اس نے اپنی طرف سے ترپ کا ایک پتا پھینک دیا تھا، اس نے پاکستانی خفیہ ایجنسی کے کسی ذمے دار افسر کے بجائے میرے بہی خواہوں سے رابطہ کیا تھا تاکہ وہ کوئی ایسا ہی طریقہ آزمانے کی کوشش پہ مجبور ہو جائیں، جیسا کہ میں نے میجر ریاض باجوہ کے ساتھ اندر ہی اندر معاملہ نمٹانے کے سلسلے میں کیا تھا۔ مگر میری بات اور تھی، میری میجر باجوہ

صاحب کے ساتھ اچھی اور دوستانہ طرز کی انڈراسٹینڈنگ تھی اور پھر اب تو سندرداس کا معاملہ اوپر تک جا چکا تھا، زہرہ بانو یا اول خیر وغیرہ ایسی کسی مہم جوئی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، جیسا کہ میں اپنے باپ کے سلسلے میں کر چکا تھا۔ اس صورت میں میرے ساتھیوں اور پاکستانی خفیہ اداروں کے درمیان تصادم ہونے کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا، وہ اپنی سی کوشش میں متعلقہ افسران پر میری رہائی کے سلسلے میں دباؤ ڈال سکتے تھے، آخر کو میں وطن کے ایک بہادر غازی سپاہی کا فرزند تھا۔ لیکن میں بالکل بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کچھ ہو۔ جبکہ مکار بھجوانی چاہتا تھا کہ میرے سلسلے میں خفیہ اداروں کے متعلقہ افسران پر میرے ساتھیوں کا دباؤ، عوامی احتجاج میں بدل جائے اور ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ میرے ساتھی جوش میں آ کر ایسا کر سکتے تھے، کیونکہ مجھے اپنا وہ وقت بھی یاد تھا جب اپنے باپ کو بھجوانی کے قبضے سے چھڑانے کے سلسلے میں میری بھی میجر باجوہ صاحب سے بحث ہو گئی تھی۔

میری کوشش تھی کہ میں کسی طرح اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے انہیں صبر کی تلقین کروں، تاکہ وہ جلد بازی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جو خود ان کے لیے کسی مشکل کا باعث بن جائے۔ ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب میں اس بوٹ پر اپنا قبضہ جما لیتا۔

کافی دیر گزر گئی۔ میں اپنے بنک بیڈ کے سہارے کھڑے کھڑے تھک گیا، میں نے اپنے بنک کے اوپر بنے خالی بنک بیڈ پر ایک افسردہ سی نظر ڈالی جہاں کچھ دیر پہلے بشام لیٹا ہوتا تھا، مگر اب وہ خالی تھا۔ اس کے خالی پن میں مجھے ایک سوگواریت کا احساس ہوا۔

میں ایک آزردہ سی ہنکاری خارج کر کے اپنے بنک بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسی طرح مزید تھوڑی دیر اور بیت گئی۔ بوٹ اسی طرح اپنے مقام پر لنگر انداز دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہی تھی۔ وقت کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔ تاہم دن تو نکلا ہوا تھا۔ میں خود منتظر تھا کہ اب میرے سلسلے میں کیا احکامات ملنے والے تھے؟ لیکن اب میں نے اپنا ارادہ کچھ بدل لیا تھا، پہلے میرا ارادہ ان کے ساتھ سفر کرنے اور برما پہنچ کر لولووش کا سامنا کرنے کا تھا، لیکن ان کی بربریت سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ کب یہ لوگ مجھے بھی بشام کی طرح اپنی درندگی کا نشانہ بنا ڈالتے۔ یوں بھی اب بشام اور کرنل سی جی کے حوالے سے یہاں کی صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ اب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

معاً دروازے پر کسی کے قدموں کی ہلکی چاپ ابھری۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، مجھے یوں لگا جیسے اب میری موت کا پروانہ جاری کیا جانے والا تھا۔

دروازہ کھلا اور میں قدرے چونکا۔ وہاں کوئی اور تھا، ساتھی خلاصی کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی، بھومک ہی عموماً یہاں کا رخ کرتا تھا۔ یہ برمی نہیں تھا اور کوئی مقامی انڈین ہی نظر آتا تھا، اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

دروازہ کھول کر اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ پھر میرے بنک کے ذرا قریب آتے آتے اس نے میری ہتھکڑی کو بھی ایک نظر دیکھا تھا، جو بنک کے راڈ سے بندھی ہوئی تھی، تسلی ہونے کے بعد وہ میرے قریب آیا اور کھانے کی ٹرے میرے اوپر والے خالی بنک پر رکھ دی اور... تمسخرانہ سی مسکراہٹ سے... میری طرف دیکھ کر پلٹنے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

''کیا تم مجھے اس قیدی کے بارے میں بتا سکتے ہو، جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر لے جایا گیا تھا؟'' میں نے اس سے انگریزی کے بجائے اردو میں ہی بات کی تھی۔

اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اپنی گردن پر پھیرا۔ میں اس مردود کا اشارہ سمجھ کر اندر سے کٹ کر رہ گیا اور بولا۔ ''اسے مار ڈالا ہے تو تم لوگوں نے بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔'' میں نے اپنی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے اس کے تار بپود کو ہلانا شروع کر دیا۔ ''وہ تم لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔''

میری بات سن کر وہ اپنے شانے اچکا کر بولا۔ ''ہمیں کیا معلوم؟ یہ تو وہ دونوں جانیں۔''

''سنو! انہوں نے ایک خزانے کی تلاش کے سلسلے میں اسے بلاوجہ ہی ہلاک کیا ہے۔'' میں نے دانستہ ہیرے کے بجائے ''خزانے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس حد تک ان دونوں سفاک برمیوں کے عزائم کا پتا تھا۔

''خزانہ! کیسا خزانہ......؟'' وہ اپنی بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ کمرا ''بگڈ'' ہوگا اور نجانے اس کا لاسلکی رابطہ براہِ راست اسی بوٹ کے کسی خفیہ آپریٹنگ روم سے تھا یا پھر برما میں موجود لولووش تک اس کی رسائی کی گئی تھی، ... یہ میں ایک خطرناک رسکی کھیل کھیل رہا تھا، مگر میرے پاس یہ جوا کھیلنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ کب تک میں

یوں کسی موقع کی تاک میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا، جبکہ ان فرعونوں کی بربریت کے مظاہرے دیکھ کر خود مجھے بھی بے موت مارے جانے کا خدشہ دامن گیر تھا۔

اس کی لاعلمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں دانستہ اپنے لہجے میں ایک مکارانہ حیرت سموتے ہوئے بولا۔ ”حیرت ہے! تم لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سارا چکر اس خزانے کے لیے چلایا جارہا ہے جو قریب ہوتے ہوئے بھی ان کی لاعلمی کی وجہ سے دور ہے۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی میں نے بھانپتی ..... نظروں سے اس کے چہرے پر اثر پذیر ہونے والے تاثرات کو بھی جانچنا چاہا تھا، مجھے لگا تو تھا کہ میری اس بات نے اس کے بہ ظاہر سپاٹ چہرے پر کچھ سوچ آمیز الجھن کی سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ لوہا گرم محسوس کر کے میں نے فوراً بولا۔

”مجھے صرف دو تین آدمیوں کا ساتھ چاہیے، اس کے بعد وہ عظیم خزانہ جو کالی ماتا کا خزانہ کہلاتا ہے، وہ ہمارا ہوگا۔“ میں نے دیکھا، اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک سی ابھری تھی، وہ بولا۔

”تم ان دونوں کے ساتھ مل کر کیوں نہیں یہ کام کر لیتے ہو؟“ اس کے بے وقوفانہ سوال پر میرا جی اس کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہا تھا لیکن اس کی یہ ”بے وقوفی“ ہی تو میرے کام آنے والی تھی۔

”تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، دیکھتے نہیں کہ میں ان کا قیدی ہوں، یہ مجھ سے خزانے کا راز اگلوانا چاہتے ہیں، لیکن میں نے اگل کے نہیں دیا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد مجھے بھی میرے ساتھی کی طرح مار ڈالیں گے۔“

”تمہارے ساتھی کو انہوں نے کیوں مارا؟“ اس نے پوچھا۔ اسے سوالاً جواباً کی سطح پر آتے دیکھ کر میں کچھ پُرامید سا ہوا اور بولا۔

”مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے، لیکن میں زیادہ دیر ان کا تشدد نہیں برداشت کروں گا مگر تم لوگ بھی سن لو، خزانہ حاصل کرنے کے بعد یہ ماسوائے اپنے ساتھیوں کے، تم سب کو مار ڈالے گا، تاکہ خزانے کا راز بھی دفن ہو جائے، ہوش کرو اور میرا ساتھ دو، میں چاہتا ہوں وہ خزانہ تم لوگوں کی مدد سے حاصل کرنے کے بعد تمہیں تمہارا حصہ دے کر نکل جاؤں گا، تم بھی خزانہ پاکر ساری عمر عیش و عشرت سے گزارو گے، بلکہ تمہاری آنے والی نسلیں تک آرام سے بیٹھ کر اس عظیم خزانے کے مزے اڑاتی رہیں گی۔ بولو! کیا کہتے ہو؟“

میری بات پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بیک وقت تذبذب، خوف اور لالچ کے آثار گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ میں نے دوبارہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔

”تھوڑی ہمت کرنے کی ضرورت ہے، تم، میں اور تمہارے ساتھی مل کر ان دونوں وحشی اور سفاک برمیوں پر بہ آسانی قابو پاسکتے ہیں۔ ان کی لانچ قبضے میں کر کے ہم خزانے کے مقام تک پہنچیں گے اور پھر سارا خزانہ نکالنے کے بعد اس کی حصہ داری کر کے اپنی اپنی راہ ہولیں گے۔“

”یہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور صرف دو نہیں ہیں۔“ وہ پہلی بار دھیمے میں لہجے میں بولا۔ اسے نیم رضامند اور ”معاملہ داری“ کی طرف آتے دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا۔

”چاہے جتنے بھی ہوں، کوئی پروا نہ کرو، اگر ہم مل جائیں تو بہ آسانی ان سب پر قابو پاسکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔“ ایک لمحہ توقف سے بولا۔ ”تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اپنے بھارتی ساتھی کتنے ہیں؟ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ انہوں نے تمہیں ادھر سے ہی اپنی لانچ میں نوکر رکھا ہے؟“

”ہاں! ہم بھارتی ہیں اور ادھر ہی خلیج کھمبات کے کنارے ہماری بستی ہے، ہم وہیں رہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہوں......“ میں نے سوچا، تو گویا یہ علاقہ خلیج کھمبات کہلاتا تھا۔

”تم کتنے ہو؟“

”پہلے تو پانچ تھے، اب تین ہیں۔ دو چھوڑ گئے تھے نوکری۔“

”میں نے دو انڈین لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔“

”وہ طوائفیں ہیں۔“

”ان کا تعلق کس ملک سے ہے؟ بھارت یا برما سے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم، وہ دونوں ہم سے پہلے یہاں موجود تھیں۔“

”ان کے ساتھی کتنے ہیں؟ میرا مطلب ہے برمی؟“

”پانچ، چھ تو ہوں گے ہی۔“

”سے جی کوہارا اور بھومک کو ملا کر؟“

”نہیں، ان دونوں کے علاوہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا، فرض کرو تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتے

ہو تو، کیا سمجھتے ہو، تمہارے باقی دو ساتھی ہم خیال بن جائیں گے؟ یعنی، ایسا تو نہیں کہ وہ ان برمیوں کو ہماری مخبری کر دیں؟“

میری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”مخبری تو نہیں کریں گے، لیکن ان سے بات کرنا پڑے گی، مگر ہم ان برمیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، یہ بہت ظالم اور طاقت ور ہیں۔“

”تم لوگ کب سے ان کے ساتھ ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں۔“ اس جواب دیا۔

”ان لوگوں نے تمہیں کیا کہہ کر اپنے ساتھ رکھا تھا؟“

”یہی کہ انہیں خلاصیوں کی ضرورت تھی۔“ اس نے خاطر خواہ جواب دیا، کیونکہ جب میں نے پہلی بار عرشے پر ان لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا تو مجھے یہاں دو قسم کے ہی خلاصی (ملاح) دکھائی دیے تھے۔ ایک بھارتی اور دوسرے برمی۔ میرے ذہن میں اسی وقت یہ خیال آیا تھا کہ برمی خلاصیوں کے مقابلے میں بھارتی خلاصیوں کے گروپ کو یہاں صرف نوکر یا غلاموں کی حیثیت حاصل ہوگی، اور اگر میں کسی طرح ان کا مائنڈ سیٹ اَپ بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں تو یہ (بھارتی خلاصی) اس نوکری اور غلامی پر لعنت بھیج کر میرے ہم خیال بن سکتے تھے۔ لہٰذا ان سب باتوں کے تناظر میں، میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور بولا۔

”نہیں، انہیں خلاصیوں یا نوکروں کی ضرورت نہیں تھی، انہیں تو ان لوگوں کی ضرورت تھی جنہیں یہ برمی اس خزانے کی تلاش میں جھونکنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور واپس اپنے ملک کی راہ لیں تاکہ یہ راز آشکارا ہی نہ ہو سکے۔“

میری بات پر اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات کی ایک جھلک سی اُبھری اور وہ فکرمندی سے بولا۔

”تت......تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اور پھر ان کا کیا مقصد ہے یہاں؟ مجھے اور میرے ساتھی کو کس پاداش میں انہوں نے یہاں قیدی بنا رکھا ہے؟ اس لیے کہ وہ ہم سے اس خزانے کا راز اگلوانا چاہتے تھے اور مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے ان ظالموں نے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑا تو تم لوگوں کو کیوں بخشیں گے؟ دیکھو! میری بات کا یقین کرو، خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو بلکہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاؤ، تم غریبوں کی قسمت بدل جائے گی۔ میں ان کی بعض ایسی کمزوریوں سے واقف ہوں جس کے زور پر میں انہیں قابو کر سکتا ہوں، ہمت کرو اپنی تقدیر بدلنے کا یہ موقع ضائع مت کرو۔ میرا ساتھ دو، بولو! کیا کہتے ہو؟“

پہلی بار اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پھر ”سمجھداری“ کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ پھر میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ ”مجھے کیا کرنا ہوگا ابھی؟“

”شاباش! یہ کی ناں عقل مندوں والی بات۔“ میرا دل اپنی کامیابی پر بلیوں اچھل پڑا۔ ”اب مجھے یہ بتاؤ، یہ دونوں یعنی کوہارا اور بھومک اس وقت کہاں ہیں؟“

”کوہارا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کہیں گیا ہوا ہے، جبکہ بھومک لانچ پر ہی موجود ہے۔ اس نے جواب دیا اور میری آنکھوں میں معنی خیز چمک ابھری۔ مجھے اس کا اندازہ تھا کہ کوہارا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ضرور و کرم اور سوشیلا کی تلاش میں نکلا ہوگا، ان دونوں کی تلاش میں کوہارا کا خود نکلنا، اس کی مہم کی اہمیت کو اجاگر کرتا تھا۔ جبکہ اس کا مقرب خاص...... بھومک لانچ میں تھا، یہ بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ اس کی لانچ میں موجودگی کوہارا نے سوچ سمجھ کر ہی کی تھی۔ وہ اس کا سچا اور وفادار دستِ راست تھا۔

”سنو! میں جانتا ہوں اچھی طرح کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔“ میں نے اپنی آواز میں جوش سموتے ہوئے کہا۔ ”یہی موقع ہے ان پر قابو پانے کا۔ اب تم سب سے پہلے ایک کام کرو، اس کمرے میں کہیں خفیہ ٹرانسمیٹر نصب ہے۔ تم وہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو، اس کے ذریعے یہ ہماری خفیہ باتیں سُن سکتے ہیں۔“ میری بات پر یک دم اس کے چہرے پر خوف کی ایک واضح جھلک ابھری تھی، وہ گھبرانے لگا، میں نے جلدی سے کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم یہ کر سکتے ہو، اس کا کنکشن ضرور سے جی کوہارا کے کمرے میں......“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک موٹا اور ٹھگنا برمی خلاصی نمودار ہوا، اس کے چہرے پر غصیلے پن کے آثار تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار کی طرح ... کا خم دار چنگیزی چھرا نظر آرہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے پہلے ایک پُرغیظ سی نگاہ مجھ پر ڈالی، پھر قریب کھڑے بھارتی خلاصی کو گھورا اور منہ سے بھی شاید اس نے کوئی غضب ناک سی غراہٹ نکالی تھی، دوسرے ہی لمحے وہ اس کی جانب دانت نکوستے ہوئے لپکا۔ بھارتی خلاصی کی

جان پر بن آئی، کم تو انا وہ بھی نہیں تھا، جان کسے پیاری نہیں ہوتی، اس نے فوراً اپنے دفاع کے لیے حرکت کی، بری اپنا تلوار نما چھرا لیے جیسے ہی اس کے قریب آیا، بھارتی خلاصی نے اسے جھونک دینے کی کوشش چاہی، اس میں وہ اسی قدر ہی کامیاب ہو سکا تھا کہ بری خلاصی کا چھرا اس کے پیٹ کے بجائے، اس کا شانہ زخمی کر گیا، بھارتی خلاصی مارے تکلیف کے تلملا اٹھا۔ چرکا بڑا اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ جس نے بھارتی خلاصی کو بُری طرح بلبلا کر رکھ دیا تھا، میں نے دیکھا اذیت ناکی نے اسے بھی جیسے ایک جوشِ جنوں میں مبتلا کر دیا۔ بری دوسرے وار کے لیے ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ بھارتی نے اپنی لات چلادی جو بری کے پہلو پہ لگی، وہ لڑکھڑا کر میرے بنک کے قریب آیا اور تب ہی میں نے حرکت کی، میں نے بنک بیڈ کے سہارے خود کو ٹکایا، اگرچہ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، مگر ٹانگیں آزاد تھیں، وہی میں نے قینچی کی طرح بہ سرعت اس وحشی بری قسائی کی موٹی سی گردن میں پھنسا دیں، اس نے اپنے چھرے والے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی، جس کا مجھے ادراک تھا، مگر وہ میرے ایک خطرناک داؤ ''لیگ لاک'' میں آچکا تھا، میں نے اپنے وجود کی پوری طاقت کو ٹانگوں میں سموتے ہوئے مخصوص انداز میں ایک زوردار ''جرک'' لیا، کمرے میں کڑاکے کی ہولناک آواز ابھری اور موٹا بری یک دم ڈھیلا ہو کر میری دنوں ٹانگوں کے ''جکڑ بند'' میں جھول کر رہ گیا، میں نے اس کے تنِ مردہ کو چھوڑ دیا، وہ دھڑام سے گرا، چھرا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر چکا تھا، میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس زخمی بھارتی خلاصی سے بولا۔

''چھرا اٹھا لو اور جلدی سے میری ہتھکڑی کاٹ ڈالو، ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔'' وہ میری خطرناکی کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اور میری بات کا بھی اسے یقین آ گیا تھا، یوں بھی اب اس کے پاس میری بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، مگر وہ خود بھی زخمی تھا۔ اُس کے دائیں شانے سے بھل بھل خون رِسے جا رہا تھا۔ تاہم جان پر اس کی بھی بنی ہوئی تھی، اور میری بھی۔ اس نے ہمت کی اور زمین پر سے چنگیزی مار کا چھرا اٹھا لیا۔ میں نے پہلے اپنی ہتھکڑی کا جائزہ لیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ میرے ہاتھ کے قریب والی جگہ پر ضرب لگانے کے بجائے، راڈ سے بندھی ہوئی زنجیر پر لگائے، وہ بے چارہ بہ مشکل ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھا، تاہم اس نے وہی کیا، چھرا تیز تھا اس نے اس کی دو تین ضربات اس پر لگائیں تو ہتھکڑی بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے ٹوٹ گئی، باقی کام میں نے تیزی سے نمٹایا اور بھارتی ملاح کے ہاتھوں سے چھرا لے لیا۔ وہ اب نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

''تم فکر مت کرو، میرا وعدہ ہے، میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑوں گا، لانچ میں ضرور مرہم پٹی کا پورا سامان موجود ہوگا۔ بس مجھے ایک بار اس لانچ پر قبضہ جمانے دو۔'' اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے اسے فرش پر آرام سے لٹا دیا۔ اس کے بعد میں نے بری خلاصی کی لاش کا جائزہ لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کم بخت کی ڈیوٹی اسی کمرے میں ہوگی جہاں یہ بیٹھ کر اس بگڈ کمرے میں ہونے والی گفتگو سنتے ہوں گے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس جہنم واصل بری خلاصی نے ہماری گفتگو سن لی تھی تو بھومک اب تک اس سے کیوں بے خبر تھا؟ اس کی ایک ہی وجہ میرے ذہن میں آتی تھی کہ کوہارا کی غیر موجودگی میں بھومک یا تو آرام میں مصروف ہوگا یا پھر لانچ میں موجود انڈین طوائفوں کے ساتھ موج مستی میں غرق ہوگا۔ اس دوران یہ بری خود ہی اس معاملے کو نمٹانے کے لیے چھرا لیے ادھر آن پہنچا۔

بہرکیف کچھ بھی تھا، میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی چولا ٹائپ قمیص پھاڑ کر زخمی خلاصی کے زخم پر پٹی باندھی تاکہ کم از کم جریانِ خون میں کمی ہو سکے پھر پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''گگ...... گوردن۔'' اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔

''تمہارے دو ساتھیوں کے نام؟''

''اش...... اشوک اور...... مہتا......''

''ہوں...... ٹھیک ہے، اب تم ذرا آرام کرو، میں باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں جانے لگا تو وہ یک دم کراہتے ہوئے بولا۔

''ٹھ ٹھ...... ٹھہرو...... میرا تمہارے ساتھ ہونا ضروری ہے، ورنہ میرے ساتھی تمہاری مدد کو نہیں آئیں گے۔'' میں نے اس کی بات پر لمحہ بھر غور کیا تو اس کی بات مجھے ٹھیک لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم چل سکتے ہو؟''

''ہاں! بس، تھوڑا سہارا دے دو مجھے۔'' وہ اٹھنے کی کوشش میں کسمسایا تو میں نے فوراً اسے سہارا دیا اور کھڑا کر دیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں تلوار نما چھرا تھا اور دوسرے

ہاتھ سے میں نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے باہر کی سن گن لی پھر باہر جھانکا۔ چونکہ یہ حصہ بوٹ کے ''دنبالے'' کی جگہ کا تھا اسی لیے یہاں کوئی نظر نہ آیا۔ ہم باہر گلیارے میں آ گئے۔ گوردن میری راہنمائی کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ پہلے اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرے۔

کھلی راہ داری میں چلتے ہوئے ابھی ہمیں چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے اوپر ایک بڑا سا جال آن گرا اور ساتھ ہی قدرے بلندی سے کوئی زور سے حلق کے بل چلّایا، ہم دونوں اس جال میں بُری طرح الجھ سے گئے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، عرشے کی وسطی ریلنگ پر ایک برمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جال کی رسی تھمی ہوئی تھی، جسے اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے مخصوص انداز میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اور گوردن جال میں الجھنے کے باعث اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے اور گر پڑے، زخمی ہونے کے باعث گوردن تکلیف سے چلانے لگا، خود میں اس اچانک افتاد ناگہانی پر ایک لمحے کے لیے بوکھلا سا گیا تھا، گرنے کے باعث میرے ہاتھ سے چھرا ابھی چھوٹ گیا۔ ادھر جال تیزی سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا اور ہم گول مول سے ہو گئے تھے، میرا دل تشویش ناک انداز میں تیزی سے دھڑک رہا تھا، جانتا تھا میں کہ اگر ہم ان سفاک برمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت بھیانک انجام سے دوچار کر دیے جائیں گے۔

''جلدی سے چھرے کی مدد سے جال کاٹ ڈالو......'' گوردن چلانے اور کراہنے کے انداز میں بولا۔

''چھرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ہے۔'' میں چلّایا۔

جال میں ہم دونوں لپٹ کر گول مول ہو گئے تھے۔ تاہم میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں پر قابو پایا اور تیزی سے اردگرد نگاہ ڈالی تو راہداری کے فرش پر ایک جانب وہ چھرا پڑا دکھائی دے گیا۔ میں نے جال میں لپٹے اوندھے منہ پڑ کر اس طرف گھسنے کی کوشش کی اور اپنا ایک ہاتھ جال کے چوکور سوراخ سے باہر نکالا، مگر میرا ہاتھ چھرے کی پہنچ سے دور رہا۔ میں نے اپنے بدن کی پوری طاقت اس طرف سرکنے پر دے ڈالی، گھٹنوں کو فرش پر زور سے گھسیٹا، جس کے نتیجے میں وہ بُری طرح چھل کر رہ گئے۔ اوپر وہ بدبخت جال کو لپیٹے اوپر کھینچنے کی کوشش کیے جا رہا تھا، ساتھ ہی حلق کے بل برمی زبان میں چیخ بھی رہا تھا، وہ شاید اپنے ساتھیوں کو باخبر کر رہا تھا، اسی وقت راہداری میں دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں، میں نے جال کے اندر سے ان آوازوں کی طرف اپنا سر گھما کر دیکھا، چار، پانچ خلاصی ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے تھامے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان میں برمی خلاصیوں کے علاوہ دو انڈین بھی تھے۔ میں نے گوردن سے کہا۔

''اپنے ساتھیوں، اشوک اور مہتا سے مدد لو۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا تاہم وہ انہیں دوڑتے ہوئے آتے دیکھتا رہا، میں نے چھرے کو حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اس کا پھل میری انگلیوں کو چھونے لگا، اسی دوران وہ تینوں ہمیں قابو کرنے کے لیے جیسے ہی قریب پہنچے تو میں نے دیکھا، گوردن کے تو دو انڈین خلاصی ادھر ہی رک گئے، انہوں نے شاید اپنے ساتھی کو بھی زخمی حالت میں دیکھ لیا تھا، لیکن ایک برمی نے انہیں بُری طرح جھڑکا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی بول رہا تھا۔ ایک نے اس سے کہا۔

''تم دیکھ نہیں رہے ہو، ہمارا ساتھی بھی جال میں لپٹا ہوا ہے، ڈنڈے چلانا درست نہیں، جال کھول کر پہلے قیدی پر قابو پانا ہوگا۔'' اس کی بات پر وہ برمی خلاصی زور سے غرایا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے، ڈنڈا سنبھالے آگے بڑھا اور ہم پر پل پڑا، گوردن نے چلّا کر اشوک اور مہتا سے کہا۔

''بچاؤ...... یہ برمی سسرے...... ہمرے دشمن ہیں۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ دونوں الٹا انہی برمیوں پر ڈنڈے برسانے لگے۔ مگر انڈین بے چارے ان موٹے تازے سانڈ نما برمیوں کے مقابلے میں کمزور تھے، ایک برمی نے طیش میں آ کر انڈین خلاصی کے سر پہ گھما کر ڈنڈا رسید کر دیا، اس بے چارے کا سر کھل گیا اور بھیجا باہر آ پڑا، وہ تیورا کر گرا، دوسرا انڈین خلاصی خوف زدہ ہو کر جان بچانے کی غرض سے الٹے پاؤں بھاگا تو ایک برمی اس کے پیچھے ڈنڈا لہراتا غراتا ہوا دوڑ گیا، باقی ہم پر پل پڑے، اس وقت تک میں بھی چھرے پر اپنی گرفت جما چکا تھا اور جال کے اندر سے ہی میں نے ایک برمی کے پیٹ میں وہ چھرا گھونپ دیا۔ اس کی زبان باہر آ گئی اور منہ سے خون ابل پڑا، ایک دو ڈنڈے میرے جسم پر بھی پڑے تھے اور میں اپنا سر بچانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ نجانے بے چارے گوردن کا کیا حشر ہوا تھا۔ مگر مجھے ایک دو ڈنڈوں نے بری طرح بلبلا کر رکھ دیا تھا، میں نے دوسرے برمی کو بھی بری طرح گھائل کر دیا تو تیسرا محتاط ہو کر پیچھے ہٹ گیا،

میرے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی تھی۔ فرطِ جوش سے میرا رُواں رُواں پارا بنا ہوا تھا، آن واحد میں میں نے جال کو اتنا کاٹ ڈالا تھا کہ باہر نکل سکوں، میں نے دیکھا، اوپر موجود برمی غائب ہو گیا تھا، وہ یقیناً یا تو بھونک کو اطلاع دینے گیا تھا یا پھر اسلحہ اٹھانے گیا تھا۔ جبکہ میرے پاس اسلحے کے نام پر صرف یہ چنگیزی ٹائپ کا چھرا تھا۔ یہ بھی اس نازک وقت میں غنیمت تھا۔ باقی ایک برمی بچا تھا اور وہ میرے مقابلے پر پر تولے آن کھڑا ہوا، اس کی آنکھوں سے وحشت مترشح تھی اور وہ مجھ پر بدستور اپنا ڈنڈا تولے کھڑا تھا۔ مجھے اس پر جلد قابو پانا تھا۔ اس نے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ بلند کی اور ڈنڈا ہوا میں لہرایا، میں اس کے حملے کا انداز سمجھ گیا، وہ اسے مجھ پر اچھالنا چاہتا تھا۔ میں بھی محتاط تھا، مگر اسے کوئی موقع دیے بغیر ہی میں نے خود یہ حرکت کر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھرا اس کی طرف اچھال دیا، جو سیدھا اس کے سینے میں جا کر کھب گیا، اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ وہیں اپنا گھائل سینہ پکڑے تیورا کر گرا، اسی وقت گولی چلی، میں بہ سرعت غیرارادی طور پر جھکائی دے گیا اور راہداری کے فرش پر لیٹ گیا، گولی میرے قریب دیوار میں پیوست ہو گئی، مجھے سرے پر دو مسلح آدمیوں کی جھلک دکھائی دی تھی، میں آگے جانے کے بجائے تیزی سے عقب میں پلٹا، اسی وقت میری نگاہ جال میں پھنسے ہوئے گوردن پر پڑی، وہ شدید زخمی حالت میں پڑا مدد طلب نظروں سے میری جانب تکے جا رہا تھا مگر میں اب اس بے چارے کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا اور خود مجھے ابھی بہت کچھ کرنا تھا، اسے اللہ کے بھروسے چھوڑ کر میں اٹھ کر الٹے پاؤں دوڑا، میرے عقب میں دو تین مزید گولیاں داغی گئی تھیں، مگر میں راہداری میں زگ زیگ انداز میں تیزی سے دوڑتا چلا گیا اور ایک جگہ سے راہداری بائیں جانب... گھوم رہی تھی، اسی طرف مڑ گیا۔ سامنے مجھے ایک سیڑھی اوپر عرشے کی طرف جاتی دکھائی دی، میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

سیڑھی کے نیچے بنے خلا کی دیوار میں...... مجھے ایک سنگل پٹ کا دروازہ دکھائی دیا تھا، میں نے اوپر جانے کا ارادہ ترک کیا اور دروازے کو ایک زوردار لات رسید کی، وہ دھڑ سے کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

میں شاید انجن روم میں آ گیا تھا یا پھر کوئی بوائلر روم تھا۔ کیونکہ میرے دائیں بائیں مشینیں نصب تھیں اور بھاری بھرکم پسٹن تھے، جن میں دھواں اٹھ رہا تھا، شائیں شائیں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ اسی وقت مجھے دو تین فائر سنائی دیے، ان ظالم برمیوں نے شاید بے چارے گوردن کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں آگے بڑھا اور تنگ اور بھل بھلیوں جیسے راستوں سے ہوتا ہوا، ایک ایسی جگہ آ کر رکا، جہاں مجھے کاٹھ کباڑ اور آئلی ریختوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا، یہاں بڑی گندی بساند پھیلی ہوئی تھی، جیسے میں کسی جھینگوں اور مچھلیوں کے گودام میں آ گیا تھا۔ مجھے یہاں گھٹن کا احساس ہونے لگا اور نکاسی کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا تو یہاں آ کر پچھتانے لگا، لیکن ہمت نہیں ہاری اور ایک طرف کو بڑھ گیا، مگر ہر جگہ دوڑ دوڑ کر آہنی دیواروں سے سر ٹکرا کر میں بے دم سا ہو گیا۔ لیکن مجھے نکاسی کا راستہ نہ ملا، ناچار میں واپس پلٹا تو راستہ بھولنے لگا، گھٹن کا احساس الگ مجھے مارے ڈال رہا تھا اور اس خیال سے ہی میں لرز اٹھا تھا کہ میں شاید کسی چوہے دان میں اپنے آپ آن پھنسا ہوں۔ آکسیجن اور دیگر کاربائن ٹائپ کی بو سے مجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی اور دم پھولنے لگا تھا، دل کچا ہو رہا تھا، متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بے دم سا ہو کر ایک فولادی پائپ کے سہارے تک گیا مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور زمین پر لڑھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

نجانے کب میری آنکھ کھلی تھی۔ میں پورا ٹھنڈے پانی سے شرابور تھا۔ میں کھلے عرشے پر پڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کسی مضبوط ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ کسی جال کی ڈوری تھی۔ تیز شراٹے دار ہوائیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ ہی عرشے کے تختے دار فرش میں گھرگھراہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں، صاف ظاہر تھا کہ بوٹ کا سفر کسی نامعلوم منزل کی جانب شروع ہو چکا تھا۔

میرا اوپری بدن برہنہ تھا، نیچے صرف جینز پینٹ تھی۔ ابھی مجھے پوری طرح ہوش بھی نہیں آیا تھا کہ ایک زوردار اور تڑپا ڈالنے والا کوڑا میرے ننگے بدن پر پڑا اور اذیت کے باعث میرے حلق سے ایک چیخ خارج ہو گئی۔ کوڑے کی یہ ضرب شاید مجھے پوری طرح ہوش میں لانے کے لیے ماری گئی تھی۔ جس نے ماؤف سے دماغ کی بندشوں کو کھول دیا تھا۔ میں کراہنے لگا اور آنکھیں کھول کر ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں اوندھے منہ اس عرشے پر پڑا تھا کہ

صرف اپنے سر کو ذرا اٹھا کر دائیں بائیں ہی دیکھ سکتا تھا۔

ڈھلتے ہوئے دن کی خنک شام کا آغاز ہونے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے مجھے کسی کے جوتے نظر آئے، دیکھا تو یہ سے جی کوہارا تھا اور کرسی پر بڑے آرام سے بیٹھا، میری طرف قہر آلودہ نظروں سے گھورے جارہا تھا، میز ایک طرف کو سرکائی ہوئی تھی، باقی دو کرسیاں خالی تھیں۔ دو بری خلاصی ہاتھ باندھے، پاؤں پھیلائے اس کے عقب میں کھڑے تھے اور اس کا دستِ راست بھومک ہاتھ میں ایک خاردار کوڑا لیے کھڑا تھا، اس کے چہرے سے بھی وحشت نا کی ٹپک رہی تھی۔ وہ جلاد صفت کوڑا تھامے یوں کھڑا تھا جیسے مجھ پر اس کی بارش کرنے کے لیے بے چین ہو۔ تب ہی کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھے سے جی کوہارا نے اسے مخصوص اشارہ کیا اور جیسے پھر بھومک کی مراد بر آئی۔ اس نے مجھ پر یکے بعد دیگرے کوڑوں کی بارش کردی، میری سمع خراش چیخوں سے یوٹ گونجنے لگی۔ کوڑے میں فولادی تاروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ ان کے تیز نکیلے سرے ابھر آئے تھے۔ اس کی پڑنے والی ہر ضرب جاں کش تھی ... ایسا لگتا تھا جیسے کھال ادھڑی جارہی ہو۔

''خ خ...... خدا کے لیے بب...... بس کرو! بس کر دو......'' میں بہ مشکل بول سکا تھا، یہ پہلا موقع تھا میری زندگی کا کہ میں کسی سے یوں بے بس اور لاچارگی کے عالم میں بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نڈھال اور نیم بے ہوش سا ہونے لگا تھا، تب ہی شاید سے جی کوہارا نے اپنے اس جلاد ساتھی کو کوئی اشارہ کیا تھا اور وہ رک گیا۔

میرا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، چھلے ہوئے جسم میں ایسی جلن مچی ہوئی تھی جیسے کسی نے میرے وجود کو آگ میں جھونک دیا ہو، مجھ سے سانس بھی ٹھیک طرح نہیں لی جارہی تھی۔ جبکہ وہ بدبخت بھومک خاردار کوڑا پکڑے ہانپ رہا تھا اور اس کی بیل جیسی ہانپتی سانسوں.... سے بھی وحشت کی بو آرہی تھی، اس نے کوڑا ایک طرف پھینکا اور کہیں چلا گیا۔ میرا منہ کھلا ہوا تھا اور بہ وقت تمام سانسیں لے رہا تھا۔ بھینچی بھینچی نظروں سے میں نے سے جی کوہارا کی طرف دیکھا اس کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ چونکہ میرا چہرہ اس کے جوتوں کے قریب تھا اسی لیے وہ تضحیک آمیز انداز میں اپنا ایک پیر میرے گال سے لگاتے ہوئے پُرغرور لہجے میں بولا۔

''چچ چچ چچ...... بہت مار لگا دی اس نے تمہیں...... لیکن میں کیا کروں؟'' اس نے حظ اٹھانے والے انداز میں میرا تمسخر اڑایا۔ ''یہ اس کم بخت بھومک کی مجبوری ہے، کوئی بھی ایسی حرکت کرے تو یہ کسی کو نہیں بخشتا مگر...... میرا خیال ہے تمہارے ساتھ اس نے پھر بھی رعایت برتی ہے، تم نے ہمارے ساتھی ہلاک کر ڈالے اور آپس میں انہیں لڑوایا بھی۔ میں نے واپس آکر سوبچرنگ روم میں تمہاری اور گوردن کے درمیان ہونے والی گفتگو کی ڈسک جب سنی تو تمہاری اس خطرناک ذہانت سے تو میں بھی خوف زدہ ہو گیا کہ تم نے کس طرح اسے کسی فرضی خزانے کا ذکر کر کے بے وقوف بنایا، لیکن افسوس...... تمہاری اس چال نے گریٹ ماسٹر کا بڑا دل دکھایا ہے اور تمہیں ان کی خاص رعایت سے اب محروم کر دیا گیا ہے۔'' اس کا لہجہ لحہ بہ لحہ زہریلا ہوتا جارہا تھا۔ پھر وہ ایک طرف گردن موڑ کر کچھ دیکھنے کے بعد مصنوعی انداز میں چونک کر بولا۔

''ارے...... ! یہ کیا؟ یہ پھر آرہا ہے...... لگتا ہے اس کا دل نہیں بھرا، دیکھیں تو ذرا اب یہ تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے؟''

پتا نہیں اب مجھ پر یہ اور کون سی قیامت ڈھانے والے تھے، میں نے دھڑکتے دل سے بہ مشکل تمام لیٹے لیٹے اپنی گردن ذرا گھمائی تو کیا دیکھتا ہوں' وہ رذیل جلاد بھومک...... اپنے ہاتھ میں ایک مچھیروں جیسا کپڑے کا تھیلا اٹھائے اسی طرف سر دھنتا ہوا چلا آرہا تھا۔ میں کراہنے لگا اور دل میں ہول سے اٹھنے لگے تھے کہ اب جانے یہ رذیل بھومک میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

وہ میرے قریب آگیا۔ اس کا چہرہ مکروہ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جنونی قسم کی سفاکیت تیر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ تھیلے کے اندر ڈالا اور جب باہر نکالا تو نجانے اس کی مٹھی میں کیا بھر گیا تھا کہ وہ اس نے میرے ننگے مضروب اور چھلے ہوئے زخم والے جسم پر الٹ دیا، نہ صرف یہ بلکہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھ سے ملنے بھی لگا، تکلیف اور اذیت کی تیز اور جاں کش سی لہریں، کسی آسمانی بجلی کی طرح میری روح تک میں اترتی چلی گئیں۔

اس خبیث نے مچھلیوں اور جھینگوں پہ لگانے والا نمک میرے زخموں پر چھڑک دیا تھا، بلکہ اسے اچھی طرح مل بھی دیا تھا تا کہ کسی مرہم کی طرح وہ نمک میرے کھلے زخموں میں جذب ہو کر مجھے مزید قیامت خیز اذیتوں سے دوچار رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے زخموں پر نمک نہیں کسی نے گوشت خور چیونٹیاں چھوڑ دی ہوں جو مجھے نوچ کھسوٹ کر کھال کے

اندر جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔ میں بلبلا رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور وہ دونوں شیطان، سے جی کوہارا اور بھومک بدمست قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔ میں مارے اذیت کے تڑپ رہا تھا، ایک جان کنی کا عالم تھا مجھ پر، ظلم تو یہ تھا کہ میرے دونوں ہاتھ بھی پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے کہ میں اپنے زخموں کو سہلا کر ہی کچھ قرار پا لیتا، میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا، کبھی ادھر کبھی ادھر سر پٹخ رہا تھا۔ یوٹ کا عرشہ میری چیخوں، آہوں اور کراہوں سے گونج رہا تھا اور انہی میں سے جی کوہارا اور بھومک کے وحشیانہ قہقہے بھی شامل ہو رہے تھے۔ پھر ایک ایسا مقام بھی آیا کہ میں ان ناقابلِ برداشت اذیتوں کی انتہا پر جا پہنچا اور بے ہوش ہو گیا اور جانے کب تک بے ہوش رہا۔

دوبارہ میری آنکھ کسی نسبتاً کشادہ اور آرام دہ کمرے میں کھلی تھی۔ ماحول میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نیم غنودہ اور ماؤف.... ذہن کے ساتھ ادھ کھلی آنکھوں سے چھت کو تکے جارہا تھا اور چند ثانیے اسی طرح ہی پڑا رہا۔ میرا ذہن ڈوبا ڈوبا سا رہا، پھر آہستہ آہستہ مجھے یاد آتا رہا کہ میں کہاں اور کن حالوں میں تھا۔ نیز تھوڑی دیر پہلے ہی میری کیا درگت بنائی گئی تھی، مجھے اپنے اذیت ناک اور سلگتے ہوئے زخموں کا احساس ہوا، مگر وہاں اب ٹھنڈک اور آرام تھا اور ایک ذرا جائزہ لینے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہاں مرہم وغیرہ لگا دیا گیا تھا، ورنہ جاگنے سے میرا پھر وہی درد کے مارے بُرا حال ہو جاتا، لیکن میں ہلنے جلنے سے قاصر ہی رہا تھا، اگرچہ میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا۔ مجھے نقاہت اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں فقط جانگیے میں تھا اور سارا جسم چھالا بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی کاؤچ پر لٹایا گیا تھا۔

''اسی طرح پڑے رہو...... حرکت کرو گے تو زخم کھل جائیں گے۔'' معاً ایک بھاری آواز ابھری، میں نے بہ وقت تمام لیٹے لیٹے اپنی گردن آواز کی سمت گھمائی، وہاں سامنے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے صوفے پر سے جی کوہارا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا جبکہ وہ جلاد صفت بھومک اس کے عقب میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے کھڑا میری طرف بڑی سُلگا دینے والی مسکراہٹ سے تکے جارہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے پورے مضروب وجود میں اس کے خلاف غیظ وغضب کی لہری اٹھی تھی۔

''تمہیں گریٹ ماسٹر! کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، انہی کی سفارش پر تمہارے ساتھ یہ رعایت برتی گئی ہے۔'' وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی چھوٹی سی چپٹی بوتل تھی، جسے وہ اپنے منہ سے لگا کر وقفے وقفے سے چُسکیاں بھی بھرے جارہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اور اس کا گریٹ ماسٹر لولوش میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ پیٹ رہے تھے، مار رہے تھے، پھر دودھ پلا رہے تھے۔ میں خاموش رہا، ابھی میں اپنے اندر بولنے کی بھی سکت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''لیکن ماسٹر کو اس بات کا غصہ ہے کہ تم نے ہمارے کئی آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا ہے اور خلاصیوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کی۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی کتنی بھیانک سزا ہے، تمہیں اس سزا سے بھی ماسٹر نے بچا لیا۔'' اس نے آخر میں سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں...... تمہارے ماسٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بہ مشکل اپنے ریختہ سے وجود کی طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ یوٹ رکی ہوئی تھی، شاید اسے کسی مقام پر لنگر انداز کر دیا گیا تھا۔

میری اس بات پر سے جی کوہارا کی آنکھوں میں معنی خیز سی چمک ابھری تھی۔ ''بہت جلد تمہاری ماسٹر سے ملاقات کروادی جائے گی، ابھی ہمیں کچھ اہم کام نمٹانا ہیں۔''

مجھے کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ ان لوگوں نے ابھی یہاں کون سے ''اہم'' کام نمٹانے تھے۔ تاہم میں نے اس کے رویے میں کچھ نرمی کا عنصر محسوس کرتے ہوئے بالآخر وہی سوال کر ڈالا جو مجھے ابتدا سے بے چین کیے ہوئے تھا۔

''کیا تم میری ایک بے چینی دور کر سکتے ہو؟''

''کیسی بے چینی؟'' اس نے اپنی بھویں سکیڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

مجھ پر انسانیت سوز تشدد کے بعد اس کی حیوانی خصلت کو قدرے تسکین حاصل ہو گئی تھی، شاید اسی لیے وہ میرے ساتھ سوالاً جواباً پر آمادہ بھی ہو گیا تھا۔ ورنہ تو اس نے مجھے بولنے تک سے بھی مانع رکھا ہوا تھا۔ میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ''مجھے میرے ملک سے اغوا کرنے والے وہ دو غیر ملکی کون تھے، جن سے، بہ قول تمہارے، مجھے چھڑا لیا گیا تھا؟'' میرے اس سوال پر کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری تھی۔

''وہ امریکی سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔ تمہیں یرغمال بنا کر امریکا لے جانے کے ایک خفیہ ٹاسک پر پاکستان آئے تھے اور تم بہ آسانی ان کے ہتھے بھی چڑھ گئے تھے۔''

میں اس انکشاف پر بے اختیار ایک گہری سانس لے

کر رہ گیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ ”ٹائیگر ٹیگ“ کے ہی ایجنٹ تھے، جن کے بارے میں مجھے آنسہ خالدہ پہلے ہی بتا چکی تھی۔ تاہم ایک ٹیڑھ باقی تھی، بولا۔ ”کمال ہے، تم لوگوں نے کیسے اتنی آسانی سے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا؟ کیا انہیں مار دیا تم نے؟“

”ہاں! ایک تو مارا گیا تھا، دوسرا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔“

”لیکن تمہارا ان لوگوں کے ساتھ کس مقام پر ٹکراؤ ہوا تھا؟ کیونکہ جب انہوں نے مجھے میرے ملک میں اغوا کرنے کے بعد بے ہوش کر ڈالا تھا تو میری آنکھ اس بوٹ میں کھلی تھی؟“

”اصل میں تم ہمارا شکار تھے، جبکہ گریٹ ماسٹر کو پہلے ہی سے اس کی اطلاع تھی کہ ہمارا شکار کون لوگ اچکنا چاہتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اپنے ”گریٹ ماسٹر“ کا کچھ زیادہ ہی غرور کسی نشے کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ آگے بولا۔ ”ماسٹر تو ان کے منصوبے کی ایک ایک کڑی سے واقف تھا، لیکن تم چونکہ اصل میں گریٹ ماسٹر کا شکار تھے اسی لیے ماسٹر نے ہمارے ذریعے تمہیں ان سے اچک لیا۔“

اس دوران ایک انڈین دوشیزہ ہاتھ میں کوئی پیالہ لیے میرے قریب آئی، اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

”یہ دوائی ہے، پی لو، آرام آتا رہے گا۔“ کوہارا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے اس انڈین دوشیزہ کی طرف دیکھا، وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی کاؤچ کے قریب آگئی، وہ پیالہ تھامے میرے بالکل قریب جھک آئی اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا، میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر پیالے میں دیکھا، ایک بدرنگ سا محلول اندر ہلکورے لے رہا تھا، میرا پہلے تو دل ہی نہیں کیا اسے پینے کو مگر خطرناک دشمن کی قید میں اس ”کرم نوازی“ کو ٹھکرانا خود کو مزید کمزور کرنے کے مترادف ہوتا، میں خود چاہتا تھا کہ میں جلد صحت یاب ہو کر اپنے دفاع کے لیے کوشش جاری رکھوں، سو میں نے دوائی کا پہلے ایک گھونٹ بھرا تو اس کا ذائقہ واقعی کسی کڑوی کسیلی دوائی کا سا ہی لگا، مگر میں آنکھیں بند کیے ساری دوائی چڑھا گیا، پیالہ منہ سے ہٹانے کے بعد بھی وہ بھارتی دوشیزہ مجھ پر جھکی رہی، شاید وہ آخر میں میری نظروں کا ”ملاپ“ چاہتی تھی۔ کیونکہ دوا ختم ہونے کے بعد جب غیر ارادی طور پر میری نظر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنی بائیں آنکھ کا خفیف اشارہ مجھے کیا اور فوراً سیدھی کھڑی ہو گئی۔ میرے اندر ایک جھماکا ہوا، اپنی آنکھ کا یہ اشارہ اس نے مسکراتے چہرے کے بجائے بہت سنجیدگی سے کیا تھا اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس اشارے کے پس پردہ کسی پسندیدگی یا عامیانہ پن کے بجائے کچھ اور ہی مقصد کارفرما تھا۔

وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ دوا پیتے ہی مجھے اپنے پورے بدن میں دو طرح کی تبدیلیوں کا احساس ہوا، ایک یہ کہ زخموں میں جو تھوڑا بہت جلن اور درد تھا وہ بالکل ہی جاتا رہا تھا، دوسرا یہ کہ میں اپنے اندر طاقت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا جی اٹھ کر بیٹھنے کو چاہا اور میں ذرا کسمسایا۔

”نہ...نہ... !اسی طرح لیٹے رہو۔“ کوہارا نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے سے منع کر دیا اور آگے بولا۔ ”ہاں! تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ہم نے کس طرح اپنا شکار سی آئی اے کے ان دو ٹاپ ایجنٹوں سے چھینا۔ یہ دونوں تمہیں پلاننگ کے مطابق اغوا کر کے بحری جہاز کے ذریعے کراچی سے مشرق وسطیٰ کے کسی علاقے کی طرف لے جانا چاہتے تھے اور ایسا انہوں نے کیا بھی، آگے کا امریکا کا سفر انہوں نے ورجن اٹلانٹک کے طیارے سے کرنا تھا، تمہیں مریض بنا کر لے جانا تھا، اس مقصد کے لیے انہوں نے تمہیں ایک ایسا انجکشن بھی لگا دیا تھا جس سے تم اعصابی طور پر لاغر ہو جاتے، سننے اور دیکھنے کے علاوہ تم حرکت کرنے اور بولنے سے اس وقت تک معذور رہتے جب تک کہ امریکا جے ایف کینیڈی نہ اتار لیے جاتے۔ تاہم بحری جہاز میں لے جاتے ہوئے تمہیں طویل بے ہوشی کا ایک ٹیکا لگا دیا گیا تھا۔

ادھر گریٹ ماسٹر کے منصوبے کے مطابق عریبئین سی میں ہم نے اس مسافر بردار جہاز میں خفیہ کمانڈو کارروائی کی، جس کے نتیجے میں سی آئی اے کا ایک ایجنٹ ہمارے ہاتھوں مارا گیا۔ دوسرا زخمی ہو کر سمندر میں کود کر اپنی جان بچا گیا۔ ہمارا مقصد پورا ہو چکا تھا، اور ہم تمہیں اپنی بوٹ میں ڈال کر بھارت کی طرف نکل آئے۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو میں اس کی زبانی یہ سب سن کر حیران بھی ہوا اور متفکر بھی کہ میں سے جی کوہارا کو محض ایک ملاح یا ان کا سردار قسم کی کوئی شے سمجھا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سے جی کوہارا بھی اسپیکٹرم کا ایک چلتا پرزہ ٹائپ کارندہ تھا اور لولووش کا مقامی (برمی) دستِ راست بھی...... ورنہ تو میں اس خوش فہمی میں تھا کہ مجھے ایک ذرا موقع بھی ملتا تو میں اسے بچھاڑ سکتا تھا، مگر اب یہ اتنا آسان نہیں لگتا تھا۔ مایوس تو میں اب بھی نہیں تھا اور نہ ہی میری سرشت میں یہ تھا کہ دشمن کی طاقت کا اندازہ ہوتے ہی

میں میدان چھوڑنے کی سوچتا، لیکن اب ناکوں چنے چبانے اور جوئے شیر لانے والی بات تھی۔

”کیا سوچنے لگے؟“ وہ مجھے سوچ میں غلطاں پا کر بولا۔ اس نے بڑے پُرغرور انداز میں اپنی بھویں اچکا رکھی تھیں۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسے پُرغرور آدمی کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے تو ناکامی کے چانسز کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں ظاہری طور پر توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے، پھر تو مجھے واقعی تمہارا اور تمہارے گریٹ ماسٹر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے مجھے سی آئی اے جیسی بدنامِ زمانہ اور دنیا کی خطرناک ایجنسی کے چنگل سے بچا لیا، ورنہ وہ امریکا لے جا کر جانے میرا کیا حشر کرتے۔“

”میرا نہیں، صرف گریٹ ماسٹر لولووش کا شکریہ ادا کرو۔“ سے جی کوہارا اسی پُرغرور مسکراہٹ سے بولا۔ آج اس خرانٹ مغز برمی بدمعاش نے مجھے سوالاً جواباً کا موقع دیا ہی تھا تو میں بھی اس سے کھل کر سوالات کرنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا، تاکہ دھیرے دھیرے میں اسے اپنے سیر حاصل مقصد کی طرف لا سکوں۔ لہٰذا سب سے پہلے تو میں نے اپنے ذہن میں مچلتے اس سوال کی بے چینی کو رفع کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی میری...... جہاں تک میری معلومات ہیں، تمہارے گریٹ ماسٹر لولووش کا فادر ان لاء باسکل ہولارڈ خود سی آئی اے کے اس خطرناک اسائٹ ونگ ٹائیگر ٹیگ کی سربراہی کر رہا ہے، اور وہ دو سی آئی اے ایجنٹ اسی کی ایما پر پاکستان مجھے اغوا کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے تو، پھر لولووش نے اپنے فادر ان لاء کے مفادات کے خلاف کیوں قدم اٹھایا؟ اس سے متصادم کیسے ہو گیا وہ؟ کیا اس طرح سسر اور داماد کے بیچ نفرت و عداوت کی دیوار کھڑی ہونے کا امکان مسترد کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ میں نے سنا ہے ان دونوں کے درمیان سسر داماد کے رشتے سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ زیادہ مضبوط ہے، اور باسکل ہولارڈ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی انجیلا کی لولووش سے شادی بھی اسی دیرینہ دوستی کا نتیجہ ہے۔“

”بہت برمحل سوال ہے تمہارا...... اور مجھے تمہاری گریٹ ماسٹر اور باسکل ہولارڈ کے بارے میں اس قدر معلومات پر حیرت بھی ہوئی ہے۔“ سے جی کوہارا نے یہ کہتے ہوئے بھومک کو ایک اشارہ کیا اور اپنی پیٹھ صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دی۔ بھومک حرکت میں آیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

”گریٹ ماسٹر نے صحیح کہا تھا تمہارے بارے میں...... کہ ہمیں تم پر ہاتھ ڈالنے کے بعد انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے، تم بہت خطرناک آدمی ہو اور ہوتے بھی کیوں ناں...... جس کے پیچھے دنیا کی تین بڑی بین الاقوامی سطح کی تنظیمیں بلیو ٹکسی، ٹائیگر ٹیگ (سی آئی اے)، اسپیکٹرم...... ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہوں وہ کوئی عام آدمی کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

”میں ایک عام انسان ہی تھا، مجھے خطرناک بنانے والے یہی لوگ ہیں۔“

”اور تم نے انہیں نیست و نابود کرنے کا پکا عزم کر رکھا ہے!“ سے جی کوہارا اس بار زہرناک لہجے میں بولا تو میں یک دم محتاط سا ہو گیا اور مکاری سے بولا۔

”یہ میرا دردِ سر نہیں، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے ان لوگوں سے تمام معاملات بہ خیر و خوبی طے پا جائیں اور میں اپنے ملک میں ایک عام امن پسند شہری کی طرح زندگی بسر کروں، اسی لیے تو میں جلد از جلد گریٹ ماسٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ذہین ہونے کے ساتھ مکار بھی ہو۔“ وہ بولا۔ میں خاموش رہا۔ اثنائے راہ بھومک ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا، اس میں وہسکی کی ایک بوتل اور دو پیگ رکھے ہوئے تھے۔ برف کی چھوٹی ڈلیوں کا ایک بھرا ہوا باؤل بھی تھا، اس کے اندر ادھ کٹے لیموں بھی تھے۔ وہ اس نے سامنے رکھی ایک درمیانے سائز کی گلاس ٹاپ میز پر رکھ دی اور واپس اپنی جگہ جا کر مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ کوہارا نے ایک خالی پیگ میں برف کی ڈلیاں ہاتھ سے اٹھا کر ڈالیں، پھر ان پر وہسکی انڈیلنے لگا۔ پیگ تیار کرنے کے بعد وہ پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک گھونٹ معدے میں منتقل کرنے کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ہو سکتا ہے تم بلیو ٹکسی اور سی آئی اے والوں کا کچھ بگاڑ لو اور کسی حد تک اسپیکٹرم کو بھی تھوڑا بہت نقصان پہنچا دو، مگر گریٹ ماسٹر لولووش کا تم ایک ذرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، اس لیے کہ تم کیا کوئی بھی نہیں جانتا، ماسٹر لولووش کی پشت پر کیسی عجیب اور پُراسرار طاقتیں کارفرما ہیں، وہ برمودا کے جزائر کا پروردہ ہے، ان جزیروں کے دیوتاؤں کی اسے بڑی طاقتیں حاصل ہیں، افریقہ کے گھنے جنگلات کے وچ

ڈاکٹرز اس کے آگے پانی بھرتے ہیں، جاننے والے اسے برموڈا کا شہزادہ بھی کہتے ہیں۔ ماسٹر لولووش کسی تنظیم یا آدمیوں کا محتاج نہیں، وہ اپنی ذات میں خود ایک تنظیم ہے...... ایک ناقابلِ تسخیر تنظیم......''

اس کی یاوہ گوئی میں دلچسپی لیے بغیر میں نے اسے اپنا سوال یاد دلایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر لولووش کا جو جی کرتا ہے وہ کر ڈالتا ہے، کسی کی ناراضی کی پروا کیے بغیر۔ وہ جب چاہے تمہیں کسی کے بھی حوالے کر دے۔ امریکا خود ماسٹر لولووش اور اسپیکٹرم کی بالادستی چاہتا ہے، چھوڑو یہ سب باتیں۔ اب میرے سوالوں کا جواب دو......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو اب مجھے محتاط ہونا پڑا، ساتھ ہی دل ہی دل میں، میں اس بھاڑے کے ٹٹو پر لعنت بھی بھیجتا جا رہا تھا جو خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت سے انکاری ایک دنیاوی کیڑے لولووش کو نجانے کن کن طاغوتی طاقتوں سے تشبیہ دینے پر تلا ہوا تھا۔ جبکہ میرا ایمان تھا کہ سچ اور حق ہر شیطانی اور باطل طاقت کو بالآخر نیست و نابود کر ڈالتا ہے۔

''تم کیا سمجھے ہوئے ہو کہ اب تم زندہ رہو گے؟''

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس نے میری جتنی لکھی ہوگی اتنی تو میں ضرور گزاروں گا۔''

''خطرناک، مکار ہونے کے ساتھ ساتھ تم شیخی خورے بھی ہو......'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ میں نے اس بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''وکرم اور سوشیلا کا کیا بنا...... تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ان کی تلاش میں بھی گئے تھے؟''

میری بات پر اس کے چہرے پر ایک تندی لہر کا شائبہ سا ابھرا اور پھر وہ اسی لہجے میں میری طرف گھور کر بولا۔ ''اپنی زبان کو اب تالا لگا دو...... سمجھے تم۔'' میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی اس مہم میں بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا ہوگا۔ لیکن میں نے دیکھا میرے اس آخری سوال نے اس کا موڈ بری طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے چیخ کر بھومک سے برمی زبان میں کچھ کہا اور بھومک جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا، میں ڈر سا گیا کہیں یہ بدبخت جلاد پھر مجھ پر تشدد کے کوہ گراں تو نہیں گرانے والا؟ مگر شکر رہا ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس نے ایک خوفناک نال والا پستول نکال لیا تھا۔ پھر اس نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

میری حالت اب وہی تھی، یعنی کمزوری اور دکھن۔ دوائی اور مرہم وغیرہ سے اگرچہ کافی افاقہ ہو گیا تھا لیکن جلنے سے جیسے یہ قیامت خیز کیفیات دوبارہ جاگ اٹھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کاؤچ سے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو میرا سارا وجود درد اور دکھن سے بُری طرح سنسنا اٹھا، میرے حلق سے بے اختیار کراہ آمیز چیخ سی خارج ہو گئی۔

''خیال رکھنا...... اب کی بار کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یہ کم بخت بھومک تمہیں دوبارہ رگید کر رکھ دے گا اور اس بار اس نے تم پر کوڑے برسا دیے تو تمہارے جسم پر ابھرے ہوئے آبلے، کوڑھ میں بدل جائیں گے، پھر تمہیں کہیں زندہ ہی سمندر میں نہ پھینک دیا جائے۔ کوڑھ کے مریض سے تو خونخوار مچھلیاں بھی دور بھاگ جاتی ہیں...... ہاہاہا......'' سے جی کوہارا نے تضحیک آمیز انداز میں یہ کہتے ہوئے ایک بدمست قہقہہ بھی لگا دیا اور میں اندر تک سلگ اٹھا۔

ابھی مجھے نجانے کتنے اور بے بسی و بے چارگی کے گھونٹ بھرنے تھے۔ سو یہ گھونٹ بھی بھر لیا اور بغیر کسی سہارے کے بہ مشکل کھڑا تو ہو گیا، مگر میرا سر چکرانے لگا تھا۔ اسی دوران میں نے اپنے جسم کا جائزہ بھی لیا تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میرا پورا جسم چھالوں اور آبلوں سے اٹا پڑا تھا، اپنی یہ حالت دیکھ کر میری وحشت جنوں خیزی کسی خوابیدہ آتش فشاں کے مانند بیدار ہونے لگی تھی اور میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کسی طرح بھومک سے پستول جھپٹ لوں اور پھر ان دونوں برمی شیطانوں پر گولیوں کی بارش کر دوں۔ لیکن میں خود کو ایک لاغر وجود سمجھے ہوئے تھا۔ میرے لیے تو ایک قدم بھی اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ ادھر جسم کو تھوڑی سی بھی حرکت دیتا اور سارے بدن کے چھالے اور آبلے چیخ اٹھتے۔ بڑی مشکلوں سے میں لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکلا اور باہر آ گیا۔

کھلی فضا میں آ کر میں نے ایک کیبن کی دیوار کے سہارے لگ کر چند گہرے گہرے سانس لیے اور پھر چار و ناچار آگے بڑھنے لگا۔

بھومک مجھے اسی طرف ہی چلنے کا اشارہ کیے جا رہا تھا، جدھر وہی منحوس تنگ اور تکونی شیپ کمرا تھا۔ میں بس اپنی قوتِ ارادی کے بل پر ہی چل رہا تھا، ورنہ تو ہر قدم پر ایسا ہی لگتا تھا کہ اب گرا کہ تب گرا...... بالآخر گرتے پڑتے میں بھومک کے آگے آگے، اسی طرح چلتے ہوئے دروازے تک پہنچا جو ادھ کھلا پڑا تھا، میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ بھومک نے اندر آنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور باہر ہی سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

میں اپنے بنک بیڈ پر جا پڑا اور یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے میلوں کی مسافتیں طے کرتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ایک بار پھر میرے وجود میں زخموں کی جلن اور دکھن اٹھنے لگی جس نے مجھے ہولے ہولے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر زخموں نے مجھے ویسے ہی پورا مفلوج سا کر رکھا تھا۔ مجھے اپنی ایسی بے بسی پر خود...... ہی رونا آ رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اس بات پر بھی افسوس ہونے لگا کہ قسمت نے مجھے گوردن کی صورت میں جو موقع دیا تھا، وہ شاید میں جلد بازی یا غیر محتاطی کے باعث گنوا بیٹھا تھا۔ کاش! میں انجن روم کا رخ...کرتا اور نہ ہی اس چوہے دان میں پھنستا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ وہ دبلی پتلی نازک اندام بھارتی دوشیزہ کا آنکھ مارنا مجھے یاد آیا تو دل و دماغ میں مایوسی کے سیاہ گھرتے بادل کچھ چھٹتے سے محسوس ہونے لگے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے یوں آنکھ مارنے میں کوئی رمز تھا، ایسا نہیں تھا کہ اس میں کسی قسم کی پسندیدگی تھی بلکہ آنکھ کا وہ رمزیہ اشاریہ کچھ اور ہی کہانی مجھے سناتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اس پر غور کرنے لگا، اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ کیا وہ مجھے کسی قسم کی تسلی دینا چاہتی تھی یا پھر کوئی مزید جارحانہ حرکت سے مجھے مانع کرنا اس کا مقصد تھا؟ کیوں؟ کیا وہ خود میرے لیے ایسا کوئی بندوبست کرنا چاہتی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں اگر سوچا جاتا تو اس میں ایک ایسی طوائف کا کیا مفاد پوشیدہ تھا جو خود بھاڑے پر خرید کر اس بوٹ میں لائی گئی ہو؟

بہرکیف میرے لیے کسی اچھے وقت کے انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بھومک کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دروازہ کھلا، میں نے بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے بہ دقت تمام دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ دروازے سے وہی بھارتی دوشیزہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔ پتا نہیں اس میں دوائی تھی یا کھانے پینے کا سامان، تاہم میں اسے اسی طرح پڑا دیکھتا رہا، وہ قریب آ گئی۔ میں نے اس سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ اس نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلایا، ساتھ ہی اپنی آنکھوں کو کمرے کی خالی فضا کا جائزہ لینے کے انداز میں گردش بھی دی، جیسے مجھے ایک خاموش اشارے سے کچھ یاد دلانا چاہ رہی ہو۔ تب ہی میں فوراً اس کا اشارہ بھانپ کر محتاط ہو گیا۔

میں واقعی ذرا دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ یہ کمرا بگڈ تھا اور اب تک کی ساری خرابیوں نے کم و بیش ادھر ہی سے سر اٹھایا تھا۔ بشام چھلگری کی بے رحمانہ موت، گوردن کے ساتھ میرے معاملے کی خرابی، جس میں، میں نے اوور کانفیڈنس اور جلد بازی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا اور اب میں پھر وہی غلطی کرنے والا تھا۔ حالانکہ میں بے حد محتاط رہ کر ہر کام سرانجام دینے کا عادی تھا، پھر پتا نہیں کیوں مجھ سے یہ فاش غلطیاں گویا سرزد ہی ہونے لگی تھیں۔

''شکر کرو کہ یہ لوگ درد دیتے ہیں تو دوا بھی کرتے ہیں۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' اس نے میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مترنم لہجے میں کہا تو اس کے بولنے کے نپے تلے انداز اور الفاظ نے مجھے بہت کچھ باور کرا دیا، لہٰذا میں نے بھی اس کا اسی انداز میں ساتھ دینا مناسب جانا اور بہ جبر و کراہ مسکرا کر بولا۔

''ٹھیک ہی کہتی ہو تم اے نازنین ماہ جبیں! پہلی بار ایسے مہربان دشمنوں سے پالا پڑا ہے۔''

اس نے مجھے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ ''ٹھیک جا رہے ہو۔'' پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے میرے بنک پر ایک جانب رکھتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اوپر والے بنک کو فولڈ کر کے دیوار سے لگایا اور آہنی ہک میں پھنسا دیا۔ اب میں اپنے بنک بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی دوران اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلیہ اور انگوٹھے کو مخصوص انداز میں پھیلا کر درمیان کی تین انگلیاں موڑیں اور ریسیور سا بنا کر کان اور منہ کی طرف لے جا کر اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ میں اس کا اشارہ بھانپ گیا۔ سمجھ گیا کہ وہ مجھے بار بار کیوں اس قسم کا اشارہ کر رہی تھی کہ میں غیر ارادی طور پر بھی یہ بات نہ بھولوں کہ کمرا ''بگڈ'' تھا۔

ایسا نپا تلا اشارہ کرنے والی یہ بھارتی دوشیزہ کسی صورت میں بھی طوائف نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ میرے دل نے اس کے بارے میں پہلی گواہی دی تھی، تو پھر یہ کون تھی؟ میں اندر سے بدک سا گیا تھا۔ تاہم میں نے اس کی طرف دیکھ کر خاموشی سے اپنے سر کو تفہیمی انداز کی جنبش دی تھی۔

''تم جب تک یہ بھوجن کر لو، میں تھوڑی دیر میں دوبارہ آؤں گی، تمہارے چھالوں پر مرہم لگانے۔ ٹھیک؟'' اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور میں نے ''شکریہ'' کہہ دیا۔ وہ واپس چلی گئی۔

اب شاید اسی نے یہاں آنا جانا کرنا تھا، کوہارا کے

بیشتر ملاح ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، ایک محتاط اندازے کے مطابق بھومک کو چھوڑ کر کوئی ایک آدھ ہی باقی بچا ہوگا، یہ میرے لیے ایک خوش آئند بات تھی اور بہتر بھی۔ مگر میں نے اس کا خمیازہ بھی تو بھگتا تھا۔

بہرکیف میں ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ پانی کی بوتل، سینڈوچز، ابلا ہوا انڈا، بھنی ہوئی مچھلی، ابلے ہوئے چاول اور ملک پیک کے علاوہ جوس پیک بھی تھا۔ کھانے کے قوت بخش لوازمات اس طرف اشارہ کرتے تھے کہ یہ لوگ مجھے بہت جلد "بھلا چنگا" دیکھنا چاہتے تھے اور یقیناً اس میں لولووش کی "ہدایات" کا ہی دخل ہوسکتا تھا، ورنہ کم از کم سے جی کوہارا جیسے جلاد ابنِ جلاد سے ایسی "خیر" کی توقع نہ تھی مجھے۔ کھانے کی اشتہاء انگیز خوشبو نے میری مری مری سی بھوک کو یکدم چمکا دیا تھا۔ کھانا پینا میرے لیے ضروری تھا، کھانے کے دوران میں اس دوشیزہ کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اس کو دوبارہ آنا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوا تو میں نے ٹرے کے دوسرے گوشے کا جائزہ لیا، وہاں بھانت بھانت کی مرہم اور دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ آگئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا، وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں اس کی طرف دیکھ کر جوابی مسکراہٹ پھینک کر رہ گیا۔ لیکن میں چونکا اس وقت جب اس نے اپنی مٹھی میں دبا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کاغذ مڑا تڑا تھا، میں اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

"مت بھولنا کہ تم خطرناک لوگوں کے بیچ میں ہو، اس لیے ہر طرح سے محتاط رہو، جلد بازی مت کرو۔ اس کمرے کی دیواروں کے کان ہیں، سرگوشی بھی کرو گے تو سن لی جائے گی۔ اشارہ سمجھ رہے ہو تم، ساری باتیں، چاہے کسی بھی زبان میں ہوں، سوپچر نگ روم کے آٹو ڈیوائس میں ٹرانسلیٹ ہورہی ہوتی ہیں۔ اچھا ہوا ان کی نفری قوت کم ہو گئی ہے، مگر یہ کچھ زیادہ پُرامید صورتِ حال نہیں ہے۔ کوئی اور چال چلنا پڑے گی، میں تمہاری مدد کروں گی۔ بس تھوڑا انتظار کرو، قلم رکھنے کی ممانعت ہے، یہ کاغذ بھی میں بڑی مشکلوں سے لکھ کر لائی ہوں۔ فقط پنسل ہی لاسکی ہوں۔"

"چندر کلا۔"

اختتام پر یہ یقیناً اسی کا نام تھا۔ میں نے وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنے بریزر میں ہاتھ ڈالا، میں دوسری طرف تکنے لگا، اس نے ایک پنسل کی نوک ہولے سے میرے بازو میں چبھوئی، میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور پنسل لے کر اسی کاغذ کے پیچھے فقط یہ لکھ کر کہ...... "تم کون ہو اور میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟" کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے وہ پڑھا اور پنسل میرے ہاتھ سے لے کر جلدی سے چند جملے گھسیٹے۔

"میں ایک عام سی طوائف ہوں، مگر ان ظالم اور وحشی برمیوں نے میرے تین ہم وطن خلاصیوں کو بڑی بے دردی سے ہلاک کرڈالا ہے، انہی میں اشوک بھی تھا، وہ بے چارہ مجھے چاہنے لگا تھا اور یہاں سے فرار کا پروگرام بنائے ہوئے تھا میرے ساتھ۔ میرے ساتھ جو دوسری طوائف ہے اس کے اور میرے ساتھ یہ لوگ بڑا بدترین سلوک کرتے ہیں، ہم دونوں تمہاری مدد سے بھاگنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ضروری یہ ہوگا کہ تمہارے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ ان لوگوں نے اپنی عیاشیوں کے لیے ہمیں خرید تو لیا ہے مگر ہمیں ان سے اپنی جان کو خطرہ ہونے لگا ہے، اب بس کرتی ہوں۔"

یہ سطریں مجھے پڑھانے کے بعد اس نے وہ کاغذ اور پنسل اپنے بریزر میں چھپا لیا اور اسی وقت باہر دروازے پر کھڑ بڑ کی آوازیں ابھریں۔ وہ بہ سرعت حرکت میں آئی اور مجھے مرہم لگانا شروع کردیا۔ میرے وجود میں ٹھنڈک اترنے لگی۔

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا، چندر کلا نے دروازے کی طرف دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ سمجھی اور اپنے کام میں لگی رہی، جبکہ میں نے ضرور قدرے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا، وہاں مجھے بھومک کا مکروہ چہرہ نظر آیا تھا، اس نے ایک کرخت سی بھانپتی ہوئی نظر ہم دونوں پر ڈالی اور پھر جیسے مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا اور دروازہ بھی بند کردیا۔ تب ہی چندر کلا نے اپنی ذرا گردن موڑ کر اس دروازے کی طرف دیکھا تھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے چلی گئی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ چندر کلا میری آزادی کے سلسلے میں کیا کرنے والی تھی؟ اب سے جی کوہارا کے آئندہ کے عزائم کیا تھے؟ بوٹ کا سفر ایک بار پھر کیوں روک دیا گیا تھا؟ نیز اب ہم بھارت کے کس شہر کے ساحل کے قریب تھے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اپنے بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے پورٹ ہول سے باہر دیکھنے کی سعی چاہی تھی، جہاں گھور تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں سو گیا۔

نیند سے دوبارہ جاگنے تک کا دورانیہ غالباً چند ہی گھنٹوں پر محیط رہا تھا، کیونکہ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو پورٹ ہول کے باہر ابھی تک مقدور بھر نظر آنے والے آسمان پر دمکتے تاروں تلے مجھے رات کا اندھیرا ہی پانی کے ساتھ ہلکورے لیتا دکھائی دیا تھا۔ کمرے کی لائٹ گل تھی، جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جس وقت نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں اس وقت لائٹ آن تھی، ہوسکتا ہے بعد میں بھومک مجھے دیکھنے آیا ہو اور اسی نے لائٹ گل کر دی ہو، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں جاگا کیونکر تھا؟ تب ہی اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی بھی تھا۔ اس پُراسرار احساس کے ہوتے ہی میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

"ک...... کون؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"شش...... شی......" کسی نے بہت قریب ہی شسکارتی ہوئی سرگوشی کی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ معاً ہی مجھے اپنے اوپر والے بنک بیڈ پر کسی کی ہلکی سی کھنکتی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں بھنک رہ گیا۔

"میں تمہارے اوپر والے بنک پر موجود ہوں، اپنے بولنے کی آواز ہلکی رکھنا۔"

اس شناسا سی آواز پر میں بدکا۔ یہ چندر کلا تھی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ "تم اس وقت...... یہاں کیا کررہی ہو؟"

"اتنی آواز ٹھیک ہے، اب کوئی چنتا نہیں، سب سو رہے ہیں، سوپچر نگ روم بھی خالی پڑا ہے۔ کوئی ہماری باتیں نہیں سن سکتا۔" وہ بولی۔

"مت بھولو کہ سوپچر نگ روم میں کوئی نہ بھی ہو تب بھی یہاں کی گفتگو وہاں ریکارڈ ہوتی رہتی ہے، جس کی ڈسک نکال کر کسی بھی وقت سنی جاسکتی ہے۔"

"مجھے تمہارا یہ محتاط انداز پسند آیا۔" وہ قدرے شوخی سے بولی۔ "مگر اب اس کی بھی چنتا نہ کرو، میں نے ٹائمر کی مدد سے دو گھنٹوں کے لیے سسٹم آف کردیا ہے۔"

اس کی باتیں میرے دل و دماغ میں ایک بار پھر اس کی جانب سے شکوک و شبہات پیدا کرنے لگی تھیں۔ ایسی احتیاط، ایسی نپی تلی اور گھاگ گفتگو کوئی عام لڑکی نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے فوراً خوش امیدی تلے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے پھر، یہاں سے ہمیں فرار ہو جانا چاہیے؟"

ڈرائیور

مال روڈ پر اپنا کام نمٹانے کے بعد میں واپس آیا تو اسے غائب پایا۔ میں گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں شدید گرمی میں آدھ گھنٹا کھڑا رہا، وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر پشیمانی کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ اس نے الٹا مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ "صاحب! آپ تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئے، میں کافی دیر آپ کا انتظار کرتا رہا، پھر میں ٹہلنے چلا گیا۔ صاحب، مال روڈ کی بہت تعریفیں سنی ہوئی تھیں دیکھی آج ہے!" پھر واپسی کے دوران گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہ ہوئی، میں نے اسے کہا کہ "بونٹ کھول کر چیک کرو کہ کیا خرابی ہے؟" وہ بولا۔ "صاحب، مجھے تو انجن کا کچھ پتا نہیں!"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں، آپ دھکا لگائیں۔" اس نے سیدھا سا حل بتایا...!

مجھے بہت غصہ آیا مگر میں نے ایک دفعہ پھر ضبط سے کام لیا، اس سے چابی پکڑی اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اسے دھکا لگانے کے لیے کہا گاڑی اسٹارٹ ہو گئی!

"تم تو کہتے تھے کہ تمہیں گاڑی اور ڈرائیونگ کا بہت تجربہ ہے مگر لگتا ہے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"صاحب! مجھ پر الزام نہ لگائیں۔" اس نے غصے سے کہا۔ "میں گاؤں میں بیس سال ٹریکٹر چلاتا رہا ہوں اور میں نے نمبردار کے بیٹے کی گاڑی بھی چلائی ہے۔"

اس دفعہ میں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا، وجہ صاف ظاہر ہے، اس کے پاس پستول کا لائسنس تھا!

حماقت

ڈاکٹر: مریض سے "تم اب میرے پاس آئے ہو، اس سے پہلے پتا نہیں کتنے ڈاکٹروں کو دکھایا ہوگا۔"

مریض: "جی نہیں، میں تو ایک کیمسٹ کے پاس گیا تھا۔"

ڈاکٹر: "کھلی جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا کہ علاج کر سکے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، خیر بتاؤ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟"

مریض: "جی اس احمق نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔"

کراچی سے ندا مہرین کی سوغات

''نہیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''اس کا ابھی کوئی فائدہ نہ ہوگا ہمیں۔ اس لیے کہ ہم ساحل سے دور ہیں، لیکن تم فرار کیوں ہونا چاہتے ہو؟ کیا تم ان لوگوں سے انتقام نہیں لینا چاہتے؟''

''میرا تو دل کرتا ہے اسی وقت ان سب کو جہنم واصل کرڈالوں۔'' میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''اس کا موقع میں تمہیں فراہم کرسکتی ہوں۔'' وہ ترنت بولی۔ ''مگر پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو گے۔''

''پوچھو، کیسا سوال؟''

''تمہیں ان لوگوں نے کیوں یرغمال بنا رکھا ہے؟''

''تم تو سے جی کوہارا کی قربتوں کی ساتھی رہی ہو، کیا ابھی تک اس سے یہ معلوم نہیں کرسکی ہو؟''

''اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تمہیں وہ اپنے باس کے حکم پر رنگون لے جانے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''یہ نہیں بتایا، کیوں؟''

''میں نے پوچھا تھا۔'' چندرکلا بولی۔ ''مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔''

''ہم......'' میں نے ہولے سے آواز نکالی اور پہلی بار اسے نام سے مخاطب کرکے مستفسر ہوا۔

''ایک بات تو بتاؤ چندرکلا...... ! تم ہو کون؟ اور کس کے ایما پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کررہی ہو؟ جانتی بھی ہو کہ یہ لوگ کس قدر سفاک اور درندہ صفت ہیں۔''

میرے سوال پر چندرکلا کو جیسے چند ثانیوں کے لیے ایک چپ سی لگ گئی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟'' اس نے الٹا سوال کرڈالا۔

''ایک خوب صورت لڑکی، مگر طوائف نہیں، ہاں کسی کی آلۂ کار ضرور سمجھتا ہوں، جو طوائف کے روپ میں یہاں لائی گئی ہے۔'' جو میرے دل میں اس کے لیے تھا وہ میں نے اس سے کہہ دیا۔

''بہت ذہین ہو تم! کیونکہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ بہتر بھی یہی ہوگا ہم ایک دوسرے کے سامنے کھل جائیں، تاکہ آگے کے معاملات بھی ہمارے درمیان بہ آسانی طے پاتے رہیں۔''

میری دوٹوک گفتگو نے اسے ''کھلنے'' پر آمادہ کرلیا تھا۔ لہٰذا اس کی تائید میں بولا۔ ''بہتر بھی یہی ہوگا کہ اگر ہم ایک دوسرے کے کام آسکیں۔''

میں اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ میرے بارے میں کتنی جان کاری رکھتی تھی؟

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، تمہارے اور لولووش کے بیچ معاملہ کوئی کاروباری نوعیت کا ہے'' بالآخر اس نے کہا۔ ''کسی جہاز راں کمپنی کے کچھ شیئرز تمہارے نام ہیں، وہ تم سے ہتھیانے کی کوشش کی جارہی ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے مسرت ہوئی کہ چندرکلا میرے بارے میں صرف اسی قدر ہی جانتی تھی اس سے زیادہ نہیں اور یہ بات میرے حق میں جاسکتی تھی جب تک کہ اس کی دورخی شخصیت میرے سامنے نہیں کھل جاتی۔ میں نے اس کی ''محدود'' جان کاری کی حد بندی کرتے ہوئے اس کی تائید میں کہا۔

''ہاں! یہاں معاملہ ایسا ہی کچھ ہے، وہ مجھے اپنے پاس یرغمال بنائے رکھنے کے دوران وہ شیئرز میرے ساتھیوں سے حاصل کرنے کے بعد ایک اسٹامپ پیپر پر میرے سائن کروانا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس اڈیسہ نامی جہاز راں کمپنی کا بلاشرکت غیرے مالک بن جائے۔''

''اوہ......'' چندرکلا کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا تھا کہ میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔ ''اب تم اپنے بارے میں بتادو ٹھیک ٹھیک اور یہ بھی کہ میں بدلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''میرا معاملہ تم سے زیادہ گمبھیر ہے۔'' وہ اسرار بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم سے پہلے جو قیدی یہاں موجود تھا، بوشام......''

''بشام......'' میں نے ہولے سے تصحیح کی۔

''ہاں! وہی، وہ میرے بہت کام کا آدمی تھا اور تمہارا ہم وطن بھی تھا، اسی لیے تمہارے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہوگئی تھی، مگر افسوس، اس نے طلسم نور ہیرے سے متعلق تم سے گفتگو کرکے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرڈالے تھے۔''

اس کی زبان سے طلسم نور ہیرے سے متعلق سن کر مجھے اپنے وجود میں سنسنی کا احساس ہوا تھا۔ بولا۔ ''کیا تم بھی اس کے حصول میں دلچسپی رکھتی ہو؟ اگر ایسا ہے تو میرا دوستانہ مشورہ تمہیں یہی ہوگا کہ اس سے باز آجاؤ...... یہ سرپھروں کا کام ہے۔'' میں نے دانستہ آخر میں ایسا کہا تھا، تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بھی اس ہیرے کے حصول میں دلچسپی رکھے ہوئے تھا اور کیوں نہ رکھتا، یہ نادر و نایاب ہیرا میرے وطن کی ملکیت تھا۔ اس کی خاطر بشام نے اپنی جان کی قربانی تک دے ڈالی تھی۔ لیکن میں چندرکلا کے سامنے ایسا کچھ

ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، جس سے وہ میری طرف سے بھی کھٹک جاتی، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے مجھ سے کیا غرض تھی؟

''یہ واقعی سرپھروں کا کام ہے۔'' وہ میری بات کی تائید میں بولی۔ ''لیکن شاید تم نہیں جانتے کہ اس پُراسرار ہیرے کے پس پردہ بعض لوگوں کے کس قدر خطرناک عزائم ہیں۔''

''مثلاً۔'' میں نے سوالیہ کہا، اندر سے کھٹک گیا تھا میں۔

''سنو گے تو تمہارے پیروں تلے زمین نکل جائے گی۔''

''میرے پاؤں یوں بھی زمین پر کب ہیں، تم اپنی بات جاری رکھو۔'' میں نے کہا۔

''مذاق اچھا کرلیتے ہو۔'' وہ کھنکتے لہجے میں بولی، میں مستفسرانہ انداز کی خاموشی اختیار کیے رہا پھر اس نے ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے مزید کہا۔

''اس ہیرے کے حصول میں دو گروہ کارفرما ہیں، ایک گروہ تو وہ ہے جس کا مطمح نظر دولت ہے، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو تین ممالک کے درمیان جنگ چاہتا ہے، جوع العرض کے جنون میں مبتلا کچھ جرنیل ان تینوں ممالک کو جنگ کی آگ میں جھونک کر سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ خطے کے مالک بن جائیں گے، مگر وہ نہیں جانتے ہیں کہ اس طرح تیسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے کا خطرہ ہے اور پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آسکتی ہے، جو دنیا کے خاتمے کا بھی سبب بن سکتی ہے کیونکہ یہ جنگ مکمل طور پر ایٹمی جنگ میں بدل سکتی ہے اور پھر کوئی بھی نہیں بچے گا۔''

اس کی بات پر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا مجھے اس تناظر میں بشام کی بات یاد آگئی تھی، اس نے بھی مجھے یہی کچھ بتایا تھا۔ جس کے مطابق امریکا، روس اور بھارت کے تین جرنیل خفیہ طور پر پاکستان، ایران اور چین کے درمیان ایک بڑے بھیانک مشترکہ منصوبے پر کام کررہے تھے، جسے ''ورلڈ بگ بینگ'' کا نام دیا گیا تھا۔ تاہم میں نے چندرکلا سے کہا۔

''تم ان دونوں گروہ میں سے کس سے تعلق رکھتی ہو؟ دولت کے حصول والے گروہ سے یا پھر...... دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنے والوں سے؟''

''دولت والے گروپ سے......'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''خوب! پھر تو تمہاری اور میری خوب نبھے گی۔'' میں نے بھی دانستہ خود کو لالچی اور لامحالہ طالع آزما گروہ سے منتھی کرلیا۔

''اور میرا خیال ہے ہم کم از کم اس دوسرے خطرناک جرنیلی گروہ سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔'' اس نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ ہم کسی کی جان لینے کے درپے نہیں ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہتی ہو تم۔'' میں نے تائیداً کہا، ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے یہ سوچنے میں محو تھا کہ سردست یہ میرے سلسلے میں کیا مدد کرسکتی ہے، یقیناً یہ اس مشن میں اکیلی نہیں ہوگی اس کے اور بھی ساتھی کہیں نہ کہیں موجود اور کسی موقع کی تاک میں ہوں گے۔ اس لیے ابھی میں خود کو اسی کا ہم خیال ثابت کرنے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی پوزیشن میں رکھے ہوئے تھا۔ چندرکلا کے ذریعے میں ایک پنتھ دو کاج بلکہ سہ کاج انجام دے سکتا تھا۔ میں نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔

''کیا اچھا ہوتا کہ مجھے بھی تم لوگ اپنے گروپ میں شامل کرلیتے، اس بیش قیمت ہیرے سے تو مجھے بھی دلچسپی ہے۔''

''تم شامل ہوچکے ہو۔'' وہ بولی۔ ''بس! ایک مدد چاہیے تمہاری۔''

''میری مدد؟'' میں نے دانستہ اپنے چونکتے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ ''میں بھلا تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟ میں خود تمہاری مدد کا محتاج ہوں۔''

''ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔'' وہ اس بار سنجیدگی سے بولی، لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ اب مطلب کی بات پر آرہی تھی۔ میں چپ رہا۔

''میں کوشش کے باوجود وہ ڈسک نہ تلاش سکی، جس میں تمہاری اور بشام کی اس ہیرے سے متعلق تفصیلی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی۔ لیکن میں نے کوہارا اور کسی حد تک بھومک کے منہ سے اس ہیرے کے متعلق اتنا ضرور اگلوا لیا کہ انہیں اس کا کسی حد تک کھوج مل چکا ہے، جو کسی سوشیلا نامی عورت کے قبضے میں ہے، جو انہی کی تنظیم اسپیکٹرم سے وابستہ تھی، اس نے تنظیم کی ایک فیلڈ آفیسر کی حیثیت سے وہ ہیرا تمہارے ملک پاکستان سے اڑایا اور اپنے تنظیمی ساتھی بشام کو چکما دے کر بھارت لوٹ آئی۔ اس کے ہمراہ وکرم نامی ایک ساتھی بھی تھا۔ لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی ساتھی نے کیا گل کھلایا ہے، بعد میں وہ ہیرے سمیت غائب ہوگئی

اور کافی عرصے تک اس کی ڈھنڈیا پڑی رہی، بالآخر ان لوگوں نے اس کا کھوج لگالیا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

یہ سب باتیں میرے علم میں پہلے ہی سے تھیں لیکن اس کی آخری بات میرے لیے چونکا دینے والی ثابت ہوئی، یہ انکشاف میرے لیے بے حد اہم اور تکلیف دہ بھی تھا کہ سوشیلا ان رذیلوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی، جس کا مطلب تھا ہیرے تک ان کی رسائی کافی حد تک ممکن ہونے والی تھی، میں بے چین سا ہوگیا مگر میں نے چندر کلا پر ایسا کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ ابھی تک میں اس کی طرف سے تشکیک کا شکار تھا۔ لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ سوشیلا کے سلسلے میں کوہارا کی مہم جوئی کہاں تک پہنچی تھی، جس کے لیے اس قسائی نے بدقسمت ہشام کی.... بیدردی سے جان لی تھی۔ میں نے بہ ظاہر غیر دلچسپی سے کہا۔

"سوشیلا کو انہوں نے کہاں قید رکھا ہوا ہے اور کیا اب تک یہ لوگ اس کے منہ سے ہیرے سے متعلق کچھ نہیں اگلوا سکے؟"

"وہ اوپر والے کیبن میں ہے اور ان دونوں وحشی برمیوں نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس کے گلے میں پٹا ڈال کر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان سے رو رو کر موت کی بھیک مانگتی ہے۔"

"اس نے کچھ بتایا نہیں، ہیرے کے بارے میں؟" میں نے دلچسپی لیے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

"اس نے جو بتایا ہے وہ خاصا سنسنی خیز ہے۔ کوہارا اس کے بیان کی تصدیق کرنے کے بعد ہی اسے ہلاک کرے گا تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو اب تک کیا بتایا ہے اس نے اور کوہارا وغیرہ نے کیا قدم اٹھایا؟" میرے سوالات جاری رہے۔

"اس نے کچھ بتایا تو ہے اور کل صبح بھومک اور ایک ساتھی اس کی تصدیق کے لیے جائیں گے۔" وہ بولی۔

"ہوں ں ں......" میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری لی۔ پھر بولا۔ "بھومک اور اس کے ساتھی کے جانے کے بعد کوہارا اس بوٹ میں اکیلا رہ جائے گا۔"

"بالکل۔" اس نے فوراً درمیان میں کہا۔ "میرا منصوبہ یہی ہے، میں اس کے ساتھ سوئی ہوتی ہوں، صبح تک اسے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دوں گی، تم اس کی مشکیں کس لینا، ہمارا کوہارا یا بھومک سے کوئی لینا دینا نہیں، ہم سوشیلا سے معاملات طے کرنے کی کوشش کریں گے اور بس!"

اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ چندر کلا کیا چاہتی تھی؟ اسے صرف ہیرے کی برآمدگی سے دلچسپی تھی اور میں جانتا تھا کہ ہیرا ہاتھ آتے ہی یہ مجھے بھی "ہاتھ" دکھا جائے گی۔

لیکن ابھی چونکہ میری اپنی "گوٹ" پھنسی ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ مجھے بھی اس کی مدد سے یہاں موجود اپنے بہت سے دشمنوں سے حساب چکانا تھا، جن میں سرفہرست کرنل سی جی بھجوانی تھا۔ نیز میں نے پاکستان اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فونک رابطہ بھی کرنا تھا۔ وہ سب میری وجہ سے کس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "چندر کلا......! میں ہر معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں، لیکن بس ایک بات کا خیال رہے کہ ہمارے تمہارے بیچ اعتماد کا یہ رشتہ نہ ٹوٹنے پائے، مفادات کو مشترکہ ہی رہنے دینا اور ایک دوسرے کی غرض و غایت کا بھی پاس رکھنا۔ پھر میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

میری بات سن کر وہ بنک سے نیچے اتر آئی، اس کے جواں اور نوخیز کلی جیسے بدن کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ تاریکی کے باعث میں اسے دیکھ تو نہیں پا رہا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنے چہرے پر کسی کے گرم گرم سانسوں کی مہک محسوس ہوئی، اس کے بعد کسی کی نرم و نازک انگلیوں کا لمس میرے چہرے سے ٹکرایا، اور چندر کلا کی جذبات سے بھرپور آواز آئی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں میرے پریتم! ہر معاملے میں، ہر جگہ، جہاں اور جیسے کہو، وہ مجھے قبول ہوگا۔"

اس کی اس حرکت نے مجھے بدکا کر رکھ دیا، میرا اسے پرے دھکا دینے کو جی تو چاہا تھا لیکن میں ایسا نہ کرسکا، تاہم اسے آہستگی کے ساتھ خود سے پرے کیا اور بہانے سے اپنے بنک پر سے نیچے اتر آیا۔

سریع الاثر ادویات اور مرہم وغیرہ نے میرے زخموں پر ہی نہیں بلکہ میری طبیعت پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا، میں اپنے اندر کھوئی ہوئی طاقت اور بشاشت کو لوٹتا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے صبح کا سورج اس بوٹ پر ہماری

حکمرانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے؟" اس کا جواب چندر کلا نے یوں دیا کہ میرا ایک ہاتھ تھام کر مجھے کوئی ٹھوس فولادی شے تھما دی، جس کا میں خوب اچھی طرح لمس آشنا تھا۔ یہ کوئی ہتھیار تھا۔ بھاری پستول۔ یہ تھمانے کے بعد وہ جواباً بولی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ سنبھالے رکھو۔ معاملہ بگڑتے دیکھو تو بے دریغ استعمال کرلینا۔ اگرچہ میں صبح تک کام مزید آسان کرلوں گی۔"

"میں اس سنہری موقع کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔" میں نے ہولے سے کہا۔ ہتھیار اور موقع محسوس کرتے ہی میرے اندر فطری جوش نے یک دم انگڑائی لی تھی۔

"چلتی ہوں میں، بہت جلد تم اور میں اس لانچ پر قیدیوں کی طرح نہیں، بلکہ آزاد ساتھیوں کی طرح ملیں گے۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

مجھے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اسی طرح گم صم سا کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے اور میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے پورٹ ہول کی طرف دیکھا، جہاں مقدور بھر نظر آنے والے سمندر پر کہیں دور پرے جھکے ہوئے چاند کی ضوفشانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ رات کا جانے کون سا پہر تھا، مجھے کچھ ٹھیک طرح اندازہ نہ تھا۔

بہرکیف پستول ہاتھ میں آتے ہی میں اپنے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میری پرانی جنگجو فطرت بیدار ہونے لگی تھی۔ غیظ و غضب کے وہ سارے طوفان جو میرے اندر کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح جوالا مکھی بن کر بھڑکنے کو تیار تھے، وہ اب مجھے ایکا ایکی ہی امڈنے کو بے چین سے محسوس ہونے لگے تھے۔

میں اپنے بنک بیڈ پر آکر نیم دراز سا ہوگیا۔ آزادی اور دشمنوں پر قابو پانے کی نوید و امید پاتے ہی میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہو چکی تھی۔ پستول میں نے بنک بیڈ کے سرہانے اس طرح چھپا کر رکھ دیا کہ ایک تو میں اسے جب چاہتا نکال سکتا اور کسی کو نظر بھی نہ آتا۔

میں صبح کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ چندر کلا کی باتیں کافی دیر تک میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہیں۔ اگر وہ میری مدد سے اس طلسم نور ہیرے کا حصول آسان بنانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی تو میں اسے اس کی ایک بڑی بھول قرار دیے ہوئے تھا۔ وہ بھی مجھے اپنی طرح کا ایک طالع آزما بنا کر اپنی کشتی میں سوار کرنا چاہتی تھی۔ میرے دل میں بھی لالچ کا بیج بو کر وہ سمجھ رہی تھی کہ میری مدد سے اپنا کام بہ آسانی نکال لے گی۔ یہ بعینہٖ وہی چال تھی جیسی میں گوردان سے چلنے والا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ "خزانے کی تلاش" کی اس قدیمی اور روایتی کہانی میں میرے علاوہ اور کتنے لوگ چندر کلا کی پشت پر تھے؟ اور اگر تھے بھی تو وہ کہاں تھے؟ چندر کلا اب تک ان کی مدد لینے سے کیوں قاصر تھی؟ یہ اور ایسے کئی سوالات میرے ذہن رسا میں گڈمڈ ہونے لگے تھے، لیکن میں نے بھی اپنے دل میں یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ ہیرے کے حصول کے سلسلے میں چندر کلا اور اس کے چھپے ہوئے ساتھیوں کو میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

وقت گزرتا رہا، میری آنکھیں پھر نیند سے بوجھل ہونے لگیں لیکن میں ابھی سونا نہیں چاہتا تھا، یوں بھی اس بوٹ میں ایک قیدی کی حیثیت سے میں سوتا ہی رہا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کسی کھٹکے پر کھلی تھی۔ کوئی دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے قدرے چونک کر نیم غنودگی کے عالم میں بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے ذرا گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

دروازے کے پار مجھے صبح کاذب کی روشنی محسوس ہوئی تھی اور اسی کے اجالے میں مجھے کسی کا بھاری بھرکم وجود بھی نظر آیا تھا۔ وہ متحرک ہوا، اور کمرے میں چٹ کی ہلکی سی آواز ابھری، کمرا روشن ہوگیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسی طرح پڑا رہا۔ آنے والا بھومک تھا، اس بدذات کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔

اگرچہ مجھے اس کے نازل ہونے کی پوری امید تھی، حالانکہ چندر کلا نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی سے جی کوہارا کی ہدایت کے مطابق وہ ہیرے کی کھوج کے سلسلے میں کہیں روانہ ہونے والا تھا۔ تاہم یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بوٹ سے روانہ ہونے سے قبل میرے کمرے کا رخ کرسکتا تھا اور وہی ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا بھومک کو اس کی موت یہاں کھینچ لائی تھی، کیونکہ چندر کلا نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اگر تو بھومک اپنے مشن پر جانے سے پہلے میرے کمرے کا رخ کرتا ہے اور اپنی تسلی اور میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر خاموشی سے پلٹ جاتا ہے تو اسے جانے دیا جائے، بہ صورت دیگر وہ مجھے دوبارہ رسن بستہ یا اسی طرح کی کوئی

اور حرکت، بہ شمول مجھے بے بس کرنے کی نیت رکھتا ہو تو میں بے دریغ اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ یہ تو خیر چندر کلا کی ہدایت تھی اور میں خود بھی ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن بھومک کی آمد کا تو میں خود بھی بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اب چاہے وہ مجھ سے کوئی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر نہ بھی لوٹتا، بہ مجھے اس خبیث جلاد صفت کو چھوڑنا نہیں تھا۔

بھومک کو اپنے کمرے میں دراندازہوتے دیکھ کر ہی میری رگوں میں خون، مثلِ لاوا کی طرح کھولنے لگا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ بدبخت مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگانے ہی آیا تھا، شاید یوٹ سے روانگی سے پہلے وہ مجھے پوری طرح محبوس رکھنے کا ارداہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے بھی اندر ہی اندر دانت بھینچ لیے تھے۔ اس مردود کو دیکھتے ہی مجھ پر جنون طاری ہونے لگا تھا، اور میں اس کی گردن دبوچنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

وہ پہلے تو دروازے پر کھڑا بہ غور میری طرف گھور کے دیکھتا رہا، اس کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے بنک کے قریب آکر ذرا فاصلے سے کھڑا ہو گیا، اس کے ایک ہاتھ میں زنجیر نظر آرہی تھی اور دوسرے میں پستول۔ آج پہلی بار میں اس خبیث کے ہاتھ میں پستول دیکھ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہوگی کہ میں کمرے میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا، اس کا کمرے میں داخل ہونے کا انداز بھی اسی طرح محتاط رو تھا، جیسے وہ کسی شیر کے پنجرے میں داخل ہوا ہو۔

''اسی طرح لیٹے لیٹے کوئی اور حرکت کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھ راڈ کے اندر سے گھما کر آگے بڑھا دو۔'' معاً اس کی کرخت اور تحکمانہ سی آواز ابھری۔ وہ بدبخت پھر سے میرے دونوں ہاتھوں کو بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے باندھنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب پھر وہی جاں گسل بے بسی تھی، میں اپنے سینے میں اس جلاد بھومک کے لیے نفرت و غیظ کے ہزار طوفان چھپائے اس کی طرف قہر بار نظروں سے گھورے جا رہا تھا، اور تب ہی اس نے شاید میری آنکھوں سے بہت کچھ محسوس کر لیا تھا، کیونکہ اسی وقت اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میرے سر کی طرف کر لیا تھا، جبکہ میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ راڈ سے گھما کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اب زنجیر لگانے کے لیے اسے پستول والے ہاتھ کو بھی بروئے کار لانا پڑا۔ زنجیر کے فولادی کڑے میرے ہاتھوں سے گزارنے کے لیے، اسے بھی میرے ذرا اور قریب آنا پڑا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر ٹھاٹھیں مارتا جوش کا ایک سمندر سا اپنے مدوجزر کے ساتھ اچھلا اور میرے دونوں آگے بڑھے ہوئے آہنی ہاتھوں کے شکنجے میں بھومک کی موٹی گردن سما گئی اور ایک بپھری ہوئی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میں نے اس کا سر پوری قوت سے اسی آہنی راڈ کے ساتھ بڑے زور سے ٹکرا دیا۔ اس کی پیشانی فولادی راڈ پر لگی تھی۔

اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ خارج ہوئی، میں نے دوسری بار بھی یہی عمل دہرایا، اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر چکا تھا۔ پیشانی پھٹ گئی تھی، مگر وہ سخت جان ثابت ہوا، اس نے سنبھلتے ہی میرے چہرے پر اپنے ہتھوڑے جیسے گھونسے کا وار کیا جو میں اپنی ناک بچاتے ہوئے، دائیں گال پر سہہ گیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں بنک بیڈ سے اتر آیا، اتنے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ فرش پر ایک طرف گرے پستول اٹھانے کے لیے جھکا، میں تب تک اس کے سر پہ سوار ہو چکا تھا، میری ٹانگ حرکت میں آئی جو اس کی پشت پر لگی، وہ الٹ کر دیوار سے سر کے بل جا ٹکرایا۔ ایک بار پھر اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی خارج ہو گئی، وہ وحشی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا پلٹا، اس کا مکروہ چہرہ خون میں تر تھا، اور مسخ ہو کر مزید کریہہ صورت بن چکا تھا۔ وہ زخمی بھینسے کی طرح مجھ پر جھپٹا، میں بھی پرے نہیں ہٹا اور باقاعدہ اس کے ساتھ زور آزمائی پر اتر آیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔

میری چشم تصور میں بار بار وہ منظر رقص کرنے لگا جب، یہ مردود مجھے خاردار کوڑے برسا رہا تھا اور میرے کھلے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا، اس کے جسم میں واقعی کسی افریقی بھینسے جیسی طاقت تھی، مگر جوشِ جنوں سے میرا بھی کم برا حال نہ تھا، یہی شے میری طاقت کو سوا کیے ہوئے تھی، میں نے اسے گھما کر پشت کے بل زور سے دیوار پر مارا اور ساتھ ہی اپنی داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی، وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ مگر فوراً ہی برداشت کرتے ہوئے اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر بھی رسید کر ڈالی، یہ ضرب میرے لیے اچانک تھی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا مگر خود کو گرنے نہیں دیا، وہ مجھے گرتا دیکھ کر بھیڑیے جیسی غراہٹ حلق سے خارج کرتا ہوا لپکا، تو میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا، وہ گھوم سا گیا، میں پھر نہیں رکا اور اس پر لاتوں مکوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی، وہ

نڈھال ہو کر گر پڑا، میں نے اسے دبوچ کر بنک بیڈ پر ڈال دیا، اس کے بعد زمین پر گری زنجیر اٹھا کر اس کے دونوں ہاتھ بنک کے فولادی راڈ کے ساتھ باندھ دیے۔

میں چند ثانیے کھڑا ہانپتا رہا، اس کے بعد اپنا اور اس کا پستول سنبھال لیا۔ میرا اوپری بدن ابھی تک برہنہ تھا، نیچے ٹائٹ پینٹ تھی، ایسے میں، میرا کسرتی جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ذرا دیر تک اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد میں دروازے کی طرف پلٹا ہی تھا کہ اچانک وہاں سے کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹکا۔

چندر کلا کو وہاں دیکھ کر میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ وہ ہنوز مختصر لباس میں تھی، اور اس دلنشیں آنکھوں میں حیرت تھی، وہ اندر آگئی تھی اور کبھی بنک بیڈ پر کراہتے ہوئے نڈھال پڑے بھومک کو دیکھتی تو کبھی میرے چہرے کو تکنے لگتی۔

''تم نے اپنا کام ختم کر لیا؟'' میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور بولی۔ ''یہ خبیث کب یہاں آیا تھا؟''

''اس خبیث کو چھوڑو اور مجھے سوئچ نگ روم کی طرف لے چلو، جلدی .... مجھے اپنے ساتھیوں سے ضروری بات کرنی ہیں۔''

''پہلے اس مردود کو ٹھکانے لگانا ہوگا، وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا ہے، جاگ گیا تو مصیبت بن جائے گا۔'' وہ بولی۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور آگے بڑھا، وہ میرے شانہ بشانہ کمرے سے باہر آگئی۔

باہر آکر میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ چندر کلا میرے آگے چل رہی تھی، ہم اس تنگ سی راہداری سے ہوتے ہوئے دنبالے کی حدود سے نکل کر عرشے اور کیبن کی طرف آگئے۔

کھلی سمندری فضا بہت صاف اور شفاف معلوم ہو رہی تھی۔ کھلے نیلے آسمان پر سفید لمبی چونچوں والے آبی پرندے اڑتے پھر رہے تھے۔ حدِ نگاہ پھیلے بیکراں سمندر کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

چندر کلا مجھے لے کر ایک کیبن میں داخل ہوئی، جس کا دروازہ پہلے ہی سے ادھ کھلا ہوا تھا۔ یہ ایک مکمل طرح سے رہائشی اور آرام دہ کیبن تھا۔ ایک بڑے سے کاؤچ پر مجھے سے جی کوہارا کا گینڈے جیسا وجود کسی ڈھیر کی طرح پڑا نظر آیا۔ وہ بے سدھ تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں، دونوں ... ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے، ٹانگوں کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔

''ان کا اس وقت اور کوئی ساتھی یوٹ میں موجود ہے؟'' میں نے ایک نظر میں جائزہ لینے کے بعد چندر کلا سے پوچھا۔

''ایک ساتھی تھا......'' وہ جواباً بولی۔ ''وہ شاید کوئی ٹیکنیکل فالٹ درست کرنے کے لیے نیچے انجن روم میں گیا ہوا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس یوٹ میں تین دشمنوں کے علاوہ ہم دو ہیں اور...... چھٹا قیدی؟ ساتواں مسافر تمہاری ساتھی طوائف؟'' میں نے اس سے تصحیح چاہنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں!'' چندر کلا نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''اور ان تینوں دشمنوں میں سے دو بڑے دشمن تقریباً زیر ہو چکے ہیں۔ رہی وہ طوائف، تو وہ میری ساتھی نہیں تھی، میں نے اسے ملکِ عدم پہنچا دیا ہے اور اب میرا خیال ہے کوہارا اور بھومک کو بھی ختم کر کے ان کی لاشیں سمندر برد کر دیتے ہیں۔''

اس کی بات سُن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے کس قدر سفاکی سے مجھے اپنی ساتھی طوائف کو قتل کرنے کا ذکر کیا تھا، جس نے مجھے اس کی طرف سے مزید محتاط رہنے کا احساس دلایا تھا، ساتھ ہی میرے اس خدشے کو بھی تقویت ملتی تھی کہ چندر کلا طوائف کے بھیس میں کچھ اور ہی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ اس کی پشت پر کوئی بڑا ''ریکٹ'' بھی ہوتا لیکن کوہارا اور بھومک کو ہلاک کرنے پر مجھے اس کی بات سے اختلاف تھا، میں ابھی کوہارا اور بھومک کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم کوہارا کو تو بالکل بھی نہیں، کیوں؟ یہ میں چندر کلا کو نہیں بتا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بدقسمت ساتھی طوائف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے پر دانستہ کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے کہا۔

''ان دونوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ پہلے اس گینڈے کو قابو کر لیں، تم کوئی مضبوط سی رسی یا زنجیر کا بندوبست کرو، اس سے پہلے کہ اسے ہوش آجائے۔'' میری بات پر چندر کلا نے اثبات میں ... سر ہلایا اور رسی وغیرہ ڈھونڈنے چلی گئی۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر بے سدھ پڑے کوہارا کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا، انسان اپنی طاقت کے غرور میں کس قدر اندھا [illegible] ہو جاتا ہے۔ اب ایک عورت کے ہاتھوں

زیر ہوکر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔
کوہارا کے سان وگمان میں بھی یہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنی عیاشیوں کے لیے جس طوائف کو رکھے ہوئے تھا، نہیں جانتا تھا کہ اسے ''طوائف'' سمجھنے کی اس نے بڑی فاش غلطی کی ہے، حالانکہ چندر کلا پوری طرح سے میری مدد میں شامل تھی بلکہ ایک طرح سے اس منحوس بوٹ میں میرے لیے نجات دہندہ بھی ثابت ہوئی تھی، مگر باوصف اس کے میں اس کی طرف سے بھی محتاط تھا، کیونکہ میں ابھی تک اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا، ممکن تھا وہ مجھے استعمال کر رہی ہو، اس میں اس کا کوئی مفاد ہو، اور ایسا تھا بھی، اس خدشے کا بھی مجھے احتمال تھا کہ اپنی غرض نکل جانے کے بعد وہ مجھے بھی ''ہاتھ'' دکھا سکتی تھی۔
تھوڑی دیر بعد وہ ایک مضبوط سی رسی لے آئی، ہم نے مل کر کوہارا کی مشکیں کس ڈالیں۔ اس سے فارغ ہوکر میں نے تیسرے برمی ساتھی کی تلاش میں انجن روم کا رخ کیا اور چندر کلا کو بھی اپنے ساتھ لیا۔
میں اب اس کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا، نیز میں ضرورت پڑنے پہ اس پر حکم بھی چلا سکتا تھا۔ ہم دونوں انجن روم میں آگئے، کوہارا کے تیسرے برمی ساتھی کو میں نے اور چندر کلا نے بہت تلاش کیا، مگر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے حیرت آمیز تشویش نے آن لیا۔ وہ کدھر اچانک غائب ہوگیا تھا؟ انجن روم سے باہر بھی بوٹ کے ہر حصے میں، ہم نے اسے تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔
''کہیں تم نے تو اسے بھی......'' میں نے چندر کلا سے تشکیک بھری نظروں سے کہنا چاہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
''اسے اگر میں ہلاک کرتی تو تم سے کیوں چھپاتی، لیکن مجھے لگتا ہے وہ خطرہ محسوس کر کے سمندر میں چھلانگ لگا کے کہیں فرار ہو چکا ہوگا۔''
اس کی بات مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا۔
''ساحل یہاں سے کتنی دوری پر ہے؟''
''کچھ زیادہ نہیں، چند ناٹیکل میل کے فاصلے پر ہو گا۔'' اس نے جواب دیا۔
''کون سا ساحل لگتا ہے؟ میرا مطلب ہے بھارت کے کس علاقے کا؟''
''بالاسور......''
میں چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں اسے لیے سوپچر نگ روم کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں نے ایک نظر اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ بھی ایک کیبن نما کمرا تھا۔ ایک جانب دو بنک بیڈ نظر آتے تھے، دوسرے کونے میں ایک چھوٹا سا پینل نصب تھا۔ اس کے ساتھ ایک اسکرین بھی تھی، جبکہ پینل کے قریب ایک تقریباً سترہ انچ کا سی سی ٹی وی، ایل سی ڈی مانیٹر بھی رکھا تھا، یہ فور چینل اسکواڈ تھا اور اس میں اس وقت بیک وقت چار مناظر ڈسپلے ہو رہے تھے، جو اسی بوٹ کے مختلف گوشوں کا منظر دکھا رہے تھے، ہم اسی طرف ہی بڑھے تھے کہ مجھ سے پہلے ہی چندر کلا نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔
''پہلے مجھے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے دو۔'' میں نے اس سے کہا۔
''میں پہلے اس کی فریکوئنسی بدل دوں، تاکہ ان کے ساتھی لوکیشن ٹریس کرتے ہوئے ان کی مدد کو یہاں نہ پہنچ سکیں اور نہ ہی ہمیں تلاش سکیں۔'' اس نے بدستور پینل پر اس کے جلتے بجھتے بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں چپ رہا۔
تھوڑی دیر بعد وہ ایک گہری سانس خارج کر کے سیدھی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''یہ اب ریڈی ہے۔ یہ بیک وقت وائرلیس اینڈ ٹیلی فونک سیٹنگ پر ہے۔''
''گڈ۔'' میں نے اس کی توصیف ضروری سمجھی، مگر اندر سے اس کے بارے میں میری کھٹک مسلسل تقویت پکڑ رہی تھی کہ چندر کلا کوئی چلتا پرزہ تھی اور مجھے اس سے حد درجہ محتاط رہنے کی بھی ضرورت تھی۔
چندر کلا نے ایک ہیڈ فون مجھے تھما دیا، میں نے ''تھینکس'' کہا۔ یہ لگانے کے بعد میں دھڑکتے دل سے بیگم ولا کا نمبر ملانے لگا۔ ذرا دیر تک لاسلکی لہروں کی چچر مچر سنائی دیتی رہی، پھر ٹون کی آواز آنے لگی، کچھ لمحے بعد ہی دوسری جانب سے ایک شناسا نسوانی آواز ابھری، یہ زہرہ بانو کی آواز تھی اور شاید بلیوتسی کے کرنل سی جی بھجوانی کے رابطہ کرنے کے بعد سے ہی وہ فون کا کارڈلیس اپنے قریب ہی رکھے ہوئے تھی۔ اس کی آواز سن کر میں فوراً بولا۔
''ہیلو، زہرہ! یہ میں بول رہا ہوں، شہزی!''
میری آواز سنتے ہی وہ یک بیک لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔
''شش...... شہزی! ی ی...... یہ...... واقعی...... تت...... تم ہو؟ تت...... ٹھیک تو ہو ناں......؟ کک کہاں ہو؟ کیسے ہو؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ بے چینی اور تشویش کا عنصر غالب تھا۔

''ہاں! ہاں! یہ میں ہی ہوں زہرہ! اور میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن خدا کے لیے میری بات ذرا دھیان اور پورے سکون سے سنو۔''

''میں سُن رہی ہوں۔'' وہ یکدم بولی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ذرا پُرسکون کیا پھر بولا۔

''زہرہ! پہلے تم بتاؤ! کرنل سی جی کے رابطے کے بعد تم لوگوں نے اب تک کون سا قدم اٹھایا ہے؟''

میں اپنی طرف سے کوئی بات کرنے سے پہلے یہ تسلی کرلینا چاہتا تھا کہ وہاں کی کیا صورتِ حال تھی اب تک کی؟

''ابھی تک تو کچھ نہیں، ہاں میجر باجوہ صاحب سے اس سلسلے میں ضرور ملنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، لیکن تمہارے دوستوں اول خیر اور شکیلہ کو اس پر سخت اعتراض تھا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''وہ دونوں تمہاری رہائی یا بازیابی کے سلسلے میں اپنے طور پر کچھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''وہ دونوں میجر باجوہ صاحب سے مدد لینے پر کیوں معترض ہیں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تھا۔ وہ جواباً بولی۔

''ان کا خیال ہے کہ اس طرح تمہاری رہائی کا معاملہ طول پکڑ جائے گا اور کچھ گڑبڑ ہونے کا بھی امکان ہے، ہاں البتہ کبیل دادا کا اس بارے میں ہم سب سے خیال مختلف تھا اور حیرت کی بات ہے شہزی کہ کبیل دادا کی بات درست ثابت ہوئی جس کی سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ تم آج مجھ سے باتیں کررہے ہو۔''

''اچھا!'' اس کی آخری بات پر مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔ ''اس کا کیا خیال تھا اس بارے میں؟''

''وہ کہتا تھا کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں، شہزی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عام آدمی ہے، وہ خود بھی ایک انتہائی تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کے حالات کیا ہیں، اس کا وہی اچھی طرح ادراک رکھتا ہوگا، اسی لیے فی الحال خاموشی اختیار کی جائے۔ جبکہ مجھ سمیت اول خیر اور شکیلہ کوئی بھی اس کی اس بات سے متفق نہ تھا، مگر آج......''

''کبیل دادا کا خیال بالکل درست تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''وہ ایک گرگ باراں دیدہ، دور اندیش اور ذہین آدمی ہے۔ منہ کا تلخ ضرور ہے مگر بات سچی اور کھری کرتا ہے۔ اب سنو میری بات غور سے۔'' میں اتنا کہہ کر ذرا تھما، دوسری جانب سے زہرہ ہمہ تن گوش بر آواز رہی تو میں نے آگے کہنا شروع کیا۔

''تم میں سے کسی کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی...... ہاں! مجھے جس ساتھی کی بھی ضرورت پڑی تو میں خود ہی اسے بلالوں گا۔ میں سمجھتا ہوں قدرت نے مجھے آگے بڑھنے کا خود ہی موقع فراہم کردیا ہے۔ میں اس وقت آزاد ہوں، خیریت سے ہوں۔ آپ لوگ میجر باجوہ سمیت کسی بھی ذمے دار افسر سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کریں گے جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں......''

''لل...... لیکن، شہزی......!''

''بات مت کاٹو میری اور صرف سنتی جاؤ، مجھے اپنے دشمنوں پر کاری وار لگانے کا ایک موقع ملا ہے، اس طرح ممکن ہے میں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرسکوں۔ میری فکر مت کرو، مجھے جیسے جیسے موقع ملتا رہے گا، میں تم لوگوں سے رابطہ کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دیتا رہوں گا۔''

''پلیز، شہزی! اپنے کسی ساتھی کو تو بلالو، تم ہو کہاں اور کس ملک میں؟'' زہرہ متفکر لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

''ضرور بلاؤں گا، اس سلسلے میں بعد میں بات کرتے ہیں، ابھی تم سب کو میری خیریت کے سلسلے میں تسلی دے دو، میں جلد دوبارہ رابطہ کروں گا، اللہ حافظ!'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں جب ساتھ کھڑی چندر کلا کی طرف متوجہ ہوا تو چونک پڑا۔

وہ بڑے غور اور عجیب سی نگاہوں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے میں محو تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک دم ہی کسی گہری سوچ کا شکار ہوگئی ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں اپنے بہی خواہوں سے رابطے کے جوش اور روا روی میں کچھ ایسے الفاظ بھی اپنے منہ سے نکال بیٹھا تھا جو مجھے...... کم ازکم چندر کلا کے سامنے ادا نہیں کرنا چاہیے تھے، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میجر باجوہ، بلیو ٹلسی اور کرنل سی جی بھجوانی جیسے الفاظ اور چند دوسرے الفاظ چندر کلا کو میری طرف...... سے حیرت میں بھی مبتلا کرگئے تھے اور کھٹک کا بھی باعث بن سکتے تھے۔

''تم کیا پاکستانی جاسوس ہو؟'' بالآخر اس نے وہی سوال داغ ڈالا جس کی مجھے اس سے توقع تھی۔ بات بنانے کی کوشش میں قدرے ہنستے ہوئے میں نے کہا۔

''نہیں، میں تو ایک عام سا کاروباری آدمی ہوں، ہاں! پاکستان میں میرے تعلقات بعض اعلیٰ افسران سے

بھی رہ چکے ہیں اسی لیے تو میں نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں کسی ایسے افسر سے مدد نہ لیں، جس سے میرے عالمی گینگسٹر لولووش کے ساتھ تعلقات ظاہر ہوں۔''

''مگر...... لولووش تو تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟''

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''دشمن تو وہ میرا اب ہوا ہے، پہلے تو دوست تھا، کاروباری رابطوں کے درمیان ہی مجھے اس کے منشیات اور اسمگلنگ کے دھندوں کا علم ہوا تو میں اس سے کنارہ کش ہوگیا، جس کی سزا آج میں اس کی دشمنی کی صورت میں بھگت رہا ہوں۔''

''اور یہ بلیو ٹلسی اور سی جی بھجوانی کیا بلا ہیں؟''

''یہ واقعی بلا ہیں۔'' میں بغیر جھجکے اس کے سوالات کے جواب دیے جارہا تھا۔ ''یہ بھارتی خفیہ ایجنسی ہے، اور لولووش نے انہیں میرے پیچھے لگا رکھا ہے، لیکن مجھے حیرت ہے، تم ان سے کیسے لاعلم ہو؟ جبکہ تم تو کوہارا کی خلوتوں کی ساتھی رہی ہو، پھر ایک دو روز پہلے ہی مجھے ان کے حوالے بھی کیا گیا تھا اور......''

''چھوڑو اب یہ فضول باتیں۔'' اس نے بیزاری دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اوپر جا کر سوشیلا کی خبر لینی چاہیے۔''

''چلو۔'' میں نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی اور میں اس کے عقب میں چل پڑا۔

ایک مختصری اسٹیل راڈ راسٹیئر چڑھنے کے بعد ہم ایک اور چھوٹے سے کیبن میں آگئے۔ چندر کلا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی اور میں بھی اس کے عقب میں اندر داخل ہوگیا۔

سامنے ہی میں نے جو شرمناک منظر دیکھا وہ انسانیت سوز اور بربریت کا منہ بولتا ثبوت نظر آیا تھا۔ کیبن میں صرف ایک ہی بنک بیڈ تھا، باقی ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ مختصر سے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر آڑے ترچھے انداز میں ایک جوان عورت اس طرح بے سدھ سی پڑی تھی کہ اس کے جسم پر لباس نام کی ایک دھجی تک نہ تھی۔ بلاشبہ وہ حسن کا شاہکار ہی تھی، گورا رنگ، مناسب قد اور دری پر اس کے بکھرے ہوئے گھنے ریشمی بالوں کو دیکھ کر بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے فرانس کی کسی فحاش آرٹسٹ کا نمونہ ہو۔ لیکن اس وقت وہ جیتی جاگتی تصویر کی صورت میں نمونۂ عبرت ہی نظر آرہی تھی۔

''پہلے اس کی ستر پوشی کا بندوبست کرو، پھر اس سے کچھ بات کرتے ہیں۔''

چندر کلا نے اپنے جسم پر لپٹی چادر کھول کر عورت کے اوپر ڈال دی۔ اس دوران شاید کھڑکے وغیرہ سے سوشیلا کسمسائی اور کیبن میں کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ یک دم ہسٹریائی انداز میں چلاتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''نن...... نہیں...... نہیں...... مم...... میرے قریب مت آؤ...... بھگوان کا واسطہ ہے تمہیں، مجھے مار ڈالو...... لل...... لیکن یہ ظلم مت کرو میرے ساتھ......''

''خاموش رہو......'' چندر کلا نے اسے جھڑکنے کے انداز میں کہا تو وہ ایک دم خاموش سی ہو کر باری باری متوحش نگاہوں سے ہمارے چہرے دیکھنے لگی۔

''تم سوشیلا ہو؟'' میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کی قابلِ رحم ہیئت کذائی بتارہی تھی کہ اس کے ساتھ وہ دونوں وحشی بری سے جی کوہارا اور بھومک کیا کرتے رہے ہوں گے۔ اس کے بدن کے نازک حصوں پر ہی نہیں بلکہ چہرے اور ہونٹوں پر بھی سرخ کٹ کے نشانات اور خراشیں نظر آرہی تھیں۔

''ہہ...... ہاں!'' اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک خوف کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''دیکھو...... ہم ان لوگوں سے زیادہ خطرناک لوگ ہیں، جنہوں نے تمہاری یہ حالت کی ہے۔ لیکن ہمارا وعدہ ہے اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے، بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔''

میری بات پر اس کے مُتے ہوئے چہرے کا رنگ کچھ تبدیل ہوا تھا۔ آنکھوں میں امید کی لو ٹمٹائی تھی اور لبوں پر فریادی سی جنبش کی جھلک ابھری تھی۔

''لیکن...... ایک بات یاد رکھنا۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ سب بھانپتے ہوئے میں نے تہدیدی انداز اختیار کیا۔ ''ہمارے ساتھ کسی قسم کا دھوکا یا فریب کے بارے میں خیال تک اپنے دل میں مت لانا، کیونکہ تم اب ہماری قید میں ہو اس وقت، جب تک تمہاری باتوں کی تصدیق نہیں ہوجاتی۔''

''تت...... تم لوگ کون ہو؟'' اس نے بالآخر سوال کیا۔

میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ ''ہم بھی انہی لوگوں کے ساتھی ہیں اور ان سے مختلف نہیں بلکہ دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔

اس لیے زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں...... بس! تعاون اور سچ بولنے کی بات کرو۔''

''مم...... تیار ہوں، لل...... لیکن بھگوان کے واسطے مجھے ان وحشی درندوں کے حوالے مت کرنا۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

''یہ تمہارے تعاون سے مشروط ہوگا۔ ابھی تم اپنے حواس بحال کرو اور ذرا ڈھنگ کا حلیہ اختیار کرو پھر تم سے آکر تفصیلاً گفتگو کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے چندر کلا کو اشارہ کیا اور کیبن سے باہر آگیا۔ چندر کلا نے کیبن کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ ہم دوبارہ نشست گاہ والے بڑے کیبن میں آگئے۔ ہمیں اچانک کسی کے زور زور سے بولنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ کوہارا تھا جس کی اب بوٹ پر حکمرانی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ صورتِ حال اب بدل چکی تھی، اب وہ میرا قیدی تھا۔ میں نے چندر کلا سے کہا۔

''یہاں ہم زیادہ دیر نہیں رک سکتے، انڈین کوسٹ گارڈ کی گشتی موٹر بوٹ یہاں آسکتی ہے۔ کوہارا کی بات اور تھی مگر ہم انہیں قائل نہیں کر سکتے، میں خود غیر قانونی طور پر یہاں ہوں۔'' وہ میری بات سن کر متفکر سی نظر آنے لگی۔ پھر جیسے پل کے پل کچھ سوچ کر تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

''چنتا کی کوئی ضرورت نہیں، میں انہیں قائل کرلوں گی، لیکن اس سے پہلے تمہیں یہاں کسی خفیہ گوشے میں چھپا دوں گی۔''

''یہ رسک لینے کا کیا فائدہ؟''

''تم کیا چاہتے ہو پھر؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''تمہارے ساتھ اس ہیرے کی کھوج اور لولوش کے دوست کرنل سی جی بھوانی سے ایک ملاقات۔'' میں نے کہا۔

''کرنل بھوانی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''لولوش نے اسے میرے خلاف جن باتوں پر ورغلا رکھا ہے، میں اسے صاف کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لولوش کے ساتھ ہونے والی میری ایک آخری دیرینہ کاروباری ڈیلنگ کے سلسلے میں مدد بھی کرے۔'' پھر اس کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کے لیے میں نے اسے تاکید کی کہ وہ سوشیلا کو جا کر کوئی ڈھنگ کا لباس دے آئے۔ میں جب تک کوہارا سے ایک ملاقات کرتا ہوں۔ چندر کلا میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ایک دیوار گیر کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں وہاں سے کوہارا والے کیبن میں آگیا۔

اندر داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بڑے خونخوار انداز میں غرایا۔ مارے طیش اور غیظ سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے اس طرح کے دھوکے اور بے بسی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسے میں نے بڑی بری طرح سے رسن بستہ کر رکھا تھا، دونوں ہاتھ تو اس کے پشت کے بل باندھے ہی تھے میں نے، اس کی ٹانگوں کو بھی موڑ کر ہاتھوں کے قریب کرکے باندھ ڈالا تھا، جس سے اس کی جسمانی ہیئت مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی۔

''جانتے ہو اس جرأت کا انجام تم...... تمہارے تصور سے بھی زیادہ بھیانک ہو سکتا ہے۔'' وہ غرایا۔ میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر رسی کا وہ چھوڑا ہوا سرا جھک کر اٹھایا جو ذرا لمبا کر کے میں نے دانستہ چھوڑ رکھا تھا، اور پھر اس کے گینڈے جیسے وجود کو اسی طرح کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا باہر عرشے میں آگیا۔ وہ اپنے حلق سے بدستور مغلظات کا طوفان اگلتا رہا، میں نے اس کی رسی چھوڑی اور بڑے آرام سے چلتا ہوا دنبالے کی طرف آگیا، پھر اس تکونی کمرے میں داخل ہوا، جہاں بنک پر بھومک بھی آہنی جکڑ بند میں پڑا ہوا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ بھیڑیے جیسی آوازوں کے ساتھ غرانے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اسے بنک پر سے کھینچ کر بوری کی طرح نیچے فرش پر مارا اور ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اسے بھی عرشے پہ لاکر سے جی کوہارا کے قریب پٹخ دیا، جہاں چندر کلا بھی آچکی تھی اور اب بڑے آرام سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر فولڈنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ سے جی کوہارا اسے بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے میں مصروف تھا۔

''ایک عورت کے بل پر مجھے دھوکے سے زیر کرنے والے تم مسلمی پھنے خاں اور کر بھی کیا سکتے ہو......'' مجھے دیکھتے ہی اس کی توپوں کا رخ میری طرف ہوگیا۔ بدھا کے اس پیروکار کے منہ سے اس طرح اگلے جانے والے زہر نے میرا اندر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس حال میں بھی پہنچ کر اس نے اپنے غرور کا سر ایک ایسی بات کا سہارا لے کر اونچا کرنے کی کوشش چاہی تھی، جو ایسی غلط بھی نہ تھی۔ اس پر واقعتاً میں نے نہیں بلکہ چندر کلا نے ہی دھوکے سے قابو پایا تھا۔

اگرچہ اس کے دستِ راست بھومک کو میں نے اپنے زورِ بازو سے قابو کیا تھا۔ مگر موقع کی بات تھی، کوہارا کے سلسلے میں یہ موقع مجھے نہیں مل سکا تھا، لیکن اس نے

مجھے ''مسلمی پھنّے خاں'' کا جو خطاب دیا تھا، اس کا قرض اتارنا مجھ پر واجب ہو گیا تھا۔

''چندر کلا......! تم نے اسے دھوکے سے قابو پایا تھا، اب تم ہی اسے آزاد کرو گی، اٹھو...... اس کی رسیاں کھول دو، میں اس کا یہ غرور بھی خاک میں ملانا چاہتا ہوں۔''

میں نے کرسی پر بیٹھی ہنستی مسکراتی چندر کلا سے جوشِ غیظ تلے یہ کہا تو یک دم اس کی ہنسی کو ہی نہیں بلکہ اس کی مسکراہٹ کو بھی بریک لگ گیا اور اس کی جگہ خوف نے لے لی۔

''یہ یہ...... یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ یک دم کپکپاتی آواز میں بولی۔ میں نے دیکھا ایک لمحے کے لیے سے جی کوہارا کے چہرے پر بھی ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

''تم نے سنا نہیں چندر کلا......؟'' میں حلق کے بل چیخا۔ میرا چہرہ فرطِ جوش تلے سرخ ہو گیا تھا۔ میری دہاڑ پر چندر کلا یک دم کپکپا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتی کانپتی سی رسن بستہ حالت میں پڑے سے جی کوہارا کی طرف بڑھی اور اکڑوں بیٹھ کر اس کی رسیاں کھولنے لگی۔ سے جی کوہارا جیسے قوت باز شیطان کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کھولتے ہوئے چندر کلا کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے، رسیاں کھولنے میں اسے دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، مگر وہ اپنے کام میں جتی رہی، اسے تھوڑی دیر ضرور لگی مگر اس پر سے جی کوہارا جیسے شیطان کی ایسی دہشت طاری تھی کہ وہ اس کا آخری جکڑ بند کھولتے ہی ایک چیخ سی مار کے جلدی سے اٹھ کر ایک طرف کو دوڑ کے جا کھڑی ہوئی۔

جکڑ بندوں سے نجات پاتے ہی سے جی کوہارا کسی بدمست سؤر کی طرح چیخا تھا اور غضب آلودہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگا۔ وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح باچھوں سے جھاگ خارج کرنے لگا تھا۔ اس کے گینڈے جیسے جسم میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی، اگرچہ قد میں وہ مجھ سے ذرا دبتا ہوا تھا مگر جسم اس کا پلے ہوئے سؤر جیسا ہی نظر آتا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر ہتھوڑے کی طرح مار کے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی تھی۔ اب اس کا گوشت کے پہاڑ جیسا موٹا تازہ وجود نیم برہنگی میں مزید کسی موٹے تازے بیل کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ خود میرا اوپری جسم بھی ہنوز برہنہ تھا اور چمکتے سورج کی تمازت میں میرا کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ سینے کا گوشت کسی مضبوط چٹان کی طرح تنا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سخت حریفانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ میری پتلون کی بیلٹ میں دو پستول اڑسے ہوئے تھے، ایک پستول تو وہ تھا جو چندر کلا نے مجھے رات میں تھمایا تھا، جبکہ دوسرا میں نے بھومک سے چھینا تھا۔ میں نے وہ دونوں نکال کر عرشے میں ایک طرف کو لڑھکا دیے۔

''ختم کر ڈالو اس مسلمی کو باس! زندہ مت چھوڑنا...... یہ اب تمہارے ہاتھوں نہیں بچے گا باس......'' معاً فرش پر بندھے پڑے اس کے پالتو کتے بھومک نے زہرخند لہجے میں چلا کر سے جی کوہارا سے کہا اور یہی وہ وقت تھا جب کوہارا بھیڑیے جیسی خونخوار غراہٹ خارج کرتا ہوا مجھ پر جھپٹا، اس کا خیال تھا کہ میں اپنی جگہ چھوڑ دوں گا مگر میں وہیں اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا ایستادہ ہو گیا تھا، وہ پوری قوت سے مجھے اپنی تباہ کن ٹکر سے گرانے کے لیے مجھ پر پل پڑا تھا، قریب آتے ہی میں نے بڑے آرام سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر بازوؤں کے سہارے اس کے بدمست جسم کو ایک مخصوص ٹرک کے ذریعے اس طرح زور مارا تھا کہ وہ اپنی جھونک میں سیدھا لڑکھڑاتا ہوا عرشے کی ریلنگ سے جا ٹکرایا تھا۔ قریب تھا کہ وہ سمندر میں الٹ پڑتا، کہ میں نے فوراً آگے بڑھ کر پیچھے سے اس کی موٹی بیل جیسی گردن کے گرد اپنے ایک بازو کا شکنجہ کس دیا اور اپنے ساتھ لگائے ہوئے چند قدم عقب میں پلٹا اور دیسی ساختہ اڑنگا لگا کر اسے عرشے پر گرا ڈالا۔ کوہارا اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دھڑام کی خاصی زوردار آواز کے ساتھ عرشے پر گرا تھا۔

''بس! اتنا ہی دم تھا تمہارے اندر کوہارا......! جس پر تم اتنا اکڑ رہے تھے۔''

میرے اس استہزائیہ جملے نے جیسے جلتی پر تیلی کا کام کیا اور اس نے اپنے جثے کے بالکل برعکس بڑی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، لیٹے لیٹے اپنی ایک ٹانگ چلا دی تھی۔ یہ داؤ میرے لیے اچانک ہی ثابت ہوا تھا، نتیجتاً میں اپنی جگہ سے اچھل کر عرشے پر آ رہا۔ میرے گرتے ہی وہ عرشے پر کسی بھاری بھرکم وہیل کی طرح تڑپا اور بلاخیز پھرتی سے اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کا ''لیگ لاک'' میری گردن کے گرد کس دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مجھے اس کے گینڈے جیسے بھاری بھرکم جثے سے ایسی پھرتی اور داؤ بازی کی توقع نہ تھی۔ شاید یہی وجہ میرے مار کھانے کی بنی تھی۔

اس کے گینڈے جیسی موٹی ستونوں والی ٹانگوں کی قینچی میں میری گردن کا جکڑ جانا کسی ہولناک موت کا باعث بننے سے کم نہیں تھا، میری گردن اپنی ٹانگوں میں جکڑتے ہی اس نے اپنے پہاڑ جیسے وجود کی پوری طاقت کو صرف کرتے ہوئے زورآوری کا مظاہرہ شروع کر دیا اور مجھے اپنی سانسیں کیا بلکہ کسی بھی وقت گردن ٹوٹنے کا خطرہ صاف نظر آنے لگا تھا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس ٹانگوں کی قینچی کھولنے پر پورے جسم کی طاقت کا زور لگا دیا تھا، مگر بے سود، کیونکہ اس خطرناک داؤ میں ہاتھوں کے مقابلے میں اس وقت اس کی ٹانگوں میں پورے جسم کی طاقت صرف کرنے میں نسبتاً آسانی ہو رہی تھی۔ اور یہی وہ کر رہا تھا۔ پل کے پل میری سانسیں گھٹنے لگیں اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا تھا کہ اچانک میرے ڈوبتے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں نے اس کی ٹانگوں کے گرد بے سود لپٹے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو کچھ اور متحرک کیا اور جو میں چاہتا تھا وہی ہوا، یعنی میں نے اس کی ٹانگوں کے فولادی شکنجے کو کھولنے کی کوشش ترک کر کے اپنے ہاتھوں کے دونوں پنجے فرش پر جما دیے اور پورے وجود کی طاقت صرف کرتے ہوئے میں گھٹنے سکیڑے کھڑے ہونے کی تگ و دو کرنے لگا اور یوں میرے ساتھ ہی سے جی کوہارا کا جسم ساتھ اس کی ٹانگوں کی طرف سے اوپر اٹھنے لگا تو اس کی طاقت کی زورآوری میں دراڑ پڑتی مجھے صاف طور پر محسوس ہوئی۔ اس مہلک داؤ کا آخری اور فوری توڑ یہی میری سمجھ میں آیا تھا جس میں خاطرخواہ کامیابی محسوس کرتے ہی میں نے اپنے جسم کا سارا زور اسی جوابی داؤ میں صرف کر دیا، یہاں تک کہ میں اپنے گھٹنوں کے بل پر کھڑا ہونے لگا اور اسی وقت میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مزید حرکت دیتے ہوئے کسی طرح اس کے دونوں پیروں کے انگوٹھوں کو پکڑ کر زور لگا کر مروڑنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنے جسم کو بل بھی دیتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کا جسم بھی بل کھا گیا اور اسی وقت اس کا لیگ لاک کافی حد تک کمزور پڑا تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کی دونوں ٹانگیں کھول ڈالیں اور پیروں کے انگوٹھے مروڑ کر ہڈیاں توڑ ڈالیں، اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی۔ ایک خطرناک داؤ سے نکلنے اور موت کے منہ سے بال بال بچنے کے بعد مجھ پر بھی جنونانہ وحشت طاری ہو گئی تھی۔ کوہارا اپنے پیروں کا ابھی زخم ہی چاٹ رہا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر اپنے بھاری بوٹ کا ''ٹُو'' رسید کر دیا جو اس کی ناک پر لگا، اس کی ناک پھٹ کر بھل بھل خون چھوڑنے لگی۔ انگوٹھوں اور پھر ناک کی چوٹ نے اسے بے حال سا کر دیا تھا مگر سخت جان بھی تھا، وہ ان چوٹوں کی پروا کیے بغیر وحشیانہ غراہٹ سے کھڑے ہونے کی کوشش میں لوٹ لگا کر میرے بوٹ کی دوسری ضرب سے بچنے کے لیے پرے لڑھک گیا اور یک دم کھڑا ہو گیا، لیکن اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے، مگر میں اسے اب سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور چند قدم اس کی طرف بڑھ کر میں اپنے ایک پاؤں کی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوما اور دوسری ٹانگ کو قوس کی صورت میں تیزی کے ساتھ حرکت دی، میرے پاؤں کی یہ زوردار ضرب اس کے جبڑے کو بری طرح چٹخا گئی اور وہ کئی قدم عقب میں لڑکھڑا گیا، مگر میں نے پھر اسے سنبھلنے نہیں دیا اور اسی طرح کبھی ایک تو کبھی دوسری راؤنڈ کک سے اس کی تواضع کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بے حال ہو گیا اور لڑکھڑا کر گرا، مگر اسی وقت اس نے اپنی سی ایک آخری کوشش میں لڑھکنی لگائی اور جدھر میں نے پستولیں رکھی تھیں، وہ اس طرف جا پڑا، ابھی اس نے لیٹ کر ایک پستول کے دستے پر اپنا ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میں اس کی حرکت کو پہلے ہی بھانپتے ہوئے اچھل کر اس پر جا پڑا، اس طرح کہ میرا ایک پیر میرے لمبے چوڑے جسم کے بھرپور وزن سے اس کے ہاتھ کی کلائی پر اس زور سے پڑا کہ اس کی ہڈی کو ہی بری طرح چٹخا کر رکھ دیا۔ میں نے اس پر لاتوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی، وہ درد و اذیت سے حلق کے بل چلانے لگا، اسے بالکل نڈھال سا کرنے کے بعد میں اسے دوبارہ ایک ٹانگ سے گھسیٹتا ہوا اسے وہیں لا پہنچا جدھر وہ تھوڑی دیر پہلے پڑا ہوا تھا۔ وہی رسی رکھی ہوئی تھی جس سے میں نے ذرا ہی دیر میں پھر سے اس کی مشکیں کس دیں اور خود ہانپتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

چندر کلا جو تھوڑی دیر پہلے سے جی کوہارا کے آزاد ہونے پر خوف سے پیلی پڑ گئی تھی اب فرطِ حیرت سے اپنا منہ کھولے کبھی اس کی طرف اور کبھی میری طرف تکے جا رہی تھی، جبکہ قریب پڑے بھومک کا چہرہ بھی پہلی بار خوف کا شکار نظر آنے لگا تھا۔

میں نے چندر کلا سے پانی لانے کا کہا اور پھر اپنا ایک پاؤں فرش بوس سے جی کوہارا کی گردن پر رکھتے ہوئے اس پر ذرا جھک کر زہرخند لہجے میں بولا۔

''تم نے تو ابھی تک صرف اپنے زرخرید کتوں کے بل پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیے رکھا تھا اور کمزور و بے بس کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا تھا، لیکن اب تمہیں اچھی

طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس مسلمی چھنے خان نے اپنے شایانِ شان، اپنے زورِ بازو پر تمہارا چیلنج قبول کر کے تمہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا، کیا کہتے ہو اب؟"

احساسِ شکست تلے کوہارا کا چہرہ بالکل ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا، اپنی خفت مٹانے کی ایک لغوسی کوشش کرتے ہوئے وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "تم...... تم! زندہ نہیں بچو گے، تم گریٹ ماسٹر کو نہیں جانتے، نہ ہی اس کی بے پناہ طاقت سے واقف ہو۔"

"تمہارے گریٹ ماسٹر کا بھی عنقریب میں ایسا ہی حشر کروں گا پاگل کتے! اب اپنی زبان بند رکھنا۔" میں نے اسی پاؤں سے اس کے چہرے کو ہلکی ٹھوکر رسید کی۔ اس اثنا میں چندر کلا پانی کی بوتل لے آئی اور میری طرف بڑھا دی۔ اس کا ڈھکن وہ پہلے ہی کھول چکی تھی، میں نے وہ منہ سے لگا لی اور گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔

☆☆☆

اگلے چند منٹوں میں، میں سے جی کوہارا اور بھومک کو بوٹ کے دنبالے والے اسی تکونی کمرے میں مقید کر چکا تھا۔ بوٹ پر اب مکمل طور پر میرا قبضہ قائم ہو چکا تھا۔

میں اور چندر کلا سوئچرنگ روم میں آن بیٹھے تھے۔ سوشیلا کو بھی اوپری کیبن سے نکال کر لے آئے تھے۔ میری سخت تاکید پر چندر کلا نے اب ذرا ڈھنگ کا لباس زیب تن کر لیا تھا اور سوشیلا کو بھی لباس پہنا دیا تھا۔ اس کی حالت اب قدرے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اسے کچھ کھلایا پلایا بھی گیا تھا۔ میں نے اور چندر کلا نے بھی تھوڑا بہت زہر مار کیا، اس کے بعد میں نے سوشیلا سے دوٹوک لہجے میں طلسم نور ہیرے کے متعلق دریافت کرتے ہوئے اس پر اپنی معلومات کا بھی رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

"بشام سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ ہیرا تم لے اڑی تھیں، مختصراً یہ کہ اب تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ وہ ہیرا آیا ابھی تک تمہارے قبضے میں ہے یا پھر تم اسے اپنے کسی منصوبے کے مطابق کسی اور کے حوالے کر چکی ہو، جھوٹ بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ اس لانچ پر اب میرا قبضہ ہے اور جوان خطرناک لوگوں پر قابو پا سکتا ہے وہ خود کتنا خطرناک ہوگا، اسی لیے تمہاری بات کی تصدیق تک تم ادھر ہی رہو گی۔ لہٰذا اب سچ بولنا شروع کر دو۔"

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری، اس کا خوبرو اور حسین چہرہ اس وقت بھی بری طرح ستا ہوا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ کوہارا اور بھومک نے اسے بری طرح تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور وہ اب اپنی زندگی سے بھی مایوس نظر آتی تھی۔ لہٰذا اس سے جھوٹ بولنے کی امید کم ہی نظر آتی تھی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"وہ ہیرا میں نے ہی بشام سے اڑایا تھا، مگر اس کا میرے ساتھی وکرم کو پتا نہ تھا۔ میں جنرل ایڈوانی کے لیے کام کرتی ہوں۔ وہ ہیرا میں اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ میری بہن اوشا اور اس کے بچوں کو چھوڑ دے۔" وہ اتنا ہی بتا کر سسک پڑی۔

"کیا مطلب؟ تمہاری بہن اور اس کے بچوں کا بھلا جنرل ایڈوانی سے کیا تعلق؟" میں نے اس کے سسکنے کی پروا کیے بغیر پوچھا تو وہ اسی طرح غم زدہ لہجے میں بولی۔

"ایڈوانی کے آدمیوں نے اسپیکٹرم کے بھارتی ممبران کو ٹریس کیا تھا اور بھارت میں صرف میں اور وکرم ہی اسپیکٹرم کے ممبر اور فیلڈ آفیسر تھے۔ وکرم کو چھوڑ کر انہوں نے مجھے نشانہ بنا لیا۔ اس کے آدمی مجھے اغوا کر کے ایڈوانی کے پاس لے گئے۔ پہلے تو وہ مجھے وطن پرستی کا درس دیتا رہا پھر میرا مائنڈ سیٹ بدلنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس طلسم نور ہیرے پر بھارت کا حق ہے جبکہ طلسم نور ہیرے سے متعلق اسپیکٹرم کی حتمی رپورٹ کے مطابق وہ پاکستان کی ملکیت تھا۔ اس رپورٹ کو بین الاقوامی سطح پر ابھی ظاہر ہونے نہیں دیا گیا اور اسپیکٹرم کے روحِ رواں مسٹر ڈی کارلو کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہو گیا۔ لولوش نے اس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالی تو ہمیں بھی اس حقیقت کا علم ہوا کہ اب اسپیکٹرم محض عالمی جرائم پیشہ گاڈ فادر کی ایک ریکٹ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ میں اور وکرم اس سے کنارہ کش ہونے لگے، ہیرے سے متعلق اسپیکٹرم کی حتمی رپورٹ کو بھی دبا دیا گیا تھا، صاف لگتا تھا کہ بعض عناصر اسے پاکستان کی ملکیت کے حوالے سے متنازعہ بنانا چاہتے تھے۔ یہ سب باتیں چونکہ پہلے ہی سے میرے علم میں تھیں اسی لیے مجھے ایڈوانی کی ہر بات جھوٹ کا پلندا محسوس ہوئی اور مجھے شک گزرا کہ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا، میں اپنے تئیں چالاکی کر کے اور اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر کے اس وقت تو اس کے چنگل سے نکل آئی مگر یہ میری بھول تھی، میں نہیں جانتی تھی کہ ایڈوانی کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ مگر دوسری بار ایڈوانی نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی زحمت کیے بغیر مجھے دوسرے طریقے سے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کی۔

"اوشا میری ایک ہی بہن ہے، اس کے دو بچے ہیں، اس کے پتی نریندر کمار کو ایڈوانی نے ہلاک کروا دیا اور بیوی بچوں کو یرغمال بنا لیا۔ اس کے بعد اس کے آدمی بلراج سنگھ نے مجھ سے صرف ٹیلی فونک رابطہ کیا اور مختصر لفظوں میں حکم کی تعمیل کی سختی سے تاکید کی، بہ صورتِ دیگر میری بہن اور اس کے دونوں چھوٹے معصوم بچوں کو ہلاک کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ میں مجبور ہو گئی تھی، یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ہیرے کو اسپیکٹرم کا کوئی ممبر ہی حاصل کر سکتا ہے۔

"اسی دوران مجھے اور وکرم کو نیویارک ہیڈ کوارٹر سے پیغام ملا کہ ہم دونوں فوراً پاکستان پہنچ کر بشام نامی اپنے ساتھی ممبر سے رابطہ کر کے، ہیرے سے متعلق گمشدگی اور برآمدگی کے سلسلے میں اس کی مدد کریں۔ میرے لیے اس ہیرے کو حاصل کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ بلراج سنگھ نے میرا کام مزید آسان کرنے کے لیے روانگی سے قبل مجھے ایک اور ہیرا بھی دے دیا تھا جو ہوبہو طلسم نور ہیرے کی نقل تھا۔

"میں اپنے مشن میں کامیاب رہی اور بھارت لوٹنے کے بعد ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بلراج نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے ہیرا اس کے حوالے کرنے سے پہلے اپنا یہ مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا کہ وہ پہلے میری بہن اوشا اور اس کے دونوں بچوں کو چھوڑ دے۔ خود میں روپوش تھی اور میری کوشش یہی تھی کہ جنرل ایڈوانی یا اس کے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ سکوں، یہ معاملہ ایسا تھا کہ میں کسی سے مدد بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اسی لیے یہ سب میں نے خود ہی کرنے کی ٹھانی تھی۔ میرے پاس کافی حد تک وسائل موجود تھے۔ بلراج سنگھ مجھے دھمکیاں دینے لگا، مگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔ بالآخر ان لوگوں کو ہی میرا یہ مطالبہ ماننا پڑا۔ اس کے لیے ایک مقررہ مقام طے پایا گیا۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ جنرل ایڈوانی نے میری بہن اوشا اور اس کے دونوں بچوں کو چھوڑ دیا ہے تو میں نے وہ ہیرا جنرل ایڈوانی کے آدمی بلراج سنگھ کے حوالے کر دیا اور اوشا کے گھر پہنچی تو وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ پورا گھر بھڑکتے شعلوں کی زد میں تھا۔ ان ظالموں نے میری بہن اور اس کے دونوں معصوم بچوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ میں خون کے آنسو رو پڑی۔ جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے مجھے بھی مضبوط ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ بھارت اَن گنت زیرِ زمین "ڈون" سے بھرا پڑا ہے۔ میں نے بھی ایک ایسے ہی "ڈان" سے رابطہ کیا اور بھاری معاوضے پر انہیں ایڈوانی کے قتل کی سپاری دینا چاہی، مگر ایڈوانی کے ساتھ "جنرل" کے لاحقے نے انہیں میری مدد سے معذور کر دیا۔ میں مایوس ہو گئی، پھر اسی دوران میں ان وحشی برمیوں (سے جی کوہارا اور بھومک) کے ہتھے چڑھ گئی۔ میں نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا اور ایک طرح سے خوش بھی ہوئی کہ سیر کو سوا سیر پڑنے والے تھے، شاید یہی لوگ میرا انتقام جنرل ایڈوانی سے لے سکیں، مگر یہ لوگ تو میری کسی بات پر بھروسا ہی کرنے پر تیار نہ تھے، یہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں اور وہ ہیرا میرے ہی پاس ہے۔ لیکن جب انہوں نے مجھے اپنے ہر طرح کے وحشیانہ تشدد اور بہیمانہ سلوک کا اچھی طرح نشانہ بنا لیا تب کہیں جا کر ان وحشیوں کو میری بات کا کچھ بھروسا ہوا اور یہ لوگ ایڈوانی اور بلراج کی تلاش میں نکلے مگر انہیں ناکامی

ہوئی، ایک بار پھر ان درندوں نے مجھے تختۂ مشق بنالیا، بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ کر ان سے موت کی بھیک مانگنا شروع کر دی......"

سوشیلا اپنی لرزہ خیز کتھا بتا کر گھٹ گھٹ کے رو پڑی۔ اگر تو یہ سچی تھی تو اس کا مطلب تھا، ہیرے کی چوری میں اس کی اپنی ذاتی غرض کا دخل نہ تھا، وہ ایک مجبوری تھی۔ نیز یہ بھی کہ وہ اب تک اسپیکٹرم (جب تک یہ ایک معتبر عالمی ادارہ تھا) کے لیے دیانت داری سے کام کرتی رہی تھی۔ مگر جنرل ایڈوانی کی دھونس دھاندلی اور ہراسمنٹ نے اسے غلط راستے پر چلنے پہ مجبور کر ڈالا تھا۔ لہٰذا میرے فیصلے کی کسوٹی پر وہ بے قصور ہی نہیں قابلِ رحم بھی تھی۔ ایک اور بات پر بھی میں نے فوری طور پر غور کیا تھا، چندر کلا کے مقابلے میں سوشیلا اس طلسم نور ہیرے کی برآمدگی کے سلسلے میں میری خاطر خواہ اور بے غرض مدد کر سکتی تھی، یوں بھی وہ جنرل ایڈوانی سے اپنی بہن وغیرہ کا انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ یہ میرا بھرپور ساتھ دے سکتی تھی، جو میرے لیے کئی محاذوں پر کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا، اگر چندر کلا اور سوشیلا کا موجودہ حالات میں موازنہ کیا جاتا تو سوشیلا دیارِ غیر میں میرے لیے اچھی اور خاطر خواہ "سپورٹر" بھی بن سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جنرل ایڈوانی نے پہلے اس کے بہنوئی کو موت کے گھاٹ اتروایا اور بعد میں ہیرا ملنے کے باوجود اس کی بیوہ بہن کو اس کے دو معصوم بچوں سمیت زندہ بھی جلا ڈالا۔ یہی سبب تھا کہ سوشیلا کے سینے میں جنرل ایڈوانی کے خلاف نفرت کا ایک جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ وہ ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بھارت کے انڈر گراؤنڈ پر ہی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

ایک مظلوم اور کمزور جبر سہنے کے بعد جب ظالم کو بھی اسی حالت میں دیکھتا ہے تو اس کے طیش اور انتقام کی جس حالت کا تصور کیا جا سکتا ہے وہی اس وقت سوشیلا کی ہو رہی تھی۔ وہ ہانپ گئی تھی مگر اس کے اندر کی آتشِ انتقام سرد نہیں ہوئی تھی، اس کے تیز ناخنوں نے ان دونوں کے چہروں پر سرخ لکیروں کی صورت میں کھرونچے ڈال دیے تھے اور ان کے منہ سے میری اور سوشیلا کی شان میں مغلظات کا طوفان بپا تھا۔ میں نے چندر کلا کو مخصوص اشارہ کیا، وہ آگے بڑھی اور سوشیلا کو سنبھالتی ہوئی اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے آئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پھر نشست گاہ والے کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

سوشیلا کی حالت اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ اسے یہ

"ڈان" کی مدد لینے کی بھی ایک ناکام کوشش کر چکی تھی۔ میری صورت میں اسے ایک چلتا پھرتا "کمانڈو ڈان" دستیاب ہو رہا تھا تو وہ بھی یقیناً میری ہر طرح کی مدد کے لیے فرشِ راہ ہو جاتی۔ اب مجھے چندر کلا کا وجود ایک بوجھ بلکہ مسئلہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ میرے آگے کے سوچے سمجھے اہم معاملات کو بگاڑنے کا باعث بن سکتی تھی، وہ دوست نما دشمن بننے میں ذرا بھی دیر نہ لگاتی، تاہم اس سے بھی مجھے مصالحت کے ساتھ چلنا تھا۔

پل کے پل یہ سب سوچنے اور گہرے تجزیے کے بعد میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور اس بار بڑے نرم لہجے میں سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سوشیلا......! ذرا آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شاید اس یوٹ میں پہلی بار ایسا نرم لہجہ سنا تھا اور وہ سر اٹھا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

وہ کبھی اپنی پُرکشش مگر اشک بار آنکھوں سے میرے، اس کی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو تکنے لگتی تو کبھی میرے چہرے کی طرف۔ میں ہولے سے مسکرایا تو اس کے گداز لبوں پر ان کہی سی جنبش لرزی، تب اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں اسے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور قریب کھڑی چندر کلا کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

سوشیلا کو لے کر میں دنبالے کی طرف آیا جدھر تنگ اور تکونی قید خانے میں کوہارا اور بھومک مقید تھے۔ دروازہ کھول کر میں نے حیران پریشان سوشیلا کو سامنے کا منظر دکھا دیا۔ پہلے تو اسے کوہارا اور بھومک کو ایسی حالت میں دیکھ کر حیرت اور غیر یقینی کا جھٹکا لگا پھر جیسے یکایک اس کے چہرے کے تاثرات متغیر سے ہوئے اور آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ہسٹریائی چیخ بلند ہوئی اور وہ تیزی کے ساتھ ان دونوں پر کسی زخمی ناگن کی طرح جھپٹی، پھر میرے اور چندر کلا کے دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس نے اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے کوہارا اور بھومک کے چہروں پر کھرونچے ڈالنے شروع کر دیے اور ساتھ ہی پھنکار سے مشابہ آوازیں بھی اپنے حلق سے خارج کرتی گئی۔ کوہارا اور بھومک بندھے ہوئے تھے اسی لیے وہ صرف اپنی گزیدگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور کراہیں خارج کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے بھی سوشیلا کو دل کی بھڑاس نکالنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی اور خاموشی سے چندر کلا کے ساتھ دروازے

سب دکھانے کا میرا ایک مقصد تھا۔ اس سے وہ میرے بارے میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ میں کیا تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم نے کوہارا جیسے شیطان اور اس کے ساتھی کو یوں چوہوں کی طرح بے دست و پا کر کے رکھ ڈالا ہے۔" سوشیلا میری طرف دیکھ کر توصیف آمیز حیرت سے بولی تو چندر کلا نے اسے ساری بات بتا دی۔ میرے اور کوہارا کے درمیان دو بہ دو مقابلے کا بھی سن کر وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ میرے جسم پر زخموں کی خراشیں اور کوہارا کے ٹوٹے ہوئے دونوں پیروں کے انگوٹھوں سمیت بھومک کی پچکی ہوئی ناک ان باتوں کا بیّن ثبوت تھے۔

"سوشیلا! تمہیں یہ سب دکھانے کا میرا ایک ہی مقصد تھا کہ تم مجھ پر، میرے زورِ بازو پر بھروسا کرو اور مجھ سے بغیر کسی دھوکے کا خیال بھی لائے، تعاون کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ میری فطرت ہے کہ دوستوں کا میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا اور دشمنوں کو معاف کرنا میری سرشت میں شامل نہیں۔ لہٰذا اب یہ تم پر منحصر ہے کہ میری کون سی فطرت کا انتخاب کرتی ہو۔"

"میں تمہاری دونوں سرشتوں کا ہی سچے دل سے انتخاب کروں گی۔" وہ ایک دم موہنی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ چندر کلا شاید اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر چونکی تھی مگر میں کسی حد تک اس کی ذومعنی بات کا اندازہ لگا چکا تھا اور اس کی طرف چونکنے کے بجائے مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا تو وہ بھی اسی انداز میں مسکرا کر وضاحت میں دوبارہ بولی۔

"تمہاری دشمنوں والی فطرت میرے دشمنوں کے لیے کام آئے گی اور دوستوں والی سرشت میرے لیے، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے صرف تمہاری دوستی والی سرشت ہی نہیں بلکہ دشمنوں والی فطرت بھی قبول ہے۔"

"میں سمجھ گیا تھا۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "تمہاری ظلم بھری داستان سن کر ہی نہیں بلکہ چندر کلا کی زبانی مجھے تمہاری مظلومیت جان کر بھی تمہارے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات پروان چڑھے تھے۔"

"کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟" اس نے میری طرف گہری گہری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"شہزاد احمد خان، عرفیت شہزی رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا نام بھی تمہاری طرح خوبرو اور پُروجیہہ

اخلاقیات

دو سیلز مین بہت عرصے بعد ملے۔ ایک نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج کا دن تو بہت ہی برا گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی۔ کہیں گالیاں، کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کر لیا، کہیں گرجے برسے لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔"

"کیا بیچ رہے ہو آج کل؟" دوسرے نے پوچھا۔

"اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔" پہلے نے جواب دیا۔

ایبا کامران، سبی

ہے۔ تم واقعی ایک اچھے اور دلیر انسان ہو۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اس ہیرے کے سلسلے میں کوئی لائحہ عمل طے کر لینا چاہیے۔" چندر کلا نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے چہرے پہ نظریں جمائیں۔ وہ خاصی بیزاری سی نظر آ رہی تھی۔ شاید سوشیلا کا میرا یوں تعریف کرنا اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے بھی ہولے سے کھنکھارتے ہوئے، سوشیلا سے اس کی تعریف کرنا ضروری سمجھا اور اسے بتایا کہ اس شیطانی یوٹ پر قابض ہونے میں چندر کلا کا بھی ہاتھ تھا۔ اس پر سوشیلا نے ایک دوستانہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بھی ڈالی اور بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں، لیکن بعد میں تم نے بھی تو سے جی کوہارا سے دو بدو مقابلہ کر کے اسے خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"میرا خیال ہے اب ہم فضول قسم کی باتوں میں اپنا وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔" چندر کلا نے دوبارہ جیسے اپنی بیزاری کا اعلان کیا۔

"آخر تمہیں اس ہیرے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" بالآخر سوشیلا نے اس سے کہہ ڈالا تو وہ بولی۔

"اس ہیرے سے تو ہم سب کو ہی دلچسپی ہے۔"

"کیا تم اس میں حصہ داری چاہتی ہو؟" سوشیلا نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم یہ نہیں چاہتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

''اس لیے کہ وہ ہیرا ہماری ملکیت نہیں ہے، نہ ہی ہمارا اس پر حق ہے۔'' سوشیلا نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی تھی۔ اس کی اس بات نے ثابت کر ڈالا تھا کہ وہ اسپیکٹرم کی ایک سچی رکن تھی اور اپنے کاز اور فرض سے بھی غافل نہیں تھی۔ مگر چندر کلا کو یہ بات بُری لگی۔ بولی۔

''وہ ہیرا کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے۔ بس! جس کے ہاتھ میں ہے وہی اس کا مالک ہے اور یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔''

''تو پھر اس کا مالک اس وقت ایڈوانی ہوا، کیونکہ وہ ہیرا اب اسی کے پاس ہے۔'' سوشیلا نے ہلکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ان کی گلوخلاصی کرانا ضروری سمجھا اور درمیان میں بولا۔

''اس بحث کو ابھی چھوڑو، پہلے ہیرے کو اپنے ہاتھ میں آجانے دیا جائے، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' مجھے چندر کلا کی بات بھی رکھنا تھی، اس لیے سوشیلا سے اس کی حمایت میں بولا۔ ''ویسے چندر کلا کا ہیرا حاصل کرنے کا مقصد صرف لالچ ہی نہیں ہے، اس میں عالم انسانیت کو ایک بڑی جنگ میں جھونکنے سے بچاؤ کا بھی نیک جذبہ کارفرما ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بالآخر ''ورلڈ بگ بینگ'' والی بات اس کے گوش گزار کر ڈالی تو سوشیلا حیرت بھری نگاہوں سے چندر کلا کا چہرہ تکنے لگی۔

''تت...... تو کیا...... تت تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے؟''

''ہاں!'' چندر کلا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

''کک...... کیسے معلوم ہوئی یہ بات تمہیں؟'' سوشیلا کی حیرت کم نہ ہوئی تو میں نے کچھ اندازہ لگاتے ہوئے سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں یہ جنرل ایڈوانی انہی جنگی جنونی جرنیلوں میں سے ہو جو ایک بھیانک سازش کے تحت پوری دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنا چاہتے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے چندر کلا اور بشام کی دی ہوئی معلومات کی مختصر اً صراحت بھی اسے بتا ڈالی۔

''یقیناً...... ایڈوانی کا تعلق انہی تین ممالک کے جرنیلوں سے ہے، جو ایڈولف ہٹلر کی طرح پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔'' سوشیلا نے پورے وثوق سے توثیق کی تو چندر کلا نے اپنا بدلہ چکاتے ہوئے سوشیلا سے طنزاً کہا۔

''اور تم یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ جنرل ایڈوانی کتنا خطرناک آدمی ہے، تم نے محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر وہ ہیرا اس کے حوالے کر کے ان جنگی جنونیوں کے ورلڈ بگ بینگ کے بھیانک منصوبے کو شرمندۂ تعبیر ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔''

''اس لیے کہ میں سمجھتی تھی کہ یہ محض چند مٹھی بھر جنگی دیوانوں کا خواب ہے، جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر اب تمہیں کیسے یقین آگیا؟'' چندر کلا بدستور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں لگی ہوئی تھی۔ ہیرے سے ''حصے داری'' کے متعلق سوشیلا کا کہنا شاید چندر کلا کو ابھی تک کھل رہا تھا۔

''تمہاری زبان سے یہ سب سن کر......'' سوشیلا اس کے اندر کے جلاپے کو سمجھے بغیر بولی۔ ''اور مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا بھی کسی نہ کسی حوالے سے کسی ایسے جرنیل سے ضرور رابطہ رہا ہوگا۔'' سوشیلا نے وہی بات کہہ ڈالی تھی جو میرے دل میں پہلے ہی سے تھی مگر میں نے مصلحتاً چندر کلا سے نہیں کہی تھی۔ مگر اس بار میں نے بھی ان کی بات کاٹنے کی کوشش نہیں کی اور چاہتا تھا کہ ان دونوں ''خواتین'' کے درمیان یہ موضوع ذرا آگے بڑھے۔ چنانچہ میں دزدیدہ نظروں سے چندر کلا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، تاکہ اس کے تاثرات کا ردِعمل بھانپ سکوں۔ وہی ہوا۔ اس کی بات پر چندر کلا نے قدرے گھبرا کر میری طرف دیکھا تھا، میں اس کی طرف سے فوراً اپنی نظریں چرا گیا تو وہ جیسے ہڑبڑا کر بولی۔

''نن...... نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں سمجھ گیا دال میں کچھ کالا ہے اور اس ''کالک'' کو میں سرِدست تاریکی میں ہی چھپے رہنے دینے کی غرض سے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے سوشیلا سے بول پڑا۔

''اس کی ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں سوشیلا! کہ چندر کلا کا تعلق ورلڈ بگ بینگ کے منصوبہ ساز کسی جرنیل سے نہیں ہے۔''

''کیوں......؟ تم بھلا اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ یہ کوئی معمولی راز نہیں ہے جو ہر ایرے غیرے کی زبان پہ زدِ عام ہو۔'' مجھ سے یہ کہتے ہوئے جب سوشیلا نے میری طرف دیکھا تو میں نے چندر کلا سے نظر بچا کر اسے آنکھ مار دی اور جلدی سے اس بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بولا۔

''دیوانوں کی باتیں زبانِ زدِ عام ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے سوشیلا! لیکن اس بات کا تمہیں بھی میری طرح

یقین کر لینا چاہیے کہ چندر کلا کا ایسا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں! طالع آزماؤں سے تم اس کا تعلق بے شک جوڑ سکتی ہو۔ جو خزانے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔'' سوشیلا ذہین ثابت ہوئی۔ وہ فوراً سے نہ صرف میری آنکھ کا اشارہ سمجھ گئی تھی بلکہ میری ہوا میں اڑائی ہوئی بات کا مطلب بھی بھانپ گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے بھی ہنسی میں اس بات کو ہوا کرنے کی غرض سے کہہ ڈالا۔

''صحیح کہتے ہو شہزی! یہ طالع آزما بھی تو کم سر پھرے نہیں ہوتے۔ خزانوں کی تلاش میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے لیے نکل جاتے ہیں اور ہاتھ کچھ نہیں آتا، الٹا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں، میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ......''

چندر کلا نے اچانک گہری سنجیدگی سے کہا تو مجھ سمیت سوشیلا بھی اس کی طرف چونک کر تکنے لگی۔

''بالاسور میں میرے تین ساتھی موجود ہیں، انہی میں سے ایک خود کو ان جرنیلوں میں سے ایک کا قریبی ملازم کہتا ہے، لیکن وہ کس ملک کے کس جرنیل سے تعلق رکھتا ہے یہ وہ نہیں بتاتا، کیونکہ یہ بتانے سے وہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا ہے۔''

''لیکن تم پھر یہاں کیسے آن پھنسیں؟'' سوشیلا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''پھنسی نہیں تھی، میں یہاں لائی گئی تھی۔''

''کس کے کہنے پر؟ اور تمہیں کیا پتا کہ یہ لوگ، یعنی کوہارا وغیرہ طلسم نور ہیرے کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟'' سوشیلا اس کی طرف سے موقع ملتے ہی جیسے اس کے ساتھ جرح پر اتر آئی تھی، میں بھی اب یہی چاہتا تھا کہ چندر کلا کا اصل چہرہ سامنے آجائے، لہٰذا خاموشی سے سامع بنا ان کی باتیں سنتا رہا۔

''ہمیں شبہ ہوا تھا ان پر......'' چندر کلا بتانے لگی۔

''درحقیقت یہ لوگ بالاسور کی بندرگاہ میں طوائفوں کو تلاشتے پھر رہے تھے۔ میں اس پیشے سے تعلق تو نہیں رکھتی ہوں، مگر گھر میں میرے بوڑھے ماں باپ اور تین چھوٹے بھائی بہن ہیں، ان کی کفالت میرے ذمے ہے، میرے ماں باپ بہت ضعیف ہیں۔ ہم جنگل میں تیندو کے پتے چننے کا کام کرتے ہیں۔ وہ اب بیمار رہتے ہیں، میں اکیلی اتنے پتے نہیں چن سکتی، اور ٹھیکے دار مجھے اس سے زیادہ کام نہیں دیتا، ناچار میں ان لوگوں کے ساتھ آگئی۔ بعد میں مجھے ان کی گفتگو سے جب یہ پتا چلا کہ یہ تو درحقیقت اسی ہیرے کی تلاش میں آئے ہیں تو میں چونک پڑی اور اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر پہنچانے کے لیے بے چین ہو گئی مگر بدقسمتی سے یہاں سے مجھے جانے کی اجازت نہیں دی گئی اور تب مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ یہ لوگ ہمیں صرف عیاشی کے لیے ہی نہیں لائے تھے بلکہ اپنا غلام بھی بنا کر رکھنا چاہتے تھے، سو مجھے فرار کی اور کوئی راہ نہ ملی تو میں نے شہزی کے ساتھ خفیہ ساز باز کر لی۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے سوشیلا کی طرف دیکھا۔ میری طرح اسے بھی اس کی اس نئی کہانی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''اس وقت ہمارے نزدیک اس سے زیادہ اہم معاملات ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ سب سے پہلے اس لانچ پر اپنے قبضے کو یقینی بنانا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم میں سے کوئی اسے پائلٹ کرے۔''

''اس پر قبضے کی کیا ضرورت ہے؟'' چندر کلا بولی۔ ''یہاں لائف بوٹ ضرور موجود ہوگی۔ ہم اس میں سوار ہو کر بہ آسانی بالاسور کے ساحل پر اتر جاتے ہیں۔''

''میں ابھی اس بوٹ سے دست بردار نہیں ہو سکتا، ابھی میرے اس سے بہت سے مفادات وابستہ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تھوڑا بہت تجربہ تو ہے، اگر کوشش کروں اور اس کا میکینزم سمجھ میں آجائے تو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' سوشیلا کے خیالات مجھ سے میل کھاتے تھے، چندر کلا سے زیادہ میں اس کے لیے قابلِ بھروسا ساتھی تھا اور وہ میرے لیے۔ لہٰذا میں نے فوراً کہا۔

''اس سے زیادہ بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ آؤ پھر پائلٹ روم میں چلتے ہیں۔''

''ٹھہرو......!'' معاً چندر کلا نے تیز سی آواز میں کہا اور ہم دونوں قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ نال والا پستول نظر آرہا تھا۔ جس کا رخ ہماری طرف ہی تھا۔ میرے چہرے پہ سناٹے بکھرتے چلے گئے۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

اس بے عیب منصوبے کی روداد جس میں معمولی سی دراڑ آگئی تھی...

دو متضاد طبیعتوں کے مالک میاں بیوی کامیاب زندگی گزارتے ہیں تو کہیں طبیعتوں کا یہی تضاد انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے... مغرب کے مخصوص ماحول میں گندھی تحریر جہاں ان کے تہواروں کو نہایت جوش اور منفرد انداز میں منانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے... ایک ایسے ہی تہوار کی پُرجوش تقریب کا احوال... ہر مہمان متبادل چہرے کے ساتھ موجود تھا...

ایس انور

الٹی تدبیر

''میک، میں واقعی میں کوئی ہیلووین پارٹی نہیں کرنا چاہتی۔''

میک نے اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جب تم میری مخالفت کی کوشش کرتی ہو تو اس وقت بھی واقعی بے حد کیوٹ لگتی ہو۔''

جینی کے پچاس برس سے اوپر کے گھٹنے جتنی تیزی کے ساتھ اسے اجازت دے سکتے تھے، وہ ڈائننگ روم کی کرسی پر سے اتنی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میک،

ہم آخرکار اپنے لیے گھر بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور تم یہاں لوگوں کا جمگھٹا لگانا چاہتے ہو۔"

"ویل اگر تم یہ سوچ رہی ہو تو ایسی کوئی بات نہیں ہے ہنی۔" میک نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی۔ صرف چند ایک پڑوسی اور کچھ پرانے دوست ہوں گے جو صرف چند گھنٹوں کے لیے اکٹھا ہوں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ کاسٹیوم میں آئیں۔ یہاں لٹکے ہوئے سیبوں کو منہ سے لپکنے کا کھیل ---- اور دیگر تفریحی اشیا ہوں گی۔"

جینی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے شوہر کو تکنے لگی۔ "میں قسم کھاتی ہوں کہ تمام بچے گھر سے باہر نکلے ہوئے نہیں ہیں۔ میرے پاس ابھی بھی یہاں ایک بارہ سالہ بچہ رہ رہا ہے۔"

میک نے کھی کھی کرتے ہوئے اخبار دوبارہ اٹھالیا اور جھک کر ایک بار پھر نظریں اخبار پر جما دیں۔ وہ جیت چکا تھا۔ جب بھی جینی کی جانب سے بارہ سالہ بچے کا حوالہ دیا جاتا تھا تو وہ سمجھ جاتا تھا کہ جینی نے اپنی بات کی ہار مان لی ہے اور اس کی جیت ہوگئی ہے۔

جینی نے ایک آہ بھری۔ "اوکے، لیکن پندرہ سے زیادہ لوگ نہیں ہونے چاہئیں۔ سمجھ گئے۔ دیٹس آل۔"

"دیٹس آل۔" میک کو اپنی ہنسی دبانے میں مشکل پیش آئی۔

جینی جانتی تھی کہ یہ کام بھی اسی کو کرنا ہوگا۔ وہ اٹھی اور ڈائننگ روم کی میز کی طرف چل پڑی۔ جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ پیڈ اور ایک پینسل تھی۔ "میں مہمانوں کی فہرست بنانا شروع کرتی ہوں لیکن ----"

"لیکن کیا؟" میک نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم .... مجھے نہیں معلوم۔" جینی نے جواب دیا اور پھر چند نام لکھنا شروع کردیے۔

☆☆☆

جب تہوار کا وہ دن ڈھلنے لگا تو اس وقت تک انہوں نے گھر کو کارڈ بورڈ کے شوخ بھڑکیلے رنگوں کے مصنوعی انسانی ڈھانچوں اور کاغذی پیٹھوں سے سجالیا تھا۔ ان کے ڈائننگ روم کی بڑی سی میز فنگر فوڈ اور ڈیزرٹ بوفے میں تبدیل ہوچکی تھی۔ میک نے لٹکے ہوئے سیبوں کو منہ سے لپک کر کھانے کے آئیڈیے کو رد کردیا تھا کیونکہ انہوں نے حال ہی میں فرش پر نئے قالین بچھائے تھے اور وہ ان قالینوں کو گندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سی ڈی پلیئر پر بھوت گھروں کی موسیقی تیار تھی لیکن نہ تو جینی اور نہ ہی میک کو یاد رہا تھا کہ آئی فون اسپیکرز کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے جو ان کے بیٹے نے انہیں دیا تھا۔

نچلی منزل کے فیملی روم میں انہوں نے ایک بڑے سے فلیٹ اسکرین کے سامنے چند کرسیاں سیٹ کردی تھیں جہاں وہ اپنے مہمانوں کو ایک پرانی ڈراؤنی فلم دکھانا چاہتے تھے۔

جینی نے وکٹورین عہد کا لباس پہنا ہوا تھا جبکہ میک نے سول وار کا فوجی یونیفارم زیب تن کیا ہوا تھا۔ یہ لباس انہوں نے اپنے رشتے داروں سے مستعار لیے تھے۔ وہ سیب سے تیار کردہ مشروب کو چکھنے لگے۔ میک نے اپنا سرخ پیپر کپ جینی کی جانب بلند کیا اور بولا۔ "تمہارے اعزاز میں مائی ڈیئر!"

جینی نے فوراً ہی گھٹنے جھکا کر اسے بھونڈے انداز میں تعظیم دی۔

"کیا بیئر کا پیپا تیار ہے؟" میک نے پوچھا۔

"عقبی پورچ میں رکھا ہوا ہے۔" جینی نے بتایا۔ "میں بس یہی چاہتی ہوں کہ بہت زیادہ پیا پلایا نہ ہو۔"

"ہنی، پریشان مت ہو۔ ٹھیک ہے، ہر کوئی اعتدال میں رہے گا۔ ان میں سے بیشتر پیدل ہی آئیں گے کیونکہ زیادہ تر مہمان پڑوسی ہی ہیں۔"

جینی نے ایک مڑے ہوئے آرائشی ڈھانچے کو سیدھا کیا اور اسے متشکک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بس مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے ...."

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ میک داخلی ہال کی جانب چل دیا۔

"ہمارے پہلے مہمان آئے ہیں۔" میک نے بلند آواز سے کہا۔

وہ مہمان سانتا کلاز کے کاسٹیوم میں تھا۔ مہمان پر نظر پڑنے سے پہلے ہی جینی کو میک کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ ان کا موٹا پڑوسی سام تھا جو سانتا کلاز کے حلیے میں اندر آرہا تھا.... جبکہ حقیقت میں وہ ایک گول مٹول گیند کے مانند لگ رہا تھا۔ "سانتا اتنا برا بھی نہیں ہوتا۔" جینی خود سے بڑبڑائی۔

"زبردست لباس ہے، سام۔" میک نے کہا۔

برے سانتا کے حلیے میں موجود سام افسردہ سا ہو گیا۔ "تم نے کیسے پہچان لیا کہ یہ میں ہوں؟"

میک نے اس کی بڑی سی توند کو تھپتھپایا۔ "تم نے یہاں کوئی تکیہ وغیرہ نہیں چھپایا ہوا ہے۔"

"یقیناً اس میں ہوا بھرائی ہوئی ہے۔" سام نے جواب دیا۔ "گزشتہ تھینکس گوونگ ڈے کے لذیذ کھانوں کی۔"

دونوں افراد ہنستے ہوئے ڈائننگ روم میں چلے گئے جہاں جینی اپنے مہمان کے لیے بیئر کا ایک کپ لیے انتظار کررہی تھی۔

"یہ زبردست جگہ لگ رہی ہے۔" سام نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں نے اسے اس طرح کی ہیلووین پارٹی کے انداز میں سجایا ہوا ہے جیسے کہ ہمارے بچپن کی پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔"

"لیکن یہاں لٹکے ہوئے سیبوں کو منہ سے لپکنے کا معاملہ نہیں ہے۔" میک نے کہا۔ "دراصل ہمارے قالین بالکل نئے ہیں۔"

"کرسٹی کہاں ہے؟" جینی نے سام سے اس کی بیوی کے بارے میں پوچھا۔

سام نے شانے اچکا دیے۔ "وہ نہیں آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے ہیلووین پسند نہیں ہے۔" سام نے سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ "عجیب عورت ہے۔ کہتی ہے کہ اسے ان پارٹیوں سے اختلاج ہونے لگتا ہے۔"

"ہوں۔" جینی بس اتنا کہہ کر رہ گئی۔

میک نے سام کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولا۔ "بہت احمقانہ باتیں ہوگئیں۔ ہمیں ہیلووین سے بالکل اسی طرح لطف اندوز ہونا ہے جیسا کہ ہم اپنے بچپن میں ہوا کرتے تھے۔ تم اپنی پسندیدہ اشیا سے خود اپنی پلیٹ تیار کرلو۔"

میک سی ڈی پلیئر کی جانب چلا گیا اور ڈراؤنی موسیقی کا ٹیپ آن کردیا جبکہ جینی نے مہمانوں کے استقبال کے لیے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جو وقفے وقفے سے آنا شروع ہوگئے تھے۔

ایک جوڑا کتے اور بلی کے لباس میں تھا۔ یہ میاں بیوی تھے جو عام طور پر آپس میں کتے اور بلی کے مانند لڑا کرتے تھے۔ کچھ نے لازمی طور پر چڑیلوں کے کاسٹیوم پہنے ہوئے تھے جبکہ دیگر سادے اور سہل کاسٹیوم میں تھے جیسے ہپی، آوارہ گرد یا کاؤبوائے۔

جینی میزبانی کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف تھی اور مہمانوں کو مشروبات پیش کررہی تھی۔ میک کمرے میں ہر ایک کے ساتھ گپ شپ کرتا پھر رہا تھا۔ مہمان خود بھی خوش گپیاں کررہے تھے۔ نومولود پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے بارے میں، کالج میں پڑھنے والے بچوں کے بارے میں، گریجویشن کرنے والے بچوں کے بارے میں۔

اس سال ان کے ٹاؤن شپ میں ٹرک اینڈ ٹریٹ نائٹ کے ختم ہوجانے کے بعد میک اور جینی کی پارٹی کا آغاز ہوا۔ میک نے بچی ہوئی ٹریٹ کی اشیا ایک بڑے سے

کترنیں

جدید انٹرویو

ایک شخص کا جاب کے لیے انٹرویو ہو رہا تھا۔

پہلا سوال: آپ یہ بتائیں اگر ایک ہوائی جہاز پر پانچ سو اینٹیں لدی ہیں۔ اگر ایک اینٹ گر جائے تو باقی کتنی بچیں گی؟

امیدوار: چار سو ننانوے۔

دوسرا سوال: فریج میں ہاتھی رکھنے کے تین مراحل بتائیں؟

امیدوار: فریج کھولا، ہاتھی رکھا اور فریج بند کردیا۔

تیسرا سوال: فریج میں ہرن رکھنے کے چار مراحل بتائیں؟

امیدوار: فریج کھولا، ہاتھی نکالا، ہرن رکھا اور فریج بند کردیا۔

چوتھا سوال: جنگل میں شیر کی سالگرہ ہے سب جانور آئے ہیں۔ ماسوائے ایک کے۔ کیوں؟

امیدوار: ہرن، کیونکہ وہ تو فریج میں ہے۔

پانچواں سوال: ایک بوڑھی عورت ایک ایسا دریا جہاں مگرمچھ رہتے ہیں، بے خوف و خطر پار کررہی ہے کیسے؟

امیدوار: مگرمچھ تو شیر کی سالگرہ پر گئے ہوئے ہیں۔

آخری سوال: لیکن عورت دریا پار نہیں کرسکی۔ وہ راستے میں ہی مرگئی۔ کیسے؟

امیدوار: پریشان ہوکے۔ وہ ڈوب گئی۔

انٹرویور: آپ جاسکتے ہیں۔ وہ جہاز سے گرنے والی اینٹ لگنے سے ہلاک ہوئی۔

پیالے میں جمع کر لیں اور اس پیالے کو داخلی راہداری میں ایک میز پر رکھ دیا تا کہ اس کے مہمان رخصت ہوتے وقت چاہیں تو مٹھی بھر ٹریٹ گھر بھی ساتھ لیتے جائیں۔

اسے اور جینی کو یہ لالچ نہیں تھا کہ مہمانوں کی تواضع کی چیزیں بچ جائیں البتہ میک دل ہی دل میں یہ آس لگائے ہوئے تھا کہ پورچ میں موجود بیئر کے پیپے میں کچھ نہ کچھ ضرور بچ جائے۔

جب میک نے دیکھ لیا کہ ہر کوئی مشروبات اور کھانے پینے سے فارغ ہو چکا ہے تو اس نے گونجتی آواز میں سب کو مخاطب کیا۔ ''سب لوگ اب نچلی منزل کے میک تھیٹر روم میں چلیں جہاں آرام دہ سیٹیں تو نہیں ہیں لیکن انٹرٹینمنٹ کے لیے بہت بڑے اسکرین کا ٹی وی موجود ہے۔''

لیکن اس سے پیشتر کہ میک اپنے مہمانوں کو نچلی منزل پر لے جاتا، دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

میک نے دروازہ کھولا تو فرینک اسٹائن عفریت کے کاسٹیوم میں ایک اور مہمان کی آمد ہوئی تھی۔ اس مہمان کا پورا لباس سیاہ رنگ کا تھا اور چہرے پر سبز رنگ کا نصف ماسک تھا جس پر اسٹچز اور بولٹس بنے ہوئے تھے۔

''جارج، میں جانتا ہوں، یہ تم ہو۔ یہ اس وقت سے تمہارا پسندیدہ کردار رہا ہے جب ہم بچے ہوا کرتے تھے۔۔۔ فرینک اسٹائن!'' میک نے کہا۔ ''اور تمہاری بیوی کہاں ہے؟''

''بہن کے پاس ہے۔'' بھرائی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

''ٹھیک ہے، تم اسے بتا دینا کہ یہاں پارٹی میں تم کتنا لطف اندوز ہوئے تھے۔'' میک نے کہا۔

جواب میں وہی غراہٹ کی سی آواز آئی۔

میک اپنے دیگر مہمانوں کی جانب گھوم گیا۔ ''شب کے مہمانوں کی تعداد مکمل ہو گئی۔ ہمارے آخری مہمان تاریخ کے انتہائی مشہور سائنسی تجربے کے حوالے سے پہچانے جا سکتے ہیں۔''

فرینک اسٹائن کاسٹیوم میں ملبوس شخص نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے حلق سے ایک بار پھر غراہٹ سنائی دی۔

''اور وہ اس کردار کو پوری طرح نباہ رہا ہے۔'' میک نے کہا۔ ''کردار کے مانند یہ بھی زیادہ بولنے سے گریز کر رہا ہے۔''

اس بات پر کردار نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا جیسے میک کی تائید کر رہا ہو۔ اس مرتبہ بھی اس کے حلق سے صرف غراہٹ سی بلند ہوئی تھی۔

میک نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور اپنے دوستوں کو نیچے چلنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ فیملی روم میں داخل ہو رہے تھے تو جینی نے میک سے کہا۔ ''تم نے یہ بات تو کبھی نہیں بتائی کہ اس رات کے لیے تم نے کون سی فلم کا انتخاب کیا ہے۔ کیا تمہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ کمپیوٹر اور ٹیلی وژن کو ایک ساتھ کس طرح چلاتے ہیں؟''

''ایزی پیزی۔'' میک نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ اس نے کمپیوٹر سے ٹیلی وژن چلانے کے بارے میں تمام باتیں اس وقت اچھی طرح سمجھ لی تھیں جب ان کا بیٹا ان کے یہاں آیا ہوا تھا اور اس نے میک کو ٹربل شوٹنگ کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اب وہ خود ہی سب کچھ کر سکتا تھا۔ ''ایزی پیزی، رائٹ؟''

اور ایسا ہی ہوا۔ میک کو خود بھی حیرانی ہوئی کہ اسے سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ مووی شیئرنگ سائٹ پر لاگ آن ہوا اور وہ فلم ڈاؤن لوڈ کر لی جو اس نے منتخب کی تھی۔ پھر تکنیکی ساحری سے کام لیتے ہوئے وہ فلم کمپیوٹر سے بڑے سے فلیٹ اسکرین پر لے آیا۔

جب وہ مووی اسکرین پر چلنا شروع ہوئی تو کمرے میں تفریح کے لیے آنے والے مہمانوں کے منہ سے ''اوہ!'' اور ''آہ'' کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

وہ فلم ''نائٹ آف دی لیونگ ڈیڈ'' تھی۔

''آج کی رات کوئی بھی دروازہ مت کھولنا۔'' کسی نے آواز لگائی۔

سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔

تاریک فیملی روم میں یہ بلیک اینڈ وائٹ مسلکی کلاسک فلم کسی عہد کی عکاسی نہیں کر رہی تھی۔ میک کو بھی جو اس فلم کو متعدد بار دیکھ چکا تھا، اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ فلم جب درمیان میں پہنچی تو میک نے وقفے کا اعلان کر دیا تا کہ دوبارہ فلم شروع ہونے سے پہلے ہر کوئی اپنی اپنی پلیٹ اور کپ کھانے پینے کی اشیا

مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ''لیکن اس وقت تک سب کچھ ٹھیک رہے گا اگر کوئی لاش جس میں جادو کے زور سے جان ڈال دی گئی ہو، آج رات ہمارے دروازے پر نہ نمودار ہو جائے۔''

''اسمارٹی۔'' میک نے جینی کے گال پر چٹکی لے لی۔

نصف شب تک فلم اختتام پذیر ہو گئی۔ ڈائننگ روم کی میز پر سے کھانے پینے کی اشیا بھی تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ کاسٹیوم میں ملبوس مہمانوں نے اپنے اپنے گھروں کو جانا شروع کر دیا۔

جینی اور میک اپنے گھر کی داخلی راہداری میں کھڑے ہو گئے اور اپنے مہمانوں کو گلے لگا کر رخصت کرنے لگے۔ بیشتر مہمان میز کے پاس رک کر پیالے میں سے ٹرک اینڈ ٹریٹ نائٹ کی بچی ہوئی ہیلووین ٹافیاں اور کینڈیز گھر ساتھ لے جانے کے لیے مٹھی میں بھرتے رہے۔

فرینک اسٹائن کے کاسٹیوم میں ملبوس جارج رخصت ہونے والوں میں سب سے آخر میں تھا۔

''جارج، مجھے فون ضرور کرنا۔'' میک نے کہا۔ ''جب سے ہم پرانے محلے سے یہاں منتقل ہوئے ہیں ہماری کیرول اور تم سے ملاقات ہی مشکل سے ہوتی ہے۔''

فرینک اسٹائن کے کاسٹیوم میں ملبوس جارج کے حلق سے اس بار بھی غراہٹ کی سی آواز نکلی اور اس نے پیالے سے کچھ کینڈیز مٹھی میں بھر لیں۔

''یہ ابھی تک اپنے کردار کے روپ میں ہے۔'' جینی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج رات بچوں کو ڈرانا مت شروع کر دینا۔''

وہ فرینک اسٹائن کو روش پر سے گزر کر فٹ پاتھ تک جاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اپنا دروازہ بند کر دیا۔ پھر میک نے جینی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم صفائی کا کام صبح تک کے لیے چھوڑ سکتی ہو میری سیکسی بیوی؟''

جینی کھلکھلانے لگی۔ ''مہمانوں کے جاتے ہی تمہیں مستیاں سوجھ رہی ہیں۔''

☆☆☆

اگلے روز صبح وہ دونوں کچن میں تھے۔ کاؤنٹر پر رکھا ہوا چھوٹا ٹیلی وژن آن تھا اور اس پر مقامی نیوز اسٹیشن کی نشریات آ رہی تھیں۔

میک کپ میں موجود کافی کی چسکیاں لے رہا تھا جبکہ جینی گزشتہ شب کی پارٹی کے بچے کھچے کو سمیٹنے میں مصروف تھی۔ وہ اپنے شوہر کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔ ''میرا خیال تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔''

میک نے سر اٹھا کر جینی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں نے جو تمہاری مدد کی تھی، وہ؟''

جینی نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈش صاف کرنے والا چھوٹا تولیا میک کو دے مارا اور کوڑے کی ایک تھیلی اٹھا کر ڈائننگ روم کی جانب پلٹ گئی۔

اچانک اسے میک کی آواز سنائی دی۔ ''فوراً! اِدھر آؤ، جینی!''

وہ لپک کر کچن میں پہنچ گئی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ذرا خبریں تو سنو۔'' میک نے ٹیلی وژن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹی وی اینکر کی جانب متوجہ ہونے کے بعد جینی کو اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہونے لگیں اور وہ میک کے برابر میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اوہ، ڈیئر گاڈ!'' اس نے سرگوشی کے

انداز میں کہا۔ ''بے چارہ جارج۔ اگر وہ بھی کیرول کے ساتھ ہوتا ....''

''تو شاید ان دونوں کو شوٹ کر دیا جاتا۔ کیرول کو صرف اس تھوڑی سی رقم کے لیے قتل کر دیا گیا جو اس کے پرس میں موجود تھی اور وہ بھی ان کے گھر کے عین باہر۔''

''اوہ، ہنی، ہمیں جارج کو فون کرنا چاہیے۔''

میک نے فون ملایا لیکن جواب نہیں ملا۔ اس نے آنسرنگ مشین پر پیغام چھوڑ دیا۔ ''شاید وہ فون کالز موصول نہ کر رہا ہو۔''

''یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گی، اگر....''

میک نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''ایسا سوچو بھی مت۔''

اتنے میں دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ میک جواب دینے کے لیے دروازے کی جانب چلا گیا۔

جینی کو باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میک صاف ستھرے سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان کو ساتھ لیے کچن میں آ گیا۔

''ہنی، یہ سراغ رساں لینڈس ہے۔ یہ گزشتہ شب کے بارے میں ہم سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہے۔''

''گزشتہ شب کے بارے میں؟'' جینی کے چہرے پر الجھن کے آثار امڈ آئے۔

''یس میڈم۔'' اس نوجوان نے اپنی نوٹ بک میں دیکھا اور بولا۔ ''جارج گریفن گزشتہ شب.... آٹھ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک یہاں موجود تھا؟''

''ہاں۔''

''تمام وقت؟ وہ درمیان میں کہیں نہیں گیا تھا؟''

''وہ تمام وقت یہیں موجود تھا۔'' میک نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' سراغ رساں نے اس سوال پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں بالکل یقین سے کہہ رہا ہوں۔ ہم بیشتر وقت نچلی منزل پر اپنے فیملی روم میں مووی دیکھتے رہے تھے۔'' میک نے بتایا۔

''اس فیملی روم سے باہر جانے کا اندرونی زینے کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا میں وہ فیملی روم دیکھ سکتا ہوں؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''یقینا، اس طرف آ جاؤ۔'' میک نے اشارہ کیا اور نوجوان کو اپنے ہمراہ لے کر نیچے فیملی روم میں چلا گیا۔

وہ دونوں چند ہی منٹ کے بعد واپس آ گئے۔

''کیا تم مجھے ان دیگر افراد کے نام دے سکتے ہو جو تمہاری رات کی پارٹی میں شریک تھے؟'' سراغ رساں نے کہا۔

اس مرتبہ جواب جینی نے دیا۔ ''کیوں نہیں۔ مجھے نام دینے میں صرف چند منٹ لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سراغ رساں لینڈس نے کہا۔

''میں تمہیں اپنے مہمانوں کی فہرست دے سکتی ہوں۔ اس میں ان کے پتے بھی درج ہیں۔ میں نے انہیں یہ احمقانہ دعوت نامے بھیجے تھے۔ جانتے ہو ویسے ہی جیسے ہم اپنے بچپن میں استعمال کیا کرتے تھے۔'' جینی یہ کہتے ہوئے اٹھی اور ڈائننگ روم میں چلی گئی۔

جب وہ پلٹ کر آئی تو فہرست اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہ فہرست نوجوان سراغ رساں کو تھما دی۔ ''میں بے حد معذرت خواہ ہوں سراغ رساں۔ میں نے تمہیں کافی کے ایک کپ تک کی پیشکش نہیں کی۔ اس معاملے نے مجھے بے حد اپ سیٹ کر رکھا ہے۔ ہم جارج اور کیرول کے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔''

سراغ رساں لینڈس مسکرا دیا۔ ''او کے، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔''

میک سراغ رساں کی جانب گھوم گیا۔ ''کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ تمام سوالات جارج کے بارے میں کیوں کیے جا رہے ہیں؟''

''بس قتل کی تحقیقات کی معمول کی روٹین کے سلسلے میں۔''

جینی اس جواب پر مطمئن نہیں ہوئی۔ ''لیکن خبروں میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ گھر آ رہی تھی تو اسے سرِ راہ دھونس دے کر لوٹا گیا ہے۔''

''ہم تمام امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں، میڈم۔''

میک اپنی بیوی کی جانب کھسک گیا اور تسلی دینے کے انداز میں اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیا۔

''مسٹر اینڈ مسز میک، چونکہ تم دونوں کبھی ان کے پڑوسی تھے تو تمہارے علم میں ایسا کچھ ہے کہ مسٹر اور مسز جارج کے درمیان کسی قسم کی کوئی پرابلم رہی ہو؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

میک نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں۔''

لیکن جینی خاموش تھی۔ میک نے محسوس کیا کہ اس سوال پر جینی کا جسم کچھ تن گیا تھا۔ جینی کے رویے میں اس تبدیلی کو سراغ رساں نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اس نے جینی کی طرف دیکھا اور استفہامیہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''میڈم؟''

جینی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آئی ایم سوری، ہنی۔ کیرول نے مجھے رازداری کی قسم دے رکھی تھی۔ میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتی تھی۔''

''کیا بات تھی، مسز میک؟'' سراغ رساں کا لہجہ ملائم تھا۔

''جارج اُسے مارتا پیٹتا تھا۔''

یہ سن کر میک نے تیزی سے ایک گہرا سانس لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''نہیں۔''

جینی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ''میں نے چوٹ کے نشانات خود دیکھے تھے۔ ایسا کئی بار ہوا تھا البتہ وہ میرے پاس اس حالت میں صرف ایک مرتبہ آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ رپورٹ درج کرا دے۔ لیکن میرے خیال میں اس نے ایسا نہیں کیا۔''

سراغ رساں لینڈس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔ ''ہاں، اس نے رپورٹ تو کی تھی .... ایک بار نہیں کئی بار۔ لیکن الزام عائد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ہمارے پاس اس پر تشدد کی تصویریں موجود ہیں۔''

میک سر ہلانے لگا۔ ''لیکن وہ تو اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا تھا....''

''ہاں، ایسے لوگ بظاہر اپنی بیویوں سے اتنی ہی زیادہ محبت کیا کرتے ہیں۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر تم لوگوں کو اور کوئی بات یاد آ جائے تو ....''

میک کرسی پر یوں بیٹھا رہ گیا تھا جیسے بے حد تھک گیا ہو۔

سراغ رساں سے کارڈ جینی نے لے لیا۔ ''ٹھیک ہے، ہم ضرور بتا دیں گے۔''

پھر وہ سراغ رساں کو رخصت کرنے دروازے تک چلی گئی۔

جب وہ پلٹ کر واپس کچن میں آئی تو ٹیلی وژن بند تھا اور میک کی نظریں باہر ان کے عقبی صحن میں کہیں تکے جا رہی تھیں۔ ''آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ بند دروازوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہوتا ہے۔'' میک نے کہا۔ ''وہ تو اس سے اتنا زیادہ پیار کرتا تھا۔''

جینی اس کے برابر میں بیٹھ گئی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔

''لیکن کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ جارج اس وقت کہاں تھا جب کیرول..... کیرول کا قتل ہوا۔ ہم موقع واردات پر اس کی عدم موجودگی کا ثبوت ہیں۔'' میک نے کہا۔ اس کی نظریں بدستور باہر جمی ہوئی تھیں۔

جینی کچھ نہ بولی۔ بس اس کا شانہ تھپتھپانے لگی۔

جینی کو جارج اور کیرول کی پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ کوئی بات درست نہیں تھی لیکن اس بات کی ذہن میں نشاندہی نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی بات .... ایسی بات جو ان کی پارٹی سے متعلق تھی .... یا پھر جارج کے بارے میں کوئی بات تھی؟

لیکن میک اس معاملے پر سوچنے سے گریز کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''دیکھو، میں جانتا ہوں کہ تم اپ سیٹ ہو۔ اسی طرح میں بھی ہوں۔ چلو اس بارے میں باتیں کرتے ہیں۔''

جینی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں ابھی تیار نہیں ہوں۔'' اس نے چند پیپر کپ اور پلیٹیں کوڑے کی تھیلی میں ڈالے

پری

''ہاں، تو بیٹا! میں کہہ رہی تھی کہ کوہ قاف میں ایک پری تھی۔ ایک دن وہ اڑتے ہوئے سمندر پر سے گزر رہی تھی کہ......!''

پوتے نے دادی کی کہانی میں یکا یک قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''دادی ماں...... دادی ماں...... کیا پریاں واقعی اڑتی ہیں؟''

''ہاں، بیٹا! اللہ میاں نے ان کو پر دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کبوتروں اور چڑیوں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔''

''لیکن ہمارے پڑوس والی آنٹی تو نہیں اڑتیں!'' بچے نے اٹھلا کر شکوہ کیا۔

''بیٹے...... وہ ہم تم جیسی ہیں...... وہ پری نہیں ہیں!''

''لیکن بابا تو شام کو انہیں گلے لگا کر کہہ رہے تھے کہ تم میری پیاری پری ہو!''

''چپ ہو جا!'' دادی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''یہ اپنی ماما سے نہ کہہ دینا...... وہ میرے بیٹے کی زندگی اجیرن کر دے گی۔''

کھاریاں سے شبنم شفیق کا انتباہ

ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے بعد میں میرا ذہن تیار ہو جائے۔ اس وقت تو میں صرف غیر ذہنی کام کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ حقیقت میں صرف سوچنا چاہ رہی تھی۔ میک کو جینی سے شادی کیے اتنا عرصہ بیت چکا تھا کہ وہ سمجھ گیا تھا اسے کب پسپائی اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اٹھ کر نیچے فیملی روم میں چلا گیا اور ٹی وی آن کر دیا۔

اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب اس نے جینی کو سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے دیکھا۔

''میرا خیال ہے میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔'' جینی نے اس کے پاس آکر کہا۔

''کس بات کا اندازہ لگا لیا ہے؟'' میک نے پوچھا۔

''یہ کہ جارج نے یہ سب کیسے کیا؟''

میک اس بات پر اپنی بیوی کی صورت تکنے لگا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ ''جارج نے یہ نہیں کیا ہوگا۔ وہ رات بھر ہمارے پاس رہا تھا۔ تم نے خود بھی اُسے دیکھا تھا۔''

''نہیں، میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔'' جینی نے کہا۔ پھر واپس زینے کی جانب پلٹتے ہوئے بولی۔ ''میں سراغ رساں لینڈس کو فون کرنے جا رہی ہوں۔''

☆☆☆

سراغ رساں لینڈس، میک کے لیونگ روم میں ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نوٹ بک اس کی گود میں کھلی ہوئی تھی۔

''مسز میک، یہ یقینی طور پر وہی تھا جو تم نے ہمیں بتایا تھا اور جس سے کیرول جارج کے قتل کے ملزم تک ہماری رہنمائی ہوئی۔''

میک نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''مجھے اب بھی مشکل ہی سے یقین آ رہا ہے۔ مجھے یہ یقین کرنے میں بھی مشکل ہو رہی ہے کہ مجھے کیوں پتا نہیں چلا۔''

''یہ کوئی نئی چال نہیں تھی۔ جارج نے چند سو ڈالر کے عوض کسی کی خدمات فرینک اسٹائن کا لباس پہننے کے لیے مستعار لی تھیں تاکہ یہ ظاہر ہو جیسے وہ خود پارٹی میں شریک ہے۔ جیسا کہ تم نے بتایا وہ حقیقت میں کوئی بات نہیں کر رہا تھا اور کردار کے مانند بولنے سے گریز کرتے ہوئے صرف حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکال رہا تھا۔ کاسٹیوم پہننے والے شخص کو اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ کسی قتل میں مددگار بن رہا ہے۔ جب ہم نے اسے تلاش کیا تو اسے پتا چلا کہ حقیقت کیا تھی۔ جب ہم نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا۔

''میں حقیقت میں اُسے جارج ہی سمجھا تھا.... عفریت کہیں کا۔'' میک نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرا میری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔''

''ہمیں شاید پتا ہی نہ چلتا کہ تمہاری پارٹی میں شریک وہ کوئی بناوٹی تھا اگر تمہاری بیوی کو یہ یاد نہ آتا کہ اصلی جارج گریفن کو مونگ پھلی سے الرجی تھی اور ....''

''وہ بناوٹی ٹرک اینڈ ٹریٹ کے پیالے میں سے اسنکرز کی بار اٹھانے کے بعد اسے کھول کر چباتا ہوا گھر سے باہر نکلا تھا اور فٹ پاتھ تک اسے جاتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا۔'' جینی نے بتایا۔ ''اگر وہ حقیقت میں جارج ہوتا تو وہ ہماری روش تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ مونگ پھلی کی کینڈی بار کھاتے ہی چکرا کر گر پڑتا اور شاید بے ہوش ہو جاتا۔ اسے مونگ پھلی سے اسی نوعیت کی شدید الرجی تھی۔''

''جارج نے تمہاری پارٹی اور اس حقیقت کو استعمال کرتے ہوئے کہ اس کی بیوی اپنی بہن کے پاس جا رہی ہے، اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جو اس کے خیال سے ایک بے عیب قتل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے گیراج کی عقبی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اپنی بیوی کے واپس آنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ آئی تو اس نے اسے گولی مار دی اور اس کا پرس لے لیا تاکہ ایسا ظاہر ہو جیسے یہ رہزنی کی واردات تھی۔ اس کی بیوی بالآخر اس سے طلاق لے رہی تھی اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اُسے قتل کر دینے کا کیا جواز تھا؟'' میک نے کہا۔

سراغ رساں لینڈس نے اپنی نوٹ بک بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایسا اتفاق سے ہو جاتا ہے۔''

☆☆☆

بعد میں میک اور جینی صوفے پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔

میک نے نظریں اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جانتی ہو میں کیا سوچ رہا تھا۔ اگر ہم نے وہ ہیلووین پارٹی نہ کی ہوتی تو شاید کیرول آج زندہ ہوتی۔''

جینی نے اپنی کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ''مجھے شبہ ہے۔ تمام شوہر تمہاری طرح نہیں ہوتے۔''

میک اس دن پہلی بار مسکرایا تھا۔ پھر وہ دوبارہ اپنی کتاب پڑھنے میں مگن ہو گیا۔

دوسری گواہی

محمد زبیر سلیمانی

دل کا موسم اس وقت سہانا اور مست ہوتا ہے جب ہر سو محبتوں کے پھول کھلے ہوں... لیکن پیار کی بہار کے ساتھ دولت کی آکاس بیل پروان چڑھنے لگے تو پھر دل کی سرزمین بنجر ہو جاتی ہے... مکین و مسکن میں ویرانیوں کا راج بڑھنے لگتا ہے... ایک ایسی جفاگزیدہ کہانی... ایک طرف مال و زر کی چکا چوند تھی... تو دوسری جانب یہی دولت موت کے خواہش مند کے لیے جینے کی امنگ تھی... بھوک... پیار اور ہوس گزیدوں کی یکجائی سے جنم لینے والی کہانی...

جھوٹ اور سچ کی گواہی کے درمیان پل پل رنگ بدلتے وقت کا انوکھا فیصلہ...

سارے شہر کی خاک چھان لینے کے بعد ہاشم ستانے کے لیے لاری اڈے کی ایک ٹوٹی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے استاد مٹھو خان کا چائے کا ڈھابا تھا۔

''کیسے ہو ہاشم؟'' وہ چائے دانی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

''جس حال میں دیکھ رہے ہو ویسا ہی ہوں۔'' ہاشم نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی کام ملا؟''

''نہیں یار، کوئی کام نہیں ملا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''چائے پیے گا؟'' مٹھو نے سوال کیا۔

''پیسے نہیں ہیں یار، کل سے سائیں کرم دین کے مزار پر جاؤں گا، وہاں تھوڑا بہت کام مل جاتا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو میں پچھلا ادھار بھی چکتا کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی سی پیالی میں بھاپ اُڑاتی چائے اس کے سامنے آگئی۔ چائے پینے کے بعد وہ اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔

ہاشم ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس کا باپ ایک بینک میں کلرک تھا، اچھی خاصی تنخواہ تھی پھر بینک والوں نے گولڈن ہینڈشیک کے تحت چند لاکھ روپے دے کر اس کو بینک سے فارغ کر دیا۔ اس کے باپ نے وہ پیسا کاروبار میں لگایا۔ ایک ماہ کے اندر کاروبار فلاپ ہوگیا اور اس کا سارا پیسا ڈوب گیا، اس ناکامی کا غم اس کا باپ برداشت نہ کر سکا اور ایک رات ہارٹ فیل ہوجانے کے باعث چل بسا۔ ماں پہلے ہی شوگر کی مریضہ تھی وہ مناسب علاج نہ ہونے کے باعث فالج کے حملے کا شکار ہو کے راہی عدم ہوئی، اس طرح صرف دو سال کے عرصے میں اس کے ماں باپ دنیا چھوڑ گئے اور وہ اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا۔ صرف ایک چچا تھا جو اپنے بچوں کی کفالت سے بھی نالاں تھا۔ اس نے ہاشم کی تنہائی اور غربت دیکھتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ پھر ہاشم نے دو تین جگہوں پر ملازمت کی کوشش کی مگر دیگر پڑھے لکھے لوگوں کی بدحالی دیکھ کر وہ سرکاری یا پرائیویٹ جاب کے بجائے چھوٹے موٹے کام کرنے لگا۔ کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے پہلے والا گھر چھوڑنے کے بعد اب وہ ایک انتہائی بدحال علاقے کے ایک سیلن زدہ فلیٹ کے ایک ایسے کمرے میں رہنے لگا جس میں پہلے ہی سے تین بدقماش قسم کے لوگ رہتے تھے۔

چھوٹے موٹے کام کرتے کرتے اس کو خیال آیا کہ کیوں نہ ٹیوشن سینٹر کھول لیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے نسبتاً اچھے علاقے میں ایک کمرا کرائے پر لیا اور باہر بورڈ لگوا دیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا ٹیوشن سینٹر۔ کلاس 5th سے 10th تک کے طلبا و طالبات کے لیے۔

کام سے آتے ہی وہ اس ٹیوشن سینٹر میں بیٹھ جاتا۔ اس طرح چھ دن گزر گئے مگر کوئی بھی بچہ ٹیوشن پڑھنے نہ آیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ 15 دن بعد اس کے پاس دو اسٹوڈنٹ آئے، ان کی فیس اس کے حساب سے 2 ہزار روپے بنتی تھی مگر انہوں نے 500 روپے فی طالب علم کے حساب سے داخلہ لے لیا۔ وہ تقریباً چھ دن تک آتے رہے ساتویں دن سے اُن کا آنا بند ہوگیا۔ اس کے بعد اس ٹیوشن سینٹر میں مزید کوئی اسٹوڈنٹ نہیں آیا۔ ہاشم نے ایک ماہ مکمل ہونے پر ٹیوشن سینٹر بند کر دیا۔ اب اس کے دماغ میں کہانی نویس بننے کا خیال آیا۔ لہٰذا اس نے ایک کہانی لکھنی شروع کر دی۔ دو دن میں کہانی مکمل کرنے کے بعد وہ کہانی ایک ایڈیٹر کے پاس لے گیا۔ ایڈیٹر نے کہانی کے پہلے دو صفحات پڑھے۔ اکتا کر ہاشم کی جانب دیکھا اور کہا۔

''بیٹا کوئی اور کام کرو، کہانی لکھنا تمہارے بس کی بات نہیں۔'' ہاشم نے اس کو یوں دیکھا جیسے اس کے ایڈیٹر ہونے پر شک ہو۔

''جناب عالی! آپ نے پوری کہانی پڑھی نہیں اور فیصلہ سنا دیا۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کہانی پر فلم بھی بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ سید نور جیسے فلم ساز کے ہاتھ لگ جائے۔'' ہاشم رائے دینے والے انداز میں بولا۔

''تو پھر آپ یہ کہانی سید نور کے پاس لے جایئے۔'' ایڈیٹر بیزاری سے بولا۔ ''اور ہاں جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔'' یہ کہہ کر وہ ایڈیٹر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ہاشم نے بے بسی سے ایڈیٹر کو دیکھا جو شریفانہ انداز میں اس کو کمرے سے نکلنے کا کہہ رہا تھا۔ پھر وہ جاتے ہوئے دروازہ بند کر کے نیچے سڑک پر آگیا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہانی لکھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کہانی پڑھتے ہی ایڈیٹر چونک اٹھے گا۔ اس کے ساتھ معقول تنخواہ پر معاہدہ کرلے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس نے کہانی کے صفحات کو پُرزے پُرزے کیا اور قریبی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

شام کو وہ اپنے دوست مٹھو کے ڈھابے پر تھا۔

''تم نے بڑی جلدی ہمت ہار دی پیارے، ہوسکتا ہے وہ کہانی کسی اور رسالے میں چھپ جاتی مگر تم نے کہانی ہی ضائع کر دی۔ خیر جو ہوا بہتر ہوا، لو چائے پیو۔'' یہ کہہ کر مٹھو خان نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''مٹھو استاد کوئی بزنس بتا۔ حال بہت خراب ہے یار، بمشکل دو وقت کا کھانا کھا سکتا ہوں، اس طرح تو زندگی نہیں گزر سکتی۔'' ہاشم چائے کا ایک ہلکا سے گھونٹ لے کر بولا۔

''کوئی چھوکری پھنسا۔ پیسے والی ہو، چھوکری نہ ہو تو

کوئی بیوہ ہو۔ ایمان سے زندگی بن جائے گی تیری۔ ایک نہیں دو ڈھونڈنا، ایک میرے لیے بھی۔'' یہ کہہ کر مٹھو اپنے گنجے سر کو کھجلانے لگا۔

''نہ اپنے پاس موبائل ہے، نہ گاڑی ہے، یہ کام میرے بس کا نہیں۔ اتنے پھکو آدمی سے تو کوئی 50 سالہ بیوہ بھی شادی نہیں کرے گی یار...... اچھا یار میں چلا۔'' چائے کا کپ ایک طرف رکھا اور اپنے فلیٹ کی جانب چل دیا۔

اس رات اپنے بستر پر جاتے ہی اس نے کسی ایسے کام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو کم پیسے سے شروع ہو اور جلد ہی منافع بخش کاروبار بن جائے مگر کافی سوچ بچار کے باوجود ایسا کوئی بھی کام اس کے ذہن میں نہ آسکا اور پھر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے روز وہ جاگا تو سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اس کے سرہانے ایک میز پر کچن کا مختصر سا سامان رکھا تھا۔ آج تو اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی اور سر میں درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک یونہی لیٹا رہا پھر بغیر دودھ کے اس نے چائے بنائی اور معدے میں انڈیلنے کے بعد وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ نجانے کب تک وہ یونہی آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ وہ تو اس دنیا میں بالکل بے قیمت آدمی ہے۔ نہ کوئی خونی رشتہ نہ کوئی چاہنے والا، نہ گھر، نہ کوئی بزنس سب زیرو۔ کیا فائدہ اس وجود کا۔ یہ سوچ کر اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا پھر یہ سوچنا شروع کیا کہ موت کا کون سا طریقہ سب سے آسان رہے گا پھر اس کو خیال آیا کہ قریب ہی ایک نہر بہہ رہی ہے جس کی گہرائی بارہ فٹ سے زیادہ ہے کیوں نہ پل پر کھڑے ہو کر اس میں چھلانگ لگائی جائے یہ سوچ کر اس نے نہر کا رخ کیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ پل پر کھڑا تھا، اس کے نیچے نہر کا گدلا پانی رواں دواں تھا۔ اس نے آس پاس گزرتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھا۔ پھر وہ پل کے کنارے بنی ہوئی ریلنگ پر چڑھنے لگا۔ دو تین اسٹیپ چڑھنے کے بعد وہ خود کو نہر کے حوالے کرنے کے قریب تھا یکایک کسی نے اس کو گدی سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کے سامنے ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا جو لگ بھگ پینتیس سال کا تھا۔ وہ ہاشم کو تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی تک لایا اور اس کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

ہاشم کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔

''خودکشی کا پروگرام تھا کیا؟'' نوجوان نے اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر سوال کیا۔

''جی ہاں، مگر تم نے مجھے کیوں روکا؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''روکا نہیں، کچھ مہلت دی ہے۔ تم ٹھیک کر رہے تھے یہ دنیا واقعی رہنے کے قابل نہیں مگر مرنے سے پہلے ایک کام کرتے جاؤ۔ میں اس کام کے بدلے تمہیں تین دن تک تمہاری مرضی کی زندگی گزارنے کا موقع دوں گا۔ اس تین دن میں تم بے شک لاکھوں روپے خرچ کر ڈالو، مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ چوتھے دن تم میرا ایک خاص کام کرو گے اس کے بعد موت خودبخود تمہارے مقدر میں لکھ دی جائے گی۔ اگر میں تمہیں بروقت نہ بچاتا تو اس وقت تم کئی فٹ گہرے پانی میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہوتے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

''جی، بالکل ایسے ہی ہو رہا ہوتا۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ اجنبی دوبارہ گویا ہوا۔

''تمہارا لباس، تمہارے جوتے اور تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ خودکشی کی وجہ تمہاری غربت ہے، ہے ناں یہی بات؟'' اجنبی نے سوال کیا۔

''جی بالکل یہی بات ہے۔ جب مجھے اپنے اور گلی میں گھومنے والے کتے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا تو میں نے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔''

نوجوان کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''مجھے رضوان کہتے ہیں اور میں اس ملک کی ایک بہت بڑی ماڈل گرل کا خاوند ہوں، یہ گاڑی اسی کی دی ہوئی ہے۔ ابھی میں تمہیں ایک عالی شان محل میں لے جاؤں گا وہ بھی اسی کا خریدا ہوا ہے۔ تم اگر گلی میں گھومنے والے کتے ہو تو میں اس کی زنجیر سے بندھا ہوا گل ڈاگ ہوں۔ ہم دونوں ایک جیسے ہیں ہاہاہاہا۔''

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر خاموش ہوگیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کو ایک نظر دیکھا پھر اپنی نظریں ونڈ اسکرین پر لگا دیں اور بولا۔ ''کتنے دنوں سے کھانا نہیں کھایا تم نے؟''

''آج دوسرا دن ہے۔'' ہاشم نے مختصراً جواب دیا۔

''گمنامی میں خودکشی کوئی کمال نہیں ہے۔'' اس نے بات شروع کی۔ ''اگر تم نے مرنا ہی ہے تو اس طرح سے مرو کہ ٹی وی میں بریکنگ نیوز چلے۔ کئی دن تک اخبارات میں

شہ سرخیوں سے تمہارے تذکرے ہوں۔ کچھ کر کے مرو اور وہ طریقہ میں تمہیں بتاؤں گا لیکن پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ پھر کچھ دور جا کر اس نے اپنی گاڑی ایک اچھے سے ریسٹورنٹ کے سامنے روکی۔ دونوں نیچے اترے اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ ٹیبل سنبھالتے ہی ایک باوردی ویٹر اُن کے سر پر آن کھڑا ہوا اور مینیو ان کے آگے کر دیا۔

''کیا کھاؤ گے؟'' رضوان نے سوال کیا۔

''دال یا سبزی منگوا لو۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

رضوان مسکرا دیا اور ویٹر کو سب سے عمدہ ڈش لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے کھانے کا ڈھیر لگ گیا۔

''آرام سے اور پیٹ بھر کے کھاؤ۔'' رضوان نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا اور ہاشم اس کے کہنے کے مطابق آرام آرام سے کھانے لگا۔ ایسا شاندار کھانا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھا کر انہوں نے کولڈ ڈرنک پی اور پھر ریسٹورنٹ سے نکل گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی رضوان نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ ہاشم اب ایک نئی دنیا میں تھا۔ کہاں مٹھو خان کی پتلی اور ادھار کی چائے۔ اور کہاں یہ مفت کی ٹھنڈی بوتل۔ کہاں وہ آئے روز کے فاقے اور کہاں آج کا شاندار لنچ۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص اس کو اتنا شاندار ماحول دے کر نہ جانے خودکشی کا کون سا طریقہ بتاتا ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رضوان آخر اس سے کیا چاہتا ہے۔ اس کو کشمکش میں دیکھ کر رضوان نے سوال کیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے ایک خودکشی سے بچا کر دوسری خودکشی کیوں کرانا چاہتے ہو۔ شاندار ماحول اور شاندار کھانے کے بعد تو روح میں تازگی سی آ گئی ہے۔ خودکشی کا ارادہ ملتوی بھی تو ہو سکتا ہے۔''

رضوان کی نظریں بدستور ونڈ اسکرین پر تھیں پھر وہ گویا ہوا۔ ''تم سو فیصد خودکشی کر چکے تھے۔ بس یوں سمجھو کہ تمہیں وقفہ ملا ہے جیسے ڈرامے کے دوران اشتہار چلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ڈراما ختم ہو چکا ہے۔ میں تمہیں ابھی یہاں اتار دوں تو چند دن بعد تم پھر خودکشی کی طرف جاؤ گے کیونکہ دنیا کے اس جنرل اسٹور میں تمہارے خریدنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم مجھے پیدائشی بدقسمت لگتے ہو۔ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ جینے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میری بات سمجھ گئے ہو ناں۔''

''ہاں سمجھ گیا ہوں۔'' ہاشم نے مریل سی آواز میں جواب دیا۔

''ابھی میرا گھر آئے گا، تمہیں وہاں لے چلتا ہوں، سب معلوم ہو جائے گا۔''

پھر دونوں طرف سے خاموشی چھا گئی۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ان کی گاڑی پوش علاقے میں داخل ہو گئی جہاں پر عالی شان بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ سورج بھی غروب ہو رہا تھا اور اسٹریٹ لائٹس آن ہو رہی تھیں۔

''تم سیٹ کے نیچے چھپ جاؤ اس طرح کہ کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے۔'' رضوان نے ہاشم سے کہا۔

''مگر کیوں؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گا، تم چھپو تو سہی۔''

ہاشم پچھلی سیٹ کے پائیدان میں چھپ گیا۔ تھوڑی دور جا کر رضوان نے گاڑی روکی اور زور سے ہارن بجایا۔ تھوڑی دیر بعد سامنے والے بنگلے کا دروازہ کھلا اور رضوان اندر داخل ہو گیا لیکن اس نے اپنی گاڑی کار پورچ سے پہلے روک دی اور گاڑی سے نیچے اتر کر چوکیدار کو بلایا۔

''جی صاحب جی۔'' چوکیدار قریب آ کر بولا۔

رضوان نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کو تھمایا۔ ''سگریٹ لے آؤ۔'' چوکیدار پیسے لے کر بنگلے سے باہر نکل گیا۔ رضوان نے بنگلے کا گیٹ بند کیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ہاشم کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ ہاشم گاڑی سے نکل کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

''وہ دیکھو سامنے دیوار پر سی ٹی وی کیمرا لگا ہوا ہے۔ ہم دونوں گاڑی سمیت اس کی رینج سے باہر ہیں اور ہمیں باہر ہی رہنا ہے۔''

''کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟'' ہاشم نے حیرت سے سوال کیا۔

''فضول سوال مت کرو ہم لان سے ہو کر جائیں گے، آؤ میرے ساتھ۔''

یہ کہہ کر رضوان نے اس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دونوں بیڈروم میں داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی رضوان نے دروازہ بند کر دیا۔ ہاشم گویا ہوا۔ ''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو اور یوں اتنے پُراسرار انداز میں لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں؟''

''بڑے بزدل ہو یار، مت بھولو کہ تم سو فیصد خودکشی کر چکے تھے۔ یہ لمحات جو تم کو ملے ہیں میری مرہونِ منت ہیں۔'' رضوان نے جواب دیا۔

''میں بزدل نہیں ہوں، بزدل لوگ خودکشی نہیں کرتے۔ تم ٹھیک کہتے ہو میری یہ سانسیں ادھار ہیں مگر

معاملے کو اتنا پُراسرار نہ بناؤ جو کہنا ہے کھل کے کہو۔''

رضوان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''چوکیدار کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے کیونکہ اس نے تمہیں نہیں دیکھا۔ تم آہستہ بات کرو، وہ ابھی آتا ہی ہو گا۔''

ہاشم خاموش ہو کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ سامنے دیوار پر بڑا سا ٹی وی لگا ہوا تھا اور دیگر دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ فرنیچر بہت قیمتی تھا۔ کافی دیر تک ان دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ رضوان نے ہاشم کو دروازے کے پیچھے چھپنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔

''یہ لیں صاحب سگریٹ اور یہ بقایا پیسے۔'' چوکیدار تعظیم سے بولا۔

''رکھ لو چاچا، یہ پیسے تم رکھ لو۔'' رضوان نے ملائمت سے کہا۔ چوکیدار سلام کر کے جانا ہی چاہتا تھا کہ رضوان نے اس کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک کر رضوان کو دیکھنے لگا۔

''چاچا اس دفعہ تم گاؤں نہیں گئے، دو تین ماہ تو ہو گئے ہیں تمہیں گئے ہوئے۔'' چوکیدار نے مسکین سی صورت بنا کر رضوان کو دیکھا پھر بولا۔

''صاحب جی کم از کم تین دن کی چھٹی ملے گی تو میں جاؤں گا اور بی بی جی اتنی لمبی چھٹی کہاں دیتی ہیں۔''

رضوان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''چاچا ابھی نو بجے ہیں تم یوں کرو اپنا ضروری سامان لے کر گاؤں چلے جاؤ۔ دس بجے والی ٹرین تمہیں مل جائے گی۔ مزے سے تین چار دن گزارو۔''

چوکیدار نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا۔

''مگر صاحب جی میڈم......''

رضوان نے درمیان میں بات کاٹ کر کہا۔ ''میڈم کی فکر مت کرو، میں کہہ دوں گا کہ تمہارے گاؤں سے ایمرجنسی فون آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے دو دن کی چھٹی دی ہے۔ جاؤ شاباش، اتنی خدمت کرتے ہو اتنا تو حق ہے تمہارا۔''

چوکیدار سلام کر کے چلا گیا۔

رضوان نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاشم بھی دوبارہ صوفے پر آن بیٹھا۔ دونوں جانب سے خاموشی رہی پھر رضوان گویا ہوا۔

''ملیحہ خان کا نام تم نے سنا ہو گا مشہور ماڈل اور ڈراما آرٹسٹ ہے۔''

''ہاں سنا تو ہے اس کے ڈرامے بھی دیکھے ہیں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''ملیحہ خان میری بیوی ہے۔'' رضوان نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ایک وقت تھا جب ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کی خوشامدیں کر کر کے اور ڈراما پروڈیوسروں کے تلوے چاٹ چاٹ کر تھوڑا بہت کام حاصل کر لیتی تھی۔ میں نے اس کے بُرے دنوں میں اسے سہارا دیا۔ اپنی ساری جمع پونجی بیچ کر ایک سیریل میں پیسا لگا کر اس کو ہیروئن بنایا اب جبکہ وہ اس ملک کی ٹاپ کی ماڈل بن چکی ہے وہ مجھ سے دامن چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کی خاطر میں نے باپ سے لڑ جھگڑ کر اپنے حصے کی زمینیں بیچ کر سارا پیسا اس کی سیریل پر لگا دیا۔ گھر والے مجھے دھتکار چکے ہیں اور اب ملیحہ مجھے آنکھیں دکھا رہی ہے۔''

''مگر کیوں؟ وہ تم سے دامن کیوں چھڑانا چاہتی ہے؟'' ہاشم نے سوال کیا۔

رضوان نے ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔ ''آج کل اس کی یاری ایک نئے پروڈیوسر کے ساتھ ہے۔ وہ امریکا سے پروڈکشن کا کورس کر کے آیا ہے اور انٹرنیشنل لیول پر کوئی فلم بنانا چاہتا ہے۔ ملیحہ مکمل طور پر اس پر مرمٹی ہے اور وہ کئی بار مجھ سے الجھ چکی ہے۔ میرے بغیر ایک پل نہ رہنے والی اب پچھلے کئی دنوں سے اس کے بنگلے میں رہائش پذیر ہے۔ اگر اس نے مجھ سے خلع لے لیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا کیونکہ میرے پاس تو اب کچھ نہیں رہا۔'' یہ کہہ کر وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

''تم اس سے اپنی زمینوں والے پیسوں کا تقاضا تو کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بنگلا اور گاڑی تمہیں دے دے۔'' ہاشم نے تبصرہ کیا۔

''وہ لالچی اور خود غرض عورت ہے۔ وہ اس فلم ساز کو بھی تگنی کا ناچ نچائے گی جو آج اس کی زلفوں کا اسیر بن چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ملیحہ آج رات آئے کیونکہ اس کی جیولری یہاں رکھی ہے۔ میرے میسج کے جواب میں اس نے آنے کا ذکر تو کیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ریموٹ سے مختلف چینل بدلنے لگا۔

''لیکن تم مجھے کس لیے یہاں لائے ہو، میں تو ایک بیکار سا انسان ہوں، اس سارے معاملے سے میرا کیا تعلق ہے یار۔'' ہاشم حیرت سے بولا۔

''تعلق ہے۔'' رضوان نے جواب دیا۔ ''اس سے

پہلے کہ وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرے اور میرے انکار کی صورت میں خلع حاصل کرلے میں اس کو ٹھکانے لگادوں گا اور اس کو تم قتل کروگے۔ قتل کے بعد ایسے ثبوت چھوڑو گے جس سے پولیس سیدھا تم تک پہنچ جائے اور تمہیں گرفتار کرلے۔ تم تو ویسے ہی خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ گمنامی میں خودکشی کروگے تو کیا ملے گا۔ ایک مشہور و معروف ماڈل گرل اور ایکٹریس کو قتل کروگے تو پاکستان کیا دنیا بھر کا میڈیا تمہیں ہاتھوں ہاتھ لے گا۔'' پھر وہ خاموش ہوکر ہاشم کے چہرے پر اپنی باتوں کا ردِعمل دیکھنے لگا۔

''میں خودکشی تو کرسکتا ہوں مگر قتل نہیں کرسکتا۔'' ہاشم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''وہ بھی اس عورت کا قتل جس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔'' یہ کہہ کر ہاشم خاموش ہوگیا۔

''ٹھیک ہے اس موضوع پر کچھ دیر بعد بات ہوگی۔ میں کوئی اور راستہ نکالوں گا مگر اس کو راستے سے تو ہٹانا ہے۔'' یہ کہہ کر رضوان نے ریموٹ سے ٹی وی آف کردیا۔

☆☆☆

ملیحہ خان جب نواز شاہ کی لمبی سی کار سے اتر کر اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ نواز شاہ اپنی نئی فلم کا افتتاحی سین کررہا تھا۔ وہ امریکا سے ہدایت کاری کا کورس کرکے آیا تھا اور اپنی ہزاروں کنال زمین کا کچھ حصہ بیچ کر ایک مہنگے بجٹ کی فلم بنا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ملیحہ سے رابطہ کیا اور بھاری معاوضے پر اس کو سائن کرلیا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے یہاں تک کہ دونوں نے مستقبل کے پلان بھی بنالیے تھے۔ نواز شاہ دل و جان سے اس پر مرمٹا تھا اور رضوان سے طلاق لینے پر بھی اس کو راضی کرچکا تھا۔

افتتاحی سین فلم بند کرانے کے بعد جب وہ نواز شاہ کے ساتھ اسٹوڈیو سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ تھکن سے اس کا سر دکھ رہا تھا۔

''خاموش کیوں ہو؟'' نواز شاہ نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر درد کررہا ہے۔'' وہ ماتھے کو مسلتے ہوئے بولی۔

''کہیں رضوان کی محبت تو پاؤں کی زنجیر نہیں بن رہی اسی لیے ٹینشن سے سر میں درد ہوگیا ہو۔'' نواز شاہ نے قدرے طنزیہ انداز میں مگر مسکرا کر کہا۔

''فضول باتیں مت کرو، میں اس سے طلاق لینے کا پکا فیصلہ کرچکی ہوں۔ وہ نکما آدمی میری کمائی پر عیش کررہا ہے۔''

''آج اس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردو۔ یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اچھا ہے۔'' یہ کہہ کر نواز شاہ نے گاڑی کو ملیحہ کے گھر جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی پھر چوکیدار کی آواز سنائی دی۔ ''صاحب جی میں جارہا ہوں گیٹ بند کردیں اور ہاں ابھی میڈم نے فون کیا ہے، وہ ایک گھنٹے تک آجائیں گی۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' رضوان نے جواب دیا۔

''صاحب جی میڈم کو آپ خود بتادینا کہ میری مجبوری تھی گاؤں سے فون آگیا تھا۔'' چوکیدار منمنایا۔

''ہاں یار بتادوں گا، تم جاؤ۔'' رضوان نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غراتے ہوئے کہا۔

''چوکیدار کو فون کرکے اپنے آنے کی اطلاع دے رہی ہے۔ مگر مجھے میسج تک نہیں کیا اس نے۔'' آخر میں ایک موٹی سی گالی دی، پھر وہ باہر چلا گیا اور ایک پستول لے آیا اور اسے لہراتے ہوئے بولا۔ ''ملیحہ خان تمہارا کھیل میں اپنے ہاتھ سے ختم کروں گا۔ جس سنگ مرمر کو تراش کر میں نے بت بنایا آج اسی بت کو اپنے ہاتھ سے توڑوں گا۔'' پھر وہ ہاشم سے مخاطب ہوا۔

''تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول کے میگزین سے تمام گولیاں نکال لیں اور خالی پستول ہاشم کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' ہاشم اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کمرے سے نکل کر رضوان رک گیا اور بولا۔ ''یہ پستول تمہارے ہاتھ میں ہے، تم لان کے راستے سے گیٹ تک جاؤ پھر دبے قدموں چلتے ہوئے کار پورچ کے راستے یہاں آجاؤ اس طرح کہ سی سی ٹی وی کیمرا تمہاری ریکارڈنگ کرسکے۔ مطلب تمہاری ویڈیو بن سکے، تمہارے آنے کا انداز ایسا ہو کہ تمہارا پستول والا ہاتھ صاف نظر آئے۔ بس اس کے بعد تمہارا کام ختم ہوجائے گا، میں تمہیں ایک معقول رقم دوں گا، جاؤ۔''

''یعنی کہ قتل تم کروگے اور پکڑا میں جاؤں گا۔ میں تو پھر اس قتل میں برابر کا شریک ہوجاؤں گا۔'' ہاشم دلیل دینے والے انداز میں بولا۔

''ابے او گھامڑ اپنی فضول دلیل اپنے پاس رکھ، یہ جو تو خود کو قتل کررہا تھا، وہ کیا تھا اور یہاں سے اگر تو یہ کام کیے بغیر واپس چلا جائے گا تو اور کتنے دن جی پائے گا۔ نہ روزگار، نہ رہائش، نہ کوئی سہارا۔ تو نے پھر خودکشی ہی کرنی ہے۔ میں تجھے اس چھوٹے سے کام کے ایک لاکھ روپے دے رہا ہوں اور کیا پتا پولیس تجھ تک پہنچ ہی نہ پائے۔ اس ایک لاکھ سے تو کوئی بھی کاروبار کرسکتا ہے۔ بول کیا کہتا ہے۔ اگر نہیں کرنا تو ابھی اسی وقت واپس چلا جا۔ گیٹ کھلا ہوا ہے۔''

ہاشم کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے نوٹ بکھرنے لگے۔ اس نے پستول کو غور سے دیکھا اور رضوان کی ہدایت کے مطابق ایکٹ کرکے واپس آگیا۔ رضوان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے ہاشم کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور ایک اور کمرے میں جا گھسا دو تین منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں پانچ ہزار والے بیس نوٹ تھے جو اس نے ہاشم کے ہاتھ میں تھمادیے۔

''اب تم جاؤ اس ڈرامے میں تمہارا کردار اب ختم۔ ویسے ضروری نہیں کہ میں اس کو قتل کروں، آج رات اسے منانے کی کوشش کروں گا۔ ہوسکتا ہے وہ مجھ سے طلاق لینے کا خیال دل سے نکال دے۔ اس طرح وہ زندہ رہ پائے گی۔ آج کی رات تو مذاکرات ہوں گے۔ موت یا زندگی کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ وہ آنے والی ہوگی۔ اب تم یہاں سے جاسکتے ہو۔''

ہاشم نے پیسے جیب میں ڈالے اور رضوان کی ہدایت کے مطابق لان کے راستے گیٹ تک پہنچا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد رضوان نے اطمینان کی سانس لی۔ قتل سے پہلے وہ قتل کا ثبوت حاصل کرچکا تھا۔ ایسا ٹھوس ثبوت جو ہاشم کو تختۂ دار تک پہنچا سکتا تھا۔ اب وہ بے چینی سے ملیحہ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

رات دس بجے کے قریب بیل بجی۔ وہ کمرے سے نکل کر گیٹ پر آیا۔ ملیحہ گیٹ پر کھڑی تھی، اس نے نواز شاہ کو پیار سے الوداع کہا اور اندر داخل ہوگئی۔ رضوان نے جب ملیحہ کے ساتھ نواز شاہ کو دیکھا تو اس کا پارا چڑھ گیا مگر خاموش رہا۔ ملیحہ جو کہ رضوان کے بنا ایک پل نہیں رہ سکتی تھی آج کئی دن کی غیر حاضری کے بعد جب گھر پہنچی تو اس نے رضوان کا حال تک نہ پوچھا۔ وہ اندر سے تلملا کر رہ گیا۔ نفرت کی ایک لہر سی اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید وہ اس کا حال پوچھے مگر وہ بدستور سرد رویے کے ساتھ سامنے صوفے پر بیٹھ کر کانوں کے جھمکے اتار رہی تھی۔

''گھر کی یاد آگئی تمہیں؟'' بالآخر رضوان نے بات

مجبوری

وکیل استغاثہ نے خاتون سے کہا۔

''سڑک پر ایک طرف دو آدمی جارہے تھے، دوسری طرف بڑا ہجوم تھا...... اگر تمہاری گاڑی کے بریک خراب ہی ہوگئے تھے تو تمہیں گاڑی کو ان دونوں کی طرف موڑ لینا چاہیے تھا تاکہ زیادہ لوگ ہلاک یا زخمی نہ ہوں...... تم نے ہجوم پر گاڑی کیوں چڑھائی...... بتاؤ...... جواب دو؟''

''میں نے گاڑی ان دونوں کی طرف ہی گھمائی تھی۔'' عورت نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''میری گاڑی کا رخ دیکھتے ہی وہ دونوں بدمعاش چیختے چلاتے ہوئے بھیڑ میں گھس گئے اور مجھے مجبوراً......!''

بات ادھوری رہ گئی کیونکہ خاتون نے اچانک رونا شروع کردیا تھا......

کراچی سے سعدیہ علوی کا عذر

شروع کی۔

''میں طنز سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، بہت تھک چکی ہوں کل بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

رضوان ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

ہاشم جب اپنے گھر پہنچا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ایک لاکھ روپے اس نے اپنی جرابوں میں چھپا رکھے تھے۔ ان روپوں نے اس کے دل میں جینے کی امنگ پیدا کر دی تھی مگر اس کو رہ رہ کر یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ اگر رضوان نے ملیحہ کو قتل کر دیا تو سی سی ٹی وی میں اس کی ریکارڈنگ جلد ہی اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جائے گی اور کم از کم عمر قید یا پھانسی کی سزا اس کا مقدر ہوگی۔ وہ پولیس سے بچنے اور ان روپوں سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس دوران اس کے تمام روم میٹ باری باری اپنے کاموں سے واپس آ چکے تھے۔ وہ نیند کی آس پر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی جرابوں میں پڑے ہوئے نوٹ اس کو زندگی سے محبت کی جانب لے جا رہے تھے اور رضوان کے گھر میں اس کے ناکردہ گناہ کا ثبوت اس کو موت کی جانب لے جا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں اس کو نیند آ گئی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ملیحہ شب خوابی کے لباس میں اندر داخل ہوئی۔

''تم کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہو مگر میں بہت کچھ کہنے کے موڈ میں ہوں۔'' وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''جی فرمایئے۔'' ملیحہ نے بیڈ پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''فرمانا یہ ہے کہ اس نئے چھوکرے کے ساتھ مجھے تمہارا یہ میل ملاپ بالکل پسند نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا تعلق شوبزنس سے ہے جہاں اس قسم کے میل جول لازمی ہوتے ہیں مگر یہ میل جول کاروباری نہیں لگ رہا۔ تم دو تین دن تک مسلسل اس کے پاس رہی ہو۔ دنیا کا کوئی بھی مرد اس قسم کے میل جول کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

ملیحہ نے کچھ دیر تک اس کو دیکھا پھر آرام سے بولی۔

''رضوان اگر تمہیں برداشت نہیں ہوتا تو مجھے چھوڑ دو، ویسے بھی اب مجھے انٹرنیشنل پروجیکٹ مل چکا ہے۔ میں اب پاکستان میں کم ہی نظر آؤں گی۔''

''تمہارے تیور کافی بدلے بدلے سے ہیں۔ لگتا ہے پورا اسکرپٹ لکھا ہے تم نے اور تمہارے نئے یار نے۔ کیا اس کو کنگال کرنے کے بعد کوئی تیسرا تلاش کرو گی۔''

''شٹ اَپ!'' ملیحہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

''یو شٹ اپ۔'' وہ دہاڑا۔

''کیا......! تم نے مجھے گالی دی۔ اب اگر تم نے ایسا کوئی لفظ منہ سے نکالا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔'' وہ غراتے ہوئے بولی۔

رضوان شعلہ بار نگاہوں سے اس کو دیکھتا رہا پھر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''جو دل میں ہے کہہ دو، کیا چاہتی ہو تم؟''

''مجھے طلاق چاہیے۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

''اور اگر میں طلاق نہ دوں تو؟'' رضوان نے سوال کیا۔

''تو میں عدالت چلی جاؤں گی۔ خلع تو مل جائے گا ناں۔''

رضوان نے سرد آہ نکالی۔ ''ٹھیک ہے جب تم تعلق توڑنے پر آمادہ ہو ہی گئی ہو تو پھر مجھے حساب کتاب بھی کر لینے دو۔''

''کیسا حساب کتاب؟'' اس نے سوال کیا۔

''پانچ سال پہلے جب تم ایک ایک پروڈیوسر کے در پر حاضری دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ ظہیر جیسے تھرڈ کلاس پروڈیوسر کی ہر خواہش پوری کی تب بھی اس نے تمہیں اپنے ڈرامے میں چند لائنوں کا کردار دیا۔ یہ میں تھا جس نے اپنے حصے کی زمین اونے پونے بیچ کر سیریل میں سرمایہ کاری کر کے تمہیں ہیروئن بنایا۔ کچھ یاد ہے ناں تمہیں۔'' رضوان اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں، تو کون سا مجھ پر احسان کیا۔ وہ تو تم نے سرمایہ کاری کی تھی۔'' ملیحہ بے پروائی سے بولی۔

''اس زمانے میں تیس لاکھ کی زمین بیچی تھی۔ آج اس کی قیمت پچاس لاکھ سے اوپر ہے۔ مجھے پچاس لاکھ ادا کر دو، میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ یاد رہے کہ میں طلاق دینے کا معاوضہ طلب نہیں کر رہا بلکہ اپنا وہ پیسا مانگ رہا ہوں جو میں نے تمہیں بلندی پر پہنچانے کے لیے لگایا تھا۔ تم اس کو سرمایہ کاری کہو یا جو دل چاہے سمجھو۔''

''میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو میں نہ دیتی۔ تم اگر چاہو تو سیف میں میری دس لاکھ کی جیولری پڑی ہے وہ لے لو۔ گاڑی بھی لے جا سکتے ہو۔ دونوں کی موجودہ قیمت اٹھارہ بیس لاکھ ہوگی۔''

''تم مجھے یہ گھر دے دو۔'' رضوان آرام سے بولا۔

''میں سمجھوں گا کہ میں نے زمین بیچ کر گھر خرید لیا۔ تم سے

جدا ہو کر مجھے واپس اپنے گاؤں ہی جانا ہے۔ ماں باپ کے سامنے کچھ تو بھرم رہ جائے گا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ ایک کروڑ کی کوٹھی تمہیں کس خوشی میں دے دوں۔ یہ میری محنت کی کمائی ہے۔“ ملیحہ کا لہجہ کافی سخت تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔“ رضوان نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”طلاق تو تمہیں دینی ہو گی۔ میں اب تمہارے ساتھ ایک پل نہیں رہ سکتی۔ اگر تم نے طلاق نہ دی تو میرے لیے عدالت کا راستہ کھلا ہے۔ کچھ مدت تو لگے گی مگر تم سے جان چھوٹ جائے گی۔“ یہ کہہ کر ملیحہ کروٹ بدل کر سو گئی۔ ہاشم کی آنکھوں میں نفرت کی ایک بجلی سی کوندی اور اس نے میز کی دراز سے ریوالور نکال کر ملیحہ پر تان لیا۔ وہ دوسری طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ چند ثانیے بعد سائلنسر لگے پستول سے یکے بعد تین گولیاں نکلیں اور ملیحہ کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئیں۔ اس نے زیادہ حرکت نہ کی اور ساکت ہو گئی۔ رضوان نے وہاں پر اپنی موجودگی کے ثبوت ختم کیے، ریوالور سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور گیٹ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قریبی پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر اس نے بیان دیا کہ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو گیٹ کھلا ہوا تھا اور ملیحہ مردہ حالت میں پڑی تھی۔ پولیس نے اس کا بیان ریکارڈ کیا اور انسپکٹر نے چند سپاہیوں کو رضوان کے گھر روانہ کر دیا۔

☆☆☆

ملیحہ کے قتل کی خبر اگلے دو تین گھنٹوں بعد تمام چینلز پر بریکنگ نیوز کے طور پر نشر ہونے لگی۔ ہر چینل کے نیوز روم میں مختلف انداز سے ملک کی مایہ ناز فنکارہ کی زندگی اور اس کی موت پر بات چیت ہونے لگی۔ اگلے روز کے اخبارات بھی چھوٹی بڑی سرخیوں کے ساتھ اسی خبر کو اچھال رہے تھے ساتھ ہی نامعلوم قاتل کا ذکر بھی ہوتا رہا۔

ہاشم نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی پر جب یہ خبر دیکھی تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے دل میں سوچا اگر وہ پولیس کو بروقت اطلاع دے دیتا تو اتنا بڑا سانحہ نہ ہوتا مگر ایک لاکھ روپے نے اس کی آواز کو بند کر دیا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ اس رقم کے آتے ہی اس نے خودکشی کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اب ہر لمحے اس کو یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج بہت جلد پولیس کے ہاتھ لگ جائے گی اور قانون کا پھندا اس کے گلے میں پڑ جائے گا۔ اپنے کمرے کے باہر ہونے والی ہر آہٹ پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی مگر دو دن گزرنے کے باوجود پولیس اس کو گرفتار کرنے نہ آئی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ پولیس کے پاس اس کا ایڈریس نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ اس کو نہ ڈھونڈ سکے پھر اس نے وہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے تین چار دنوں تک وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی محدود رہا، اس دوران اس نے شیو بھی بڑھالی تھی پھر ایک رات اپنا مختصر سامان ایک بیگ میں ڈال کر کسی دور افتادہ علاقے میں جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ کسی دور دراز کے گاؤں جا کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر سے نکلا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ گھر سے نکلتے ہی اس نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا اور جو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اسی میں جا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز پولیس نے رضوان کو گرفتار کر لیا۔

کار پورچ والا کیمرا پچھلے کئی دنوں سے خراب پڑا ہوا تھا۔ رضوان کی کیمرے میں غیر معمولی دلچسپی اور پھر کیمرے کی خرابی پر اس کے بدلتے ہوئے تاثرات پر انسپکٹر چوکنا ہو گیا تھا۔ کیمرے میں ہاشم کی ریکارڈنگ نہ ہو سکی تھی مگر یہ تمام ثبوت رضوان کی گرفتاری کے لیے ناکافی تھے۔

ہوا یوں کہ جب چوکیدار ریلوے اسٹیشن پہنچا تو گاڑی لیٹ تھی اسی دوران ملیحہ کا فون آ گیا جس نے اس کو واپس ڈیوٹی پر آنے کا حکم دیا۔ جب چوکیدار گھر کے گیٹ پر پہنچا تو اندر سے رضوان اور ملیحہ کے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابھی گیٹ کے قریب ہی تھا کہ تیزی سے رضوان باہر نکلا جو اندھیرے میں کھڑے ہوئے چوکیدار کو نہ دیکھ سکا۔ اس کے جانے کے بعد جب چوکیدار گھر میں گھسا تو بیڈ روم میں ملیحہ کی تازہ دم لاش پڑی تھی۔ وہ گھبرا کر بھاگ گیا مگر پولیس اس کے گاؤں جا پہنچی اور اس کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ انسپکٹر کو اس بات پر سخت حیرانی تھی کہ رضوان نے گھر کے تیسرے فرد یعنی چوکیدار پر قتل کا شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ پولیس کو اس نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا تھا جس میں چوکیدار کو بھی مشکوک ٹھہرایا ہو۔ دو چار تھپڑ کھانے کے بعد چوکیدار نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ نتیجے میں پولیس نے رضوان کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ چوکیدار کی بے وقت واپسی نے رضوان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

نیکی کر...

منظر امام

حاتم طائی... منیر شامی اور حسن بانو کی تکون... آج بھی یادوں کے نہاں خانوں میں رچی بسی ہے... عہدِ رفتہ کے انہی زندہ کرداروں پر مشتمل جدید انداز کی پُرفکر کہانی... سوچوں کے در وا کرتی اختیار و اقتدار کے بازی گروں کے کھیل کی منظر کشی...

نفرتوں کی سرزمین پر محبتوں کی اثر انگیز کہانی...

حسن بانو بہت تیکھی اور کٹارہ قسم کی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔

حاتم طائی کا دل چاہا کہ وہ اس وقت منیر شامی پر لعنت بھیج کر خود اس سے محبت کا اظہار کر دے۔ پھر اسے اپنے منصب کا خیال آ گیا۔

اسے دنیا میں دوسروں سے ہمدردی اور ان کے دکھوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر وہ خود ہی حسن بانو سے محبت شروع کر دیتا تو یہ اس کی شان کے

خلاف تھا۔

منیر شامی کو اس نے ایک ہوٹل میں چائے اور پاپے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کھائے جارہا تھا اور روئے جارہا تھا۔ حاتم طائی اس وقت اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ راہ ہمدردی اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ''تجھے کیا تکلیف ہے اے چوہے جیسی شکل کے نوجوان۔ بتا مجھے کہ شاید میں تیرے کسی کام آسکوں اور تجھے اس کرب سے نجات دلا.... دوں جس میں تو مبتلا ہے۔''

وہ نوجوان خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

حاتم طائی نے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا پاپے بہت سخت ہیں کہ تجھ سے چبائے نہیں جارہے اور تو روئے جارہا ہے۔''

''نہیں۔'' اس بار اس نوجوان نے جواب دیا۔ ''پاپے بہت اچھے ہیں۔ دل پذیر بیکری کے ہیں۔ ان کی ہر چیز بہت اچھی ہوتی ہے۔''

''تو کیا چائے میں تیزاب ملا ہوا ہے؟'' حاتم طائی نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں چائے بھی بہت اچھی ہے۔ دودھ پتی والی۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''تو پھر تیرے دانتوں میں تکلیف ہوگی؟''

''نہیں بھائی، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہے، کچھ تو پتا چلے۔ دیکھ تجھے اپنے سر کی قسم۔ اگر تو نے مجھے نہیں بتایا تو میں دلبرداشتہ ہوکر اس ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔''

''بھائی، مجھے کسی سے عشق ہوگیا ہے۔'' اس نوجوان نے جواب دیا۔

''ہاں، یہ بات تو رونے والی ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔ میں اس عشق کے لیے نہیں رو رہا بلکہ اس لڑکی کے باپ سے پریشان ہوں جس نے میرے سامنے سات سوال رکھ دیے ہیں۔''

''کیا؟'' حاتم طائی بے چین ہوگیا۔ ''کہیں تیرا نام منیر شامی تو نہیں ہے؟''

''ارے تمہیں کیسے معلوم؟'' نوجوان اُچھل پڑا۔

''بے وقوف پہچان مجھے۔ میں حاتم طائی ہوں۔ کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ پچھلی بار میں نے ہی تیرے سات سوالات حل کیے تھے۔''

''اوہ، حاتم بھائی۔'' نوجوان نے حاتم کا ہاتھ تھام لیا۔ ''قدرت ایک بار پھر تمہیں میری مدد کے لیے لے کر آگئی ہے۔ لگتا ہے تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا دیا ہے۔''

''ہاں، تاریخ اسی طرح خود کو دہراتی رہتی ہے۔ یہ بتا تو یہاں آنے کے بعد کیا کر رہا ہے۔ تیری کیا مصروفیات ہیں؟''

''میں آج کل ایک فیکٹری میں سپروائزر ہوں۔'' منیر شامی نے بتایا۔ ''گولیمار میں رہتا ہوں۔''

''اور یہ حسن بانو سے کیسے ملاقات ہوگئی؟''

''میں جس فیکٹری میں کام کرتا ہوں، وہ دواؤں کی فیکٹری ہے۔ حسن بانو وہاں پیکنگ کے شعبے میں ہے۔ وہیں اس سے ملاقات ہوئی اور ہم دونوں نے ماضی کے حوالے سے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا پھر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اسے اس جنم میں چائنیز کھانے کا بہت شوق ہوگیا ہے۔ تو میں اسے کئی بار چائنیز لے گیا۔ لیکن حاتم بھائی تم تو جانتے ہو کہ چائنیز کھانے کتنے مہنگے ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔'' حاتم نے گردن ہلائی۔ ''میں خود دو بار پھنس چکا ہوں۔''

''تو بھائی، میں نے سوچا کہ حسن بانو کو محبوبہ بنانے سے بہتر ہے کہ اس سے شادی کر کے بیوی ہی بنالوں۔ کیونکہ وہ جب تک محبوبہ بنی رہے گی، چائنیز کی فرمائش کرتی رہے گی اور بیوی بن گئی تو بڑی آسانی سے اسے چولھا چکی کے چکر میں اس طرح ڈالوں گا کہ چائنیز بھول جائے گی۔''

''یہ تو عقل مندی کا فیصلہ تھا، پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ اس کے باپ نے روڑے اٹکا دیے۔ کہنے لگا پہلے میرے سات سوالوں کے جواب ڈھونڈ کے لاؤ۔ پھر شادی کردوں گا۔''

''اس کا باپ کیا کرتا ہے؟''

''درزی ہے حاتم بھائی۔ فردوس کالونی میں اس کی اپنی دکان ہے۔ ایک نمبر کا چور قسم کا بندہ ہے، مہنگے کپڑے سیتا ہے۔''

''تو پھر تم نے کیا کیا۔ سوالوں کے جواب ڈھونڈ لیے؟''

''کہاں سے ڈھونڈتا۔ عجیب بے تکے سوالات ہیں۔ اس کا پہلا سوال ہے نیکی کر کے دریا میں ڈال۔ میں نے اس وقت اس سے ہاں تو کردی تھی لیکن اب رات دن اسی فکر میں رہتا ہوں کہ کہاں سے جواب لاؤں۔ اب تم مل گئے ہو حاتم بھائی، اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میری حسن بانو

مجھے مل جائے گی۔ پہلے بھی تمہاری وجہ سے ملی تھی۔ اس بار بھی تمہاری وجہ سے ملے گی۔''

''تم ایسا کرو۔ اس درزی سے مجھے ملوا دو۔'' حاتم طائی نے کہا۔ ''تاکہ میں اس سے اس بات کی گارنٹی لے لوں کہ اس کے سوال حل ہوگئے تو اس کے بعد وہ تمہارا نکاح اپنی بیٹی سے کردے گا۔''

''ہاں حاتم بھائی، میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ تم اس سے ضرور ملو بلکہ فرصت ہو تو کل شام اسی ہوٹل پر آجائیں۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ اچھا یہ بتاؤ آپ کی شادی ہوئی؟''

''میری شادی تو پچھلے دور میں بھی نہیں ہوسکی تھی۔'' حاتم نے بتایا۔ ''جب بھی میں شادی کا موڈ بناتا ہوں، کسی نہ کسی موڑ پر تم جیسے منیر شامی سے ملاقات ہوجاتی ہے اور میں اس کے مسائل حل کرنے میں لگ جاتا ہوں۔''

''آپ جیسا نیک انسان تو پوری تاریخ میں کوئی نہیں ہوگا۔''

''اچھا چلو، کل مل لو۔ اور اب چائے اور پاپے کھاتے وقت رونا نہیں۔''

دوسری شام کو منیر شامی نے حاتم طائی کو حسن بانو کے درزی باپ کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا۔ ''انکل یہ ہیں حاتم طائی۔''

''اچھا۔'' درزی نے اوپر سے نیچے تک حاتم طائی کو دیکھا۔ ''کپڑا ساتھ لے کر آئے ہو یا صرف ناپ دینے آئے ہو؟''

''جناب، میں کپڑے سلوانے نہیں آیا۔'' حاتم طائی نے کہا۔

''تو پھر کیوں آئے ہو؟''

''میں منیر شامی کی طرف سے آپ کے سوالوں کے جواب تلاش کرنے آیا ہوں۔'' حاتم نے بتایا۔

''عجیب بے تکی بات ہے۔ یہ بتاؤ میری بیٹی سے عشق کون کررہا ہے۔ تم کر رہے ہو یا یہ کررہا ہے؟''

''جناب، یہی کررہا ہے۔''

''تو پھر اس کو سوالوں کے جواب لانے دو۔''

''جناب، یہ اس معاملے میں ناتجربہ کار ہے جبکہ مجھے اس قسم کا بہت پرانا تجربہ ہے۔'' حاتم نے کہا۔ ''میں پہلے بھی یہ سب کرچکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' درزی نے گردن ہلائی۔ ''تم ہی بتانا۔''

اسی دوران میں ایک لڑکی دکان پر آگئی۔ اس نے منیر شامی کو، مجھے اور پھر درزی کو دیکھا اور درزی سے پوچھا۔ ''ابا، نصیر آج کس کو لے کر آئے ہیں؟''

''یہ تو تو خود نصیر سے پوچھ۔'' درزی نے جھلا کر جواب دیا۔ ''اور اس وقت تو کہاں سے ٹپک پڑی۔ تجھے تو گھر پر ہونا چاہیے۔''

''ابا، میں اپنی ایک سہیلی کی برتھ ڈے پر جارہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے پانچ سو روپے دے دو۔''

حاتم کو وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ بہت تیکھا اور کسیلا حسن تھا اس کا۔ پچھلی بار وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی لیکن اس بار میک اپ وغیرہ کر کے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''میں حاتم طائی ہوں۔'' حاتم طائی نے جھٹ سے اپنا تعاف کروادیا۔ ''میں منیر شامی کی طرف سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے نکلا ہوں۔''

''حسن بانو، تم نے ان کو پہچانا نہیں۔ پچھلی بار تو یہی ہمارے کام آئے تھے۔'' منیر شامی نے کہا۔

''ارے ہاں۔'' حسن بانو اچھل پڑی۔ ''اب مجھے یاد آرہا ہے۔ ان کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔''

حاتم طائی اس وقت اندر ہی اندر سلگنے لگا۔ یہ لڑکی تو ایسی تھی کہ خود اسے بھی پسند آنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ منیر شامی پر لعنت بھیج کر اس کے درزی باپ سے خود اپنے رشتے کی بات چھیڑ دے۔

لیکن اس قسم کی خواہش چونکہ اس کے منصب کے خلاف تھی۔ اس لیے وہ صرف دو چار گہری سانسیں لے کر رہ گیا۔ حسن بانو کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس نے درزی کی طرف دیکھا۔ ''جناب، اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر میں نے آپ کے سوالوں کے جواب دے دیے تو آپ منیر شامی کا نکاح اپنی بیٹی سے کردیں گے؟''

''کس بات کی گارنٹی چاہیے۔ کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ کردے دوں؟''

''نہیں جناب، بس آپ کی زبان کافی ہے۔'' حاتم نے کہا۔ ''مجھے یقین ہوگیا کہ میری محنت رائگاں نہیں جائے گی۔ چلیں پہلا سوال بتائیں۔''

''پہلا سوال ہے نیکی کر کے دریا میں ڈال۔''

حاتم کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

''کیا ہوگیا میاں؟'' درزی نے مذاق اڑایا۔ ''کیا پہلے ہی سوال پر چکرا گئے؟''

''نہیں جناب، سوال تو آسان ہے لیکن پرابلم دریا

کی ہے۔ اس کا ثبوت دینے کے لیے دریائے سندھ یا پنجاب کی طرف جانا پڑے گا۔ کراچی میں تو کوئی دریا نہیں ہے۔''

''اچھا چلو، تمہاری آسانی کے لیے تھوڑا سا بدل دیتا ہوں۔'' درزی نے کہا۔ ''نیکی کر کے سمندر میں ڈال۔ اب تو ٹھیک ہو گیا نا؟''

''ہاں اب ٹھیک ہو گیا۔'' حاتم نے گردن ہلائی۔ ''اب میں اس مشن پر نکل جاتا ہوں۔''

''لیکن بھائی۔'' منیر شامی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے کیسے پتا چلے گا کہ اس سوال کا جواب مل گیا ہے؟''

''میں تمہیں آکر بتا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اسی ہوٹل میں آجانا جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میرے بارے میں سب بتا دیں گے۔ وہاں میرا اُدھار چلتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' حاتم نے ایک حسرت بھری نگاہ حسن بانو پر ڈالی اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس درزی نے پہلا سوال ہی بے ڈھب دیا تھا۔ نیکی کر کے سمندر میں ڈال۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی بار بھی جب اس قسم کی کوئی سچویشن اس کے سامنے آئی تھی تو اللہ کا کوئی نیک بندہ کوئی درویش کوئی مجذوب اس کی مدد کے لیے آجاتا تھا۔ اس بار بھی ایسے ہی لوگ اس کے کام آئیں گے۔

اس دن تو وہ گھر چلا گیا۔ رات بھر اسے بے چینی رہی تھی۔ رات بھر حسن بانو اس کے تصور اور خواب میں آتی رہی تھی۔

لیکن صبح ہوتے ہی اسے اپنے منصب کا خیال آگیا۔ ''حاتم طائی، تو یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ تو امانت میں خیانت ہے۔ تو تو پوری دنیا میں امانت دار کے طور پر مشہور ہو گیا ہے کیوں اپنے اس نام کو بٹا لگا رہا ہے۔ جا اس درزی کے سوال کا جواب ڈھونڈ اور حسن بانو کو منیر شامی کے حوالے کر دے۔ ورنہ وہ بے چارہ چائے اور پاپے کھاتے وقت روتا ہی رہے گا۔

اب سوال تھا کسی مرد درویش کا۔ جو اس کی مشکل آسان کر دے۔ جو اسے کسی جنگل یا پہاڑ کی طرف بھیج دے کہ جا تیرے سوال کا جواب وہاں موجود ہے۔

وہ دن بھر شہر کی جگہوں میں چکراتا پھرا۔ لیکن ایسا کوئی نہیں مل سکا۔ البتہ شام کے وقت ایک مرد درویش اسے مل ہی گیا۔ اس مرد درویش نے خود ہی اس کو مخاطب کیا۔ ''ادھر آ بچے، میرے پاس آ۔ کیوں مارا مارا پھر رہا ہے۔''

حاتم خوشی خوشی دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بابا، میں سارا دن آپ کی تلاش میں رہا ہوں۔ بس، تم مل گئے ہو۔ اب مجھے میرے سوال کا جواب مل جائے گا۔''

''یہ لے بچہ۔ میں تو خود تجھ سے سوال کرنے والا تھا اور تو مجھ سے سوال کر رہا ہے۔''

''بابا! تم بتاؤ، تمہارا کیا سوال ہے۔ اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور پورا کروں گا۔''

''مجھے یہ بتا کہ چائنیز کھانے اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں سب اس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں ایک چائنیز ہوٹل کے سامنے بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا ہوں اور یہ تماشا دیکھ کر سوچتا رہتا ہوں کہ آخر کیا خوبی ہوتی ہے چائنیز کھانوں میں؟''

''بابا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے کبھی نہیں کھائے؟''

''نہیں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔''

''چلو، پہلے تمہیں چائنیز ہوٹل لے کر چلتا ہوں۔ اس کے بعد تم کو میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

''کیوں نہیں، اس کے بعد میں دنیا کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ چل لیکن جہاں میں بیٹھتا ہوں، وہاں نہیں جانا۔ وہاں کے بیرے مجھے کئی بار ہوٹل کے سامنے سے بھگا چکے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو، اس شہر میں بہت سے ہیں۔ کہیں اور لے چلوں گا۔''

ہوٹل میں حاتم کے ساتھ اس مرد درویش کی آمد ایک تماشا بن گئی تھی۔ ہوٹل کے بیروں نے ایک ہنگامہ کر دیا تھا۔ ''نہیں صاحب، یہ بھکاری اندر نہیں جائے گا۔''

''یہ بھکاری، نہیں مرد درویش ہے۔'' حاتم نے کہا۔ ''یہ تمہارے ہوٹل کو عزت بخشنے کے لیے آیا ہے۔''

''عزت بخشنے کے لیے آیا ہے یا عزت برباد کرنے آیا ہے۔'' ہوٹل کا منیجر بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

''دیکھ لیا بچہ۔ میں اسی لیے آج تک چائنیز کھانوں سے محروم رہا ہوں کہ کوئی مجھے گھسنے ہی نہیں دیتا۔''

''سنو۔'' حاتم نے منیجر سے کہا۔ ''اگر تم کو اس کا ہوٹل میں آنا پسند نہیں ہے تو کسی ایک طرف ہماری میز لگوا دو۔''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔ پچھلی طرف ایک برآمدہ ہے۔ میں وہاں تمہاری ٹیبل لگوا دیتا ہوں۔''

ان کی ٹیبل پچھلی طرف لگ گئی تھی۔ ایک ویٹر نے ان کی میز پر مینیو لا کر رکھ دیا۔ ''اے مرد درویش کیا کھانا پسند کرو گے؟''

''بچہ، مجھے کیا معلوم کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ بس تیری مرضی جو منگوا لے۔''

حاتم نے ہاٹ اور سور سوپ، چکن فرائیڈ رائس اور چاؤمین وغیرہ کا آرڈر دے دیا۔

''میری برسوں کی حسرت پوری ہو جائے گی۔'' مرد درویش خوش ہو کر بولا۔

''اچھا۔ اب میرے سوال کا جواب تو دو۔ میں نے تمہاری یہ خواہش پوری کر دی ہے۔''

''چل بتا، تیرا سوال کیا ہے؟''

''نیکی کر کے دریا میں ڈال۔'' حاتم نے کہا۔ ''چونکہ کراچی میں دریا نہیں ہے۔ اسی لیے دریا کو سمندر سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' مرد درویش نے اپنی گردن ہلائی۔ ''یہ تو کوئی مشکل سوال ہی نہیں ہوا۔ باہر جاتے ہوئے بتا دوں گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو بابا؟''

''بالکل سچ، ہم درویش ٹائپ کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔''

ویٹر نے بڑے سلیقے سے سوپ لا کر رکھ دیا۔ مرد درویش مزے لے لے کر سوپ پیتا رہا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر چٹخارے لے رہا تھا۔ ''واہ مزہ آگیا۔ تب ہی تو کہوں کہ یہاں اتنی بھیڑ کیوں ہوتی ہے۔''

سوپ کے بعد کھانے کی باری آئی تو وہ خوشی سے اور بھی نہال ہو گیا۔ ''واہ، یہ بات ہوئی نا۔ اب تو میں ہر پندرہ دنوں کے بعد آیا کروں گا۔ سالا روٹی اور دال کھاتے کھاتے میرا معدہ تباہ ہو گیا۔''

''بابا، یہ کھانے بہت مہنگے ہوتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ یہ میرے ایک گھنٹے کی کمائی کے برابر ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ تو بھی میرے دھندے میں آجا۔ میں تجھے کچھ گر سکھا دوں گا۔ تو کہاں سوال جواب کے چکر میں پھنس گیا ہے۔''

''نہیں بابا، میں اپنا فرض ادا کرنے نکلا ہوں۔''

''اچھا تیری مرضی۔''

کھانا ختم ہوا اور بل آیا تو حاتم کے ہوش اڑ گئے۔ بہت مہنگے کھانے تھے۔ اس کے مہینے کا آدھا خرچ ایک وقت کے کھانے میں نکل گیا تھا۔

بل ادا کر کے دونوں باہر آگئے۔ مرد درویش ابھی تک کھانوں کی تعریف میں لگا ہوا تھا۔

''چلو بابا، اب میرے سوال کا جواب دو۔'' حاتم نے کہا۔

''کون سا سوال؟''

''وہی جو میں نے پوچھا تھا۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال۔''

''بچہ۔ تو نے مجھے کیا کوئی ماسٹر سمجھ رکھا ہے جو اس قسم کے سوالوں کے جواب دیتا پھروں۔ ارے بابا، میں ایک مانگنے والا بندہ ہوں۔ مجھے کیا معلوم کہ سوال کیا ہوتا ہے اور جواب کیا ہوتا ہے۔''

حاتم بھنا کر رہ گیا۔ ''اور تجھے جو میں نے اتنے مہنگے چائنیز کھانے کھلا دیے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ تو نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ اس سوال کا جواب دے دوں گا۔''

''خود سوچ بچہ، اگر میں یہ نہیں کہتا تو تو مجھے چائنیز ہوٹل لے کر آتا، میری برسوں کی خواہش میرے دل ہی میں رہ جاتی۔''

''لعنت ہو تجھ پر۔'' حاتم نے جل کر اسے دھکا دے دیا۔

وہ مرد درویش قریب کے ایک گٹر کے پانی میں جا گرا۔ حاتم اسے وہیں اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور اسی وقت حاتم کے ذہن میں جیسے چراغ سے چل گئے۔ اس مرد درویش نے اس کے سوال کا جواب تو دے ہی دیا تھا۔ اس نے اشاروں میں بتا دیا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔ حاتم جیسے جیسے اپنے سوال اور درویش کے جواب پر غور کرتا رہا، اس کی سمجھ میں سب کچھ آتا چلا گیا۔

ان بڑے لوگوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ بس ان کے اشاروں کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے حاتم کے ذہن میں واضح ہو گیا تھا۔

اب اسے ایک موقع کا انتظار تھا۔

وہ موقع کے انتظار میں درزی کی دکان کے سامنے اس طرح جا کر کھڑا ہو گیا کہ درزی اس کو دیکھ نہ سکے۔ کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ درزی اپنے کام میں مصروف رہا۔

نہ تو اس نے حاتم طائی پر توجہ دی تھی اور نہ ہی کسی اور نے حاتم طائی سے کچھ پوچھا تھا۔ دوسری صبح وہ ایک اسکیم لے کے درزی کی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔

درزی اپنی دکان میں اکیلا تھا۔ صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی تک کوئی گاہک بھی دکان میں نہیں آیا تھا۔ حاتم طائی نے ایک پتھر اٹھایا اور درزی کو نشانہ بنا کر پتھر پھینک دیا۔

وہ پتھر درزی کے سر پر جا کر لگا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے واویلا کرنا شروع کر دیا۔ حاتم کے لیے یہی سنہری موقع تھا۔ وہ دوڑتا ہوا درزی کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا ہو، کس نے مارا؟''

''پتا نہیں، سر پھٹ گیا ہے میرا۔'' درزی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''چلیں، چلیں، جلدی چلیں۔'' حاتم طائی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے ایک رکشا رکوایا اور درزی کو لے کر ایک اسپتال پہنچ گیا جہاں اس کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ حاتم نے اسے واپس اس کی دکان میں پہنچا دیا۔

وہ درزی حاتم کا بہت احسان مند ہو رہا تھا۔ ''بیٹا! تم نے میرے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''نہ جانے کون کم بخت تھا جو مجھے پتھر مار کر بھاگ گیا۔''

''بھول جائیں اس کو۔'' حاتم نے کہا۔ ''بس اتنا یاد رکھیں کہ میں نے آپ کے ساتھ نیکی کی ہے۔''

''ہاں بیٹا، میں اس کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔''

''بس اب آپ آرام کریں۔ میری مانیں تو دو چار دنوں کی چھٹی کر لیں، آرام کریں۔''

''ہاں یاد آیا۔ تم تو میرے سوال کا جواب تلاش کرنے نکلے تھے نا؟''

''بس یہ سمجھ لیں کہ اس سوال کا آدھا جواب مل گیا ہے۔ آدھا اور باقی ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کامیاب ہو گے۔'' درزی نے کہا۔ ''تمہاری محبت اور نیکی کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ اس کام میں خدا تمہاری مدد کرے گا۔''

درزی نے حاتم کے مشورے پر تین چار دنوں کی چھٹی کر لی تھی۔ پھر ایک دن جب حاتم اس سے ملنے پہنچا تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی پٹی بھی اتر چکی تھی۔

حاتم کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے حاتم کے لیے دودھ پتی کی چائے بھی منگوالی تھی۔

''قبلہ، اب میں آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔''

''ہاں ہاں کہو۔ اگر منیر شامی پر لعنت بھیجنی ہو تو بھیج

دیتا ہوں لعنت۔ حسن بانو کے لیے تم سے اچھا رشتہ کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"نہیں محترم، حالانکہ دل تو یہی چاہ رہا ہے لیکن یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔"

"چلو، جیسی تمہاری مرضی۔ ہاں تو تم کیا کہنا چاہ رہے تھے؟"

"قبلہ، آپ ایک دفعہ سمندر کراس کر لیں۔" حاتم نے کہا۔

"سمندر کراس کرلوں۔ وہ کیوں؟"

"دیکھیے نا، یہ جو آفتیں ہوتی ہیں۔ یہ کسی بھی روپ میں چھپ کر وار کرسکتی ہیں۔ یہ میرا صدیوں کا تجربہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں حاتم طائی ہوں اور صدیوں پہلے اس دنیاں میں لایا گیا تھا۔"

"ہاں جانتا ہوں۔ تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کوئی دشمن میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"بالکل، اس دشمن نے چھپ کر آپ پر وار کیا ہے۔" حاتم نے کہا۔ "دیکھیں، اگر دشمن سامنے ہو تو اس کا مقابلہ بھی ہوسکتا ہے اور جو دشمن چھپا ہوا ہو، اس پر کیسے قابو پائیں گے۔"

"یہ بات تو ہے۔" درزی سوچ میں پڑ گیا۔ "تو پھر کیا کروں؟"

"اسی لیے سمندر کراس کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ ساری نحوستیں ختم ہوجائیں گی۔"

"ہاں، یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔" درزی نے کہا۔ "لیکن سمندر کراس کرنے کا مطلب ہے میں بحرین چلا جاؤں؟"

"نہیں، اتنی دور نہیں۔ آپ کیماڑی سے منوڑہ چلے جائیں۔ سمندر کراس ہوجائے گا۔"

"ہاں، میری ایک پھوپی نے بھی ایک بار ایسا ہی کیا تھا۔"

"تو بس، پھوپی کے نقشِ قدم پر چلیں۔"

"بیٹا، میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کیوں نہیں، میں ہی تو آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"تو چلو کل کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ تم کل صبح دس بجے دکان پر آجانا۔ یہاں سے دونوں چلے چلیں گے۔"

حاتم دس سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ درزی بھی تیار تھا۔ دونوں چل پڑے۔ کیماڑی پر منوڑہ جانے والے چھوٹی موٹر بوٹ کی لائن لگی ہوئی تھی لیکن حاتم نے ایک کشتی کا انتخاب کیا تھا۔

درزی نے اس موقع پر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو حاتم، یہاں پر جو کشتی ہوتی ہے وہ دریا تک تو ٹھیک ہے لیکن سمندر کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"ارے کچھ نہیں ہوتا جناب۔ سمندر کی سیر کا مزہ کشتی میں آتا ہے اور یہ بھی تو دیکھیں کتنے لوگوں نے کشتی کر رکھی ہے۔ سب کے سب خیریت سے جائیں گے اور خیریت سے واپس آجائیں گے۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" درزی نے حاتم کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

کشتی والے نے آنے جانے کے پندرہ سو روپے مانگے تھے۔ کشتی کیماڑی سے روانہ ہوئی۔ درزی بڑے بڑے جہازوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔

"واہ، یہ تو بہت زبردست تفریح ہے۔ میں پہلے کبھی نہیں آیا۔"

"اگر پہلے آچکے ہوتے تو دشمن آپ پر کبھی غالب نہیں آتا۔" حاتم نے کہا۔ "اور یہ تو دیکھیں، یہ رنگین مچھلیاں کتنے مزے سے تیر رہی ہیں۔" حاتم نے اشارہ کیا۔

درزی نے جھک کر دیکھنا چاہا اور حاتم نے اس کے دونوں پیر اٹھا کر اسے سمندر میں دھکیل دیا۔

اور اب سوائے اس درزی کے سب ہی جیل کی سزا بھگت رہے ہیں۔ درزی کو تو بچا لیا گیا تھا۔ اس ملاح نے بچا لیا تھا جبکہ حاتم کا یہ کہنا تھا کہ اس کام کے لیے منیر شامی نے کہا تھا اور منیر شامی کا یہ بیان تھا کہ حاتم اول درجے کا بے وقوف انسان ہے۔ سوال یہ تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دے۔ یعنی جس سے نیکی کروا سے بعد میں دریا میں یا سمندر میں پھینک دو۔ حاتم نے بے چارے درزی کے ساتھ یہی کیا۔ پہلے اس کی مرہم پٹی کروائی اس کے بعد اسے سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بات بتائیں۔ گزشتہ ستر برسوں سے ہمارے حکمران تو یہی کر رہے ہیں نا۔ تھوڑی، تھوڑی بجلی، تھوڑی سی گیس اور تھوڑی سی زندگی مہیا کر کے ہمیں ذلتوں، کرپشن اور تباہیوں کے سمندر میں پھینکتے چلے جا رہے ہیں۔ پھینکتے چلے جا رہے ہیں اور ہم انہیں حاتم دوراں سمجھ کر انہیں ووٹ دیے چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں۔

چال

محمد فاروق انجم

اچھے اور پُرخلوص دوستوں کی سنگت میں دشوار گزار پہاڑی راستے ہوں یا گہری کھائیوں میں پیش آنے والے خطرات... کوئی معنی نہیں رکھتے... وہ بس ایک دوسرے کے ہمنوا اور ہم سفر ہوتے ہیں۔ ایسے ہمسفر جو احساسِ ذمے داری سے منزل تک پہنچنے کا یقین رکھتے ہوں... دہ دیرینہ دوستوں کا احاطہ کرتی تحریر... ان کے قول و فعل یکساں تھے... مگر فطرت اور نیت خطرے کو سامنے دیکھ کر رخ بدل رہی تھی... جرم کا ارتکاب کرنا آسان ہوتا ہے... مگر اس کی گہرائیوں سے باہر آنا از حد مشکل... وہ دونوں بھی جرم کے جال میں الجھ چکے تھے اور اس سے نکلنے کی ہر چال الٹی پڑ رہی تھی...

سنگ دلی و منتقم مزاج دشمن کی جوابی کارروائی......سرورق کی الم ناک کہانی

اُن کے درمیان ایک چار فٹ چوڑی میز تھی۔ میز کے ایک طرف پانچ فٹ دس انچ قد کا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی، سیاہ اور تلوار نما تھیں، سر کے بالوں کا رنگ سنہری تھا جس میں سفید بال بھی جھانک رہے تھے۔ ایک عرصے سے وہ اپنے بالوں کو یہی رنگ لگوا رہا تھا۔ جب بالوں کو ڈائی کیے زیادہ وقت ہوجاتا تھا تو سفید بال جھانکنے لگتے تھے، اس کی آنکھوں میں سفیدی تھی اور چہرے سے رعب مترشح تھا۔ اس کا نام تیمور خان تھا۔ میز پر اس کے عین

سامنے دو ریوالور رکھے ہوئے تھے اور پاس ہی درجن بھر گولیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ جبکہ میز کی دوسری طرف وہ دونوں خوفزدہ، سہمے ہوئے اور متوحش نگاہوں سے کبھی تیمور خان کو اور کبھی اس کے سامنے رکھے دونوں ریوالور کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام زاہد تھا، جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، اس کی عمر اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ براجمان اس کا دوست حماد تھا جو اسی کا ہم عمر تھا اور اس کے سر کے بال چھوٹے تھے اور اس نے فرنچ کٹ رکھی ہوئی تھی۔

تیمور خان کے پیچھے اس کا محافظ ہاتھ میں بڑی سی گن لیے کھڑا تھا۔ تیمور خان نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ نکالا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا کر، ڈبیا میز پر اچھال دی۔ ڈبیا کے میز پر گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی اس نے کچھ دیر سے چھائی خاموشی کو یکدم..... توڑ دیا۔

تیمور خان کے عقب میں کھڑے اس کے محافظ نے برق رفتاری سے لائٹر نکال کر اس کا شعلہ بلند کیا اور تیمور خان کو سگریٹ سلگا کر پھر سے لائٹر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ تیمور خان نے سگریٹ کو ہونٹوں میں ہی دبائے کش لیا اور اسی طرح دھواں چھوڑتے ہوئے دونوں کی طرف بدستور اپنی نگاہیں جمائے پوچھا۔

"تم دونوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کچھ پوچھا تھا۔ مجھے اس کا جواب چاہیے۔ میں شام تک تم دونوں کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔"

تیمور خان کی بات سن کر دونوں کے جسم میں حرکت ہوئی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ کچھ دیر بعد حماد نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کچھ وقت چاہیے۔"

"وہ تو تم دونوں نے پہلے بھی مانگا تھا اور میں نے وقت دے دیا تھا۔ آج صبح دس بجے دیے ہوئے وقت کی مدت ختم ہو چکی ہے۔" تیمور خان نے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے سگریٹ اپنی انگلیوں میں دبا لیا۔

"جیسے ہی مدت ختم ہوئی، ہم آپ کے پاس چلے آئے۔ کہیں بھاگ کر نہیں گئے۔" زاہد بولا۔

"آئے تو سہی لیکن خالی ہاتھ..... تم دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ آج کے دن تم دونوں میری رقم دے دو گے۔" تیمور خان نے کہہ کر سگریٹ کا طویل کش لے کر دھواں ایسے چھوڑا جیسے اس دھوئیں میں اس کے اندر کے غصے کی آگ بھی شامل ہو۔

"ہم نے پوری کوشش کی لیکن رقم کا انتظام نہیں ہو سکا اور ہم کہیں بھاگے نہیں بلکہ سیدھا آپ کے پاس آگئے ہیں تاکہ ہم آپ کو بتا سکیں۔" حماد نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف اور رواضح ہو گیا تھا۔

"کوئی تیمور خان کی رقم لے کر بھاگ سکا ہے؟" تیمور خان نے سگریٹ میز پر ہی مسل دیا۔

"کوئی بھاگ ہی نہیں سکتا۔" زاہد زبردستی مسکرایا۔ "کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ بھاگ سکے۔"

"اس رات تم دونوں جوئے میں اچھی خاصی رقم جیت چکے تھے۔ تم دونوں کے پاس رقم رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ کیسے تم دونوں نے اپنی ایک ایک جیب میں رقم ٹھونسی ہوئی تھی اور نوٹ جیبوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ اور پھر تم دونوں ہارنے لگے۔ ہارتے ہارتے تم دونوں کے پاس ساری رقم ختم ہو گئی۔ اور تم دونوں جیتنے کے لیے اتنے جذباتی ہو گئے کہ مجھ سے ادھار لیتے گئے اور ہارتے گئے، یہاں تک کہ تم ایک رات میں اکتیس لاکھ روپے ہار گئے۔ تم میرے جوئے خانے کے پرانے آنے والے ہو۔ میں نے تم دونوں کو اتنی رقم دی جتنی تم دونوں نے مانگی۔ اس بات کو ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ تم دونوں نے میرے اکتیس لاکھ روپے واپس دینے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت لی تھی جو آج دن دس بجے ختم ہو گئی ہے۔ اور اب تم منہ لٹکا کر میرے پاس آگئے ہو اور مجھے کہہ رہے ہو کہ رقم کا انتظام نہیں ہوا ہے۔" تیمور خان نے آخری جملہ درشت لہجے میں کہا کہ دونوں ہی اندر سے کانپ گئے۔

"چچا ملک سے باہر گئے تھے۔ ان کی رات کو واپسی ہوئی ہے۔ میں ابھی سیدھا آفس جا رہا ہوں، ان سے رقم لے کر آپ کو دے دوں گا۔" حماد نے ڈرتے ہوئے کہا۔

تمہارے باپ اور چچا کی کاروباری حیثیت تو ہے۔ وہ دونوں بھائی بھی تھے اور مشترکہ بزنس بھی کرتے تھے۔ تمہارا باپ دنیا سے چلا گیا اور تم بزنس میں ٹک کر بیٹھے نہیں۔" تیمور خان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک سگریٹ اور نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور اس کے عقب میں کھڑے اس کے محافظ نے جلدی سے لائٹر نکال کر اس کا سگریٹ سلگایا اور لائٹر واپس اپنی جیب میں رکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا جبکہ تیمور خان سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے کش لے کر دھواں چھوڑتا رہا اور نگاہیں جمائے دونوں کو دیکھتا رہا۔

"تیمور بھائی آپ سب جانتے ہیں بس میں اُن سے رقم لے کر آپ کو دیتا ہوں۔" حماد کے لہجے میں استدعا تھی۔

تیمور خان نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے بجے آؤ گے؟"

"مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ مجھے ابھی رقم دے دیتے ہیں کہ ایک دو دن کا وقت لیتے ہیں۔" حماد بولا۔

"تم اس کاروبار میں برابر کے حصے دار ہو، وہ تمہاری رقم کیسے روک سکتے ہیں۔" تیمور خان نے اپنی گھڑی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی کاروبار میں رقم ہر وقت پاس موجود نہیں ہوتی۔" حماد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈر رہا تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ چچا جان رقم دینے کے لیے کچھ وقت مانگ لیں۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" تیمور خان نے پوچھا۔

"رقم کا انتظام ایک گھنٹے میں ہو گیا تو اسی وقت آپ کے پاس لے آؤں گا اور اگر انہوں نے کچھ وقت مانگ لیا تو پھر دیر لگ سکتی ہے۔ آپ مجھے ایک ہفتے کی مزید مہلت دے دیں۔ میں سات دنوں کے اندر اندر آپ کا سارا پیسہ کلیئر کر دوں گا۔" حماد نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات مکمل کر لی۔

"یعنی پھر سات دن......؟" تیمور خان نے اسے گھورا۔

"ایک گھنٹے میں رقم دے دی تو ابھی آجائیں گے۔ کل، پرسوں جیسے ہی رقم ملتی ہے آپ کے پاس آجائیں گے۔ ہم سات دن کی مدت اس لیے مانگ رہے ہیں کہ اگر وہاں سے پیسے نہ ملے تو ہم ہر صورت میں ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کی رقم واپس کر دیں گے۔" حماد بولا۔

تیمور خان نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اپنا بازو نیچے کر لیا۔ "سات دن نہیں بلکہ چار دن دوں گا۔ چار دن کے بعد تم دونوں کو میری رقم واپس کرنا ہوگی ورنہ ایک منٹ اور نہیں دوں گا اور اگر میری رقم واپس نہ آئی تو پھر تم دونوں جانتے ہو کہ میں کیا کرتا ہوں، یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تیمور خان کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔ دونوں کے جسم میں سراسیمگی دوڑ گئی۔ انہیں ایسا لگا جیسے تیمور خان نے ابھی ان کی گردنوں کو دبوچ لیا ہے اور ان کی سانس رک گئی ہے اور آنکھیں باہر نکل آئی ہیں۔

"چار دن کم ہیں....." حماد نے کہنا چاہا لیکن تیمور خان کی گھورتی نگاہوں کے آگے وہ سہم کر چپ ہو گیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے چار دن میں ہم رقم لوٹا دیں گے۔"

"ہمیں آپ کی رقم لوٹانے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑا، ہم کریں گے اور ہر صورت میں آپ سے لی ہوئی مدت میں رقم واپس کر دیں گے۔" زاہد نے بھی کہا۔

"ٹھیک ہے یہ بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اس کے بعد مجھ سے رحم کی اُمید نہ رکھنا۔ پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں اپنا ایک پیسہ بھی کسی کی طرف نہیں چھوڑتا۔ خواہ مجھے اپنے پیسے کے بدلے اس کے جسم سے سارا خون ہی کیوں نا نچوڑنا پڑے۔ اب تم دونوں جاؤ۔" تیمور خان نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو جانے کے لیے کہا تو وہ دونوں اس جگہ سے اُٹھ کر ایسے باہر نکلے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ اگر وہ ایک لمحہ بھی رکے تو وہ انہیں گولیوں سے بھون دے گا۔

باہر چمکدار دھوپ تھی اور آسمان صاف تھا۔ دونوں نے پُرسکون سانس لی اور چلتے ہوئے کار تک پہنچے جو سات سال پرانا ماڈل تھی اور کار کا رنگ ایک دو جگہ سے خراب بھی ہو چکا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھے اور حماد نے کار وہاں سے نکال کر سڑک پر دوڑا دی۔

حماد کار چلا رہا تھا۔ اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "کاش ہم اس دن لالچ نہ کرتے اور جو رقم ہم نے جیت لی تھی وہ سمیٹ کر گھر چلے جاتے۔ لاکھوں روپے تھے۔"

"وہاں پر موجود نعیم نے ہمیں کہا بھی تھا کہ ہم مزید کھیلنا بند کر دیں اور جو ہاتھ لگا ہے اسے لے جائیں۔" زاہد نے کہا تو حماد نے تاسف اور غصے سے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ مارے۔

"اکتیس لاکھ روپے ہم ایک رات میں ہار گئے۔ اچھا بھلا ہم جیت رہے تھے۔" حماد کو پھر غصہ آگیا۔

"صرف اکتیس لاکھ روپے نہ شمار کرو۔ وہ پیسہ بھی شمار کرو جو ہم نے جیت کر ہارا تھا۔" زاہد کا چہرہ ابھی تک پچھتاوے کی گھٹا میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اب تیمور خان ہمیں مزید کوئی مہلت نہیں دے گا۔ اور کسی طرح سے بھی ہم کو رقم کا بندوبست کرنا پڑے گا ورنہ اس کی ڈکشنری میں رحم کا لفظ نہیں ہے۔ ہمارے پاس صرف چار دن ہیں۔ چار دن اور اکتیس لاکھ روپے کا پہاڑ......" حماد نے کہا۔ دونوں چپ ہو گئے۔

"اب ایک ہی اُمید ہے کہ میں چچا جان سے کسی بہانے سے رقم لوں۔ لیکن وہ میری حرکتوں کی وجہ سے مجھے

پہلے ہی برداشت نہیں کرتے۔'' حماد نے کہتے ہوئے اپنا اندیشہ بیان کیا۔ ''پتا نہیں ہے وہ مجھے رقم دیتے بھی ہیں کہ نہیں۔''

''ہمارے حالات بھی ایسے نہیں ہیں کہ میں رقم کا کوئی بندوبست کرسکتا۔'' زاہد باہر دیکھنے لگا۔

''اس لیے میں تم پر زور بھی نہیں ڈال رہا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے چند لاکھ روپے بھی لینا مشکل ہے۔ تم میرے دوست ہو اس لیے رقم کی ذمّے داری اپنے سر پر لے رہا ہوں۔'' حماد نے کار ایک عمارت کے سامنے کھڑی کردی۔ کار پارکنگ میں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''تم ابھی اپنے چچا سے بات کرو گے؟'' زاہد نے پوچھا۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے ابھی بات کرنی ہے۔'' حماد بولا۔

''میں یہاں بیٹھ کر انتظار کروں؟'' زاہد نے کہا۔

''تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' حماد نے کہہ کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور کار سے باہر نکل گیا۔ دوسری طرف سے زاہد بھی نکل آیا تھا۔ حماد نے ایک نظر اس عمارت کی طرف دیکھا جہاں ان کا آفس تھا۔ کئی سال قبل حماد کے والد اور اس کے چچا نے مل کر کاروبار شروع کیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گیا تھا۔ لیکن اچانک حماد کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ سارا بزنس اس کا چچا دیکھنے لگا۔ اور پھر حماد کا بڑا بھائی بھی اس کاروبار میں شامل ہوگیا۔ حماد کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہوا تو وہ بھی اس کاروبار کا حصہ بن گیا۔ حماد کا بیٹھنا اُٹھنا اچھے دوستوں کے ساتھ نہیں تھا۔ زاہد اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ زاہد کی رہائش شہر سے تقریباً تیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی جہاں ان کا بڑا سا گھر تھا اور کمانے کے لیے اس کے باپ کی تھوڑی سی زمین تھی۔ حماد ہی زاہد کو اپنے ساتھ جوئے خانے میں لے جانے لگا تھا۔ انہوں نے بہت پیسہ جیتا تھا اور اُڑایا تھا۔ زاہد کو بھی اس کے ساتھ جُوا کھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس بات کا علم حماد کے چچا کو ہوا کہ حماد جُوا کھیلنے لگا ہے تو اس نے ایک دو بار شدید سرزنش کی، لیکن جب حماد باز نہ آیا تو اس نے حماد کو کاروبار سے نکال دیا۔ پھر بھی حماد کبھی کبھار آجاتا تھا۔ اس کا چچا اچھا آدمی تھا لیکن وہ دولت اس طرح سے اُڑانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

دونوں لفٹ کے ذریعے سے تیسری منزل پر پہنچے جہاں ان کا آفس تھا۔ حماد نے سوچ لیا تھا کہ اسے اپنے چچا کو کیا کہنا ہے۔ دونوں استقبالیہ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تو حماد نے زاہد سے سرگوشی کی۔

''تم وہاں بیٹھ جاؤ۔''

زاہد نے رک کر اس جانب دیکھا جہاں کچھ نوجوان بیٹھے تھے۔ جونہی حماد کے قدم اپنے چچا کے کمرے کی طرف جانے لگے استقبالیہ پر موجود لڑکی نے شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''ایکسکیوزمی سر......''

''جی......'' زاہد نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے لہجے میں ایسا تغیر لے آیا تھا جس سے یہ واضح ہو کہ وہ اس کمپنی کے مالکان میں سے ہے۔

''اندر انٹرویو ہو رہے ہیں۔ سر نے سختی سے اس دوران میں کسی کو بھی اندر آنے سے منع کیا ہے۔''

حماد اس کے پاس جاکر متانت سے بولا۔ ''آپ مجھے جانتی ہیں، میں کون ہوں۔''

''جی سر...... لیکن سر میری نوکری جاسکتی ہے۔'' وہ لڑکی معصومیت سے بولی۔ ''میں مجبور ہوں۔''

حماد نے ایک نظر اس لڑکی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا اور پھر یکدم مسکرا دیا۔ ''ٹھیک ہے میں انتظار کرلیتا ہوں۔ میری اندر اطلاع کردو۔ میں وہاں صرف آپ کی نوکری کے لیے بیٹھ رہا ہوں۔''

''شکریہ سر۔'' لڑکی نے ممنون نظروں سے دیکھ کر مسکراہٹ بکھیری۔

حماد نے ایک مسکراہٹ عیاں کی اور پھر زاہد کے پاس چلا گیا جو صوفے پر بیٹھا تھا۔ حماد کو جگہ دینے کے لیے وہ تھوڑا سا دوسری طرف کھسک گیا اور حماد بیٹھ گیا۔ اس صوفے پر تین افراد اور بیٹھے تھے...... حماد، زاہد اور تیسرا وہ جو نوکری کے لیے انٹرویو دینے آیا تھا اور دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' زاہد نے آہستہ سے پوچھا۔

''اندر انٹرویو ہو رہے ہیں۔ ابھی امیدوار باہر نکلے گا تو وہ مجھے اندر بلالیں گے۔'' حماد نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے انتظار کرنا پڑے گا۔'' زاہد نے منہ بنایا۔

''ابھی بلا لیتے ہیں۔ تم فکر نہیں کرو۔'' حماد بولا۔

زبیر وجیہہ نوجوان تھا۔ اس نے کالی پینٹ کے ساتھ سفید شرٹ اور اوپر سے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ دونوں شکل سے بہت بڑے سفارشی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے آجانے سے شاید اب ان کے

انٹرویو بھی رسمی سے ہوں اور وہ ان سب کو گھر بھیج دیں۔

زبیر اس سے قبل اچھی نوکری کر رہا تھا۔ اچانک ایک دن اپنے باس کے ساتھ منہ ماری ہوگئی۔۔۔ اور باس نے اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا۔ تین ماہ سے وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ زبیر کے باپ کا جنرل اسٹور تھا۔ ان کا محلے میں دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر کا حصہ انہوں نے کرائے پر دیا ہوا تھا اور اس کی سیڑھیاں انہوں نے باہر سے نکالی ہوئی تھیں۔ پندرہ دن قبل کرائے دار وہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور وہ جگہ فی الحال خالی تھی۔

ان دونوں کے آنے سے زبیر کو اپنی نوکری کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ جس طرح سے وہ استقبالیہ کی طرف گیا تھا اور سیدھا باس کے کمرے کی طرف جانے لگا تھا تو اس سے واضح ہوتا تھا کہ وہ کسی عام باپ کا بیٹا نہیں ہے۔

''اگر یہ نوکری بھی نہ ملی تو میں عاشی کو کیا جواب دوں گا؟'' زبیر نے آہ بھرتے ہوئے سوچا۔

اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور انٹرویو دینے والا امیدوار باہر نکلا اور خارجی دروازے کی طرف چلا گیا۔ اب اندر جانے کی باری زبیر کی تھی لیکن استقبالیہ پر موجود لڑکی نے حماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو سر اندر بلا رہے ہیں۔'' حماد اپنی جگہ سے اُٹھا اور زبیر کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ بے بسی سے استقبالیہ کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں چیخ کر کہہ رہا ہو۔

''میری باری تھی۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں بیٹھا ہوں۔ یہ دس منٹ پہلے آیا تھا اور اب اسے اندر بلالیا گیا ہے......''

لیکن زبیر چپ رہا اور مضطرب پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے پاس بیٹھے زاہد کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

حماد اندر گیا تو سامنے اس کا چچا کوٹ پینٹ اور ٹائی لگائے براجمان تھا۔ اس کے دائیں جانب حماد کا بڑا بھائی جبکہ بائیں طرف حماد کے چچا کا بیٹا بیٹھے تھے۔

''ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی کہ ہم کو اپنا کام چھوڑ کر تمہیں بلانا پڑا۔'' حماد کے چچا نے نرم لہجے میں بات کی۔

''مجھے ضروری بات کرنی ہے۔'' حماد نے کہا۔

''ہاں کیا بات کرنا چاہتے ہو، لیکن ذرا جلدی بات کرنا۔'' حماد کے چچا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

کچھ توقف کے بعد حماد بولا۔ ''میں اس لیے آیا ہوں کہ میں اپنا ذاتی کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ بھی تو تمہارا ذاتی کاروبار ہے۔'' اس کے چچا نے کہا۔

''اس کاروبار میں میری کوئی جگہ نہیں ہے۔'' حماد کا لہجہ سرد تھا۔ ''یہ آپ سب کا کاروبار ہے۔''

''تم اپنے آپ کو بدل لو۔ یہ کاروبار ہم سب کا ہے۔ تمہارے لیے بھی جگہ ہے۔'' حماد کے چچا نے اسے سمجھایا۔

''یہ میرا کاروبار نہیں ہے۔ آپ مجھے چالیس لاکھ روپے دے دیں، میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔'' حماد نے جلدی سے دل کی بات کہہ دی۔ ''میرے پاس چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کرنے کی اچھی منصوبہ بندی ہے۔''

اس کی بات سن کر حماد کے چچا نے متانت سے حماد کے بڑے بھائی کی طرف دیکھا تو اس کا بڑا بھائی فوراً بولا۔

''تم گھر جاؤ ہم اس پر بعد میں بات کریں گے.... فی الحال ہم کچھ انٹرویوز کر رہے ہیں۔''

''مجھے ابھی بات کرنی ہے۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میرے پاس کاروبار کرنے کی بہترین منصوبہ بندی ہے۔ مجھے بس چالیس لاکھ روپے کا سرمایہ درکار ہے۔'' حماد نے جلدی سے کہا۔

''کام کرنا ہے تو اچھے لوگوں کی طرح بیٹھ کر کام کرو، تمہیں الگ کاروبار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے بھائی نے دوٹوک کہہ دیا۔

''میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری بات کو سمجھ نہیں رہے؟'' حماد کو غصہ آگیا۔

''پہلے یہاں بیٹھ کر کام سیکھ لو پھر الگ کام کرنے کے بارے میں سوچنا۔'' اس کے چچا نے پھر سمجھایا۔

''مجھے یہاں کام نہیں کرنا۔ میری اور آپ لوگوں کی سوچ میں بہت فرق ہے۔ مجھے چالیس لاکھ روپے آج اور ابھی چاہئیں۔'' حماد اپنی بات پر اڑ گیا۔ اس کے جسم میں کچھ بے چینی سی بڑھ گئی تھی۔

''بہتر ہے کہ تم گھر چلے جاؤ۔ تمہیں ہم ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔'' حماد کے بھائی نے بھی کچھ غصیلہ لہجہ اپنا لیا۔

''لیکن......'' حماد نے کہنا چاہا۔

''تم چلے جاؤ اور ہمیں کام کرنے دو۔'' اس بار اس کے چچا کا لہجہ بھی درشت ہوگیا اور چہرہ بھی تن گیا تھا۔ حماد کے لیے اب بولنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے باری

باری تینوں کی طرف دیکھا اور غصے سے باہر نکل گیا۔
باہر جاتے ہی وہ تیزی سے زاہد کی طرف بڑھا تو زاہد اس کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔
''کیا ہوا......؟'' زاہد نے پوچھا۔
''زاہد میرے ساتھ آجاؤ۔'' حماد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے چلتے ہوئے کہا اور وہ دونوں خارجی دروازے کی طرف چلے گئے۔ جبکہ زبیر دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ چونک گیا جب استقبالیہ پر موجود لڑکی نے دوسری بار اس کا نام پکارا اور وہ تیزی سے کمرے کی طرف چلا گیا۔
زبیر کا انٹرویو ہو گیا اور اسے یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ وہ اسے اطلاع کردیں گے۔ زبیر جھکے کندھوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے دماغ میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ اس سے پہلے جانے والا لڑکا کسی بڑی سفارش سے آیا تھا اس لیے وہ اس سے پہلے انٹرویو کے لیے چلا گیا اور اپنے ساتھی، جس کو اس نے زاہد کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس کو لے کر باہر بھی نکل گیا۔ اس بات کا صاف مطلب تھا کہ ان کا کام ہو چکا تھا۔
زبیر کے باہر جاتے قدم رک گئے اور اس نے استقبالیہ پر موجود لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے پاس جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''ایکسکیوز می۔''
لڑکی مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''جی......''
''آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ جو لڑکا مجھ سے پہلے اندر گیا تھا، یعنی کہ میری باری پر وہ اندر چلا گیا تھا، وہ کون تھا؟'' زبیر نے پوچھا۔
''شاید آپ حماد صاحب کی بات کر رہے ہیں۔ وہ اس کمپنی کے مالک کے سگے بھتیجے بھی ہیں اور پارٹنر بھی ہیں۔'' لڑکی نے بتایا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''
''نہیں بس ایسے ہی۔'' زبیر کہہ کر باہر چلا گیا۔
اس کا یہ ابہام تو دور ہو گیا تھا کہ وہ کوئی سفارشی نہیں تھا۔ لیکن اب اسے اس بات نے گھیر لیا تھا کہ اس کے ساتھ جو لڑکا آیا تھا وہ دراصل اس کی سفارش کے لیے آیا ہوگا۔ تبھی وہ باہر بیٹھا تھا اور جب وہ باہر نکلا تھا تو اس نے فوراً پوچھا تھا کہ ''کیا ہوا؟''
زبیر کو یقین ہو گیا کہ یہ نوکری اسے ملنے والی نہیں ہے۔ وہ بس کے ذریعے گھر پہنچا تو بس کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اس کی جیب میں پانچ روپے کا سکہ بچا تھا۔ وہ چلتے چلتے اپنے ابا کے جنرل اسٹور کی طرف چلا گیا اس کا ارادہ تھا کہ وہ جیب خرچ کے لیے کچھ پیسے مانگ لے لیکن اس کا باپ پہلے ہی ایک سیلز مین کو پیسے دینے کے بعد کہہ رہا تھا۔
''بہت مندی ہے۔ سارے پیسے سمیٹ کر تمہیں دے دیے ہیں۔ میری تو جیب میں بھی خرچہ نہیں بچا۔''
زبیر کچھ دیر وہاں بیٹھا اور پھر وہ بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ وہ اپنے گھر پہنچا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی بٹن دبا کر لائٹس روشن کردیں۔
اوپر والا حصہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چھوٹا سا لاؤنج، کچن، دو کمرے اور ایک باتھ روم تھا۔ کیونکہ وہ حصہ کرائے دار نے خالی کیا تھا اس لیے وہاں کوئی سامان نہیں تھا۔ ایک کمرے میں زمین پر گدا بچھا ہوا تھا اور اس گدے پر کچھ کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔
زبیر ابھی اس گدے پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل فون باہر نکالا تو وہ سستا سا اور پرانا موبائل فون تھا۔ اسکرین پر عاشی کا نام آرہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے فون کان سے لگا لیا۔
''بڑی دیر لگا دی فون آن کرتے ہوئے کیا کر رہے تھے؟'' دوسری طرف سے عاشی کی آواز آئی۔
''باتھ روم میں تھا۔'' زبیر نے بہانہ کیا۔
''آج انٹرویو ہو گیا؟'' عاشی نے پوچھا۔
''ہاں انٹرویو تو ہو گیا ہے لیکن......''
''لیکن کیا؟''
''مجھے لگتا ہے کہ کسی سفارشی کو ہی نوکری ملے گی۔ میں نے کچھ ایسا وہاں دیکھا بھی ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نوکری سفارشی کو ہی ملے گی۔'' زبیر کا لہجہ اداس اور مایوس تھا۔
''اب میں امی ابو سے کیا کہوں؟ وہ میری شادی کے لیے ضد کیے جا رہے ہیں اور مجھے زور دے رہے ہیں کہ میں کامران سے شادی کرلوں۔'' عاشی نے جلدی سے کہا۔
''یہ کامران کون ہے؟'' زبیر نے جاننا چاہا۔
''میرا کزن ہے۔ اپنا بزنس کرتا ہے۔ خوشحال ہے، گاڑی ہے اس کے پاس، لیکن میں مسلسل ٹال رہی ہوں اور اس انتظار میں ہوں کہ تمہیں نوکری ملے تو میں تمہاری بات کروں۔'' عاشی نے کہا۔
''تم میری بات کرلو۔ آج نہیں تو کل مجھے نوکری مل ہی جائے گی۔'' زبیر بولا۔ ''میں بھی اپنے والدین کے

سامنے تمہارا ذکر کر دیتا ہوں۔"

"کیا بات کروں؟ انہیں کیا بتاؤں کہ لڑکا اپنے والد صاحب کے جنرل اسٹور پر کام کرتا ہے؟ میرے والدین کو کماؤ لڑکا چاہیے۔ تم جلدی سے نوکری تلاش کرو ورنہ......"

"ورنہ کیا عاشی؟"

"میں اور کتنا ٹالوں گی اُن کو؟ کتنے بہانے کرلوں گی۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" عاشی کہتے ہوئے اداس ہوگئی۔

"عاشی میں کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلدی نوکری مل جائے گی۔" زبیر نے بے چارگی سے کہا۔

"تمہاری اس کوشش نے میرے پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ میں نے کبھی ان سے تمہارا ذکر بھی نہیں کیا۔ اگر تم نوکری کر رہے ہوتے تو میں اپنی پسند کا اظہار کر دیتی۔" عاشی نے کہا۔

"تین ماہ سے نوکری کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلدی نوکری مل جائے گی۔ اس سے پہلے کہ تم کو وہ مجبور کر کے کامران کے ساتھ باندھ دیں تم ان کو ہمارے گھر تو بھیجو۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میرے ابو اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ شادی سے پہلے وہ تمہاری نوکری کی بھی جانچ پڑتال ایسے کریں گے جیسے بال سے کوئی کھال اتار رہا ہو اور تمہارے پاس نوکری ہی نہیں ہے۔ تم اُن کے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دے سکو گے۔ میں اپنے ابو کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

"میں کہیں نہ کہیں اور کوشش کرتا ہوں۔" زبیر بولا۔

"میں تمہارا ساری زندگی انتظار کرسکتی ہوں لیکن میرے امی ابو اتنا طویل انتظار نہیں کرسکتے۔ تم جتنی جلدی ہوسکتا ہے نوکری کا بندوبست کرو۔ اوکے بائے۔" عاشی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

زبیر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر یکدم اس نے موبائل فون نکالا اور عاشی سے دوبارہ بات کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا تو اسے پتا چلا کہ اس کے فون میں بیلنس نہیں ہے۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ روپے کا سکہ تھا۔ جب سے وہ نوکری سے نکالا گیا تھا وہ اپنی ضرورت کے لیے اپنے باپ سے پیسے مانگ رہا تھا۔ اس کا دوست طارق ہوٹل میں ہیڈ ویٹر تھا۔ وہ کئی بار اس کے ساتھ اس ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کرنے بھی چلا جاتا تھا۔ ٹپ سے اس کا اچھا خاصا خرچہ نکل آتا تھا۔ اب اس کے پاس پانچ روپے رہ گئے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ طارق کو کہہ کر اس کے ساتھ پھر ویٹر کے کام کے لیے کھڑا ہوجائے۔ ہفتے تک خرچہ بن جائے تو اسے اپنے باپ سے پیسے نہیں مانگنے پڑیں گے۔

عاشی کے ساتھ اس کی دوستی دو سال سے برقرار تھی۔ دونوں کی دوستی محبت میں تبدیل ہوچکی تھی اور دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ نوکری سے نکالا نہ جاتا تو عاشی اس کے بارے میں اپنے والدین سے بات کر چکی ہوتی لیکن عاشی کا باپ اپنی بیٹی کے لیے ایسا رشتہ تلاش کر رہا تھا جو اچھی نوکری پر، یا اپنا کاروبار کرتا ہو۔ عاشی ان کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور زبیر کے پاس اب کوئی نوکری نہیں تھی۔

اسی اثنا میں زبیر کا دوست طارق آگیا۔ طارق جس ہوٹل میں ہیڈ ویٹر تھا وہ ہوٹل شہر کا مقبول ہوٹل تھا جہاں آدھی رات تک لوگ کڑھائی گوشت، مچھلی، تکے، بریانی، آئس کریم اور وہاں کا تیار کیا ہوا کھانا کھانے جاتے تھے۔

"ڈیوٹی پر جا رہے ہو؟" زبیر نے پوچھا۔

"ہاں۔ تم سناؤ نوکری ملی؟" طارق بولا۔

"نہیں ملی یار۔" زبیر مرجھا سا گیا۔ "اب تو جیب میں بس پانچ روپے رہ گئے ہیں۔ ابا سے بار بار مانگتے ہوئے شرم آنے لگی ہے۔"

"میں یہی پوچھنے آیا تھا کہ اگر کام کرنے کا موڈ ہے تو میرے ساتھ چلو۔ دو لڑکے چھٹی پر ہیں۔"

زبیر نے اس کی طرف دیکھا۔ "ٹپ مل رہی ہے ناں؟"

"کل ایک بڑی فیملی آگئی تھی۔ چھتیس سو ساٹھ روپے کا بل بنا تھا۔ انہوں نے میری پلیٹ میں چار ہزار روپے رکھے اور یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ بقایا تم رکھ لینا۔" طارق نے اسے حیران کر دیا۔

"کیا واقعی......؟" زبیر چونکا۔

"ہاں واقعی...... چلو میرے ساتھ دو، چار دن کام کرلو، جیب خرچ بن جائے تو چھوڑ دینا۔ اس دوران شاید تمہاری نوکری کا انتظام ہوجائے۔ کم ازکم کسی کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ تو نہیں پھیلاؤ گے۔"

"اسی لیے تو تمہارے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ میری ڈیوٹی اچھی جگہ لگانا جہاں ٹپ اچھی بن جائے۔" زبیر بولا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ اب جلدی چلو۔" طارق نے کہا۔

زبیر اس کے ساتھ اُٹھ کر چلا گیا۔ دونوں ہوٹل پہنچ گئے۔ طارق نے زبیر کو یونیفارم پہنا دیا اور کام پر لگا دیا۔ زبیر چند بار اس ہوٹل میں کام کرچکا تھا۔ اسے کام کرنے

میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی بس یہی خیال رہتا تھا کہ اس کا کوئی رشتے دار اسے یہ کام کرتا ہوا نہ دیکھ لے۔

رات بارہ بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور اور کام کے دوران میں ملنے والی ٹپ گنی تو وہ پورے ڈھائی سو روپے تھے۔ طارق نے اس کی ڈیوٹی ایسی جگہ لگائی تھی جہاں عام لوگ کھانا کھانے کے لیے زیادہ آتے تھے۔ اس لیے وہ کھل کر ٹپ بھی نہیں دے کر گئے تھے۔ پھر بھی اس کے لیے ڈھائی سو روپے کافی تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ایک ہفتہ یہ کام کرلے تو اس کے پاس اتنے پیسوں کا انتظام ہوجائے گا کہ اسے کہیں آنے جانے کے لیے کسی سے پیسے نہیں مانگنے پڑیں گے۔

☆☆☆

حماد اور زاہد کے ساتھ ان کا ایک اور دوست نعیم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ نعیم چند ہفتے قبل ان کا اچانک دوست بن گیا تھا۔ جب وہ جوئے خانے میں بڑی رقم ہار رہے تھے تو وہ بھی ان کے ساتھ موجود تھا۔ اور جب دونوں ہارنے لگے تھے تو نعیم نے ان کو مزید کھیلنے سے منع کیا تھا۔ نعیم دراصل بہت سے جرائم میں ملوث تھا لیکن وہ دونوں کے ساتھ ایسے تھا جیسے وہ ایک عام سا نوجوان ہو، جس کا کام بس ان کے ساتھ رہ کر ان کی چاپلوسی کرنا اور جیتنے پر کچھ مل جانے کی امید رکھنا ہو۔

حماد سوچتے ہوئے بولا۔ "اب بھاگنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم نے اس بار وعدے کے مطابق تیمور خان کو رقم نہ دی تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔ وہ بہت سفاک ہے۔"

"تم نے رقم کے لیے دوبارہ اپنے بھائی سے بات کی تھی؟" زاہد نے پوچھا۔

"میں نے بات کی تھی۔ مجھے وہ ایک پیسہ دینے کو تیار نہیں ہیں بلکہ میری امی نے بھی بھائی کو سختی سے منع کر دیا ہے اور چچا کو بھی ہدایت دے دی ہے کہ اگر انہوں نے مجھے کوئی پیسہ دیا تو وہ اپنی ذمے داری پر دیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ امید بھی ختم ہوگئی ہے۔" زاہد نے کہہ کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں اب امید کا وہ دروازہ بند ہوگیا ہے۔ اب کیا کریں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" حماد مضطرب ہوگیا۔ "شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں تو وہ ڈھونڈ نکالے گا۔ چار دن کی مہلت میں ایک دن گزر گیا ہے۔"

"اب تو پھر کسی کو اغوا کرنا ہی باقی رہ گیا ہے۔" نعیم نے اچانک لقمہ دیا تو دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کہا تم نے؟" حماد نے پوچھا۔ "رقم کے لیے کسی کو اغوا کرلیں؟"

"تیمور خان کی وہ آخری مہلت ہے۔ اب وہ مزید وقت نہیں دے گا۔ ہم سب جانتے ہیں۔ کہیں سے بھی رقم کا انتظام کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے اب کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے ایک راستہ تو یہ ہے کہ کسی موٹی پارٹی کو اغوا کر کے اس سے تاوان لے کر تیمور خان کو رقم لوٹا دو۔ اس کے لیے میں تم دونوں کی یہ مدد کرسکتا ہوں کہ میرے پاس ایک خالی مکان ہے۔ مغوی کو ہم وہاں رکھ سکتے ہیں۔" نعیم نے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ نعیم ایسے بات کر رہا تھا جیسے کہ یہ سب بہت آسان ہو۔

نعیم کی بات سن کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے جسم میں عجیب سا احساس سرایت کرگیا تھا۔ دل کی دھڑکن بھی کچھ منتشر سی ہوگئی تھی۔ اس خیال نے دونوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نعیم نے ان کو نیا راستہ دکھا دیا تھا۔

"تمہاری نظر میں ہے کوئی جسے ہم اغوا کرسکیں؟" حماد نے پوچھا۔ اس کا لہجہ دھیما اور پُراسرار سا تھا۔

"اغوا بڑے خطرے والا کام ہے۔ ہم نے پہلے کبھی ایسا کام کیا نہیں ہے۔" زاہد کے چہرے سے خوف مترشح تھا۔

"ہمیں کچھ تو کرنا پڑے گا۔ ورنہ وہ ہم دونوں کو نہیں چھوڑے گا۔ ہم دونوں نے اس کی رقم دینی ہے۔ اکتیس لاکھ روپے میں اکیلا نہیں ہارا تھا۔ تم بھی میرے ساتھ تھے۔" حماد نے جلدی سے اس کی طرف دیکھ کر خشک لہجے میں کہا۔

زاہد چپ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ حماد اس کے ساتھ نرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے ورنہ وہ آدھے پیسوں کا انتظام کرنے کے لیے اسے بھی مجبور کرسکتا تھا۔ حماد نے اس سے قبل اسے یہ بات نہیں کی تھی، مگر اس وقت اس نے زاہد کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ رقم اس کو اکیلے ادا نہیں کرنی ہے۔ تو یہ اس کے اندر کی پریشانی تھی جو اس کے لبوں پر آگئی تھی۔ حماد ایک بار پھر نعیم کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم بتاؤ...... ہم یہ کام کیسے کرسکتے ہیں؟"

"اس بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ کسے اغوا کیا جائے۔ ہاں ایک بزنس مین ہے۔ بہت پیسے والا ہے اور

بہت ڈرپوک بھی ہے اسے اغوا کیا جاسکتا ہے۔'' نعیم بھی بہت بڑا چال باز تھا۔ اس کام میں اس کا اپنا مفاد بھی وابستہ تھا۔

یکدم زاہد چونکا۔ ''ہم کسی اور کو اغوا کرنے کا خطرہ کیوں لیں؟''

''تو پھر کیا کریں؟'' حماد جلدی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ نعیم نے بھی اپنے کان کھڑے کر لیے تھے۔

''ہم یہ کام آسانی سے کرسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کام بھی ہوجائے گا اور ہم بالکل محفوظ بھی رہیں گے۔'' زاہد پُرجوش تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' حماد اس کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ نعیم کے کان اس کی طرف تھے۔

''یہ خیال ابھی اچانک میرے دماغ میں آیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میری منگیتر انگلینڈ میں ہوتی ہے۔ وہ کچھ دن ہمارے پاس رہنے اور یہاں گھومنے کے لیے اکیلی آرہی ہے۔ اس کی آج رات آٹھ بجے فلائٹ ہے۔ اسے لینے کے لیے میں جارہا ہوں۔ اگر وہ راستے سے اغوا ہوجائے تو ہمارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔'' زاہد نے اپنی بات کہتے ہوئے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

اس کی بات سن کر حماد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نعیم بھی اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ جب حماد کچھ نہ بولا تو نعیم نے کہا۔

''اسے اغوا کرنا اور تاوان لینا تو بہت ہی آسان ہوگا۔ اسے اغوا کرنے کا منصوبہ میں بتا سکتا ہوں۔''

''جلدی سے بتاؤ......'' حماد نے اپنی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ وہ بے چین سا ہوگیا تھا۔

نعیم نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر بولا۔

''ائرپورٹ سے واپس آتے ہوئے ایک سڑک کنال روڈ کی طرف بھی نکلتی ہے۔ جو تمہارے گاؤں جانے کا شارٹ کٹ راستہ ہے۔ وہ سڑک ذرا ویران ہوتی ہے۔ اس سڑک کے ساتھ بڑی اور مصروف سڑک ہے اور اسی سڑک پر شہر کا مشہور ہوٹل ہے۔ اگر زاہد اسے لے کر اس سڑک پر آجائے اور اچانک اپنی کار بند کردے اور یہ ظاہر کرے کہ پیٹرول ختم ہوگیا ہے اور ڈگی سے خالی بوتل نکال کر اپنی منگیتر سے کہے کہ وہ اس جگہ انتظار کرے، وہ ابھی پیٹرول لے کر آتا ہے۔ یہ جیسے ہی پیٹرول لینے جائے گا، ادھر ہم گن پوائنٹ پر اس کی منگیتر کو اپنی کار میں بٹھا کر سیدھا اس مکان میں لے جائیں گے جو اس وقت خالی ہے۔'' نعیم نے اپنی بات ختم کر کے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ حماد اور زاہد اس کی طرف دم بخود دیکھ رہے تھے۔

''وہ اس ویران سڑک پر اکیلی کیسے انتظار کرسکتی ہے۔ وہ کہے گی کہ وہ بھی ساتھ ہی چلے گی۔'' زاہد بولا۔

''وہ کہے گی۔ یقیناً کہے گی لیکن اسے روکنا ہے۔ اور اسے یہ کہنا ہے کہ تم بالکل پیچھے سڑک پر جارہے ہو۔ اور گاڑی کا بھی خیال رکھنا ہے اور یقیناً گاڑی میں اس کا سامان بھی ہوگا۔'' نعیم نے کہا۔

''نعیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہاری منگیتر کو اغوا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے گھر والے تو انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ ان سے رابطہ کیسے ہوگا اور پیسے کیسے آئیں گے؟'' حماد بولا۔

''وہ تو میں گھر جا کر انہیں فون کردوں گا کہ فرح کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ فرح کا ایک ماموں یہاں بھی رہتا ہے بہت امیر کبیر ہے، وہ اس کے ذریعے سے تاوان کی رقم دلا دیں گے۔ فرح کی جان بچانے کے لیے وہ ایک لمحہ بھی دیر نہیں کریں گے۔'' زاہد نے بتایا۔

''بس طے ہوگیا۔ ہم تمہاری منگیتر فرح کو اغوا کر کے نعیم کے خالی مکان میں لے جائیں گے۔ اس سے آسان اغوا ہم اور کوئی نہیں کرسکتے۔ تیمور خان کی رقم لوٹا کر ہم کچھ دن کے لیے شہر سے باہر چلے جائیں گے۔ فرح کو جب اغوا کر کے ہم اس مکان میں لے جائیں گے تو تم اس کے سامنے نہیں جاؤ گے۔ تاوان وصول کرنے کے بعد ہم اسے تمہارے حوالے کردیں گے۔ اسے شک بھی نہیں ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ شامل تھے۔'' حماد نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''اس کام کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔'' نعیم ان کو راستہ بتانے کے بعد بولا۔

''وہ کیا شرط ہوگی؟'' حماد نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

''تم جتنا چاہو تاوان لو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مکان میں جگہ اور تم دونوں کا ساتھ دینے کے لیے میں صرف ایک لاکھ روپیہ لوں گا۔'' نعیم نے کہا لیکن اس کے دل میں ایک چال چھپی ہوئی تھی۔

''تمہیں ایک لاکھ دے دیں گے لیکن تم ہمارا پورا ساتھ دو گے... اور اسلحے کا انتظام بھی تم ہی کرو گے۔'' حماد نے کہا۔

''اسلحہ کرائے پر لینا پڑے گا۔ بیس، تیس ہزار وہ لے لیں گے۔'' نعیم نے جان بوجھ کر کہہ دیا حالانکہ اسلحہ اس کے پاس تھا۔

''چلو وہ بھی دے دیں گے۔'' حماد نے بے پروائی سے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ ''تم تب تک ہمارا ساتھ دو گے جب تک ہم اُن سے تاوان کی رقم نہیں لے لیں گے۔''

''میں تم دونوں کا پورا ساتھ دوں گا۔'' نعیم مسکرایا۔

حماد، زاہد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟ تم تیار ہو؟''

''ہاں بالکل تیار ہوں۔ کسی اور کو اغوا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، یہ کام ہم آسانی سے کرسکیں گے۔'' زاہد بولا۔

''جتنی رقم مانگیں گے مل تو جائے گی نا؟'' حماد نے ایک بار پھر تسلی چاہی۔

''ہم زیادہ سے زیادہ پچاس لاکھ روپیہ مانگیں گے۔ تاکہ وہ آسانی سے دے دیں اور ہمارا کام ہوجائے۔'' زاہد نے کہا۔

''ایک کروڑ مانگو گے تو پچاس لاکھ پر بات ختم ہو گی۔'' نعیم نے مداخلت کی۔

''نعیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' حماد نے اس کی بات پر اتفاق کیا۔ ''اگر ہم پچاس لاکھ روپے مانگیں گے تو آدھے پر بات طے ہوگی۔''

''فرح کی آٹھ بجے فلائٹ آئے گی۔ کم از کم ایک گھنٹا ائرپورٹ پر لگ جائے گا اور میں اسے لے کر اس سڑک پر پہنچ جاؤں گا۔ میرا موبائل فون پر تم سے رابطہ رہے گا۔'' زاہد نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''تم جو بات بھی کرو گے کورڈ ورڈز میں کرو گے۔ جیسے ہی ائرپورٹ سے نکلو گے تم کال کر کے کہو گے میل ہوگئی ہے۔ پھر جیسے ہی تم اس سڑک پر آؤ گے تو فون پر کہو گے کہ آپ کی میل کا جواب نہیں آیا ہے۔'' نعیم نے سمجھایا۔

''سڑک پر ہم پہلے سے موجود ہوں گے۔ اس لیے وہاں آکر اسے کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حماد نے کہا۔

''سڑک کے بجائے ہم اس چوک پر موجود ہوں گے جہاں سے زاہد اس سڑک پر جانے کے لیے اپنی کار موڑے گا۔ اس کے کچھ دیر کے بعد ہم بھی چل پڑیں گے۔'' نعیم بولا۔

''تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' حماد نے کہا۔

''کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے۔'' زاہد نے تاکید کی۔ ''کوشش یہی کرنا کہ کام جلدی سے جلدی مکمل ہوجائے۔''

''فرح کو اغوا کے بعد ہم اپنی ڈیمانڈ کریں گے، یہ اُن پر منحصر ہے کہ وہ کب ہماری ڈیمانڈ پوری کرتے ہیں۔'' حماد نے دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہم ان کو صرف چار گھنٹے کا وقت دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ فرح کا جو ماموں یہاں رہتا ہے، اس سے ہمیں رقم مل جائے گی۔'' زاہد نے کہا۔ ''جیسے ہی تم فرح کو لے جاؤ گے میں فوراً گھر چلا جاؤں گا۔''

''تم گھر نہیں جاؤ گے بلکہ ہمارے پیچھے اس گھر تک آؤ گے اور کچھ دیر کے بعد جاؤ گے تاکہ تم اپنے گھر والوں پر یہ ثابت کرسکو کہ تم نے فرح کے اغوا کے بعد ان کا دور تک پیچھا بھی کیا تھا۔'' نعیم نے پھر تجویز دی۔

''نعیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک بار ہم وہاں پہنچ کر فرح کو اچھی طرح سے باندھ دیں گے اور آپس میں کچھ مشورہ بھی کرلیں گے۔'' حماد نے کہا۔

''ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔'' زاہد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد انہوں نے مزید آپس میں کچھ معاملات طے کیے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

زبیر نے طارق سے کہا کہ وہ اس کی ڈیوٹی کسی ایسی جگہ پر لگائے جہاں سے اسے اچھی ٹپ ملے۔ وہ زیادہ دن ویٹر بن کر کام نہیں کرنا چاہتا۔ چند دن کا خرچہ جمع ہوجائے تو وہ فی الحال یہ کام چھوڑ دے گا۔ طارق نے اسے یقین دلایا کہ وہ آج اس کی ڈیوٹی ایسی جگہ لگائے گا جہاں فیملی آکر بیٹھتی ہیں۔ وہاں ٹپ کی صورت میں اچھے پیسے بن جاتے ہیں۔

زبیر یونیفارم میں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا کہ طارق نے اسے بتایا کہ سات نمبر کیبن میں ایک فیملی آئی ہے وہ جا کر ان سے آرڈر لے۔ زبیر جیسے ہی اس کیبن میں داخل ہوا وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے عاشی اپنے والدین ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عاشی اسے اس حلیے میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ زبیر کو ویٹر کے لباس میں دیکھ کر اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے زبیر ہی کھڑا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے ہی دیکھے جارہی تھی جبکہ زبیر کے پاس نگاہیں چرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک لمحے اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً چلا جائے لیکن جانے کیوں وہ رک گیا۔ عاشی کا باپ مینیو پڑھ رہا تھا۔ اس نے پہلے سب کی

رائے لی کہ کس کو کیا کھانا ہے اور پھر اس نے رعب دار انداز میں زبیر کو آرڈر لکھوایا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔
’’سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔ کوئی کمی نہ ہو اور ذرا جلدی لے آنا۔‘‘
زبیر جانے لگا تو عاشی کے باپ نے اسے پھر روک لیا۔ ’’سنو۔‘‘
’’جی سر؟‘‘ زبیر نے رک کر پوچھا۔
’’یہ ٹیبل اچھی طرح سے صاف کرو۔‘‘ عاشی کے باپ نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ زبیر نے کپڑے سے میز صاف کردی۔ عاشی کی نگاہیں اس وقت بھی زبیر پر ہی مرکوز تھیں۔
’’آرڈر جلدی لے کر آنا۔‘‘ ایک بار پھر عاشی کے باپ نے کہا۔
’’یس سر۔‘‘ زبیر کہہ کر کیبن سے باہر نکل گیا اور عاشی دم بخود سوچتی رہ گئی۔ زبیر نے آرڈر لکھوایا اور سوچنے لگا کہ وہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اب جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ وہ بعد میں عاشی کو سب کچھ سمجھا دے گا اور وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں طارق نے اسے آواز دی اور اس کا دھیان دوسرے کام کی طرف چلا گیا۔ پھر زبیر نے ان کا آرڈر پورا کیا اور ایک ایک چیز اُن کے سامنے سجا دی۔ عاشی ہی جانتی تھی کہ وہ زبیر ہے۔ وہ اسے ہی دیکھے جا رہی تھی اور زبیر اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔
عاشی کی فیملی نے ہنستے کھیلتے، باتیں کرتے ہوئے کھانا کھایا اور عاشی کھاتے ہوئے بھی سوچ رہی تھی کہ اس کا مطلب ہے کہ زبیر اس کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ وہ نوکری کے لیے انٹرویو دے کر آیا ہے۔ اور خود وہ ایک معمولی ویٹر ہے۔ اگر اس نے کہیں نوکری کے لیے انٹرویو دیا ہوتا تو اسے یہ نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟
عاشی نے خود ہی یہ اندازہ کرلیا کہ زبیر اس سے جھوٹ بول رہا ہے دراصل وہ یہی کام کرتا ہے۔
کھانا ختم ہوگیا تو زبیر نے آکر پوچھا۔ ’’کچھ اور چاہیے سر؟‘‘
’’بل لے آؤ۔‘‘ عاشی کے باپ نے کہا اور زبیر برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ عاشی بغور دیکھ رہی تھی کہ جس طرح سے زبیر نے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے تھے یہ کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہوسکتا جو یہاں بہت دیر سے کام نہ کرتا رہا ہو۔ اب عاشی کیا جانے کہ زبیر اس سے پہلے بھی گا ہے بگا ہے یہ کام کرتا رہا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد زبیر بل لے آیا۔ عاشی کے باپ نے بل دیکھا اور جیب سے پیسے نکال کر اس کی ٹرے میں رکھ دیئے۔ جب زبیر پیسے واپس لے کر آیا تو عاشی کے باپ نے سو سو کے دو نوٹ اُٹھا لیے اور پچاس روپے پڑے رہنے دیئے۔
’’یہ تمہارا انعام۔‘‘
’’سوری سر میں ٹپ نہیں لیتا۔‘‘ زبیر نے جلدی سے کہا۔
اس نے زبیر کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ’’تم ٹپ نہیں لیتے؟ تم لوگوں کا تو گزارا ہی ٹپ پر ہوتا ہے، رکھ لو۔‘‘
’’میں نہیں لوں گا سر۔‘‘ زبیر نے پُراخلاق لہجے میں انکار کیا۔
’’پپا شاید ٹپ کم ہے۔ آپ سو روپیہ اور رکھ دیں۔‘‘ عاشی نے کہا تو زبیر کو لگا جیسے عاشی نے اس کے سینے میں کوئی تیز دھار چیز گھونپ دی ہو۔ وہ پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔
’’بلکہ میں اپنی طرف سے بھی ٹپ دیتی ہوں۔‘‘ عاشی نے کہہ کر اپنے پرس سے سو کا نوٹ نکالا تو اس کا باپ جلدی سے بولا۔
’’کیا کر رہی ہو۔ پچاس روپے بہت ہیں۔ یہ نوٹ اپنے پاس رکھ لو۔‘‘
’’کوئی بات نہیں پپا اُن بے چاروں کا ہماری دی ہوئی بخشش پر ہی تو گزارا ہوتا ہے۔‘‘ عاشی نے اس کے سینے پر نشتر چبھو دیا۔
زبیر کے لیے اب رکنا محال تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا اس کمرے کی طرف گیا جہاں کپڑے بدلے جاتے تھے۔ اس نے کپڑے بدلے اور باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف جانا شروع کردیا۔ پیچھے سے طارق نے آواز دی۔
’’کہاں جا رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟‘‘
’’میں جا رہا ہوں۔‘‘ زبیر نے بغیر رکے جواب دیا۔
’’کیا ہوا ہے؟‘‘ طارق نے جاننا چاہا۔
’’کچھ نہیں۔‘‘ زبیر نے کہہ کر اپنی رفتار اور بھی تیز کرلی اور تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ عاشی کے باپ کا لہجہ اور عاشی کا طنز اس کے دل و دماغ میں زہر گھول رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا سڑک پر آگیا۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس نے ٹریفک کی کوئی پروا نہیں کی اور سڑک کی

دوسری جانب چل پڑا۔ قسمت ہی تھی کہ زبیر کو اس سبک ٹریفک میں سڑک عبور کرنے کا خیریت سے موقع مل گیا اور وہ سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔
اس سڑک سے ہوکر وہ کنال روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر چلنے لگا۔ اس سڑک پر نو بجے تک آنا جانا لگا رہتا تھا اس کے بعد اِکا دُکا ہی کوئی دکھائی دیتا تھا۔ وہ چوڑی سڑک تھی اور سڑک کے دائیں بائیں کچھ کچھ فاصلوں پر درخت بھی ایستادہ تھے۔ جبکہ اسٹریٹ لائٹس کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ فاصلوں پر لگی اسٹریٹ لائٹس کہیں روشن تھیں اور کہیں اندھیرا تھا۔ زبیر چلتا ہوا ایک جگہ رک گیا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔
وہ عاشی کے لہجے سے جان چکا تھا کہ اس کی محبت کا اختتام ہو چکا ہے۔ عاشی نے ٹپ دیتے ہوئے جو لہجہ اپنایا تھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ... اب وہ کوشش کرنے کے باوجود عاشی کو اپنی صفائی سے مطمئن نہیں کر سکے گا۔
زبیر چند قدم اور چلا اور ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ اس جگہ اندھیرا تھا۔ وہ اس قدر شکستہ دل تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی جگہ بیٹھ کر زندگی گزار دے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دور تک بھاگتا چلا جائے۔ زبیر درخت کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔
کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک سفید کار آتی نظر آئی اور اس نے ایک دو جھٹکے لیے اور سڑک کے عین درمیان رک گئی۔ زبیر کی توجہ اس جانب ہوگئی اور وہ اپنا غم بھول گیا۔ کار اس سے کچھ آگے تھی اور وہ کار کے عقب میں اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا۔
اچانک کار کا دروازہ کھلا اور جو نوجوان کار سے باہر نکلا تو زبیر اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا کہ وہ وہی نوجوان تھا جو اس دن آفس میں آیا تھا جب وہ انٹرویو دینے کے لیے وہاں بیٹھا تھا، اور اس کے ساتھی نے اس کا نام زاہد لیا تھا۔ زاہد کے باہر نکلتے ہی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت اور پُرکشش لڑکی باہر نکلی۔
’’فرح تم اندر بیٹھ جاؤ۔ گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔ میں ابھی پیٹرول لے کر آیا۔‘‘
’’میں یہاں ویرانے میں کیسے گاڑی کے اندر بیٹھ سکتی ہوں؟‘‘ فرح نے دائیں بائیں دیکھا۔
’’یہ ساتھ ہی مین سڑک ہے وہاں سے مجھے پیٹرول مل جائے گا۔ بس دس منٹ لگیں گے۔‘‘ زاہد نے کہا۔
’’میں یہاں نہیں رک سکتی، تم مجھے بھی ساتھ ہی لے

حلوا خور

کچھ لوگ حلوا گھروں میں کھاتے ہیں، کچھ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھاتے ہیں اور کچھ اسمبلی میں کھاتے ہیں۔ اس طرح دنیا بھر میں لوگ حلوا کھاتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں کھاتے ہیں۔ حلوے کی بھی کئی اقسام ہیں۔ قسم قسم کے حلوے ایجاد ہو گئے ہیں۔ طرح طرح کے نام ہیں۔ کوئی کھانے والا ہے تو کوئی چبانے والا۔ کوئی چیونگم کی طرح کھانے والا تو کوئی توڑ کر کھانے والا، کوئی منہ میں ڈالتے ہی گلے میں اتر جاتا ہے اور کسی کا نوالہ گلے میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ گلے میں پھنسنے والا حلوا عام طور پر سیاست داں کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض بیوروکریٹ بھی ایسے ہیں جو حلوے کے بڑے شوقین ہیں مگر وہ اسے حلوا نہیں کہتے، اسے رشوت، حصہ، محنتانہ اور فضل ربی کا نام دیتے ہیں۔ نام جو کچھ بھی ہو، مقصد تو حلوا کھانا ہے جو وہ نسل در نسل کھاتے چلے آرہے ہیں۔ سب حلوہ خور ہیں۔

چلو۔‘‘ فرح کے چہرے سے خوف مترشح تھا۔
’’گاڑی یہاں کھڑی ہے۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تمہارا سامان پڑا ہے۔ تم گاڑی اندر سے لاک کر کے بیٹھ جاؤ میں بس گیا اور آیا۔‘‘ زاہد نے اسے تسلی دی۔
فرح تذبذب کا شکار تھی۔ پھر وہ بولی۔ ’’تم جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔‘‘
’’میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔ مجھے بھی پتا ہے کہ تم یہاں اکیلی ہو میں بس پیٹرول لے کر آیا۔‘‘ زاہد نے کہہ کر ڈکی کھولی اور اندر سے پلاسٹک کی خالی بوتل نکال لی۔ پھر اس نے ڈکی بند کردی۔ لیکن ڈکی ٹھیک سے بند نہیں ہوئی تھی۔
فرح نے ڈرتے ہوئے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ زاہد تیزی سے سڑک کی طرف چلا گیا۔ فرح گاڑی کے اندر بیٹھی ڈر رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی جبکہ زبیر کا دھیان گاڑی کی طرف تھا اور وہ اُن کو دیکھتے ہوئے اپنا غم بھول گیا تھا۔
اچانک ایک کار تیزی سے وہاں آئی اور اس کار کے برابر میں ہی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی سرعت سے کار کے دروازے کھلے اور دو نوجوان باہر نکلے۔ ایک کو تو زبیر نے پہچاننے میں دیر نہیں کی تھی۔ وہ بھی اس دن آفس میں اس نوجوان کے ساتھ آیا تھا اور استقبالیہ پر جا کر جب زبیر نے

اس کے بارے میں پوچھا تھا تو اس لڑکی نے بتایا تھا کہ اس کا نام حماد ہے اور کمپنی کے شراکت دار کا بیٹا ہے۔

زبیر کے لیے اب معاملہ کچھ حیران کن تھا۔ حماد کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ حماد نے لڑکی کی طرف کا دروازہ کھولا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا۔

''کون ہو تم...... چھوڑو مجھے......'' فرح نے مزاحمت کی۔ اس کا چہرہ ڈر اور خوف میں نہا گیا تھا۔

''شور کیا تو گولی ماردوں گا۔'' نعیم نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ فرح ڈر کر چپ ہوگئی۔

''چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔'' حماد نے حکم دیا۔ حماد نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور دوسرے لمحے نعیم نے فرح کو کار کے اندر دھکیلا اور خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا جبکہ اس کا ریوالور فرح کی پسلی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ فرح خوف کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ حماد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ہی کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

زبیر کھڑا متحیر نگاہوں سے کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی کے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا۔ تب اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب ایک طرف سے زاہد خالی بوتل لیے نکل آیا۔ اس نے بوتل ایک طرف پھینکی اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔ زبیر سمجھ گیا کہ یہ دونوں کا کوئی ڈراما تھا۔ اسی لمحے زبیر نے حرکت کی اور وہ تیزی سے جھکتا ہوا کار کے پیچھے پہنچا اور ڈکی کھول کر اندر چلا گیا۔ ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھ گئی۔

حماد کی کار کی رفتار غیر معمولی تھی۔ وہ سڑک پر دوڑتی جارہی تھی اور حماد بڑے خطرناک طریقے سے گاڑیوں کو اوورٹیک کررہا تھا۔ فرح متوحش نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ نعیم کا ریوالور اس کی پسلی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

کار ایک کالونی میں داخل ہوگئی تھی۔ نعیم اسے بتانے لگا تھا کہ اسے کس گلی سے کس طرف مڑنا ہے۔ جیسے جیسے نعیم بتاتا گیا ویسے ویسے حماد کار اس طرف لے جاتا رہا۔ اب کالونی کی جس سڑک پر کار جارہی تھی وہاں پہلے اس علاقے کا پولیس اسٹیشن آیا، اور اس سے کچھ ...مکان چھوڑ کر ایک گلی میں مڑتے ہی ایک مکان کے سامنے نعیم نے کار روکنے کے لیے کہا۔ حماد نے کار روک دی۔

''میں نے چابی ڈیش بورڈ میں رکھ دی تھی، وہاں سے چابی نکال کر گیٹ کھول کار اندر لے جاؤ۔'' نعیم نے کہا تو حماد نے ڈیش بورڈ سے چابی نکالی اور اتر کر مکان کا گیٹ کھولا اور دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اندر لے گیا اور پھر اس نے کار سے اتر کر گیٹ بند کردیا۔

نعیم نے فرح کو باہر نکالا اور وہ ریوالور کی زد میں اسے اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے حماد تھا۔ سامنے لاؤنج تھا، دائیں طرف گھومتی ہوئی سیڑھی تھی، سیڑھی کے ساتھ ہی ایک کمرے کا بند دروازہ تھا۔ نعیم سیڑھی کی طرف بڑھا اور اسے اوپر لے گیا۔ سامنے دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر نعیم جیسے ہی کمرے میں گیا اس نے فرح کو سامنے دھکا دے دیا اور فرح بیڈ پر گر گئی۔ بیڈ پر گرتے ہوئے اس کی ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نعیم نے ایک بٹن دبایا اور کمرا روشن ہوگیا۔

وہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا۔ ایک کرسی کے ساتھ چھوٹی سی میز رکھی تھی اور سامنے کمرے سے ملحق باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے آگے پردے لٹک رہے تھے۔ فرح بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے گھبرائی اور خوفزدہ بیٹھی تھی۔

''اسے باندھ دو۔'' حماد نے پیچھے آکر کہا۔

''اسے باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھڑکی پر مضبوط لوہے کی گرل ہے اور یہ بھاگ نہیں سکتی ہے۔'' نعیم بولا۔

''اس مکان سے پولیس اسٹیشن دور نہیں ہے۔ مجھے اگر پہلے پتا ہوتا تو میں یہاں آنے کا خطرہ نہ لیتا۔'' حماد نے کہا۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے یہاں کونسا کوئی ہنگامہ کرنا ہے اور پھر بہت سے کام پولیس اسٹیشن کی ناک کے نیچے ہی ہوتے ہیں۔'' نعیم کہہ کر مسکرایا۔

''باہر آجاؤ۔'' حماد جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

''مجھے کیوں یہاں لائے ہو۔'' فرح نے جلدی سے پوچھا۔

''تم چپ رہو۔ کوئی سوال نہیں...... سمجھی۔'' نعیم نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جما کر سفاک لہجے میں کہا، فرح سہم کررہ گئی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اسی اثنا میں حماد کے فون پر زاہد کی کال آگئی، وہ مکان کا پتا پوچھ رہا تھا۔ نعیم نے اسے سمجھایا اور کچھ دیر کے بعد زاہد بھی وہاں پہنچ گیا۔ کار پورچ میں کھڑی کرکے وہ نعیم کے ساتھ اندر چلا گیا۔

زبیر نے تھوڑی سی ڈکی اٹھا کر دیکھا اور پھر جلدی

سے باہر نکل آیا۔ وہ دبے پاؤں میں دروازے کی طرف گیا۔ وہاں رک کر اس نے کچھ سننے کی کوشش کی جب اسے کوئی آواز نہ آئی تو وہ اندر چلا گیا۔

دائیں جانب کے کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے آوازیں بھی آرہی تھیں۔ زبیر اس طرف چلا گیا۔ زاہد کی آواز واضح ہوئی۔

''اب میں گھر جارہا ہوں۔ فرح کا خیال رکھنا۔''

''بےفکر رہو، اوپر کمرے میں بند ہے وہ۔'' نعیم نے تسلی دی۔

''کوشش کرنا کہ راتوں رات ہمیں تاوان مل جائے تاکہ ہم صبح تک تیمور خان کی رقم دے کر پُرسکون ہوجائیں۔'' حماد نے کہا۔

''یہ بات ذہن میں رکھنا کہ فرح میری منگیتر ہے جسے ہم نے محض اس لیے اغوا کیا ہے تاکہ ہم تیمور خان کی رقم دے سکیں۔ فرح کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔'' زاہد نے متانت سے کہا۔

''تم ایسا سوچنا بھی نہیں کہ ہم فرح کے ساتھ کوئی برا سلوک کریں گے۔ بس اب تم ان سے بات کرو اور جتنی جلدی ممکن ہے ان سے پیسہ لو۔'' حماد بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں اب نکلتا ہوں۔'' زاہد کی آواز سنتے ہی زبیر نے جلدی سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سیڑھیوں کی طرف تیزی سے بڑھا اور سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر چلا گیا۔ اس نے دو کمروں کے دروازے دیکھے۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ زبیر جلدی سے بائیں طرف ایک چھوٹی سی راہداری کے بعد نظر آنے والے اَدھ کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اس مکان کا اسٹور روم تھا۔ زبیر اس کے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

زاہد سیدھا اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ ان کا گھر کھیتوں کے سامنے دوسرے گھروں کے ساتھ تھا۔ وہ گھر بڑا، اس کا صحن کشادہ تھا۔ فرح کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ اس کے باپ کے پاس اچھی خاصی زمین تھی...... فرح نے شہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اس گاؤں میں اپنے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر گرا کر اور اکثر نیلا گولڈن دھاری دار دوپٹا اوڑھ کر رہتی تھی۔ اسے نیلا رنگ بےحد پسند تھا۔ اور جب تک وہ گاؤں میں رہی، اس کی خوبصورت آنکھوں میں سرمہ ضرور نظر آتا تھا۔ وہ گاؤں میں رہتے ہوئے بالکل گاؤں کی لڑکی لگتی تھی۔

پھر اس کے باپ نے ساری زمین بیچی اور فرح کو لے کر انگلینڈ چلا گیا۔ کیونکہ فرح کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ فرح کا باپ پہلے بھی کئی سال انگلینڈ میں رہ کر آیا تھا۔ فرح کی زاہد کے ساتھ منگنی ہوچکی تھی اور فرح کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ زاہد کو بھی انگلینڈ میں ہی بلالے گا۔ اچانک فرح کے باپ کا انگلینڈ میں انتقال ہوگیا اور فرح وہاں اپنے ماموں کے پاس رہنے لگی تھی۔ فرح نے زاہد کو فون کرکے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے واپس آرہی ہے اور اپنی فلائٹ کی آمد کا بھی بتادیا تھا۔ اب فرح واپس آئی تو زاہد نے حماد کے ساتھ مل کر پیسوں کے لیے فرح کے...... اغوا کا ڈراما رچادیا تھا۔

زاہد کے والدین صحن میں ہی بیٹھے تھے۔ جیسے ہی زاہد اندر گیا اس کی ماں اور باپ نے متلاشی نگاہوں سے اس کے عقب میں دیکھا۔

''فرح کہاں ہے؟ باہر کھڑی ہے کیا؟'' زاہد کی ماں مسکرائیں۔

''ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔'' زاہد کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''کیا ہوگیا ہے؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' زاہد کا باپ اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ماں کے چہرے سے بھی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔

''ہم آرہے تھے کہ اچانک......'' زاہد کہتا ہوا رک گیا اور اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت بہترین اداکاری کررہا تھا۔

''جلدی سے بولو کیا ہوا ہے؟'' زاہد کی ماں کو بےچینی ہونے لگی تھی۔

''اچانک ایک کار میری کار کے آگے رکی اور مجھے مجبوراً بریک لگانا پڑا۔ پھر اس کار سے دو نقاب پوش باہر نکلے ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہوں نے اسلحے کے زور پر فرح کو باہر نکالا اور اپنی کار میں بٹھا کر لے گئے۔'' زاہد نے کہانی سنائی۔

''کیا......؟ فرح کو اغوا کرکے لے گئے؟'' زاہد کی ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اس کا باپ بھی دم بخود رہ گیا۔

''میں نے کار ان کے پیچھے لگائی لیکن وہ نکل گئے۔'' زاہد کے لہجے میں تاسف تھا۔

"یہ کیا ہوگیا؟" زاہد کی ماں نے رو دینے والے انداز میں پہلے زاہد کے باپ اور پھر زاہد کی طرف دیکھا۔

"پولیس کو اطلاع کی؟" زاہد کے باپ نے پوچھا۔

"نہیں۔" زاہد نے نفی میں سر ہلایا۔

"چلو میرے ساتھ ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔" زاہد کا باپ اس کی طرف بڑھا۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں پولیس کو اطلاع نہیں دینی چاہیے۔ اس طرح سے فرح کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ انہوں نے تاوان کے لیے فرح کو اغوا کیا ہوگا۔ ہمیں پہلے یہ انتظار کرنا چاہیے کہ وہ ہم سے رابطہ کرکے کیا مطالبہ کرتے ہیں۔" زاہد نے کہا۔ اس کی بات سن کر اس کا باپ پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے انہوں نے تاوان کے لیے اسے اغوا کیا ہوگا؟" اچانک زاہد کے باپ نے پوچھا۔

زاہد گڑبڑا گیا لیکن اس نے فوراً قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی تو ہے نہیں۔ اور شہر کے جو حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں۔"

"زاہد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ لوگ ائرپورٹ سے ہی ان کے پیچھے لگے ہوں گے۔" زاہد کی ماں نے بیٹے کی بات سے اتفاق کیا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد زاہد کے باپ نے کہا۔ "انگلینڈ فون کرکے ان کو اطلاع کردیں؟"

"ابھی رک جائیں۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔" زاہد اپنے منصوبے پر عمل کررہا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی اور زاہد پریشانی کے عالم میں وہاں بیٹھ گئے۔ اچانک زاہد کا باپ بولا۔

"وہ ہم سے کیسے رابطہ کریں گے؟"

"فرح کے پاس میرا فون نمبر ہے۔" زاہد نے جلدی سے بتایا۔ "اگر میرا اندازہ ٹھیک نکلا تو وہ اس سے میرا نمبر لے کر مجھے کال ضرور کریں گے۔"

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد نعیم کے نمبر سے زاہد کے فون پر کال آئی تو تینوں ایسے چونکے جیسے کوئی طوفان آگیا ہو۔

"انجانا نمبر ہے۔" زاہد نے نمبر دیکھ کر کہا اور پھر فون کان کو لگالیا۔ دوسری طرف سے نعیم کی آواز آئی۔

"ایک کروڑ روپے تاوان کی بات کرو اور بات انگلینڈ تک پہنچا دو تاکہ پیسوں کا جلدی سے جلدی بندوبست ہوسکے۔"

"آپ کون ہیں اور کیا بول رہے ہو؟" زاہد نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک بول رہے ہو۔" نعیم بولا۔

"ایک کروڑ روپیہ......؟ ہم اتنے پیسے نہیں دے سکتے......نہیں نہیں فرح کو کچھ نہیں ہونا چاہیے......صبح سورج نکلنے سے پہلے......اتنی جلدی کیسے ممکن ہے......اچھا اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔" زاہد نے پوری طرح سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ جیسے دوسری طرف سے اسے بارعب انداز میں پیسوں کے تاوان کے لیے کہا جارہا ہو۔ کال منقطع ہوگئی تھی اور زاہد نے فون کان سے الگ کرکے اپنے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک کروڑ روپیہ تاوان مانگ رہے ہیں۔"

ایک کروڑ روپیہ......؟" زاہد کے باپ اور ماں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ "اتنا پیسہ ہم کہاں سے دیں گے؟"

"میں انگلینڈ فون کرکے ان کو اطلاع کردیتا ہوں۔" زاہد نے وقت ضائع نہیں کرنا چاہا۔

زاہد کے باپ نے اس سے رائے پوچھی۔ "کیا خیال ہے ہم پہلے پولیس کو اطلاع نہ کردیں۔"

"انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع ہوئی تو وہ فرح کو گولی ماردیں گے۔" زاہد نے ڈرایا۔

"نہیں نہیں آپ انگلینڈ بات کریں۔" زاہد کی ماں فوراً ڈر گئیں۔ "ہم کوئی خطرہ نہیں لے سکتے۔"

"میں انگلینڈ کال کروں؟" زاہد نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

کچھ سوچنے کے بعد زاہد کے باپ نے کہا۔ "ہاں تم کال کرو۔ اور ان کو بتادو کہ فرح اغوا ہوگئی ہے۔"

زاہد نے ایک لمحے کے لیے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں مسکرایا کہ ابھی کال جاتے ہی وہ فرح کی محبت میں اس کی رہائی کے لیے فوراً پیسے دینے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ اور ان کی تیمور خان سے جان چھوٹ جائے گی۔

☆☆☆

زبیر اسٹور روم میں دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا رہا۔ کوئی اوپر آیا اور اس کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ زبیر کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اسی کی طرف آرہا ہو۔ وہ اندھیرے میں اور بھی زیادہ دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ پھر چلنے کی آواز بند ہوگئی اور کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر

دروازہ بند ہوگیا۔

زبیر کچھ دیر کھڑا رہا جب مکمل سکوت ہوگیا تو وہ دیوار سے الگ ہوا اور اُدھ کھلے دروازے سے باہر جھانکا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اسٹور روم سے باہر نکل آیا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کمرے تک چلا گیا جس کمرے میں فرح کو بند کیا تھا۔ یکدم پھر کسی کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے کی آواز آنے لگی۔ زبیر تیزی سے بھاگتا ہوا پھر اسٹور میں چلا گیا۔ وہ اُدھ کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نعیم تیزی سے اوپر آیا اور آگے چلا گیا۔ راہداری کی دیوار کی وجہ سے وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ نعیم کس کمرے میں گیا تھا۔ لیکن جلدی ہی نعیم سیڑھیوں کی طرف آتا دکھائی دیا اور اس کے ساتھ حماد بھی تھا۔

"ہاں کیا ہوا ہے؟" حماد نے پوچھا۔

"میں نے ابھی پھر زاہد کو فون کیا ہے۔" نعیم نے بتایا۔

"ابھی تم نے میرے سامنے فون کیا تو تھا۔ دوبارہ فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" حماد نے کہا۔

"میں نے اس سے پوچھا ہے کہ بات آگے ہوئی ہے کہ نہیں۔" نعیم بولا۔

"پھر اس نے کیا جواب دیا؟" حماد نے پوچھا۔

"اس نے بتایا ہے کہ ابھی اس کی بات والدین سے ہوئی ہے انہوں نے کہا ہے کہ وہ انگلینڈ فون کرکے اطلاع کردے۔ ابھی وہ ان کو اطلاع کرکے مجھے فون کرے گا۔" نعیم نے کہا۔

"پولیس کے چکر میں تو نہیں پڑ رہے ناں۔"

"زاہد نے اس طرف جانے ہی نہیں دیا۔ حالانکہ اس کا باپ کہہ رہا تھا کہ وہ پولیس کو اطلاع کردیں لیکن زاہد نے منع کردیا ہے۔" نعیم نے کہا۔

"اس کام میں ہوشیاری بہت ضروری ہے۔"

"ویسے تم فرح کے کمرے میں کیا کرنے گئے تھے؟" نعیم نے اچانک پوچھا۔

"ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فرح، زاہد کی منگیتر ہے۔ ہم تینوں نے رقم کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا ہے۔ میں اس سے پوچھنے گیا تھا کہ وہ بھوکی ہے تو اس کے لیے کھانے پینے کا انتظام کروں۔" حماد کو اس کی بات ناگوار گزری تھی اس لیے اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کچھ بھی کھانے پینے سے صاف انکار کردیا ہے۔ آؤ نیچے چلیں۔" حماد نے کہا۔ "کمرے کا دروازہ لاک کردو۔"

حماد کہہ کر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا اور نعیم نے اس کمرے کو مقفل کردیا جس میں فرح قید تھی پھر وہ نیچے چلا گیا۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ زبیر کی سمجھ میں ساری کہانی آرہی تھی۔ اس نے سوچا...اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی کا نام فرح ہے۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ کار میں اس سڑک تک آئی تھی وہ اس کا منگیتر ہے اور ان تینوں نے رقم کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے۔ فرح انگلینڈ سے آئی ہوگی اور اس کے والدین وہاں مقیم ہوں گے تبھی انگلینڈ فون کرنے کی بات کررہے تھے۔

زبیر خود ہی تانا بانا بنتا رہا اور خود ہی نتیجہ اخذ کرتا ہوا اسٹور روم سے باہر نکل آیا۔ وہ چلتا ہوا اس کمرے تک پہنچا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا، دروازہ لاک تھا۔ زبیر نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ فرح کی مدد کرے گا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔ زبیر نے بغیر آہٹ پیدا کیے دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر چلا گیا اور دروازہ بند کردیا۔ اس نے دیوار کو ٹٹولتے ہوئے بٹن تلاش کیے اور جونہی اس نے ایک بٹن دبایا کمرا روشن ہوگیا۔

کمرے میں ایک ڈبل بیڈ اور کچھ سامان پڑا تھا۔ زبیر کچھ دیر تو سوچتا رہا اور پھر اس نے پہلے بیڈ کے ساتھ والی تپائیوں کے دراز کھول کر دیکھے، پھر الماری کی تلاشی لینی شروع کی اور جونہی اس نے ایک دراز کھولی وہ چونک گیا۔ اس دراز میں کچھ دوسرے سامان کے ساتھ چابیوں کا گچھا بھی پڑا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا اُٹھا کر دیکھا اس میں کئی چھوٹی بڑی چابیاں تھیں۔ زبیر چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکلا اور اس کمرے کے دروازے کے لاک میں لگا کر دیکھنے لگا جس کمرے میں فرح کو قید کیا تھا۔

وہ ایک ایک کرکے چابی لگاتا رہا اور بار بار وہ اپنے عقب میں سیڑھیوں کی طرف بھی دیکھتا رہا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ اچانک کوئی اوپر نہ آجائے۔ وہ یہ احتیاط بھی کررہا تھا کہ چابیوں کے آپس میں ٹکرانے سے آواز بھی پیدا نہ ہو۔ اچانک ایک چابی جیسے ہی اس نے لگائی، وہ گھوم گئی اور لاک کھل گیا۔

زبیر نے آہستہ سے لاک کھول کر کچھ دیر توقف کیا

اور پھر یکدم ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے فرح بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا اور وہ زبیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دانست میں تھا کہ آنے والا ان کا ہی ساتھی ہے۔

زبیر نے اندر آتے ہی دروازے کو بند کرنے کے لیے دھکیل دیا لیکن وہ پوری طرح سے بند نہ ہوا اور دروازہ کچھ کھلا ہی رہا پھر وہ اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''میں آپ کی مدد کے لیے آیا ہوں۔''

فرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے متوحش نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ اسے زبیر کی اس بات پر یقین نہیں آیا ہے۔

''میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ جب آپ کو اغوا کیا جا رہا تھا تو میں وہاں موجود سب دیکھ رہا تھا۔ پھر میں اسی کار کی ڈکی میں بیٹھ کر یہاں تک پہنچ گیا جس کار میں آپ کو زاہد لے کر آیا تھا۔'' زبیر دو قدم اس کی طرف بڑھا تو فرح ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اس بار فرح کے چہرے پر خوف سے زیادہ حیرت دکھائی دے رہی تھی۔

جب فرح کچھ نہ بولی اور محض اس کی طرف سوالیہ نگاہوں اور حیرت سے دیکھتی رہی تو وہ پھر بولا۔ ''میرا یقین کیجیے میں ان کا ساتھی نہیں ہوں اور جو میں نے کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔''

''میں کیسے یقین کروں؟'' فرح نے اپنی خاموشی توڑی۔

زبیر سوچنے لگا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے کیونکہ فرح کو یقین دلانا مشکل تھا۔ پھر وہ بولا۔

''آپ کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہو رہا ہے۔ زاہد، حماد اور ان کا تیسرا ساتھی یہ آپس میں دوست ہیں اور آپ کو اغوا کرانے میں زاہد ان کے ساتھ شامل ہے۔''

''وہ ایسا کیوں کرے گا؟'' فرح نے کہا۔

''وہ تاوان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کسی تیمور خان کے پیسے دینے ہیں۔'' زبیر نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا چابیوں کا گچھا بیڈ پر رکھ دیا۔ ''یہ چابیاں مجھے ساتھ والے کمرے سے ملی ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ آپ کا تاوان لینے کا ڈراما آگے بڑھائیں، آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو یہاں سے لے جاتا ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' فرح بولی۔

''آپ یقین کریں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اتنا بہادر نہیں ہوں لیکن جانے کس طاقت نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا کہ میں خود بھی حیران ہوں۔ شاید آپ کے پیچھے کسی کی دعا ہے۔'' زبیر نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

فرح کو ابھی بھی اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ جب گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا تو زاہد نے یہ پروا نہیں کی تھی کہ گاڑی میں اکیلی لڑکی بیٹھی ہے۔ اسے یہ فکر تھی کہ گاڑی میں پڑے سامان کو کوئی نہ لے جائے۔ اور اس نے اسے گاڑی میں ہی رکنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ فرح کو ایک اور بات نے چونکا دیا تھا۔ جب کار نے جھٹکا لیا تھا اور وہ رک گئی تھی تو زاہد نے فیول میٹر کی طرف دیکھے بغیر فوراً کار کا دروازہ کھولا تھا اور باہر نکل کر کہا تھا کہ کار میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔

''آپ سچ مچ میری مدد کرنا چاہتے ہیں؟'' فرح نے سوچنے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یقین کیجیے میرا کوئی اور مقصد بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ جلدی کریں۔ میرے ساتھ چلیں اور جہاں آپ کہیں گی میں آپ کو پہنچا دوں گا۔'' زبیر نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ اسے لگا کوئی سیڑھیاں اوپر چڑھ رہا ہے۔ اس نے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا وہ کچھ کھلا ہوا تھا۔ زبیر نے فوراً چابیوں کا گچھا اُٹھایا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے دروازے کا لاک مقفل کرنے کے لیے اس میں چابی گھمائی لیکن اب اتنی چابیوں میں وہ چابی تلاش کرنا مشکل تھا جو اس دروازے کے لاک کی چابی تھی۔ وہ تیزی سے ایک کے بعد ایک چابی نکال کر کوشش کرنے لگا۔ کوئی چلتا ہوا اس دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ اور زبیر کو اس لاک کی چابی نہیں مل رہی تھی۔

☆☆☆

زاہد کوشش کر رہا تھا کہ اس کا انگلینڈ میں رابطہ ہو جائے لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود اس کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے پاس دو فون نمبر تھے اور دونوں کے ساتھ ہی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ زاہد کی ماں ایک طرف پریشان بیٹھی تھیں جبکہ اس کا باپ سوچوں کے گرداب میں الجھا ٹہل رہا تھا۔

ابھی وہ کوشش کر ہی رہا تھا کہ حماد کا فون آ گیا۔ زاہد نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا جو فون کی بیل سن کر رک گیا تھا اور اس کی نگاہیں زاہد کے ہاتھ میں پکڑے فون پر تھیں۔ زاہد نے فون کان سے لگا لیا۔

''رابطہ ہوا......؟''

''میں کوشش کر رہا ہوں۔'' زاہد نے گھبرا کر کہا۔

''تم ابھی کوشش ہی کر رہے ہو؟'' حماد کو غصہ... آ گیا۔ ''ہمیں یہ کام جلدی ختم کرنا ہے۔''

''دیکھیں فرح کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں فرح کے ماموں سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ آپ کی رقم کا انتظام ہو سکے، لیکن نمبر نہیں مل رہا ہے۔'' زاہد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''جلدی کرو۔'' حماد نے زور دے کر فون بند کر دیا۔

فون بند ہو جانے کے بعد بھی زاہد بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ لیکن فرح کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں رقم کا انتظام کر رہا ہوں۔''

زاہد نے کہہ کر فون کان سے الگ کیا تو اس کے باپ نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے تھے وہ؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ پیسوں کا جلدی انتظام کرو ورنہ وہ فرح کو مار دیں گے۔'' زاہد نے مزید ڈرایا۔

''یہ کال کیوں نہیں مل رہی ہے؟ پھر کوشش کرو۔'' زاہد کا باپ پریشان ہو گیا تھا۔

زاہد پھر کوشش کرنے لگا۔ اس بار بیل جانے لگی تھی۔ زاہد کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی تو زاہد بولا۔

''ماموں میں زاہد بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں...... زاہد کیا حال ہے۔ سب خیریت ہے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ آواز میں متانت تھی۔

''ماموں خیریت نہیں ہے۔'' زاہد نے جلدی سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ماموں نے پوچھا۔

''میں فرح کو ائرپورٹ سے گھر لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں فرح کو کچھ لوگوں نے تاوان کے لیے اغوا کر لیا ہے اور وہ اس کی زندگی کے بدلے میں ایک کروڑ روپیہ مانگ رہے ہیں۔ ہم بہت پریشان ہیں۔'' زاہد نے وقت ضائع کیے بغیر بتا دیا۔

دوسری طرف فرح کے ماموں کی متحیر آواز آئی۔ ''کیا کہا...... ؟ فرح اغوا ہو گئی ہے؟ فرح یہاں آئی کب تھی؟''

''آج ہی پہنچی تھی۔ ہمارے وقت کے مطابق رات آٹھ بجے۔'' زاہد کے لیے یہ حیرت کا جھٹکا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ فرح یہاں آ گئی ہے؟ تم لوگوں کو اس نے اپنے آنے کی اطلاع کب کی تھی۔'' فرح کا ماموں اور بھی حیران ہوا۔

''ایک دن پہلے مجھے فرح نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ فلاں فلائٹ سے رات آٹھ بجے پہنچے گی۔'' زاہد نے بتایا۔ وہ فرح کے ماموں کی اس بات پر حیران تھا۔

''اوہ......'' فرح کے ماموں نے طویل 'اوہ' کی۔ ''ہم اسے یہاں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں بتائے بغیر، اپنا پاسپورٹ لے کر تم لوگوں کے پاس پہنچ گئی۔''

''تو کیا وہ آپ لوگوں کو بتا کر نہیں آئی؟'' زاہد کے لیے یہ ایک اور حیرت کا جھٹکا تھا۔

''بالکل بھی نہیں بتایا اس نے۔ اس نے ہمیں شک بھی نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنا پاسپورٹ کب لیا، کب ٹکٹ کٹوایا اور کب وہ جہاز میں سوار ہوئی' وہ سب کچھ ہماری۔۔ ناک کے نیچے کر کے چلی گئی اور ہم اسے یہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کے پاگل ہو رہے ہیں۔'' فرح کے ماموں کی آواز بلند ہو گئی تھی اور صاف عیاں تھا کہ انہیں غصہ بھی آ گیا ہے۔

''فرح نے ایسا کیوں کیا؟'' زاہد نے پوچھا۔

''ہمیں کیا پتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ لیکن اس نے ٹھیک نہیں کیا ہے۔'' فرح کے ماموں کے لہجے میں تاسف اور غصہ تھا۔

''خیر ماموں اس پر ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ فی الحال اس کی جان بچانی ہے۔ انہوں نے ایک کروڑ تاوان مانگا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ فرح کی رہائی کے لیے آپ کچھ کیجیے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔'' زاہد اصل معاملے کی طرف آیا۔

''ہماری طرف سے فرح جائے بھاڑ میں۔ وہ لوگ فرح کو مار دیں، یا چھوڑ دیں۔ ہمارا فرح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' فرح کے ماموں نے غصے میں دوٹوک یہ بات کہہ کر زاہد کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ فرح کو مار دیں گے۔ میں ان سے ڈیل کر کے انہیں پچاس لاکھ روپے تک منا لوں گا۔ وہ بہت خطرناک گروہ سے اپنا تعلق بتا رہے تھے۔'' زاہد نے فرح کے ماموں کو ڈرانے کی کوشش کی۔

''دیکھو لڑکے۔ فرح میری مرحومہ بہن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد ہم نے اس کا خیال رکھا۔ لیکن اس نے ہماری عزت کا کوئی خیال نہیں کیا اور بھاگ کر چلی آ گئی۔ ہماری بہن مر گئی تھی۔ بہنوئی بعد میں

مر گیا تھا اور آج فرح بھی ہمارے لیے مرگئی ہے۔ تمہاری منگیتر ہے۔ اسے بچانا چاہو بچا لو، نہیں بچانا چاہتے تو آرام سے سو جاؤ۔'' دوسری طرف سے فرح کے ماموں نے کہہ کر فون بند کر دیا اور زاہد دم بخود کھڑا رہ گیا۔ فرح کے ماموں کی بات نے ان کا رچایا ہوا ڈراما ہی اُلٹ کے رکھ دیا تھا۔

''کیا بات ہوئی ہے؟ وہ کیا کہہ رہے تھے؟'' زاہد کے باپ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

زاہد چونکا۔ ''وہ فرح کے معاملے میں کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے۔'' زاہد بہت پریشان ہو گیا تھا۔

''انہوں نے انکار کر دیا؟'' زاہد کے باپ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں بھی چونکیں۔ ''وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ فرح ان کی سگی بھانجی ہے۔''

''میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' زاہد کو ابھی تک حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ''فرح کے ماموں کہہ رہے تھے کہ فرح ان کو بتائے بغیر یہاں آئی ہے۔ وہ انہیں وہاں تلاش کر رہے تھے۔''

''فرح نے ایسا کیا تھا۔ تم فرح کے دوسرے ماموں سے بات کرو۔'' زاہد کی ماں نے کہا۔

ایک امید کے ساتھ زاہد نے پھر ریسیور اُٹھایا اور دوسرے ماموں کو فون کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد رابطہ ہوا تو فرح کا دوسرا ماموں فون اُٹھاتے ہی اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اب کیا بات ہے؟''

''وہ ماموں فرح......''

''ہم سب بھائی صاحب کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ انہوں نے جو کہا ہے وہ ہم نے سن لیا ہے۔ اور جو فرح کے ساتھ ہوا ہے وہ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے۔ ہم اس کی تلاش میں اپنا کام چھوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ تم لوگوں کے پاس تھی۔ اسے چھڑانا ہے تو خود پیسے دے کر چھڑا لو، اب ہمیں دوبارہ فون مت کرنا اور ہمیں کام کرنے دو۔'' فرح کے دوسرے ماموں کے خشک لہجے نے زاہد کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ زاہد کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

''کیا کہا ہے؟'' زاہد کے باپ نے پوچھا۔

''انہوں نے بھی انکار کر دیا ہے۔'' زاہد نے بتایا۔ زاہد کی حالت ایسی تھی جیسے اس کا دماغ کہیں اور ہو اور منتشر سوچوں نے اسے سوچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہو۔

''اب ایک ہی حل ہے۔'' اچانک اس کے باپ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''وہ کیا؟'' زاہد نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

''پولیس۔'' زاہد کا باپ بولا۔ ''ہم پولیس کے پاس چلتے ہیں۔''

''نہیں وہ فرح کو مار دیں گے۔'' زاہد گھبرا گیا۔

''ہمارے پاس تاوان دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس صورت میں بھی وہ فرح کو مار دیں گے اس لیے بہتر ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں۔ شاید وہ اسے بچا لے۔'' زاہد کا باپ بولا۔

''لیکن......'' زاہد نے کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جس نمبر سے فرح کے تاوان کے لیے کال آئی تھی، مجھے وہ نمبر دو۔ میں وہ نمبر ابھی چوہدری صاحب کے پاس لے کر جاتا ہوں۔'' زاہد کے باپ کے چہرے پر گہری متانت تھی اور ان کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ زاہد حیرت کی تصویر بنا اپنے باپ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ زاہد کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔

☆☆☆

کمرے کے اندر زبیر ایک کے بعد ایک چابی کی ہول میں لگا کر دروازے کو مقفل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور باہر نعیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ اس کے چلتے قدموں کی آواز نے زبیر کے ہاتھوں میں اور بھی تیزی بھر دی تھی۔ نعیم اس کمرے کے بجائے ساتھ والے کمرے کی طرف گیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اسی اثنا میں ایک چابی کی ہول میں گھوم گئی اور دروازہ مقفل ہو گیا۔

زبیر اس جگہ سے ہٹا اور وہ چابی گچھے سے نکال کر باقی چابیوں کا گچھا بیڈ کے نیچے گھسیٹ دیا۔ زبیر پھر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر باہر کی کوئی آواز سننے لگا۔

نعیم کمرے سے باہر نکلا اور اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے اچانک رک کر فرح کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی گندگی اُتری اور اس نے گردن گھما کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر نیچے چلا گیا۔

نیچے کمرے میں حماد مضطرب بیٹھا تھا۔ نعیم کو دیکھتے ہی وہ چونکا۔ اور بولا۔ ''زاہد نے بہت دیر کر دی ہے۔''

''ایسے کام اتنی جلدی نہیں ہو جایا کرتے۔ کچھ وقت لگ جاتا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ کام جلدی سے ہو جائے۔'' حماد بے چین تھا۔

''اطمینان رکھو وہ کوشش کر رہا ہوگا۔ مجھے کمرے کی چابی دو، میں ذرا پوچھ کر آؤں کہ اس کو کچھ کھانا پینا تو نہیں ہے۔'' نعیم نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں پوچھ آیا تھا اس کو کچھ نہیں کھانا پینا۔'' حماد پریشان تھا۔

''شاید اب بھوک لگ گئی ہو؟ وہ زاہد کی منگیتر ہے اس لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔'' نعیم کی ہوس اس کی آنکھوں میں تھی۔

''مجھے اس کی بھوک سے زیادہ رقم کا انتظار ہے۔ اس کی فکر چھوڑو اور زاہد کو فون کرو کہ وہ کہاں تک پہنچا ہے۔'' حماد نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔

نعیم نے متانت سے حماد کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر میز کے کونے پر رکھی چابی کی طرف چلی گئی۔ اس کا اختیار نہیں تھا ورنہ وہ ابھی کمرے کی چابی اُٹھا کر فرح کے کمرے میں چلا جاتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے اس کمرے کی چابی، چابیوں کے گچھے سے نکالی تھی۔ اس کی دوسری چابی اس گچھے میں موجود ہوگی۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟ کچھ کھانے کو لاؤں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو اور زاہد کو فون کرو۔'' حماد نے اسے گھورا۔

نعیم کی نگاہ ایک بار پھر اس چابی پر چلی گئی اور اس نے اپنا موبائل فون نکال کر زاہد کا نمبر ملانے کے بجائے کوئی اور ہی نمبر ملا دیا اور پھر بولا۔

''اس کا نمبر بزی ہے۔ شاید وہ بات کر رہا ہوگا۔''

''راتوں رات کیسے پیسے ملیں گے؟؟'' حماد بڑبڑایا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور تیمور خان ہم کو مار دے گا۔''

''ایک فرح ہی ہے جس کے ذریعے سے تم پیسہ لے سکتے ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو سوچو تم ایک پائی بھی کہیں سے نہیں لے سکو گے اور تیمور خان تم دونوں کو شہر کے چوراہے میں لٹکا دے گا۔''

''تم مجھے ڈرا رہے ہو؟؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فرح کچھ نہیں بھی کھا رہی ہے تو اسے کھلاؤ۔ بھوک اور خوف سے اگر اسے کچھ ہو گیا تو

''تریا چلتّر''

تھکا ہارا مسافر ویرانے میں پیدل چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک کنواں نظر آیا جہاں ایک خوبرو اور معصوم سی دوشیزہ ڈول سے پانی نکال رہی تھی۔ مسافر نے پانی مانگا جو مل گیا۔ پیاس بجھانے کے بعد اس نے غور سے دوشیزہ کی طرف دیکھا تو وہ اسے اتنی سادہ اور معصوم نظر آئی کہ اسے بے اختیار تریا چلتّر کا محاورہ یاد آ گیا۔

اس نے جھجکتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ ''تم مجھے بہت نیک دل اور معصوم لگتی ہو... کیا تم بتا سکتی ہو کہ لوگ عورتوں کو مکار کیوں کہتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی لڑکی نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ مسافر بوکھلا گیا۔ ''ارے... رے... یہ کیا کر رہی ہو؟''

''ابھی گاؤں والے آئیں گے اور تمہاری تِکّا بوٹی کر دیں گے۔ تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' اس جواب نے مسافر کے ہوش اُڑا دیے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر لڑکی کے قدموں میں گر پڑا۔

لڑکی ہنسی، اسے اٹھایا اور پانی سے بھرا ڈول اپنے سر پر انڈیل لیا۔

خوف زدہ مسافر حیران و پریشان اسے تکتا رہا۔ اسی اثنا میں گاؤں سے بہت سے لوگ ڈنڈے، لاٹھیاں اٹھائے، شور مچاتے آ پہنچے۔

لڑکی نے انہیں بتایا کہ وہ کنویں میں گر گئی تھی اور چیخ رہی تھی کہ رحم دل مسافر نے آ کر اسے نکال لیا۔

گاؤں والوں نے مسافر کا شکریہ ادا کیا۔ اسے ساتھ لے گئے اور خوب تواضع کر کے اپنا مہمان بنا لیا۔

موقع ملا تو لڑکی نے تنہائی میں بس اتنا کہا۔ ''دیکھ لیا تریا چلتّر... ہر عورت بس ایسی ہی ہوتی ہے... پل میں تولہ، پل میں ماشہ!''

کراچی سے ولید بلال کی ہنرمندی

ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔'' نعیم نے کہا۔

حماد نے سوچا اور پھر بولا۔ ''وہ مرتی ہے تو مر جائے۔ ہم نے تاوان لیتے ہوئے انہیں بتانا نہیں ہے کہ فرح مر گئی ہے۔ ہمیں صرف پیسے سے غرض ہے۔'' حماد کہہ کر خود صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

''تم پریشان ہو۔ پُرسکون ہو جاؤ۔ وہ زاہد کی منگیتر ہے ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔'' نعیم نے مسکراتے ہوئے میز کے کونے سے کمرے کی چابی اُٹھا لی۔ حماد محض اسے گھورتا رہا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ خوفناک سا ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر جیسے وحشت نے پنجے گاڑ لیے ہوں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ اس نے فرح کے کمرے کے پاس جا کر 'کی ہول' میں چابی داخل کی اور گھما کر اس کا لاک کھولنا چاہا لیکن چابی گھومی نہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ لاک کھلا ہوا ہے۔ نعیم نے چونک کر دیکھا اور پھر ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے فوراً اندر دیکھا۔ کمرا خالی تھا۔

نعیم کا چہرہ حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے کمرے کے اندر جا کر باتھ روم اور پھر الماری کھول کر دیکھی، اس کے بعد اس نے کھڑکی کے آگے سے پردے ہٹائے، لوہے کی گرل کی وجہ سے وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس نے فوراً بیڈ کے نیچے دیکھا تو اسے بیڈ کے نیچے تو کوئی نظر نہ آیا البتہ اس کی نظر چابیوں کے گچھے پر پڑ گئی۔

نعیم نے چابیوں کا گچھا اُٹھا کر سوچا۔ پھر اس کا دھیان الماری کی طرف چلا گیا اور پہلا خیال یہی آیا کہ اس نے چابیوں کا گچھا اس الماری میں رکھا تھا اور فرح کے ہاتھ چابیوں کا گچھا لگ گیا اور وہ لاک کھول کر کمرے سے نکل گئی ہے۔

''وہ یقیناً ابھی اس گھر سے باہر نہیں گئی ہوگی۔ اسی گھر میں ہوگی۔'' نعیم سوچتے ہی نیچے کی طرف بھاگا۔

اس کے نیچے جاتے ہی زبیر اور فرح اسٹور روم سے باہر نکلے اور ٹیرس کے دروازے کی طرف بڑھے۔ زبیر نے دروازے کی چٹخنی کھولی اور وہ ٹیرس میں آ گئے۔ رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان سے چاند غائب تھا اور ستارے اپنی مدھم روشنی بکھیر رہے تھے۔

زبیر نے آگے بڑھ کر ٹیرس کی گرل کے پاس جا کر نیچے دیکھا۔ چند لمحے میں اس نے سب اندازہ لگانے کے بعد فرح کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کی۔

''یہاں سے نیچے اتر کر اس جگہ پاؤں رکھیں اور پھر اس دیوار پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگا دیں۔''

ٹیرس کی گرل کے نیچے ایک ستون بنا تھا جو دیوار کے ساتھ تھا، وہاں پیر رکھنے کے لیے جگہ تھی۔ اس ستون سے تین فٹ کے فاصلے پر دیوار تھی جس پر چڑھ کر فرح باہر کود سکتی تھی۔

مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔'' فرح نے دیکھ کر انکار کر دیا۔

''یہ کرنا پڑے گا ورنہ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔'' زبیر نے ہمت بندھائی۔

فرح نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وہ گرل پھلانگ کر ستون کی طرف اپنا پیر بڑھانے لگی۔ زبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ فرح نے جیسے ہی ستون پر اپنا پیر جمایا زبیر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گرل پکڑی اور کچھ آگے بڑھنے لگی اور پھر اس نے ہمت کر کے دیوار کی طرف چھوٹی سی چھلانگ لگا دی۔ وہ دیوار کے اوپر تھی اور اس کے بعد وہ دیوار سے نیچے لٹک کر کود گئی۔ وہ دیوار سات فٹ اونچی تھی اس لیے فرح کو کودتے ہوئے مشکل نہیں ہوئی۔

زبیر نے بھی اسی طرح کیا اور وہ مرد ہونے کی وجہ سے فرح سے جلدی باہر کود گیا۔ اس کے بعد دونوں ایک طرف دوڑے۔ ان کے جاتے ہی حماد اور نعیم تیزی سے اوپر آئے۔ انہوں نے دیوانوں کی طرح ایک ایک کمرا دیکھا اور اچانک ٹیرس کے کھلے دروازے کو دیکھ کر اس طرف چلے گئے۔ دونوں متلاشی نگاہوں سے ٹیرس میں کھڑے دائیں بائیں دیکھتے رہے۔ دور تک سناٹا تھا اور انہیں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حماد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور اس کی نگاہوں کے سامنے تیمور خان کا خوفناک چہرہ تھا۔

☆☆☆

زاہد کا باپ اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ زاہد کب اسے وہ فون نمبر دیتا ہے جس نمبر سے اسے کال آ رہی ہیں تاکہ وہ پولیس اسٹیشن جا کر ان سے مدد مانگ سکے۔

زاہد تذبذب کا شکار تھا۔ وہ کیسے وہ نمبر دے سکتا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔ ''میرا ایک دوست حماد ہے اس کے چچا پولیس میں اچھے عہدے پر ہیں۔ میں ان کے پاس جاتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' زاہد کا باپ بھی

چلنے کو تیار ہو گیا۔

''آپ رکیں، میں حماد کے گھر جا کر اسے لے کر وہاں جاؤں گا۔'' زاہد نے جلدی سے کہا۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے بہت بے چینی ہو رہی ہے۔'' زاہد کے باپ نے اصرار کیا۔

''آپ آرام کریں، میں آپ سے فون پر رابطہ رکھوں گا۔'' زاہد نے جلدی سے اپنا موبائل فون جیب میں ڈالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ اپنی کار خالی سڑکوں پر دوڑاتا ہوا اس مکان میں پہنچ گیا جہاں انہوں نے فرح کو رکھا تھا۔ گیٹ نعیم نے کھولا تو وہ اس سے کوئی بات کیے بغیر اندر کی طرف بڑھا۔ گیٹ بند کرنے کے بعد نعیم بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ حماد پریشان بیٹھا تھا۔ زاہد کو دیکھتے ہی حماد فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا بنا......؟ پیسے کب دے رہے ہیں وہ؟''

''بہت بڑی پرابلم ہو گئی ہے۔'' زاہد نے تاسف سے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے؟'' حماد کے ساتھ ساتھ نعیم بھی اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''فرح انگلینڈ میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی۔ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں......'' زاہد نے بتانا چاہا۔

''مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے یہ بتاؤ کہ وہ رقم کب دے رہے ہیں؟'' حماد نے اکتا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''فرح کے ماموں نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔'' زاہد نے حقیقت منکشف کر دی۔

''کیا......؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' حماد کا ہکا بکا چہرہ ایک لمحے میں کئی تغیر سے گزر گیا۔

''دراصل فرح ان کو بغیر بتائے اور چوری چھپے یہاں آئی تھی۔ فرح کے ماموں اس بات پر اتنے خفا تھے کہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ فرح کو بچانے کے لیے ایک پیسہ نہیں دیں گے۔'' زاہد اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

''تم تو کہتے تھے کہ وہ اپنی بھانجی کی محبت میں اسے بچانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا دیں گے، اب کیا ہوا ہے؟'' حماد مزید پریشان ہو گیا اور اس پریشانی میں اس کا غصہ بھی بڑھ گیا۔

''مجھے کیا پتا کہ وہاں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور فرح کن حالات میں وہاں سے بھاگ کر آئی ہے۔'' زاہد بھی

الجھن کا شکار تھا۔

حماد مضطرب اور تذبذب کا شکار اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔'' زاہد کے کندھے جھک گئے اور وہ مایوس لہجے میں بولا۔

''ہماری چال اُلٹ گئی ہے۔ فرح بھی یہاں سے بھاگ گئی ہے۔'' حماد نے کہہ کر زاہد کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ زاہد کی ششدر نگاہیں حماد کے چہرے پر جم گئیں۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ فرح کیسے فرار ہوگئی ہے؟'' زاہد نے پوچھا۔

''نعیم کی وجہ سے بھاگی ہے۔ اس نے چابیوں کا گچھا اسی کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ وہ گچھا اس کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اندر سے دروازہ کھول لیا اور بھاگ جانے میں کامیاب ہوگئی۔'' حماد کا لہجہ پریشانی کی وجہ سے اونچا ہوگیا تھا اور اس کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔

''یہ کیا کردیا تم نے؟'' زاہد چیخا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا ہے وہ چابیوں کا گچھا اس کمرے میں نہیں تھا۔'' نعیم سوچتے ہوئے بولا۔

''تو پھر وہ چابیوں کا گچھا اس کمرے میں کیسے موجود تھا؟'' حماد بولا۔

''یہ بات مجھے بھی سمجھ نہیں آرہی ہے۔'' نعیم ابہام کا شکار تھا۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ اسے باندھ دو لیکن تم میری بات نہیں مانتے تھے۔'' حماد کا غصہ اور بھی دوچند ہوگیا تھا۔

''فرح سیدھی میرے گھر جائے گی۔'' زاہد پُرخیال انداز میں بولا۔

''اب وہ جہاں جاتی ہے جائے۔ جب اس کے ماموں نے رقم دینے سے انکار کردیا ہے تو وہ ہمارے کس کام کی۔ لیکن اب ہمارے لیے ہر راستہ بند ہوگیا ہے۔ جس اُمید سے ہم نے فرح کو اغوا کیا تھا وہ اُمید بھی ختم ہوگئی ہے۔ اب ہم تیمور خان کی رقم کا انتظام نہیں کرسکیں گے اور وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔ تیمور خان ہمیں نہیں چھوڑے گا۔'' حماد کی پریشانی دوچند ہوگئی تھی۔

زاہد کا جسم بھی اضطراب میں مبتلا تھا۔ ''اب کیا کریں؟ شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں؟''

''وہ ہمیں ڈھونڈ لے گا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیں مار دے گا۔ وہ بہت ظالم اور سفاک ہے۔ اس سے رحم کی امید رکھنا بے وقوفی ہے۔ اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔'' حماد ایک جگہ رک کر بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ الجھن میں بولے جا رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم بیٹھ کر اس بات کا انتظار کریں کہ تیمور خان کب آکر ہمیں اپنی گولیوں کا نشانہ بناتا ہے۔'' زاہد مایوس تھا۔

حماد کی نظر اچانک نعیم کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور پر پڑی۔ پھر اس نے نعیم کی طرف دیکھا اور اس کا دھیان اس جگہ سے کچھ دور پولیس اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ پھر ایک خیال اس کے دماغ میں بجلی سی تیزی سے آیا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آکر چلی گئی۔

حماد جس گرداب میں پھنس چکا تھا، وہ اب کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ اسے اپنی جان بچانی تھی۔ وہ تیمور خان کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے اب اسے ایک نئی چال چلنی تھی۔

''اب ایک ہی راستہ بچا ہے۔'' حماد نے معنی خیز لہجے میں سرگوشی کی تو وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''وہ کیا......؟؟'' زاہد نے پوچھا۔

''اپنی جان بچانی ہے تو تیمور خان کی جان لے لیتے ہیں۔'' حماد نے کہہ کر دونوں کے جسموں میں سراسیمگی پھیلا دی۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' نعیم نے سوال کیا۔

''بس تم دونوں کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ جو کچھ بھی کروں گا میں کروں گا۔'' حماد نے کہتے ہوئے نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میز پر پڑا اس کا موبائل فون اُٹھا لیا۔

''دیکھو میں یہاں کوئی قتل و غارت نہیں چاہتا۔'' نعیم بولا۔ ''اور یہ بات یاد رکھنا کہ اس اسلحے کا کرایہ مجھے بیس ہزار روپے تم نے ہر حال میں دینے ہیں۔ اب فرح بھاگ گئی ہے اور تم کو اس کا تاوان نہیں ملا ہے۔ جو لاکھ روپیہ میں نے لینا تھا وہ میں نہیں لیتا لیکن بیس ہزار روپے دینے پڑیں گے۔''

''میں تجھے پورے ایک لاکھ بیس ہزار روپے دوں گا۔ بس تجھے میرا ساتھ دینا پڑے گا۔'' حماد کا انداز پُراسرار تھا۔

پورے پیسوں کا سن کر نعیم کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''مجھے کرنا کیا ہے۔''

''بس یہ دیکھنا کہ اب میں تیمور خان کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کیسے کراتا ہوں۔'' حماد نے کہہ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور بھی لے لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جیب میں پڑے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیے۔ ''یہ رکھ لو۔''

''یہاں خون خرابا نہیں ہونا چاہیے۔'' نعیم نے اپنی جیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بالکل بھی نہیں ہوگا۔ وہ صرف گرفتار ہوگا۔ اب مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں ہے۔ جیسا میں کہوں وہ تم کو کرنا ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔'' حماد بولا۔ ''ویسے جس گھر میں ہم موجود ہیں اس گھر کا اور گلی کا کیا نمبر ہے۔''

''مکان کا نمبر ایک سو چودہ اور گلی نمبر اُنیس۔'' نعیم نے بتایا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے گھر جانا چاہیے۔ فرح گھر پہنچ چکی ہوگی۔'' اچانک زاہد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہیں گھر جانا چاہیے۔ لیکن ایک منٹ میرے ساتھ آؤ۔'' حماد اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

دوسرے کمرے میں لے جا کر جب حماد نے سرگوشی میں اپنی چال اسے سنائی تو زاہد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ زاہد کوئی سوال کرتا۔ حماد نے اسے روک دیا۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لیے کچھ کہنے اور سننے کا وقت نہیں ہے، بس کرنے کا وقت ہے۔''

زاہد چپ ہوگیا لیکن اس کے چہرے پر سوچوں کے سائے گہرے تھے۔ حماد نے نعیم کے موبائل فون سے تیمور خان کا نمبر ملایا اور جیسے ہی رابطہ ہوا حماد بولا۔

''میں حماد بول رہا ہوں۔ میں نے آپ کی رقم کا انتظام کرلیا ہے۔ میں آپ کو ایک پتا لکھواتا ہوں آپ فوراً آجائیں اور اپنی رقم لے جائیں۔''

''رقم پوری ہے؟'' دوسری طرف تیمور خان نے پوچھا۔

''بالکل پوری ہے۔'' حماد پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''تو پھر لے کر میرے پاس آجاؤ۔''

''میں اس وقت ایک اور مصیبت میں ہوں۔ گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اگر آپ نہ آئے تو پھر رقم میرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لیے آپ ابھی آجائیں اور رقم لے جائیں۔'' حماد نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں اپنا آدمی بھیجتا ہوں۔'' تیمور خان بولا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ میں ایک مصیبت میں ہوں۔ کسی پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ آپ کو خود آنا پڑے گا ورنہ میں یہ رقم دوسرے کو دے کر خودکشی کرلوں گا۔'' حماد نے عجیب سے انداز میں دھمکی دی کہ تیمور خان نے آنے کی ہامی بھرلی۔ حماد نے اسے پتا سمجھا دیا۔

''تم ایک کام کرو۔ ابھی اپنی گاڑی میں بیٹھو اور پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہاں لکھا ہوا اس پولیس اسٹیشن کا نمبر پڑھ کر مجھے سینڈ کردو۔'' حماد نے اسے ہدایت دی۔

''ابھی جاؤں؟''

''ابھی اور اسی وقت جاؤ۔ اس کے بعد تم اپنی گاڑی پچھلی طرف لے جانا۔ اپنی گاڑی وہاں کھڑی کرنے کے بعد میری گاڑی اس مکان سے نکال کر اپنی گاڑی کے پاس کھڑی کردینا۔ تم گاڑی میں بیٹھے رہنا۔ کام ہوتے ہی میں پیچھے سے کود کر اپنی گاڑی میں بیٹھوں گا اور ہم دونوں نکل جائیں گے۔'' حماد نے سمجھایا۔

''تم بہت بڑا رسک لے رہے ہو۔'' زاہد پریشان تھا۔

''جب موت اور زندگی کا سوال ہو تو پھر چال شطرنج کی ہو، یا تاش کے پتّوں کی، رسک لینا ہی پڑتا ہے۔'' حماد کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ نعیم کچن میں کچھ تیار کر رہا تھا۔ حماد نے اپنی جیکٹ کے اندر نعیم کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اب اسے تیمور خان کا انتظار تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد حماد کے موبائل فون پر زاہد کا میسج آگیا، اس نے پولیس اسٹیشن کا نمبر بھیجا تھا۔

☆☆☆

زبیر اور فرح اس مکان سے نکل کر پیدل ہی چلتے رہے۔ ان کی رفتار تیز تھی۔ وہ اس لیے بھاگ نہیں رہے تھے کہ کوئی انہیں بھاگتا ہوا دیکھ لے اور وہ نئی آفت میں پھنس جائیں پھر ایک رکشا نظر آیا تو زبیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور دونوں رکشا میں سوار ہوگئے۔

رکشے نے انہیں زبیر کے گھر کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں چڑھیں اور دروازے کا لاک کھولتے ہی فرح کو اشارہ کیا۔ وہ بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ جیسے ہی دونوں اندر گئے، زبیر نے دروازہ بند کردیا۔

زبیر نے لائٹس جلائیں اور فرح کو کمرے میں لے گیا۔ ''آپ اطمینان سے بے فکر ہو کر یہاں بیٹھ جائیں۔ صبح ہوتے ہی جہاں آپ چاہیں گی میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔''

فرح اداس سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اب کہاں جاؤں۔ کس پر اعتبار کروں۔ انگلینڈ سے بھاگ کر آئی تھی کہ یہاں میرا سسرال ہے اور یہاں آئی تو زاہد نے مجھے ہی اغوا کرا دیا۔ ماں مر گئی تو باپ کا سایہ تھا۔ باپ چلا گیا تو ماموں اپنے گھر لے گئے اور مجھے شہزادیوں کی طرح رکھا۔ اور پھر میرا ذہن اس طرف مائل کرنے لگے کہ میرے والد کا جو انگلینڈ میں میرے نام پر فلیٹ تھا، اسے بیچ دوں۔ میں ماموں کی باتوں میں آگئی اور فلیٹ بیچ دیا۔ فلیٹ کا پیسہ میرے اکاؤنٹ میں تھا۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ فلیٹ کے جو پیسے میرے پاس ہیں، وہ انہوں نے کیسے لینے ہیں۔ میں ان کی نیت اور چال کو سمجھ گئی تھی۔'' فرح کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ زبیر کھڑا سن رہا تھا۔

وہ پھر بولی۔ ''دوسرے دن انہوں نے بڑی محبت اور پیار سے مجھ سے پیسے لینے کی بات کی۔ میں سب کچھ سن چکی تھی۔ میں نے کہا میں سارا پیسہ ماموں کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دوں گی۔ اسی دن میں نے ماموں کی غیر موجودگی میں ان کے کمرے سے اپنا پاسپورٹ تلاش کیا اور اپنا سارا پیسہ اس ملک میں موجود اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کیا اور فلائٹ لے کر یہاں آگئی۔ آگے سے زاہد نے یہ ڈراما رچا کر اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مار لی کیونکہ مجھے یہ سارا پیسہ اسے ہی دینا تھا۔ یقیناً زاہد نے میرے ماموں سے تاوان مانگا ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے صاف انکار بھی کر دیا ہوگا اور انہیں اس حقیقت کا بھی تب ہی پتا چلا ہوگا کہ میں یہاں آگئی ہوں۔'' فرح کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کے ماموں آپ سے پیسہ بٹورنے کے لیے شفقت اور محبت کا کھیل، کھیل رہے تھے۔'' زبیر نے کہا۔

''بالکل ایسا ہی تھا۔ میں نے خود سنا کہ وہ سارا پیسہ لینے کے بعد میری شادی ایک معذور بوڑھے سے کر دینا چاہتے تھے تاکہ میں اپنے مسائل سے نکل کر اپنے پیسے کے حصول کی جنگ ہی نہ لڑسکوں۔ پیسے کے لیے خون سفید ہو جاتا ہے۔'' فرح دکھی ہو گئی۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ شکر ہے کہ اس وقت میرے اندر۔۔۔ اتنی ہمت آگئی تھی کہ میں زاہد کی کار کی ڈکی میں چھپ گیا۔ جیسے کوئی طاقت مجھ سے یہ سب آپ کی مدد کے لیے کروا رہی تھی۔''

''میں آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہوں گی۔ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔'' فرح نے اس کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''زاہد کی گاڑی میں میرا بیگ ہے۔ اور بیگ میں میری اہم چیزیں ہیں۔ ایک تو مجھے وہ بیگ لینا ہے۔ یہاں میری ایک دوست ہے۔ اس کے پاس یہاں کے بینک کی چیک بک اور کچھ میری دوسری چیزیں ہیں۔ کل میں اس سے ملوں گی۔ وہ بہت اچھی ہے۔ اب سوچ رہی ہوں کہ میں نے اسے ہی کال کیوں نہ کر دی اور زاہد کے بجائے اس کے پاس چلی جاتی۔''

''اگر آپ ایسا کرتیں تو آپ یہ کیسے جان پاتیں کہ زاہد کے چہرے کے پیچھے کونسا چہرہ چھپا ہوا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ قدرت نے مجھے یہ حقیقت بھی دکھانی تھی۔'' فرح بولی۔

''آپ آرام کریں۔ نیچے میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔ اندر سے لاک لگا لیں اور بالکل بے فکر ہو کر سو جائیں۔'' زبیر نے تسلی دی اور باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فرح نے اندر سے کنڈی لگالی۔

☆☆☆

زاہد نے پہلے اپنی کار اور پھر حماد کی کار اس مکان سے نکال کر پچھلی گلی میں کھڑی کر دی تھی۔ اس کام کے دوران حماد نے نعیم کو باتوں میں مصروف رکھا تھا۔ نعیم کو بھوک لگ رہی تھی اس لیے اس نے اپنے لیے آملیٹ تیار کیا تھا اور مزے سے کھا رہا تھا۔

زاہد اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حماد نے مار دو یا پھر مر جاؤ کے مصداق اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر فرح اس کے گھر پہنچ گئی ہے تو پھر ابھی تک گھر سے کوئی کال کیوں نہیں آئی ہے؟ ایک اندیشہ اسے یہ بھی تھا کہ فرح ایک سال کے بعد آئی تھی۔ شاید اسے اس کے گھر کے راستے کا پتا نہ ہو اور وہ جانے کہاں چلی گئی ہو۔

زاہد کار میں بیٹھا سوچ رہا تھا اور دوسری طرف تیمور خان اپنے ایک ڈرائیور اور گن مین کے ساتھ اس مکان کے باہر پہنچ گیا۔ تیمور خان کا ڈرائیور بھی دراصل اس کا گن مین ہی تھا۔ حماد کے کان باہر کی طرف ہی لگے تھے۔ جیسے ہی گاڑی کا ہارن بجا، اس نے نعیم کو اسی جگہ رکنے کا کہہ کر گیٹ کی طرف

رخ کیا۔

وہ گیٹ کھول کر تینوں کو اندر لے آیا۔ حماد نے جان بوجھ کر گیٹ بند نہیں کیا تھا اور گیٹ کا ایک دروازہ آدھا کھلا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں پہنچ گئے تھے۔

''بیٹھ جائیں آپ۔'' حماد نے کہا۔

''ہمارے پاس بیٹھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میری رقم دو تاکہ میں جاؤں۔'' تیمور خان بولا۔

''میں ابھی اندر سے لے کر آیا۔'' حماد کہہ کر اس کمرے میں چلا گیا جس کا دروازہ سیڑھیوں کے پاس تھا۔ تیمور خان صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا۔ نعیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ حماد کیا کرنے والا ہے۔ اسے اپنے پیسوں سے غرض تھی۔ یہ مکان بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ اپنے جرائم کے چکر میں کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر ہوتا تھا اس لیے اسے کوئی فکر اور ڈر نہیں تھا۔

حماد نے کمرے میں جاتے ہی نعیم کے موبائل فون سے پولیس اسٹیشن کال کی۔ بیل جانے لگی۔ جیسے ہی رابطہ ہوا وہ گھبرائی اور ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

''میں نعیم بول رہا ہوں...... مجھے تیمور خان کی رقم دینی ہے۔ وہ اس وقت میرے گھر میں اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ مجھے مار دے گا۔ اس نے میری بیوی پر پستول تانی ہوئی ہے۔ جلدی سے آجائیں...... وہ ہمیں مار دے گا...... میں کمرے میں چھپا ہوا ہوں...... وہ مجھے اور میری بیوی کو مار دے گا......''

''کہاں سے بول رہے ہو۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

حماد نے جلدی سے گھر کا پتا لکھوایا اور پھر زور دیا کہ وہ جلدی سے آجائیں۔ فون کرنے کے بعد حماد مضطرب کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دس منٹ نہیں گزرے تھے کہ اس مکان کے باہر ہلچل سنائی دی۔ حماد نے اپنا ریوالور نکالا، کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر پولیس وین کھڑی ہوئی تھی اور اندر سے پولیس اہلکار نکل رہے تھے۔ حماد نے ریوالور میں دو گولیاں رہنے دیں اور باقی نکال کر ریوالور کو کپڑے سے اچھی طرح سے صاف کیا اور ریوالور کپڑے میں لپیٹ کر کمرے سے نکلتے ہی اس نے دونوں گولیاں نعیم کے سینے میں اتار دیں۔

حماد نے وہ سب اتنا اچانک کیا تھا کہ کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں آئی اور نہ ہی وہ فوراً کچھ کر سکے۔ نعیم کی خون میں لت پت لاش فرش پر تھی۔ اسی وقت حماد نے ریوالور تیمور خان کی طرف اچھال دیا۔ ریوالور کو تیمور خان نے پکڑا اور فوراً چھوڑ دیا۔ اسی لمحے حماد نے نعیم کا موبائل نعیم کی لاش کے... پاس صوفے پر اچھال دیا۔

تیمور خان کا گن مین اپنی گن سیدھی کر چکا تھا لیکن حماد اپنا کام کر کے تیزی سے سڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ پولیس گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہی اس مکان میں داخل ہو گئی اور انہوں نے تیمور اور اس کے ساتھیوں پر اسلحہ تان لیا۔ تیمور خان خود بھی متحیر تھا کہ اچانک اور اس سرعت سے یہ سب کیسے ہو گیا۔ اور وہ پولیس کی زد میں آگئے۔

''جس نے مارا ہے وہ اوپر کی طرف بھاگا ہے۔'' تیمور خان نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم تیمور خان ہی ہو ناں۔'' سب انسپکٹر نے تیمور خان کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں تیمور خان ہی ہوں لیکن یہ قتل میں نے نہیں کیا، جس نے کیا ہے وہ اوپر کی طرف بھاگا ہے۔'' تیمور خان نے پھر کہا۔

''بڑی شکایتیں ہیں تمہارے خلاف۔'' سب انسپکٹر نے کہا اور پھر اپنے اہلکار سے مخاطب ہوا۔ ''اوپر جا کر دیکھو کون ہے۔''

دو اہلکار سیڑھیوں کی طرف بڑھے جبکہ باقی پولیس والوں نے تیمور خان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ تیمور خان مزاحمت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ''یہ قتل میں نے نہیں کیا......''

تیمور خان کی بات سننے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ پولیس مین ان تینوں کے پیچھے کی طرف ہاتھ باندھنے لگے تھے۔ سب انسپکٹر نے تیمور کے پاس پڑا ریوالور رومال سے اُٹھا لیا تھا۔

حماد بڑی تیزی سے اوپر گیا تھا۔ اس نے ٹیرس پر پہنچ کر دروازے کی اپنی طرف سے چٹخنی لگا دی اور اسی راستے سے وہ نیچے اترا جس راستے سے فرح اور زبیر نیچے اترے تھے۔ جب حماد اور نعیم ٹیرس میں کھڑے یہ دیکھ رہے تھے کہ فرح کیسے فرار ہوئی ہے تو اسی وقت حماد نے وہ راستہ دیکھ لیا تھا اور دل ہی دل میں کہا تھا کہ اس راستے سے نیچے اترنا مشکل نہیں ہے۔

باہر کودتے ہی حماد نے اس مکان کے عقب کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ عقب میں پہنچا تو وہاں زاہد اور اس کی کار کھڑی تھی۔ حماد پہلے زاہد کے پاس گیا اور بولا۔

''میں بھی تمہارے گھر ہی جاؤں گا۔ میری کار تمہارے پیچھے ہے۔''

''میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ تم نے کام کر دیا ہے۔'' زاہد نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''لیکن تم میرے گھر کیسے جا سکتے ہو؟ اگر وہاں فرح ہوئی تو؟'' زاہد نے کہا۔

''میں باہر رکوں گا تم تسلی کر لینا اور اس کے بعد مجھے بتانا۔ ابھی تو یہاں سے نکلو۔'' حماد نے عجلت سے کہا۔

''جلدی سے نکلو پھر۔'' زاہد نے کہہ کر کار اسٹارٹ کی۔ حماد بھی اپنی کار میں بیٹھا اور دونوں کاریں ایک دوسرے کے پیچھے چل پڑیں۔ دونوں کاروں کی رفتار تیز تھی۔ جلد ہی دونوں کاریں دوسرے راستے سے وہ علاقہ چھوڑ چکی تھیں۔ رات کا وقت تھا اور سڑکیں ویران تھیں اس لیے ان کی کاریں پوری رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔ زاہد کے گاؤں تک جانے میں ان کو آدھا وقت لگا اور جیسے ہی زاہد کا گھر آیا حماد نے کار پیچھے ہی روک لی اور اس کی ہیڈ لائٹس بند کر لیں۔ زاہد نے اپنے گھر کے سامنے پہنچ کر کار کا ہارن دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی زاہد کے باپ نے لکڑی کا گیٹ کھولا۔ زاہد اپنی کار اندر لے گیا۔ اس کے باپ نے لکڑی کا گیٹ بند کر دیا۔

''کیا بنا......؟'' جونہی زاہد کار سے باہر نکلا، اس کے باپ نے سوال کیا۔

زاہد نے کہا۔ ''میں سیدھا اپنے دوست کے پاس گیا تھا اور ساری بات بتا دی تھی۔ وہ مجھے اپنے چچا کے پاس لے گیا انہوں نے وہ نمبر لے لیے ہیں جہاں سے مجھے فون آیا تھا۔ اور خفیہ طریقے سے انہوں نے فرح کی تلاش کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔'' زاہد نے جھوٹی کہانی گھڑی اور پھر پوچھا۔ ''ویسے فرح آ تو نہیں گئی؟''

''وہ کیسے آسکتی ہے؟''

''بس میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا کہ شاید وہ ان کے چنگل سے نکل بھاگی ہو اور یہاں پہنچ جائے۔ ہاں میرا دوست بھی میرے ساتھ ہے۔ اس کی کار باہر کھڑی ہے۔ میں اسے اندر لے آتا ہوں۔ اس کے چچا پولیس انسپکٹر ہیں اس لیے آپ کسی سے اس کے بارے میں ذکر نہ کیجیے گا۔''

''اسے باہر کیوں کھڑا کیا ہے ـــ اندر لے آؤ۔''

''آپ اندر چلیں اور آرام کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب بات پولیس تک پہنچ گئی ہے۔ میں اسے اندر لے آتا ہوں۔'' زاہد نے کہہ کر لکڑی کا گیٹ کھولا اور حماد کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور کار اندر لے گیا۔ زاہد کا باپ اندر جا چکا تھا۔

''فرح یہاں نہیں پہنچی۔ تم جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔'' زاہد نے اس کے پاس جا کر سرگوشی کی اور حماد کار سے باہر نکل کر جیسے ہی اس کی کار کے سامنے سے گزر کر جانے لگا اس کی نظر کار کے اندر پڑے فرح کے سامان پر پڑی تو اس نے پوچھا۔

''یہ فرح کا سامان ہے؟''

''ہاں اسی کا سامان ہے۔ بھاگ دوڑ میں نکال ہی نہیں سکا۔''

''سامان نکال کر لاؤ ذرا دیکھیں اس میں کیا ہے۔ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔'' حماد نے کہا تو زاہد نے اس کے ساتھ مل کر فرح کا سامان نکالا اور وہ اسے ایک طرف لے گیا۔ اس طرف ایک دروازہ تھا جسے کھول کر وہ اندر گئے تو ایک چھوٹی سی راہداری آگئی۔ اس کے سامنے سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی طرف جاتی تھیں۔ غیر مہمانوں کے لیے وہ راستہ تھا۔ زاہد اس راستے سے حماد کو اوپر کے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں جاتے ہی حماد بولا۔

''اب مجھے اس ملک میں نہیں رہنا۔ تیمور خان کسی وقت بھی باہر آ کر میرا قیمہ بنا دے گا۔''

''میری زندگی بھی خطرے میں آگئی ہے۔ اگر تم باہر چلے گئے تو وہ مجھے پکڑ لے گا۔''

''آگے کیا کرنا ہے اس بارے میں بھی سوچ لیں گے۔ فی الحال تم بیگ اور سوٹ کیس کھولو شاید کچھ زیورات اور پاؤنڈز مل جائیں۔''

فرح کے ہینڈ بیگ میں اس کے میک اَپ کے سامان کی کچھ چیزیں اور پاسپورٹ کے سوا کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ لیکن سوٹ کیس کو وہ پوری کوشش کے باوجود نہیں کھول سکے۔ اس کا کوڈ ورڈز میں لاک کھولنا محال تھا۔ وہ تھک کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

☆☆☆

تیمور خان سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی ساتھ ہی تھے۔ حوالات میں تیمور خان ایسے ٹہل رہا تھا جیسے پنجرے میں بھوکا شیر اس انتظار میں ٹہل رہا ہو کہ کب اس کے سامنے گوشت آئے اور وہ اپنی بھوک مٹا سکے۔ وہ جرائم کی دنیا میں کئی سالوں سے تھا۔ پولیس اسٹیشن میں کوئی نہ کوئی پولیس والا اس کا جاننے والا نکل ہی آتا تھا۔ اس پولیس اسٹیشن میں بھی ایک اہلکار اس کا واقف نکل آیا تھا۔ اس کے ذریعے سے اس نے فون کر کے اپنے

خاص آدمی لال خان کو بلالیا تھا۔

لال خان کو جیسے ہی پتا چلا وہ ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود اہلکاروں کی مٹھی گرم کی اور تیمور خان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''جو ہوا وہ میں سنبھال لوں گا۔ جس نے یہ کیا ہے اسے تم سنبھالو اور اسے عبرت کا نشان بنا دو۔'' تیمور خان نے سانپ کی پھنکار میں سرگوشی کی۔

''وہ کون ہے؟''

''حماد اور اس کا ساتھی زاہد۔''

''حماد کا گھر تو نہیں جانتا۔ زاہد کہاں رہتا ہے وہ مجھے پتا ہے۔'' لال خان نے کہا۔

''لیکن زاہد تو وہاں نہیں تھا، وہ کام تو حماد نے کیا تھا۔'' پاس کھڑے تیمور خان کے گن مین نے مداخلت کی۔

''مجھ کو دونوں سے رقم لینی تھی۔ یہ ایک کا کام نہیں ہے۔ دونوں نے مل کر کیا ہے۔ تم چپ رہو اور پیچھے ہوکر کھڑے ہو جاؤ۔'' اگر تیمور خان حوالات میں نہ ہوتا تو شاید وہ غصے میں اپنے گن مین کا سر پھوڑ دیتا۔ گن مین پیچھے ہوکر کھڑا ہوگیا۔ تیمور خان نے پھر لال خان سے کہا۔ ''دن کا سورج ان دونوں کے لیے کوئی اچھی خبر لے کر طلوع نہ ہو اور صبح وکیل کو یہاں بھیج دینا۔''

''تم فکر نہیں کرو۔'' لال خان نے کہا اور کچھ باتوں کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

زاہد کو اس سوچ نے گھیر لیا تھا کہ حماد اس وقت قاتل بن گیا ہے۔ اس نے نعیم کا قتل بھی کیا تھا اور تیمور خان کو بھی پولیس کے ہاتھوں پکڑوا دیا تھا۔ پولیس اس بات کا سراغ لگاتی ہے کہ نہیں، کہ نعیم کا قاتل کون ہے، لیکن تیمور خان اب اسے نہیں چھوڑے گا۔ حماد کے ساتھ ساتھ وہ بھی بری طرح سے پھنس گیا تھا۔ اگر فرح بھی اس گھر میں آجاتی ہے تو وہ شاید گھر میں داخل ہوتے ہی حماد کی کار پہچان لے، اور اگر اس نے حماد کو اس گھر میں دیکھ لیا تو اس کا پردہ بھی فاش ہوجائے گا۔ اس لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اسی وقت حماد کو اپنے گھر سے چلتا کردے۔

زاہد بہانے سے کمرے سے باہر نکلا اور تھوڑی دیر کے بعد بھاگتا ہوا کمرے میں آگیا۔ حماد ابھی نیم دراز ہی ہوا تھا۔

''حماد جلدی میرے ساتھ آؤ۔ فرح آگئی ہے اور وہ ابا کو اغوا کرنے والے کا حلیہ بتارہی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' حماد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''جیسے وہ تمہارا حلیہ بتارہی ہے میرے باپ کا دھیان فوراً تمہاری طرف جائے گا۔ اس لیے میرے ساتھ آؤ۔''

''مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟''

''میرے ساتھ آؤ ابھی بتاتا ہوں۔'' زاہد نے اس کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے اور زاہد نے دروازے سے اپنی گاڑیوں کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہاں کوئی کھڑا ہو۔

''میں گیٹ کھولتا ہوں۔ تم اپنی کار لے کر جلدی سے باہر نکل جاؤ۔'' زاہد نے کہا۔

حماد بولا۔ ''میں اس وقت رات کے آخری پہر کہاں جاؤں گا۔''

''فرح کی نظر میں آنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر چلے جاؤ ورنہ پھنس جائیں گے۔'' زاہد نے کہا۔

''وہ یہاں کیسے پہنچ گئی ہے؟''

''مجھے کیا پتا۔ ابھی آئی ہے اور میرے امی ابو کے پاس بیٹھی ہے۔ تم نکلنے کی کرو ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔'' زاہد نے کہا۔

حماد شش و پنج میں مبتلا تھا اور پھر وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ زاہد نے لکڑی کا گیٹ کھول دیا۔ حماد نے کار اسٹارٹ کی تھی اس نے کار باہر نکال لی۔

زاہد گیٹ بند کرنے سے پہلے حماد کے پاس گیا اور بولا۔ ''سیدھے اپنے گھر چلے جاؤ۔ میں تم سے فون پر رابطہ رکھوں گا۔''

ٹھیک اسی وقت ایک تیز رفتار کار دھول اڑاتی ان کے پاس رکی اور ایک ساتھ دروازے کھلے اور دو آدمی باہر نکلے۔ حماد اور زاہد ڈر اور خوف سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جیسے ہی لال خان باہر نکلا، دونوں کی سانسیں رک گئیں۔ لال خان کے چہرے پر قہر برس رہا تھا۔

وہ ان کے پاس جا کر بولا۔ ''اچھا ہوا کہ تم دونوں جلد ہی مل گئے۔''

لال خان نے حماد کو کار سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

مجبوراً حماد کو کار سے باہر نکلنا ہی پڑا۔

''تم دونوں کیا سمجھے تھے کہ تیمور خان کو اپنی چال میں لپیٹ کر پولیس کے حوالے کردینے سے کہانی ختم ہوجائے گی؟ اب تم دونوں کی کہانی ختم ہوگی۔'' لال خان کی آواز

میں سفاکی اور لہجہ دھیما تھا۔

''ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' حماد بولا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ زاہد کی حالت بھی ایسی تھی جیسے وہ ابھی گر جائے گا۔

''تیمور خان اب تم دونوں سے رقم نہیں لے گا بلکہ تم دونوں کی جان لے گا۔'' لال خان نے کہتے ہی اچانک ایک لمبے پھل والا خنجر نکال لیا اور حماد کو پتا بھی نہیں چلا کہ خنجر والا ہاتھ کب بلند ہوا اور کب اس کی شہ رگ کاٹ کر نیچے جھک گیا تھا۔ خون کا فوارہ نکلا اور زاہد چیخا۔

''بچاؤ......''

اس کے ساتھ ہی زاہد بھاگا۔ لال خان نے پیچھے سے ہی خنجر اس کی طرف پھینکا اور خنجر زاہد کی پشت میں پیوست ہوگیا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی تو ارد گرد کے لوگ جاگ کر اپنے گھروں کی دیواروں کے ساتھ لگ گئے۔ اچانک کسی نے فائر کیا اور لال خان کو مزید کچھ کرنے کے لیے اپنے قدم روکنے پڑے۔

ایک بار پھر فائر ہوا اور لال خان کو اپنے آدمیوں کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ گاؤں کے لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ زاہد کا باپ بھی بھاگتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ زاہد شدید زخمی تھا اور حماد کا جسم ساکت ہوچکا تھا۔ پورے گاؤں میں دہشت پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن فرح کو زبیر اپنے والدین کے سامنے لے گیا اور ساری کہانی ان کو سنادی۔

''اب رشتوں پر کیا اعتبار کریں۔'' زبیر کے ابو بات سننے کے بعد بولے۔

''شکر ہے کہ زبیر وہاں موجود تھا اور اس نے فرح بیٹی کی مدد کردی۔ ورنہ جانے کیا ہوجاتا۔'' زبیر کی امی بولیں۔

''جی ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔'' فرح نے ایک نظر زبیر کی طرف دیکھا۔

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ بس اپنا فرض نبھایا ہے۔'' زبیر نے جلدی سے کہا۔

''زبیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' زبیر کا باپ اپنی دکان پر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

ناشتے کے بعد فرح نے زاہد کے گھر جانے کی خواہش کی تو زبیر اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر زاہد کے گھر لے گیا۔ اس گاؤں میں داخل ہوتے ہی فرح کی سب یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ وہ اسی گاؤں میں رہتی تھی۔ اسی گاؤں میں اس کی پیاری دوست تھی۔

جب وہ زاہد کے گھر کے سامنے پہنچے تو وہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ فرح سب کو دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اندر زاہد کی ماں رو رہی تھی۔ فرح کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی اور بتانے لگی کہ زاہد شدید زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے۔ ساتھ وہ ان لوگوں کو کوسنے لگی جنہوں نے بغیر کسی وجہ سے اس کے بیٹے کو زخمی اور بیٹے کے دوست کو جان سے مار دیا تھا۔

فرح چپ رہی۔ وہ ایک ماں کو اس کے بیٹے کی اصلیت نہیں بتاسکی۔ اس نے زاہد کی ماں سے الگ ہوکر گھریلو ملازمہ سے پوچھا۔

''زاہد میرا سامان لایا تھا؟''

''جی وہ میں نے اوپر کمرے میں دیکھا تھا۔''

''میرا سامان لادو۔'' فرح نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ سامان لے آئی۔ گاؤں کی پڑوسن عورتیں زاہد کی ماں کے پاس آجارہی تھیں۔ فرح خاموشی سے اپنا سامان اُٹھا کر باہر آگئی۔ زبیر ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور فرح کے ہاتھ سے اس کا سوٹ کیس لے لیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ تیمور خان نے کیا ہوگا۔ شاید اپنی رقم کی وجہ سے۔ مجھے یہ پتا چلا ہے کہ انہوں نے حماد کو مار دیا ہے اور زاہد شدید زخمی ہے۔''

''آپ چلیں مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی ہے۔'' فرح نے کہا اور وہ اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ فرح کا سوٹ کیس بڑی مشکل سے زبیر نے آگے رکھا تھا۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے زبیر نے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟''

فرح کوئی جواب دینے کے بجائے چپ بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد زبیر نے پھر پوچھا۔ ''میں نے پوچھا ہے آپ کو کہاں جانا ہے؟''

فرح پھر چپ سوچتی رہی۔

زبیر نے پھر کہا۔ ''میں آپ کو کہاں چھوڑ دوں؟''

فرح نے اپنا چہرہ زبیر کے کان کے پاس کیا اور بولی۔ ''اب آپ تو مجھے چھوڑنے کی بات نہ کریں۔ میں کہاں جاؤں گی؟''

اس کی بات سن کر زبیر مسکرا دیا اور اس نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ اپنے گھر کی طرف کردیا۔

دلدلی چہرہ

روبینہ رشید

خارزارِ زیست میں ہر روز نئے چہروں سے واسطہ پڑتا ہے... سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں... کسی کے چہرے سے ناراضگی ظاہر ہوتی ہے... کسی کے چہرے پر بد مزگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور کسی چہرے سے کوفت اور بوریت ٹپک رہی ہوتی ہے... ایسے ہی چہروں کے درمیان ایک چہرہ ایسا بھی تھا جو اس کے لیے گوہرِ مقصود تھا... محبت سے بھرپور وہ چہرہ... پُرکشش... باوفا... خوش قسمتی کا شاہکار تھا... جو اچانک ہی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا... تلاش و کھوج کا یہ مقصد اسے ایسے ایسے گمراہ کن راستوں پر لے گیا... جہاں قدم قدم پر ایک نئے چہرے سے ٹکراؤ ہو رہا تھا۔

ہمدردی و دردمندی رکھنے والے دلدلی چہرے کی چونکا دینے والی کہانی

وہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے کہ کبھی کہیں تھا ہی نہیں۔

وہ روز کی طرح دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ معمول کے مطابق تیار ہوتے ہوئے دن بھر کے شیڈول کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اس نے شام کا پروگرام بھی ترتیب دے لیا تھا۔ وہ انیقہ کے پسندیدہ چائنیز میں ڈنر کرنے والے تھے اور اس کے بعد تھوڑی سی لانگ ڈرائیو...... وہ دونوں روز کی طرح ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔

''کورٹ پہنچ کے اور پھر گھر کے لیے نکلتے ہوئے مجھے او کے کال کرنا مت بھول جایئے گا وکیل صاحب۔'' وہ روز کی طرح یاد دہانی کرانا نہیں بھولا تھا۔

''تم تو یوں کرو کہ مجھ میں ایک چپ لگوا لو پھر مزے سے اپنے لاڈلے فون سے مجھے ٹریک کرتے رہنا۔'' انیقہ نے چڑ کر کہا تھا۔

''ارے ہاں یار، ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔'' وہ پلٹ کر چکا۔ ''ویسے ایسا ہو تو کس قدر آسان ہو جائے نا سب کچھ...... اور پھر اگر سارے مجرموں کو چپ لگا دی جائے تو فرار کا خطرہ ہی ختم ہو جائے۔''

''بس ہو نا پولیس والے...... مجرموں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں جناب کو۔'' اس نے اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''کیوں نہیں سوجھتا...... تم کبھی پوچھو تو مجھ سے۔'' وہ مصنوعی سرد آہ بھر کر بولا۔

''آپ کہو مجھے......'' انیقہ بھی مصنوعی رعب سے بولی۔

''جیسا تم کہو۔'' نہایت سعادت مندی سے جواب بھی ترنت ملا تھا۔ ''اب کیا دفتر نہیں جانا...... صرف مجھے گھورتے رہنا ہے؟''

''جا رہی ہوں مگر خضر تم سچ میں بہت زیادہ وہمی ہو۔ رکشے سے جاؤں تو تمہیں رکشے کا نمبر چاہیے، گاڑی درمیانی

رو میں ہی چلانی ہے، سگنل پر شیشہ نہیں کھولنا۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میڈم یہ سیکیورٹی ٹپس ہیں...... تم تو تم...... میں تو اور خواتین کو بھی یہ سمجھاتا ہوں، اگر رکشے والا یہ دیکھ لے گا کہ تم نے بیٹھتے ہی اس کا نمبر گھر بھیج دیا تو وہ بے چارہ خود ہی نہایت حفاظت سے تمہیں گھر تک چھوڑ کر آئے گا۔ خود کسی مشکل میں پھنسنے کے ڈر سے...... سمجھیں، چلو اب اللہ حافظ اور یہ بھی تو دیکھو کہ میں خود ہر جگہ پہنچ کر اطلاع دیتا ہوں نا تم کو......''

مگر اس بار وہ خود سارے سیکیورٹی ٹپس جیسے بھول ہی گیا تھا ایسا گیا تھا کہ اس کی خبر تک پلٹ کر آنا بھول گئی تھی۔ وہ جو ہمیشہ فون کی ایک بیل پر میسر ہوتا تھا اب اس کا فون مسلسل ایک ہفتے سے دسترس سے دور تھا کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

یقین کی ریت زندگی کے ہاتھوں سے گویا پھسلتی جا رہی تھی۔

وہ اسے، اپنے گھر کو...... سارے خوابوں کو ایسے کیسے بھول سکتا تھا......؟ کیسے؟

وہ جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں...... کسی بھی صورت میں ممکن نہیں...... پھر آخر وہ کہاں تھا......؟

وہ نہ جانے کب سے خضر کی کرسی پر ساکت بیٹھی دیوار کو گھورے جا رہی تھی، اس کا ذہن اسی ایک سوال کی گردان کیے جا رہا تھا۔

اچانک دور سے آتی کسی آواز نے اسے چھوا۔ ایک ہی لے میں گونجتی آواز لحہ بہ لحہ گویا قریب آتی جا رہی تھی۔ بالآخر وہ اسے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔ وہ اچھل کے کرسی سے کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

''آخر یہ انیقہ دروازہ کھول کیوں نہیں رہی؟'' زرین کال بیل کو تیسری مرتبہ دباتے ہوئے بولی۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ گھر پر نہ ہو۔'' اس سے کچھ دور کھڑے غالب نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تو...... وہ گھر پر ہی ہے، اس کی گاڑی بھی نیچے ہی کھڑی ہے گیراج میں۔'' زرین نے سر جھٹکا تو غالب اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس کی سرخ و سفید رنگت اس وقت کچھ زیادہ ہی تمتما رہی تھی۔ چمکتی ہوئی بھوری آنکھوں میں بے چینی اور فکر جھلک رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر شانوں پر بکھرے بھورے خوب صورت بالوں کو سلجھا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑی ہوئی تھی۔ اسے انیقہ کی بہت فکر ہو رہی تھی۔

زرین اور انیقہ کالج کے دنوں سے ایک دوسرے کی گہری دوست تھیں۔ انہوں نے وکالت کا امتحان بھی ایک ساتھ ہی پاس کیا تھا۔ گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے زرین نے امتحانوں کے فوراً بعد ہی ایک تجارتی ادارے میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کے برعکس انیقہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے پاپا شہر کے نامور ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ گاؤں میں خاصی زمین موجود تھی۔ روپے پیسے کی کوئی

کی نہیں تھی۔ انیقہ ان کی آنکھوں کا تارہ تھی اور اس کی کسی خواہش کو رد کرنا گویا ان کے لیے ناممکن تھا جب اس نے بار ایٹ لاء کے لیے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کیا تو اس کی جدائی کو نہ برداشت کرنے کے باوجود اس کے پاپا نے خوشی خوشی اس کی بات مان لی تھی۔ ممی نے اگرچہ تھوڑی مخالفت کی مگر اس کی ضد کے آگے ان کی بھی ایک نہیں چلی تھی۔ وہ بیرسٹر بننا چاہتی تھی۔ پڑھائی میں وہ شروع سے بہت اچھی تھی۔ بظاہر ایسی کوئی بھی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنا خواب پورا نہ کر پاتی۔ اس نے تو زرین کو بھی ساتھ لے جانے کے لیے پورا انتظام کر لیا تھا مگر زرین نے انکار کر دیا تھا۔ ایک تو اسے اپنے گھر کی ذمّے داری اٹھانی تھی، دوسرے وہ پہلے ہی انیقہ کی بہت احسان مند تھی۔ اسے اس کے پاپا کی سفارش پر ہی فوراً اتنی اچھی ملازمت مل گئی تھی مگر انیقہ اس کی زندگی میں اس طرح شامل تھی کہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد وہ کیا کرے گی۔

''تو دیکھنا زرین میں بیرسٹر بن کر لوٹوں گی اور سب کی چھٹی کر دوں گی۔'' ائرپورٹ پر اس کی آنکھوں میں اترتے پانی کو دیکھ کر وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔

''وہ تو تُو ویسے بھی کر سکتی ہے۔''

''تو اتنی اداس مت ہو، میری ممی کا خیال رکھنا ہے تجھے..... خود منہ بنا کر بیٹھے گی تو ان کا خیال کیسے رکھے گی؟''

''میں رکھوں گی۔'' زرین نے کہا۔ ''تجھے کہنے کی ضرورت نہیں..... بس میں سوچ رہی تھی کہ تو تین سال بعد آئے گی..... میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''ارے نہیں بیٹا، یہ ہر سال آئے گی۔'' اس کی ممی مسکرائیں۔ ''ہمیں چین تھوڑی پڑے گا اس کے بغیر.....''

''سنا تم نے..... اگلے سال (اسی مہینے اسی دن) کو ملاقات ہوگی۔ غمگین ہیروئن۔'' وہ شوخی سے مسکرائی تھی اور پھر فضا میں گونجنے والے اعلانات کی آوازوں میں سب سے مل کر رخصت ہوگئی۔

مگر اسے اسی سال صرف چار ماہ بعد واپس آنا پڑا تھا اس کے ممی پاپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ اس کے پاپا موقع پر ہی چل بسے تھے جبکہ ممی شدید زخمی حالت میں گویا اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کی آمد کے تیسرے روز وہ بھی شوہر سے جا ملی تھیں۔

انیقہ کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ تب زرین نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ وہ گھنٹوں ماں باپ کے کمرے میں ان کی تصویروں کے سامنے بیٹھی رہتی۔ اچانک گاڑی لے کر قبرستان پہنچ جاتی، کام، پڑھائی، دنیا، لوگ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اسے انتہائی افسوس تھا کہ وہ ان کو چھوڑ کر گئی ہی کیوں..... شروع شروع میں کچھ رشتے داروں نے اس کے ساتھ رہنا چاہا مگر سب کی اصل توجہ اس کے پاپا کی دولت کی طرف تھی جسے وہ اپنی زندگی میں اپنی بیٹی اور کچھ خیراتی منصوبوں کے نام کر گئے تھے اور اس کا سب انتظام میکانکی طریقے سے چل رہا تھا۔ انیقہ کو کسی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا آخر چند دن میں ہی سب اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ صرف زرین ہی تھی جو اس مشکل وقت میں لمحہ لمحہ اس کے ساتھ رہی تھی، اسے زندگی کی طرف کھینچ لائی تھی۔ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے انیقہ نے پریکٹس کی طرف دھیان دیا۔ پاپا کے بڑے سے بنگلے کو بیچ کر اپارٹمنٹ خریدا اور کام کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ زرین تو چاہتی تھی کہ وہ واپس جا کر اپنی تعلیم مکمل کرے مگر انیقہ اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے گزر [illegible] وقت نے اس کی تکلیف کو ختم تو نہیں کیا تھا مگر وہ جینے لگی تھی۔ کام اور مصروفیت اس کے لیے تریاق ثابت ہوئے تھے تو دوسری طرف مسلسل محنت نے بہت جلد اسے وکلا برادری میں ممتاز کر دیا تھا۔ مشہور تھا کہ انیقہ..... کبھی کوئی کیس نہیں ہارتی۔ اس کی دوسری پہچان اس کی ایمانداری تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ اسے خریدا نہیں جا سکتا وہ وہی کیس لیتی جو اس کے خیال میں ٹھیک ہوتے تھے۔

''زرین تم اسے فون کیوں نہیں کر لیتیں، ہو سکتا ہے کہ کال بیل بند یا خراب ہو۔'' غالب، زرین کی الجھن دیکھ کر بالآخر بولا۔

''ہاں..... یہ ہو سکتا ہے میں کرتی ہوں فون۔'' زرین نے بیگ سے فون باہر نکالا، ابھی وہ نمبر ملا بھی نہیں پائی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ انیقہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ خوب صورت غلافی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ کافی دیر سے روتی رہی ہو۔

''تم ٹھیک ہو انیقہ.....؟'' زرین اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھی۔ ''کب سے بیل بجا رہے تھے ہم لوگ..... تم کہاں تھیں؟''

''پتا نہیں۔'' وہ عجیب سی بے بسی سے بولی۔ ''تم لوگ بیٹھو میں منہ دھو کر آتی ہوں۔'' وہ ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''انیقہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' غالب دروازہ بند

کر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیسے ٹھیک ہوگی..... پریشانی بھی کتنی بڑی ہے۔'' زرین دھیرے سے بولی۔

''ہاں..... یہی تو کہہ رہا ہوں میں، اسے اکیلے نہیں رہنا چاہیے، تم اسے گھر کیوں نہیں لے چلتیں؟''

''وہ تیار نہیں ہے۔ تمہارے خیال میں، میں نے کوشش نہیں کی ہوگی۔'' زرین نے گھور کر غالب کو دیکھا۔

غالب اس کا صرف شوہر نہیں تھا، اس کا بہترین دوست اور بقول خود اس کا بے چارہ عاشق بھی تھا۔ اس نے زرین کی ذمّے داریوں کی وجہ سے اس کی چھوٹی تینوں بہنوں کی شادیوں تک اس کا انتظار کیا تھا۔ وہ تو اس کے چھوٹے بھائی کی ملازمت کے لیے بھی رکنے پر تیار ہوگیا تھا مگر زرین کی امی اور خود بھائی نے بہن کو شادی کے لیے تیار کر لیا تھا۔

وہ دونوں ایک ہی فرم میں کام کرتے تھے۔ غالب، انیقہ اور خضر دونوں کو ہی بہت پسند تھا۔ ہنسنا ہنسانا، خوش رہنا اور رکھنا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ انیقہ کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بہت رنجیدہ تھا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا یہ بھی کہ اگر وہ نہیں آتی تو میں یہاں رہ جاتی ہوں مگر اس نے منع کر دیا، اسے لگتا ہے کہ میں اس کی وجہ سے پریشانی میں پڑ رہی ہوں۔'' زرین بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ خضر آخر کہاں غائب ہوگیا ہے۔''

''وہ کبھی خود کہیں نہیں جا سکتا۔'' غالب حتمی انداز میں بولا۔

''مگر اس کا محکمہ تو یہی کہہ رہا ہے۔'' زرین بولی۔

''کوئی... کچھ بھی کہے مگر یہ تو ماننے والی بات ہی نہیں ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔''

''مگر غالب..... وہ کوئی عام آدمی تو ہے نہیں، ایک ذمّے دار پولیس افسر ہے، اتنی تفتیش ہوئی۔ چھ دن سے سب اسے تلاش کر رہے ہیں، کہیں کوئی حادثہ رپورٹ نہیں ہوا، میرے منہ میں خاک کوئی لاش نہیں ملی..... اس کے فون ریکارڈ سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو رہا سوائے اس کے اس نے آخری کال کلفٹن سے کی تھی..... اس کے بعد فون ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ آخر سمجھا جائے تو کیا.....؟''

''پتا نہیں مگر کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے۔'' غالب سر ہلا کر بولا۔ پھر انیقہ کو آتا دیکھ کر خاموش ہوگیا۔

''کوئی خبر آئی.....؟'' اس کے بیٹھنے کے بعد زرین نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''میں نے آئی جی صاحب کو بھی فون کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ہے جیسے ہی کوئی خبر ملی..... بتائیں گے اور وہی تسلیاں۔'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

زرین نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ''تمہیں ہمت کرنا ہوگی انیقہ، تم کو نکلنا ہوگا اگر تمہیں لگتا ہے کہ پولیس ٹھیک کام نہیں کر رہی تو آگے بڑھو، سب کچھ دیکھو، انہیں مجبور کرو کہ وہ خضر کو ڈھونڈیں..... گھر میں بند ہونے سے کیا ہوگا آخر؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... آج آئی جی سے بات کے بعد میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔ میں کل اسٹیشن جاؤں گی، خضر کے ساتھیوں سے ملوں گی۔'' وہ حوصلے سے کہے جا رہی تھی۔

''گریٹ..... اب کی نا تم نے ایک سچے پولیس افسر کی بیوی والی بات..... مگر کام کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا لہٰذا سب سے پہلے ہم کھائیں گے کھانا..... جو میں ساتھ لے کر آئی ہوں.....'' زرین مسکرا کر بولی۔

وہ دونوں کافی دیر وہاں رکے تھے۔ کھانے کے بعد واپسی پر انہوں نے انیقہ سے ساتھ چلنے کے لیے خاصا اصرار بھی کیا مگر اس کے انکار پر بادلِ ناخواستہ گھر کے لیے نکلے تھے۔

''ذرا بھی پریشانی ہو تو مجھے کال کرنا..... میں پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔'' زرین جاتے جاتے تین چار بار یہ بات دہرا کر گئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد انیقہ اسٹڈی میں گھس گئی۔ زرین کی بات اس کے دل کو لگی تھی، وہ اپنے خضر کی تلاش کے لیے صرف دوسروں پر انحصار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کاغذ اور پین لے کر بیٹھ گئی۔

شروعات کہاں سے ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا، خضر اس صبح بالکل مطمئن تھا، کوئی ٹینشن یا پریشانی اگر تھی بھی تو ایسی نہیں تھی جو اس پر طاری ہو سکتی۔

وہ شام کا پروگرام بنا کر گھر سے نکلا تھا۔ یعنی اسے یقین تھا کہ وہ سات بجے تک گھر پہنچ جائے گا۔

پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ واپس نہیں آ سکا۔ اس کی گاڑی سی ویو سے ملی تھی۔ وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ اس نے انیقہ کو

تین بجے کے قریب کال کی تھی اور پوچھنے پر صرف یہ بتایا تھا کہ وہ کام پر ہے اور دفتر سے باہر ہے، اس وقت وہ خود بھی قدرے مصروف تھی اس لیے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکی۔ ساڑھے چھ بجے اس نے خضر کو فون کیا تو اس کا فون ان ریچ ایبل آرہا تھا۔ فون ریکارڈز سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس کے فون سے کی جانے والی آخری کال تھی۔ اس رات سے ہی اس کا فون مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ جب بھی، جہاں بھی وہ سم اور فون آن ہوتا خبر ملنا ممکن ہو سکتا تھا۔

وہ ایک پولیس افسر تھا اور افسر بھی وہ جس کی پہچان اس کی ایمان داری اور فرض شناسی تھی جس کی وجہ سے خود محکمے میں اس کے بہت سے دشمن تھے۔ باقیوں میں سے بھی اکثر ایسے تھے جو اس کی موجودگی کو اپنے لیے پریشانی سمجھتے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔

پھر کیا ہوا ہوگا؟

محکمہ خضر کی گمشدگی کے حوالے سے قتل، اغوا، حادثہ، روپوشی، حتیٰ کہ خودکشی کے آپشن تک پر کام کر رہا تھا مگر تفتیش کی گاڑی کسی بھی سمت میں چلتی اور چند قدم آگے جا کر رک جاتی تھی۔

اگر اسے قتل کیا گیا ہوتا تو اتنے دنوں میں کہیں نہ کہیں سے لاش مل گئی ہوتی۔ اگر اسے اغوا کیا گیا تھا تو اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی مطالبہ، کوئی سوال تو سامنے آتا۔

روپوشی یا خودکشی نہ اس کا مزاج تھے اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ موجود تھی تو پھر وہ آخر گیا کہاں؟

سوچ کا سفر پھر اسی سوال پر آ کر رک گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''خضر...... کہاں ہو تم؟'' اس نے سامنے شیلف پر رکھی اپنی اور خضر کی تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

خضر سے اس کی پہلی ملاقات نہایت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

''آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں؟''

آنے والا عین اس کے سامنے آ کر براجمان ہو گیا تھا ابھی وہ اس کے اس طرح بغیر اجازت نازل ہونے پر ہی کم حیرت زدہ سی تھی کہ اس سوال نے اس کا دماغ گھما دیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ ہیں کون؟ اور اس طرح بغیر اجازت میرے کمرے میں آئے کیسے؟'' وہ غصے سے بولی۔

''اوہ ہاں...... میرا نام خضر ابراہیم ہے، ڈی ایس پی خضر ابراہیم۔ شاید آپ نے میرا نام سن رکھا ہو اور جہاں تک بغیر اجازت اندر آنے کا سوال ہے تو کمرے کے باہر آپ کے بیرونی آفس میں کوئی تھا ہی نہیں جس سے اجازت لی جا سکتی۔ اور یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے جس طرح میں اندر آ گیا...... کوئی بھی آ سکتا تھا، ائرکنڈیشنڈ دفاتر کی اس عمارت میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی اگر کہیں کچھ غلط ہو تو...... اس لیے آپ کو دفتر کا دروازہ بند رکھنا چاہیے۔''

''شاہجہاں باہر نہیں ہے۔'' انیقہ گڑبڑائی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو خود ہی پرائیویٹ آفس سے ایک ضروری دستاویز لانے بھیجا تھا۔ آج اس کی کوئی اپائنٹمنٹ نہیں تھی۔ اسی لیے وہ سکون سے بیٹھی کیس کی تیاری کر رہی تھی جس میں اسے شاہجہاں کی مدد درکار نہیں تھی۔

''خیر، اس کا مطلب پھر بھی یہ نہیں کہ منہ اٹھا کر بغیر دستک دیے کمرے میں داخل ہوا جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''میڈم، شاید آپ کو مصروفیت میں آواز نہ آئی ہو یا پھر......'' وہ مسکرایا۔ ''مگر میں نے دو بار دستک دی تھی۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ میں نے تو سن رکھا تھا کہ آپ کبھی غلط کا ساتھ نہیں دیتیں اور اسی وجہ سے میں آپ کا فین بنتا جا رہا تھا مگر شاید کبھی کیس نہ ہارنے والی شہرت نے آپ کو اس بار غلط صحیح کی پہچان بھلا دی ہے اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے بات مکمل کی۔

''کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟''

''بکواس نہیں...... حقیقت، جس شمس الدین کی آپ نے آج صبح ضمانت کرائی ہے، کیا آپ نہیں جانتیں کہ وہ بھتا خوری اور اسٹریٹ کرائمز میں ملوث ہے۔ کئی بار وہ بچ نکلا ہے۔ اس بار اس نے ایک دکاندار کو شدید زخمی بھی کیا ہے مگر آپ نے شک کا فائدہ دلا کر اس کے حق میں ایسی وکالت کی کہ عدالت اس کو ضمانت پر رہا کرنے پر تیار ہو گئی۔''

''جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس بات کا کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟'' انیقہ نے تحمل سے پوچھا۔

''ثبوت...... ثبوت میں خود ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے گرفتار کرایا تھا، اس نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا اور یہ پہلی بار نہیں تھا...... وہ پہلے بھی گرفتار ہو چکا ہے مگر اس کا چینل بہت طاقت ور ہے، وہ سب کچھ خرید لیتے ہیں۔ حفاظت کرنے والے ہاتھوں سے لے کر بچا لینے والے ذہن اور فیصلہ کرنے والے قلم تک......'' وہ تلخی سے بولا۔

''دیکھیے مسٹر......''

''خضر ابراہیم۔''

''جی خضر ابراہیم......'' یہ نام اسے بہت سنا ہوا لگ رہا تھا۔ ''میں بہت سوچ سمجھ کر کیس لیتی ہوں اور جنہوں نے اسے میرے پاس ریفر کیا تھا، میں ان پر یقین کرتی ہوں اسی لیے میں نے یہ کیس لیا۔ میں اگرچہ آپ کو جوابدہ نہیں ہوں مگر بات چونکہ میری کریڈیبلٹی پر آ رہی ہے اس لیے بتا رہی ہوں کہ اس کے خلاف کوئی گواہ نہیں تھا......''

''یہی تو میں نے آپ کو بتایا کہ ان کا نیٹ ورک بہت طاقتور ہے اور اب مان لیجیے کہ آپ کا یقین غلط ثابت ہوا ہے اور اب جبکہ وہ باہر آ چکا ہے، اس کے مزید گناہوں کا بار کسی نہ کسی حد تک آپ کے کاندھوں پر بھی ہوگا۔''

وہ یہ کہہ کر جس طوفانی انداز میں آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ وہ اس کے جانے کے بعد کئی لمحے تک خالی الذہنی کی کیفیت میں دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔ یہ اس کی پروفیشنل لائف کا پہلا موقع تھا جب کسی نے اس طرح اس کے فیصلے یا کام پر انگلی اٹھائی تھی۔

اسے شدید غصہ آ رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی کہی باتوں پر غور بھی کر رہی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ خضر ابراہیم کے بارے میں اس نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ وہ ایک سخت اور ایماندار افسر کی شہرت رکھتا تھا اور اس وجہ سے مسلسل تبادلوں اور پریشانیوں کا شکار بھی رہتا تھا۔

اگلے دو دن انیقہ نے شمس الدین کے بارے میں معلومات اکٹھی کروانے میں گزارے تھے اور جب نتائج اس کے سامنے آئے تو وہ سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔ اس سے واقعی غلطی ہوئی۔ اسے شدید حیرت تھی کہ اسے پہلے یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آیا۔ جھوٹ کو اس طرح سجا کر پیش کیا گیا تھا کہ وہ سچ بن گیا تھا۔ وہ رات بھر سوچتی رہی تھی۔ اب اپنی غلطی تسلیم کرنا خود اپنا مذاق اڑوانے کے مترادف تھا۔ صبح تک بہرحال وہ فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے صبح عدالت پہنچ کر درخواست جمع کرا دی تھی اب وہ شمس الدین کی وکیل نہیں تھی اور وہ اس کی اگلی پیشی میں اس کے خلاف گواہی دینے والی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے مگر مسئلہ اس کی ساکھ کا تھا۔ اسی شام خطرہ اس کے سر پر آ گیا تھا۔ شمس الدین اپنے کئی چیلوں کے ہمراہ اس کے دفتر آ دھمکا تھا۔ وہ اسے اس قدر جلد اطلاع مل جانے پر حیران رہ گئی تھی۔

''کیوں میڈم سچ کا بخار چڑھ گیا تم کو......؟'' کیس کے دوران میں منمنانے والا شمس الدین اپنے اصلی روپ میں سامنے آ گیا تھا۔

''شمس الدین میں تمہیں مطلع کرتی ہوں کہ تم نے اس طرح میرے دفتر میں گھس کر قانون شکنی کی ہے۔ اس کے لیے میں تم کو گرفتار بھی کروا سکتی ہوں اس لیے بہتر یہ ہے کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔''

''اوہو، میں تو ڈر گیا...... دیکھ رفیقے میں تو کانپ بھی رہا ہوں۔ میڈم ہم یہاں تمہاری دھمکیاں سننے نہیں آئے، یہ تمہارا کام ہے بھی نہیں...... دھمکیاں ہم دیتے ہیں اور پھر انہیں سچ بنانے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ ہم تمہیں سمجھانے آئے ہیں......'' وہ یکلخت لہجہ بدل کر بولا تھا۔

''کیا......؟ بہتر نہیں ہے کہ تم میڈم سے پہلے مجھے بھی کچھ سمجھا دو۔'' اس آواز پر انیقہ سمیت سب نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں خضر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

شمس الدین واضح طور پر اس کی وہاں موجودگی سے خائف نظر آ رہا تھا۔

''یہ میری وکیل ہیں، میں ان سے کیس کی بات کرنے آیا ہوں ڈی ایس پی، اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''یہ بات ان سے ہی پوچھ لیتے ہیں...... کیوں میڈم؟'' خضر، انیقہ کی طرف مڑا۔

''میں اب اس کی وکیل نہیں ہوں۔'' وہ صاف لہجے میں بولی۔

''میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ آپ غلط کا ساتھ نہیں دیتیں۔'' اس نے آخری جملہ قدرے دھیرے سے کہا اور پھر شمس الدین کی جانب مڑا۔ ''ہو گئی تسلی...... اب اتنا قانون تو تم جانتے ہی ہو کہ ایک محترم وکیل کے دفتر میں گھسنے، اور اسے دھمکیاں دینے کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟ چلو بھئی اندر آؤ اور شمس الدین اینڈ کمپنی کو ساتھ لے جاؤ۔'' اس کی آواز پر دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹا سا کمرا سات آٹھ پولیس افسران سے بھر گیا اور وہ انہیں ہتھکڑیاں لگا کر ساتھ لے گئے۔

''آپ...... آپ اچانک کہاں سے آ گئے؟'' وہ واقعی اس کی فلمی آمد سے حیران تھی۔

''اچانک نہیں...... مجھے صبح ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کی وکالت چھوڑ دی ہے اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ خاموش نہیں بیٹھے گا اس لیے میری نظریں آپ پر ہی تھیں۔

آپ نے آج پھر سیکیورٹی کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ باہر بیٹھا آپ کا وہ مرنجان مرنج اسسٹنٹ تو صرف ایک دھکے کی مار ہے...... خیر ویسے میں آپ کا شکر گزار ہوں، شکریہ میری بات سننے اور سمجھنے کا۔''

''یہ صرف آپ کی بات کا معاملہ نہیں تھا مسٹر خضر، میں نے معلومات کروائیں، اس بار واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''مگر اس کا ازالہ بھی ہوگیا، آپ کی وجہ سے وہ آزاد ہوا تھا اور اب آپ کی وجہ سے ہی دوبارہ اندر پہنچ گیا مگر آپ کو تھوڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے، حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ایسے میں آپ کو پراپر سیکیورٹی کی ضرورت ہے۔ میرے حساب سے آپ کو یہاں ایک اچھا گارڈ رکھنا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس بارے میں، میں خود فیصلہ کروں تو بہتر ہے۔'' انیقہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''بالکل، فیصلہ خود آپ ہی کریں مگر مشورہ ہمیشہ متعلقہ شعبے کے ماہرین سے لینا چاہیے جیسے کہ عدالتی معاملات آپ بہتر سمجھتی ہیں کسی حد تک......'' وہ مسکرایا۔ ''اسی طرح میں اس معاملے میں تو رائے دے سکتا ہوں۔''

انیقہ کی تمام تر خشک مزاجی اور بیزاری کے اظہار کے باوجود وہ اس شام اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی میں اسے گھر تک پہنچا کر گیا تھا اور پھر وہ کیسے اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ بن گیا یہ خود انیقہ بھی نہیں سمجھ پائی۔ زرین اور غالب کو بھی وہ بہت پسند آیا تھا۔

''بہت اسمارٹ ہے باتوں میں بھی اور دیکھنے میں بھی جیمز بونڈ جیسی شخصیت ہے اس کی۔ تم دونوں کی جوڑی بہت اچھی لگے گی۔'' زرین تو اس کی فین ہوگئی تھی۔ انیقہ اور خضر ہم مزاج تھے اور ہمدرد بھی...... وہ بھی برسوں پہلے اپنے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو چکا تھا۔ خاندان کے نام پر ایک بہن اور ایک بھائی تھے مگر وہ دونوں لندن اور کینیڈا میں اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔

ان دونوں نے پہلی ملاقات کے چار ماہ بعد شادی کا فیصلہ کر لیا اور سادگی سے ایک خاندان بن گئے۔ خضر سے شادی کے بعد انیقہ کو زندگی، زندگی لگنے لگی تھی۔ گزرے ہوئے دس ماہ گویا دس دن میں گزر گئے تھے اور اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے خضر کو جانتی ہو۔

''میں تمہیں ڈھونڈ کر لاؤں گی خضر......'' وہ فریم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس کا لہجہ عزم سے بھرپور تھا۔

☆☆☆

''ایس پی صاحب، مجھے آپ کی کوششوں سے انکار نہیں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ خضر کن کیسز پر کام کر رہے تھے؟'' وہ اگلی صبح خضر کے دفتر میں موجود تھی۔ اس کا وہاں اچھی طرح سے استقبال ہوا تھا مگر جب اس نے خضر کے حوالے سے سوالات شروع کیے تو اسے قدرے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اول تو وہ اس کے دفتری معاملات میں اس کی بیوی سے بات کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور دوسرے شاید انہیں اس میں اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے کوئی ایسی قانونی وجہ نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے آپ مجھے یہ نہ بتا سکیں کہ خضر ان دنوں کس کیس کے ساتھ منسلک تھے؟''

''دیکھیے مسز خضر...... پولیس اس حوالے سے کوشش کر رہی ہے۔ وہ ہمارا افسر ہے، آپ کو اس کے حوالے سے کچھ بتانا خود آپ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے یوں بھی اب تک ایسی کوئی اطلاع نہیں مل پائی ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ مسٹر خضر ابراہیم کو کسی نے اغوا کیا ہے۔'' ایس پی اس کے تابڑ توڑ سوالات پر کچھ الجھ سا گیا تھا۔

''اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ کے خیال میں وہ پکنک منانے کے لیے غائب ہوا ہے؟'' انیقہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کہیں الگ تھلگ رہنا چاہتا ہو۔''

''وہ اتنا غیر ذمے دار نہیں ہے، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' انیقہ نے جواب دیا۔

''بی بی ہم پوری کوشش کر رہے ہیں، دہشت گردی کی اس لہر نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ظاہر ہے کہ اس کا پہلا شکار ہیں۔ ہم خضر کو ڈھونڈ رہے ہیں، بہت سے مخبر لگے ہوئے ہیں اس کام میں، جلد بہت جلد ہمیں اس کی خبر مل جائے گی اور آپ یقین رکھیں کہ ہم آپ کو اس سے باخبر رکھیں گے۔'' ایس پی نے رسمی انداز میں بات گویا ختم کر دی تھی۔

انیقہ اس کے کمرے سے باہر آئی۔ وہ خضر کے دو تین ساتھیوں کو جانتی تھی، اسے امید تھی کہ شاید اسے ان سے کچھ مدد ملے مگر وہ اس وقت بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''بھائی......'' انسپکٹر راحیل اسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں آپ مایوس ہو کر جارہی ہیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا، البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ خضر بھائی آج کل اسٹریٹ کرائم اور دہشت گردی کے ایک بڑے نیٹ ورک کے پیچھے تھے، آپ تو جانتی ہیں کہ وہ اسی پر کام کررہے تھے۔ صرف گروپس اور کیس بدلتا تھا مگر ان کی جنگ دہشت گردی کے خلاف ہی تھی۔''

''ہم...... آپ کو اس بارے میں کچھ بھی خبر ملے تو پلیز مجھے بتایئے گا۔'' اندھیرے میں اتنی روشنی بھی اسے بہت لگ رہی تھی۔

''ضرور بھائی، انہوں نے دو تین دن پہلے مجھے ایک بات کہی تھی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ اس بارے میں کچھ جانتی ہیں کہ نہیں یا مجھے بتانا چاہیے کہ نہیں۔''

''آپ بتایئے پلیز......''

''وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک بڑے نیٹ ورک کے بارے میں کچھ ثبوت ہیں اور ...... اس میں بڑے بڑے پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔'' وہ رک رک کر بولا۔

''ثبوت......؟ کیسا ثبوت......؟''

''اب یہ تو نہیں معلوم...... مگر میرا خیال ہے کہ شاید تصویریں یا کوئی ڈاکومنٹس...... آج کل ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے کسی سی ڈی یا یو ایس بی پر کچھ محفوظ کرلیا ہو۔'' وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

یو ایس بی کے نام پر انیقہ کے ذہن میں پٹاخا سا چھوٹا مگر اس نے انسپکٹر پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ اس کی مدد کررہا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کو اس کا انداز عجیب سا لگ رہا تھا۔

''اچھا...... مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے، آپ کو کوئی خبر ملے تو مجھے بتایئے گا۔'' وہ اسے جواب دے کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

''یو ایس بی......'' یہ لفظ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ خضر نے ایک ہفتے پہلے اسے ایک عجیب سی قلم نما یو ایس بی دکھائی تھی۔

''یہ کچھ عجیب نہیں ہے؟'' وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی تھی۔

''عجیب سے زیادہ کارآمد ہے...... یہ نہ صرف جدید یو ایس بی ہے بلکہ اس میں کیمرا اور ٹیپ ریکارڈر بھی ہے یعنی یہ باریک سا قلم پورا جاسوسی ادارہ ہے، سمجھیں۔''

''ارے واہ...... جیمز بانڈ 007 کی فلموں کے آلات اب سچ میں سب کو میسر ہیں۔''

''ہاں، بس ان کا استعمال ٹھیک ہونا چاہیے۔'' وہ گھر پہنچ کر دیکھنا چاہتی تھی کہ خضر کی وہ کارآمد یو ایس بی کہاں ہے؟ کیا وہ اسے ساتھ لے گیا تھا یا وہ گھر پر موجود ہے؟

ہوسکتا تھا کہ واقعی اس میں ایسا کوئی ثبوت، کوئی کلیو موجود ہو جو اسے خضر تک پہنچا سکے۔

یا اس کے غیاب کے ذمے داروں کی جانب اشارہ کرسکے۔

گھٹاٹوپ اندھیرے میں امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی تھی اور وہ اس کے سہارے منزل تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

گاڑی پارک کر کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اوپر چڑھی تھی۔

خضر اپنی اس قسم کی چیزیں درازوں وغیرہ میں نہیں رکھتا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، اگر یو ایس بی گھر میں تھی تو وہ خضر کے کوٹوں میں سے کسی کی اندر پاکٹ میں ہی ہوسکتی تھی۔

اس نے ایک ایک کر کے تمام کوٹ چھان ڈالے تھے۔ الماری کا سارا سامان بستر پر ڈھیر کردیا تھا۔ گھر میں موجود تمام درازیں چھان ماری تھیں۔ گھر کا ڈیسک ٹاپ اور خضر کے لیپ ٹاپ کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ یو ایس بی کہیں نہیں تھی۔

اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے گیا ہو اگر اغوا کے وقت وہ یو ایس بی اس کے پاس تھی اور کسی کو اس میں موجود کسی مواد سے دلچسپی تھی تو اسے حاصل کرنے کے بعد خضر کو غائب کرنے کی وجہ سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

'کہیں خضر کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟' اس خیال کے آتے ہی اس کی سانس رکنے سی لگی تھی۔ وہ جن خطرناک لوگوں سے لڑ رہا تھا، جس کے خلاف تفتیش کررہا تھا، وہ بہت طاقتور اور بے رحم تھے۔ ان کا تو کام ہی خون بہانا تھا۔ ''نہیں...... خضر کو کچھ نہیں ہوا ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر آنسو پونچھے اور سارا سامان الماری میں ٹھونسنے لگی۔ خود کو تسلی دینے کے باوجود اس کے اندر کا خوف اس کے وجود کو لرزا رہا تھا۔ ہینگر لٹکاتے ہوئے اس کا پیر پھسلا، خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے ساتھ رکھی میز کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ گر ہی پڑی۔ اگرچہ اسے کوئی خاص چوٹ نہیں لگی تھی مگر وہ چند لمحے ماربل کے فرش پر ساکت پڑی رہی۔ اٹھنے سے پہلے اس کی نظر میز کے نیچے رکھے خضر کے جوتوں پر پڑی، یہ اس کے جاگنگ شوز تھے۔ اس نے نہ جانے کس احساس کے تحت جوتا باہر نکالا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اس کے چھوڑے ہوئے لمس کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

اچانک اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اس نے ٹٹول کر اسے دوبارہ محسوس کیا اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے وہی 007 یو ایس بی چمک رہی تھی۔

☆☆☆

انیقہ کو چند لمحوں تک اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہوئی۔ یو ایس بی اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور یو ایس بی اس میں لگائی۔

جوش سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اسے خضر کی خبر ملنے والی تھی۔ نہ جانے اس یو ایس بی میں کیا تھا، کیسا ثبوت تھا؟ کوئی خطرناک تصویر......؟ کسی شرمناک معاہدے کے دستخط...... نہ جانے کیا تھا ایسا جس کی وجہ سے خضر کی جان پر بن گئی تھی۔ اس نے مائی کمپیوٹر کو ہٹ کیا جیسے ہی ایکسٹرنل فولڈر کا آئی کون نمودار ہوا اس نے اسے دبایا۔

یو ایس بی کھل گئی تھی۔

جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے تھا، اسے اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

انیقہ کافی دیر تک اسکرین کو دیکھتی رہی، اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، وہ کیا کرے؟ کیا وہ کچھ کر پائے گی؟ یہ سوال اس کے حواس اڑا رہے تھے۔

انیقہ نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا، یو ایس بی کو میز کی دراز میں ڈالا اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

امید کی یہ کرن بھی ہلکا سا جھما کا دکھا کر اندھیرے میں کھو گئی تھی۔ چند لمحے پہلے والا جوش اب عجیب سی کمزوری میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے مگر وہ تہیہ کرچکی تھی کہ اب وہ نہیں روئے گی۔ اس کے آنسو اس کی ہمت بنیں گے اور اس ارادے پر وہ پوری طرح کاربند رہنا چاہتی تھی۔

اس وقت وہ بہت مایوس تھی مگر اسے یقین تھا کہ کل کا سورج اس کے لیے نئی خبر لائے گا۔ نئی خبر جو سب کچھ بدل دے گی۔

صبح واقعی سب کچھ بدلنے والا تھا مگر کیا ...... یہ صرف کاتبِ تقدیر کو ہی معلوم تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ گھنٹیوں کی تیز آوازوں سے کھلی تھی۔ رات بڑی دیر تک سونے کی کوشش میں جاگنے کے بعد اس نے بالآخر نیند کی گولی کا سہارا لیا تھا۔ اور اب کچی نیند سے اس طرح جاگنے کی وجہ سے چند لمحوں تک تو وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ وہ کہاں ہے اور یہ آوازیں کیسی ہیں؟ دو منٹ بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ سمجھ پائی کہ فون کی گھنٹی اور کال بیل دونوں ساتھ بج رہی تھیں۔ وہ تیزی سے بستر سے نکلی۔ فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ خاموش ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے سلیپر پہنے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ آنے والا اب کال بیل پر ہاتھ رکھ کر گویا بھول ہی گیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے زرین کا بدحواس چہرہ نظر آیا۔ غالب ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھا۔

''کیا ہوگیا ہے زرین، تم اتنی پریشان کیوں ہو؟'' وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''اندر آؤ...... آپ بھی غالب بھائی...... کیا کچھ برا ہوا ہے؟''

''بہت...... بہت برا ہوا ہے۔'' زرین بمشکل بولی۔

''میں پانی لاتی ہوں۔'' انیقہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''تم پانی رہنے دو...... یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔'' زرین اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''یار مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے......'' وہ بولی۔ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

زرین چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ''انیقہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کہوں، میں یہ بات کبھی نہیں کہنا چاہتی تھی مگر میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور تمہیں بتائے۔''

''کیا کہے جارہی ہو زرین...... پہلے اپنے حواس بحال کرو۔'' وہ بولی۔ عین اسی وقت اس کے ہاتھ میں موجود موبائل بجا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے زرین کو رکنے کا اشارہ کیا اور فون کان سے لگایا۔ ''ہیلو...... جی......'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی اس کا چہرہ لحہ بھر میں سفید ہوگیا، ہاتھ میں پکڑا موبائل زمین پر گر کر اس کی زندگی کے مانند بکھر گیا تھا۔

''انیقہ...... انیقہ......'' زرین نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

اس نے ایک نظر زرین کو دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں پائی۔

لمحہ بھر میں اس کی آنکھوں کے سامنے سے زرین اور غالب کے چہرے، کمرا اور وہ سارا منظر اوجھل ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''یہ نہیں ہوسکتا زرین۔'' انیقہ نے ہوش سنبھالتے ہی پہلا جملہ یہی ادا کیا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ یہ غلط ہو۔'' زرین پورے خلوص سے بولی۔ ''میں نے صبح اخبار میں گمشدہ ڈی ایس پی کی لاش برآمد کی خبر پڑھی تو میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اتنا شاندار انسان اس طرح کیسے جاسکتا ہے۔ اسی لیے میں بھاگی بھاگی یہاں آئی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم اس خبر کو سہار نہیں سکو گی۔ میں نے پولیس اسٹیشن بھی فون کیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ تم فون ریسیو نہیں کر رہیں۔''

''تم...... تم خضر کو لاش نہیں کہو گی۔'' وہ یک دم بپھر کر بولی۔

''اوکے، اوکے، تم پلیز خود کو سنبھالو۔''

''ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔'' انیقہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... مگر تم ٹھیک ہو نا...... میرا مطلب ہے چل سکو گی نا......؟'' زرین نے پوچھا۔

غالب اس دوران میں فون پر پولیس اسٹیشن سے تفصیلات معلوم کر رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ انیقہ کا وہاں چلنا فی الحال ضروری نہیں ہے۔'' وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟ پولیس والے شناخت کے لیے کال کر رہے تھے نا۔'' زرین چونکی۔

''میں نے ابھی تمام تفصیلات معلوم کی ہیں۔ انہیں لاش سمندر کے دور دراز کنارے سے ملی ہے اور اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔ اسے شناخت کرنا تو ایک طرف دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔''

''پھر...... پھر وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ...... وہ خضر ہے؟'' انیقہ کی آواز بھرّا گئی۔

''انیقہ......'' غالب اس کے قریب آکر بیٹھا اور نرمی سے اس کے کندھے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے اسے اس کی گھڑی اور انگوٹھی سے شناخت کیا ہے، میں نے وہ دونوں چیزیں یہاں منگوائی ہیں تاکہ تم انہیں پہچان سکو۔ تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ انیقہ یہ آسان نہیں ہے خصوصاً اس وقت...... مگر ہم سب کو تمہاری ذہنی قوت کی ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ لازمی طور پر خضر ہے خدانہ کرے کہ وہ ہو مگر...... وہ ہو بھی سکتا ہے۔'' وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ ''تم سن رہی ہو نا میری بات...... تمہیں رونا آرہا ہے تو تم روسکتی ہو...... بلکہ رونا اچھا ہے کبھی کبھی یہ آنسو بہت بڑی رحمت ہوتے ہیں جیسے کوکر سے نکلنے والی گیس اسے پھٹنے نہیں دیتی ویسے ہی یہ بھی غم کے اثر کو کم کرتے ہیں۔''

''مجھے نہیں رونا......'' انیقہ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''میں کیوں روؤں، مجھے پتا ہے کہ وہ خضر نہیں ہے۔ اگر وہ اس کی انگوٹھی یا گھڑی ہو بھی تب بھی یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم نے کہا نا کہ باڈی کی حالت خراب ہے۔ وہ جتنے خطرناک لوگوں سے لڑ رہا ہے وہ کسی لاش کو اس کی انگوٹھی اور گھڑی پہنا کر بھی تو پھینک سکتے ہیں سمندر میں......''

''یہ ہوسکتا ہے۔'' غالب نے سر ہلایا۔ ''مگر نہیں بھی ہوسکتا...... میں چاہتا ہوں کہ تم سارے امکان نظر میں رکھو۔''

''یہی ہوا ہے غالب، آپ کو زندگی میں ایک طرف ہونا پڑتا ہے...... دونوں امکان ساتھ لے کر چلنے والے ڈوب جاتے ہیں۔''

''اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔ زرین تم انیقہ کے ساتھ رہو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

غالب کو گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ انسپکٹر راحیل شناخت کی چیزیں لے کر آپہنچا۔

''بھائی مجھے افسوس ہے بہت، ہم سب بہت غمگین ہیں اور ان لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ یہ افسوس مت کریں۔'' انیقہ صفائی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' اس کے اس جملے کو سن کر وہ عجیب طرح سے گڑبڑا گیا۔

''میرا مطلب ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ سب خضر کا ہو۔''

''آپ دیکھیے...... یہ گھڑی اور انگوٹھی...... یہ دونوں خضر کی تھیں، ہم نے ہمیشہ انہیں یہ پہنے دیکھا ہے۔''

وہ پلاسٹک کی مخصوص تھیلی سے دونوں چیزیں نکالتے ہوا بولا۔

خضر کی گھڑی اور انگوٹھی اگلے لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ ایک لمحے کو انیقہ کو لگا جیسے اس کا دل بند ہو

جائے گا مگر اگلے ہی لمحے یقین کی آکسیجن اس کی زندگی کا سبب بن گئی۔

''کیا یہ ان کا سامان نہیں ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں، یہ ان کی ہی چیزیں ہیں مگر ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ آپ کو ملا ہے، وہ، وہی ہوں۔'' انیقہ نے بہت تحمل سے کہا۔ ''زرین میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔''

کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر جاگری تھی۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے حرکت کررہا تھا۔ انسپکٹر راحیل کا رویّہ اسے پہلے بھی عجیب لگا تھا اور اب بھی اس کا گھبرانا اور مُصر ہونا عجیب سا لگا تھا۔

اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ اس کا ذہن اب اس باڈی کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ آخر اس سارے ڈرامے کی وجہ کیا تھی؟ اور اسے اب اسی وجہ کو تلاشنا تھا۔

اگلے تین دن بہت تیزی سے گزرے تھے۔ انیقہ نے سمندر سے دریافت ہونے والی لاش کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا البتہ اس کی بے نام تدفین کا انتظام ضرور کرادیا تھا۔

زرین اور غالب عارضی طور پر اس کے گھر ہی منتقل ہوگئے تھے۔

پولیس نے انیقہ کی طرف سے سخت ردِّعمل کے باوجود خضر کی تلاش کی مہم کو تقریباً بند کردیا تھا۔ یہ ضرور کہا جارہا تھا کہ مجرمان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا مگر وہ اس رسمی اعلان سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میڈیا میں خضر کے غائب ہونے اور پھر اس لاش کے برآمد ہونے کی خبر کئی روز تک اِن رہی تھی۔ انیقہ کا موقف بھی مسلسل دکھایا جاتا رہا تھا مگر انیقہ جانتی تھی کہ اگلی بریکنگ نیوز کے ملتے ہی یہ خبر ان کے ذہنوں سے اتر جائے گی۔

اب اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ انیقہ مسلسل سوچ رہی تھی کبھی کوئی کیس نہ ہارنے والی وکیل کے سامنے اس کی اپنی زندگی کا کیس تھا اور وہ کسی بھی صورت اسے ہارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس دوران میں انسپکٹر راحیل نے اسے ایک بار فون کیا تھا اور اسے اس ثبوت کی تلاش کے بارے میں کوشش کرنے کو کہا تھا۔

انیقہ نے اسی ''ثبوت'' کو ہی نقطۂ آغاز بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

کچھ بھی کرنے سے قبل اس نے زرین اور غالب سے بات کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''زرین میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، تم نے ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا ہے مگر اس بار معاملہ کچھ الگ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ خضر کہاں ہیں؟ میں ان کی تلاش میں آخری حد تک جاؤں گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ناکامی میرا مقدر بنے اور مجھے کہیں گمنام تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑے۔ میں تم دونوں کو اس سب میں الجھانا نہیں چاہتی۔ مجھے جب ضرورت ہوگی اور ممکن ہوگا تو میں تمہیں آواز دوں گی۔'' اس سے آگے کچھ کہنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

''تو اب تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟'' زرین اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''ہم کھانے کی میز سے اٹھیں، تمہیں وِش یو گڈ لک کہیں اور اپنے گھر جائیں؟''

''زرین ناراض مت ہو، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''سمجھ لیا ہے۔'' اس بار غالب بولا تھا۔ ''زرین ہم نے بے وقوفی کی، انیقہ کو زبردستی دوست اور بہن سمجھ لیا۔ دیکھا اس نے کتنی آسانی سے ہمیں غیر کردیا۔''

''غالب......'' انیقہ کی آواز رندھ گئی۔ ''تم دونوں میرے جینے کا سہارا ہو...... میں تمہیں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

''بس...... ہوگئے بہت ڈائیلاگ...... تم نے بول دیا اور ہم نے سن لیا۔ اب یہ بتاؤ کہ پلان کیا ہے؟ اور تم کیا کرنا چاہتی ہو؟'' زرین نے گویا بات ختم کردی۔

انیقہ چند لمحے ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ''میں بہت خوش قسمت ہوں زرین......''

''میں نے کہا نا کہ کچھ نہیں سننا مجھے اور نہ ہی رونا دھونا ہے۔'' زرین اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کام کا وقت ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' انیقہ میں گویا نئی توانائی آگئی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر راحیل خاصا الجھا ہوا تھا۔

اس پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ بعض فیصلے انسان کے لیے مسلسل عذاب بن جاتے ہیں۔ سانپ کے گلے میں چھچھوندر کے مانند نہ انہیں نگلا جاسکتا ہے اور نہ اُگلا جاسکتا

ہے۔

وہ اپنے طور پر پوری کوشش کر رہا تھا مگر نتیجہ بہرحال اس کے ہاتھ میں نہیں تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کھیل میں ناکامی کا کوئی رشتے دار نہیں ہوتا۔

اسے جلد اپنی کارکردگی دکھانا تھی۔

فون کی گھنٹی کی آواز اسے سوچوں سے باہر کھینچ لائی۔ اس نے غصے سے میز پر رکھے فون کو دیکھا پھر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز کو سن کر وہ الرٹ ہوگیا۔

''جی بھابی...... میں راحیل ہی بول رہا ہوں۔ آپ بتائیں کیا آپ کو کچھ ملا؟''

''جی راحیل بھائی...... مجھے ایسا لگ رہا ہے۔'' دوسری طرف سے انیقہ بول رہی تھی۔

''آپ مجھے بتائیں، میں آکر دیکھتا ہوں۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔''

''میں آپ کو بتاؤں گی مگر فی الحال میں اسے کھول نہیں پارہی...... میں سب کچھ خود دیکھنا چاہتی ہوں اس کے بعد ہی آپ کو زحمت دوں گی۔'' انیقہ بولی۔ ''میں جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا یہ ثبوت کسی سی ڈی وغیرہ کی شکل میں ہوسکتا ہے؟'' وہ نہایت معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''بالکل...... بالکل بھابی۔ سی ڈی یا پھر یو ایس بی کی شکل میں۔'' وہ جوش میں بولا۔

''ٹھیک ہے راحیل بھائی پھر شاید یہ وہ نہیں ہے مگر میں تلاش جاری رکھوں گی۔'' یہ کہہ کر انیقہ نے فون بند کر دیا۔

انسپکٹر چند لمحے خالی الذہنی کی حالت میں فون کو دیکھتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملا کر کان سے لگالیا۔ کال شاید پہلی بیل پر ہی ریسیو کرلی گئی تھی۔

''جی...... بات شاید بن جائے...... کچھ خبر ملی ہے......''

''نہیں، فوری قدم اٹھانا خطرناک ہوگا۔'' وہ دوسری طرف سے کہے گئے جملے کے جواب میں بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں...... ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ اور فون بند کردیا۔

معاملہ اس کے ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا۔ اسے بہت جلد کچھ کرنا تھا۔

کرارے نوٹوں کی مہکتی خوشبو کی طلب اسے بے قرار کررہی تھی۔

اس نے میز پر پڑا اپنا سروس ریوالور جیب میں رکھا۔ دوسری جیب میں بڑے سیاہ ریوالور کو تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟ وہ کیا کرے گا؟'' زرین نے انیقہ کے فون رکھتے ہی پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ تو ضرور کرے گا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں دھاوا بول دے۔''

''نہیں، یہ غلطی وہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس واردات میں پھر شک اسی پر جائے گا۔'' انیقہ بولی۔

اسے انسپکٹر راحیل پر پہلے دن سے شک تھا اور امید تھی کہ ثبوت کے ملنے کی ہلکی سی بھنک اسے متحرک کردے گی اور وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرے گا جس سے ان کا راستہ ہموار ہوگا۔ اس نے اس معاملے میں جس قدر دلچسپی لی تھی، اس سے انیقہ کا شک، یقین میں بدل گیا تھا۔

اس نے خضر کی قلم والی یو ایس بی اپنے لاکر میں منتقل کردی تھی۔ خالی ہونے کے باوجود وہ یو ایس بی اس کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ ہی اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے اس کا بانکا بھی تھی اور چارا بھی۔

وہ رات ان تینوں نے خاصی بے چینی میں گزاری تھی۔ دوسرا دن بھی خاموشی سے گزر گیا تھا۔ انیقہ کے اندر توڑ پھوڑ ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اسے رہ رہ کر خضر کا خیال آرہا تھا، اس کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ خضر کو دوبارہ دیکھ پائے گی یا نہیں، یہ سوچ اسے مضطرب کیے دے رہی تھی۔

وہ دفتر سے وقت سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی وہ سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ گھر پہنچ کر کچھ دیر سونے کی کوشش کرے گی۔ شاید اس طرح اس کا تھکا ہوا مضمحل ذہن تازہ ہوجائے۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی پھر سر جھٹک کر آگے بڑھی۔

وہ چند قدم آگے بڑھی ہی تھی کہ اسے اندر اپنے بیڈ روم سے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس قدر واضح آواز تھی کہ وہ اسے اپنی سماعت کا دھوکا قرار نہیں دے سکتی تھی۔ اس آواز کے بعد یک دم خاموشی چھاگئی۔

''کون ہے وہاں؟'' انیقہ بے اختیار چلا اٹھی۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ اسے اب یقین ہوگیا تھا کہ اندر

کوئی موجود ہے اس نے دروازہ اپنی چابی سے کھولا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ جو بھی تھا، اس کے پاس اس کے گھر کی چابی موجود تھی۔

وہ لاؤنج اور اپنے کمرے کی درمیانی گزرگاہ تک پہنچ چکی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سوچا۔ اس مشکل لمحے میں اسے یک دم خضر کا خیال آیا پھر اس کی سیکیورٹی ٹپس کا ''ذرا گڑبڑ کا شک ہو تو کسی کھلی جگہ جہاں لوگ موجود ہوں وہاں پہنچو، تنہائی میں کوئی بھی شخص آسان شکار ہوتا ہے۔'' اس نے صرف ایک لمحہ سوچنے کے لیے لیا اور پھر تیزی سے باہر نکلنے کے لیے پلٹی۔

مگر وہ جو اس کے کمرے میں موجود تھا، اس کے لیے بھی وہ ایک لمحہ ہی فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچ پاتی، ایک ہاتھ کی مضبوط گرفت نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس کے عین پیچھے تھا اور اس نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اتنی سختی سے پکڑا ہوا تھا کہ اس کی سانس گھٹ رہی تھی۔

''چھوڑو...... مجھے چھوڑو۔'' وہ بمشکل بولی۔

''تمہیں غلط وقت پر انٹری نہیں دینا چاہیے تھی۔'' ایک بھرائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اور بعض غلطیاں قابلِ معافی نہیں ہوتیں۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

''کک...... کک کون ہو تم......؟ کیا چاہیے تمہیں؟''

''دیکھو اس حالت میں بھی تمہیں کتنے سوال سوجھ رہے ہیں مگر بات تم نے عقل کی پوچھی ہے۔ آخر ویسے ہی تو اتنی مشہور وکیل نہیں بن گئیں نا۔''

''چھوڑو...... چھوڑو مجھے۔'' وہ چلائی مگر اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں ہو پائی تھی۔ اس نے اپنا بھاری سیاہ ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا تھا۔

''اسمارٹ ہونا اچھی بات ہے مگر اوور اسمارٹنس صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔'' وہ اپنی گرفت کو مزید سخت کرتا ہوا بولا۔ ''لگتا ہے یہ بات تمہیں اور تمہارے اس پولیس افسر شوہر کو کسی نے نہیں بتائی...... ہاں؟''

''تم...... تم خضر کو جانتے ہو؟ کہاں ہے؟ پلیز مجھے بتاؤ۔'' وہ گڑگڑائی۔

''بتا سکتا ہوں اگر تم مجھے اس ثبوت کے بارے میں بتادو...... اس یو ایس بی کے بارے میں......''

''یو ایس بی......؟'' انیقہ بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم اس ثبوت کے بارے میں...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''مجھے معلوم تھا تم اتنی آسانی سے نہیں بتاؤ گی۔'' و:

غرایا۔ اس نے اپنی گرفت سخت کی تھی کہ ایک دم دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر غالب کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ غالباً زرین سے چابی مانگ رہا تھا۔ انیقہ اور اس شخص کی توجہ بھی اس آواز پر بھٹکی اور انیقہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹا۔ وہ کراہ کر پیچھے کی طرف مڑا۔ انیقہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ملگجی روشنی میں وہ اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی مقامی لوفر یا بدمعاش کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی ٹپکتی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں نے گویا ہونٹوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

''کہاں ہے خضر......؟'' وہ دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکی۔

وہ ابھی تک اپنا بازو جھٹک رہا تھا جس پر انیقہ کے دانتوں نے خون کی لکیر بنا دی تھی۔

انیقہ کے سوال پر اس نے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھا پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ جمایا اور اسے گھسیٹتا ہوا ڈرائنگ روم میں جا گھسا۔

اپارٹمنٹ میں بیرونی دروازے کے ساتھ ایک لابی سی تھی جس میں ایک جانب ڈرائنگ روم تھا۔ یہ لابی لاؤنج اور پھر رہائشی کمروں کی جانب لے جاتی تھی۔

انیقہ جس قدر مزاحمت کر سکتی تھی کر رہی تھی، کیونکہ اندر آنے والے لاؤنج یا بیڈ روم کی جانب جاتے، ڈرائنگ روم کی طرف ان کا دھیان فوری طور پر جانا مشکل تھا۔ وہ حملہ آور بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اسی لیے اس نے ڈرائنگ روم کی طرف رخ کیا تھا۔

''چچ چھوڑو......'' وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بالکل...... چھوڑ رہا ہوں تمہیں...... یہ لو۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ انیقہ صرف یہ دیکھ پائی کہ اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا لمبا چاقو تھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے دائیں پہلو میں اچانک گویا آگ سی اتر گئی۔ اس کے ہاتھ خود کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے پہلو تک پہنچے اور اپنے ہی خون میں لتھڑ گئے۔ وہ شاک کی حالت میں کبھی خود کو اور کبھی اس حملہ آور کو دیکھ رہی تھی۔ چاہنے کے باوجود اس کے ہونٹوں سے آواز برآمد نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔

اسی وقت غالب اور زرین گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے کمرے میں جاتے ہی وہ حملہ آور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ یقیناً وہ لمحہ بھر میں اپارٹمنٹ اور پھر بلڈنگ سے باہر نکل جانے والا تھا۔ انیقہ کے پاس خضر تک جانے والے راستے کا یہی واحد سراغ تھا مگر وہ کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ تیزی سے بہتا خون اس کی تمام تر توانائیاں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ صرف اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی جگہ سے حرکت کی اور کھسکتے ہوئے سینٹر ٹیبل کو دھکا دینے کی کوشش کی...... پہلی کوشش میں وہ میز کو ہلا نہیں پائی لیکن دوسری کوشش میں ایش ٹرے اور اس پر رکھا گلدان زوردار آواز کے ساتھ زمین پر جا گرے۔

''ڈرائنگ روم میں کون ہے؟'' زرین کی آواز پر انیقہ نے اطمینان کی سانس لی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' غالب نے جواب دیا پھر تیزی سے آتے قدموں کی آوازیں کمرے کی جانب بڑھیں۔ انیقہ کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔

غالب پہلے کمرے میں داخل ہوا تھا، وہ فرش پر پڑی انیقہ اور اس کے اردگرد پھیلے خون کو دیکھ کر ایک لمحے کو ساکت سا ہو گیا۔

''انیقہ...... ارے...... یہ کیا ہوا...... زرین کال ایمبولینس فوراً۔'' وہ زور سے چلایا۔

''کیا ہوا......؟'' اس کی آواز کے ساتھ ہی زرین اندر داخل ہوئی۔

''انیقہ...... اوہ میرے خدا......'' وہ اسے دیکھ کر دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

''زرین......'' انیقہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ ''وہ بھاگ رہا ہے...... وہ...... اسے خضر کے بارے میں معلوم ہے...... اسے پکڑو...... اسے پکڑنا پڑے گا۔''

''سب کچھ بعد میں انیقہ......'' زرین روتے ہوئے بولی۔ غالب اس دوران میں ایمبولینس بلا چکا تھا۔

انیقہ نے مایوسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جو بھی تھا یقیناً اتنی دیر میں کہاں سے کہاں نکل گیا ہوگا۔

اگلے دو دن انیقہ نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں گزارے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹرز کے مطابق چاقو کا وار اوچھا پڑا تھا جس سے کوئی بھی اعضا خطرناک طور پر متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی خون کے زیادہ بہہ جانے اور زخم کی وجہ سے انیقہ کی حالت خراب تھی۔ جسمانی حالت سے زیادہ مسئلہ اس کے ذہنی اسٹریس کا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے سکون اور خواب آور ادویات کے انجکشن دیے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی جاگتی، زرین کو اپنے پاس دیکھتی۔ اس سے شکوہ کرتی

کہ اس نے اس آخری کلیو کو بھی گم کر دیا۔ کبھی خضر سے معافیاں مانگتی، تیسرے دن وہ کچھ سنبھل پائی تھی۔ اسی روز اس کا بیان بھی ریکارڈ ہو گیا تھا۔ اس نے حملہ آور کا حلیہ بھی تفصیل سے بیان کر دیا تھا۔

ڈاکٹرز کے مطابق اس کا زخم بہت بہتر حالت میں تھا مزید تین سے چار دن میں اس کے ٹانکے خود ہی تحلیل ہو جانے والے تھے۔ چوتھے دن وہ گھر آ گئے تھے۔ غالب نے اس دوران اپارٹمنٹ کے تالے تبدیل کروا دیے تھے۔ سیکیورٹی کا انتظام بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ دروازے پر ایک گارڈ بھی تعینات کر دیا گیا تھا۔

انیقہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے کسی چیز کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بس سوچے جا رہی تھی۔

''کیوں اتنی چپ ہو تم؟'' بالآخر زرین سے نہیں رہا گیا تھا۔ ''مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم اپنی ہمت کھوتی جا رہی ہو؟''

''زرین مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس بات کا ڈر......؟''

''کیا میں کبھی خضر کو ڈھونڈ پاؤں گی؟ اس نے مایوسی سے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''ہاں......'' زرین مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اگر اللہ کی رضا ہوئی تو......''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' انیقہ دھیرے سے بولی۔

''انیقہ تمہاری امی تم سے بہت محبت کرتی تھیں نا......؟'' زرین نے اچانک پوچھا۔

''امی...... ہاں، امی کی جان تھی مجھ میں۔ میری ہر خواہش، ہر تمنا...... حتیٰ کہ جو میں سوچتی تھی نا...... امی وہ بھی کرتی تھیں میرے لیے۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی تھی کہ امی کو ٹیلی پیتھی آتی ہے۔ خود ہی سمجھ جاتی تھیں سب کچھ......'' وہ سوچوں میں کھو گئی۔

''تم کو معلوم ہے نا کہ اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں جتنی محبت کرتا ہے؟'' زرین نے دوسرا سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس بار انیقہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

''پھر کیسے وہ اپنے کسی بھی بندے کی جائز تمنا پوری نہیں کرے گا۔ بس وہ کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو...... ہماری صرف وہ تمنائیں اور دعائیں پوری نہیں ہو پاتیں جو ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوتیں کیونکہ جو وہ پاک پروردگار جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے اور پھر بھی اگر کسی بھی وجہ سے کوئی دعا پوری نہیں ہو پاتی تو بھی ہمارا عظیم رب اپنے بندے کی کوشش کو ضائع نہیں ہونے دیتا، اسے نیکی بنا کر ہمارے حساب میں تحریر کر دیتا ہے جو اس روز ہمارے کام آئے گی جب ایک ایک نیکی انمول ہوگی اور جس کا رب اتنا رحیم ہو، کیا وہ کسی بھی پریشانی میں ہمت ہارتا اچھا لگتا ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' انیقہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''سوری اللہ میاں۔'' اس کے ذہن و دل پر چھا جانے والے مایوسی کے جالے گویا ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اسے خضر کی بہت فکر تھی مگر اس احساس نے کہ ستر ماؤں جتنی محبت کرنے والا رب خضر کے ساتھ ہے...... اس کی تکلیف بہت حد تک کم کر دی تھی۔

☆☆☆

اگلے تین چار دن سست روی سے گزرے تھے۔ انیقہ کا زخم تیزی سے بھر رہا تھا۔ ڈاکٹرز اور زرین کی کوششوں سے اب وہ چلنے پھرنے لگی تھی۔ اس کے زخمی ہونے کی خبر ایک بار پھر ڈی ایس پی خضر ابراہیم کی گمشدگی کے معاملے کو میڈیا میں زندہ کر گئی تھی۔ کئی لوگوں نے اس سے رابطے کی کوشش بھی کی تھی۔ حتیٰ کہ ایک اپوزیشن پارٹی کی طرف سے اس حوالے سے واک کی آفر بھی کی گئی تھی مگر انیقہ فی الحال کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے نئے سرے سے اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

''تو تم یہ مشہور کرنا چاہتی ہو کہ وہ یو ایس بی تم کو مل گئی ہے؟'' زرین نے پوچھا۔

''ہاں...... کیونکہ اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے ہمارے پاس......''

''مگر اس طرح وہ تم پر دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔'' زرین نے گویا خبردار کیا۔

''ہاں مگر ہم اس کے لیے تیار ہوں گے اس بار......'' غالب بولا۔ ''اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی حقیقی کلیو یا راستہ مل جائے۔''

''جی میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ جب تک ان میں سے کوئی سامنے نہیں آتا، ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' انیقہ بولی۔ ''ہاں غالب، پولیس کو اس حملہ آور کے حلیے سے کوئی پہچان ملی؟''

''نہیں، انہوں نے اسکیچ سے کوشش کی ہے مگر وہ کوئی عادی مجرم یا کم از کم کوئی ایسا مجرم نہیں ہے جس کا ریکارڈ موجود ہو۔'' غالب بولا۔

''اچھا...... پھر ہم یہی کرتے ہیں۔'' انیقہ نے جواب دیا۔

''تو تم یہ خبر کس طرح پھیلاؤ گی؟'' زرین نے پوچھا۔

''کسی میڈیا پر انٹرویو دے کر...... کل ر خود بھی کوشش کریں گے کہ یہ چیز دیکھیں'' انیقہ نے جواب دیا۔

''اچھا...... کوئی دوسرا راستہ تو ہے نہیں۔'' زرین کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ہاں زرین کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔'' انیقہ مضبوط لہجے میں بولی۔ مگر اگلی ہی صبح انہیں دوسرا راستہ مل گیا تھا۔

رات وہ تینوں ہی بہت دیر تک جاگتے رہے اس لیے صبح دیر تک سوتے رہے۔ انیقہ کی آنکھ فون کی تیز آواز سے کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ پہلے اس نے فون کو نظر انداز کرنے کے بارے میں سوچا پھر اسے یاد آیا کہ کل سے فون کا فائر آئی ڈی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔ نہ جانے یہ کس کا فون ہو اور مس ہو جائے۔ یہی سوچ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا۔

''انیقہ خضر ابراہیم۔'' دوسری طرف سے پھنسی پھنسی آواز میں اس کا پورا نام لیا گیا۔

''جی میں بول رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم ڈی ایس پی خضر ابراہیم کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟'' اس سوال نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ حواسوں پر سے نیند کی دھند یک دم مٹا ڈالی تھی۔

''بالکل...... میں جاننا چاہتی ہوں وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اور...... اور آپ کون ہیں؟''

''میں تمہارا ہمدرد ہوں اور تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ اس بار لہجہ پہلے سے زیادہ سرد تھا۔ ''میں تمہیں صرف ایک ٹپ دے سکتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگر تم واقعی اس کو ڈھونڈنا چاہتی ہو تو تم کو سید پور جانا چاہیے۔'' ان جملوں کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔

''ہیلو...... ہیلو...... میری بات تو سنو۔'' انیقہ فون بند ہونے کے بعد بھی اضطراری طور پر بولی تھی پھر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے بیٹھی سوچتی رہی۔

یہ کوئی چال بھی ہو سکتی تھی اور پھندا بھی مگر اسے کسی بھی حال میں خضر تک پہنچنا تھا اور اس کے لیے اسے جاننا تھا کہ اس کی گمشدگی کی وجہ کیا ہے؟

وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اسے غائب کیا ہے؟

اور وہ کیا چاہتے ہیں؟

وہ جدید دور کی شہزادی تھی جس کے پاس اپنے سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے کسی حاتم طائی کی سہولت موجود نہیں تھی۔

اسے تاریک راستے کا سفر خود طے کرنا تھا اور پھر وہیں سے منزل کا نشان بھی ڈھونڈنا تھا۔

اور اس سب کے لیے اسے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔

☆☆☆

سید پور شہر سے ڈھائی سو کلومیٹر کی مسافت پر ایک چھوٹا مگر جدید سا شہر نما قصبہ تھا۔ یہاں کا بہتر موسم اور میلوں پر پھیلا سفاری پارک لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ انیقہ، زرین اور غالب دوپہر کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ گاڑی کے ذریعے سفر نے ان کی چولیں ہلا دی تھیں۔ شہر کے بہترین ہوٹل میں ان کی بکنگ تھی۔ طے یہی پایا تھا کہ تھوڑا آرام کر کے باہر نکلا جائے گا۔

''ہم یہاں تو پہنچ گئے مگر اب ہم کریں کیا؟'' وہ تینوں انیقہ کے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔

''انتظار...... یہی ہمارا آپشن نمبر 1 بھی ہے۔ دو بھی اور تین بھی۔'' غالب سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''وہ ہمدرد یقیناً ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوگا اور رابطہ بھی کرے گا۔''

''یہ تو ہوا آڈینس پول...... مگر ایکسپرٹ رائے کی تو ضرورت پڑے گی نا۔'' زرین، انیقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''تم دونوں اپنا یہ کون بنے گا کروڑ پتی بند کرو۔'' انیقہ مسکرائی۔ غالب ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے بھی یہی امید ہے مگر ہم یہاں بیٹھ کر انتظار نہیں کریں گے، ہمیں باہر نکلنا ہو گا...... یہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہاں ایسا کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے...... ایک بات بتاؤ، انیقہ کیا تم اور خضر پہلے یہاں کبھی آئے ہو یا پھر اس نے کبھی تم سے سید پور کا ذکر کیا ہو؟'' غالب نے پوچھا۔

''نہیں، آئے تو کبھی نہیں اور نہ ہی خضر نے کبھی ذکر کیا۔'' انیقہ سوچتے ہوئے بولی۔ پھر یک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''ممتاز شاہ۔'' وہ اچانک زور سے بولی۔

''کون ممتاز شاہ......؟'' زرین نے پوچھا۔

''ایک بار سید پور کے حوالے سے خضر نے کسی ممتاز شاہ کا نام لیا تھا۔ اس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔''

''یہ بھی بہت ہے، ہم پتا کرتے ہیں کہ ممتاز شاہ کون

ہے؟ شاید اس سے کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔'' غالب نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''اور ہاں غالب تمہیں کمشنر صاحب نے جو نمبر دیا تھا، اس سے بات بھی کرنی ہے۔'' انیقہ نے یاد دلایا۔ سید پور کے لیے نکلنے سے قبل انیقہ پولیس کمشنر جلال الدین سے بات کر کے نکلی تھی۔ پہلے تو انہوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی اور اس کے نہ ماننے پر سید پور پولیس اسٹیشن کے افسر کا فون نمبر وغیرہ دیا تھا اور ان کو پابند کیا تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر ان کے حوالے سے اس سے رابطہ کر لیں تاکہ بوقتِ ضرورت وہ انہیں فوری طور پر مدد فراہم کر سکیں۔ انیقہ نے دبے لفظوں میں انسپکٹر راحیل کے بارے میں اپنے تحفظات سے بھی انہیں آگاہ کیا تھا۔

''اوکے...... آئی وِل سی دس (میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں)۔'' وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

''جی میڈم...... میں نے بات کر لی ہے انسپکٹر کامران سے...... اس نے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ ہاں اسی سے ممتاز شاہ کے بارے میں کیوں نہ پوچھا جائے؟''

''نہیں۔'' انیقہ کچھ سوچ کر بولی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے ان تینوں کو متوجہ کر لیا تھا۔

''یس......'' غالب نے دروازہ کھولا تو ویٹر برتن لینے آیا تھا۔

''تم یہاں ممتاز شاہ نامی کسی صاحب سے واقف ہو؟'' انیقہ نے یکلخت ویٹر سے پوچھا۔ ''ہم سے ان کا ایڈریس کھو گیا ہے۔''

''شاہ جی...... کو...... یہاں سید پور میں کون نہیں جانتا بی بی صاب......'' وہ بولا۔ ''وہ تو بادشاہ ہیں یہاں کے۔''

''کیا مطلب؟''

''ان کی بہت زمین ہے سید پور میں اور اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔ ہمیشہ وہ ہی جیتتے ہیں۔'' وہ گویا ان کی کم علمی پر افسوس کرتا ہوا بولا۔ ''ان کا سفید محل یہاں سید پور میں بہت مشہور ہے اور جو لوگ گھومنے پھرنے آتے ہیں، وہ بھی باہر سے اس کی تصویر ضرور بناتے ہیں۔''

''اندر سے کیوں نہیں؟'' زرین نے پوچھا۔

''سفید محل میں داخل ہونا آسان کام نہیں ہے۔ شاہ جی بلائیں تو الگ بات ورنہ وہاں سخت پہرا ہوتا ہے، کتے بھی ہیں اور سنا ہے رات کو کرنٹ بھی لگا دیتے ہیں تاروں میں۔'' ویٹر نے رازداری سے مطلع کیا۔

''اچھا...... بھئی بڑے لوگ بڑی باتیں۔'' غالب اس کے ہاتھ میں ٹپ کا نوٹ رکھتے ہوئے بولا۔ ''لو بھئی مل گئیں معلومات...... مجھے نہ جانے کیوں لگ رہا ہے کہ یہ بادشاہ صاحب ہی ہماری منزل ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان تک کیسے پہنچا جائے۔''

زرین بولی۔ ''کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔''

انیقہ بڑبڑائی۔ ''ہمیں سوچنا ہوگا کوئی ایسا طریقہ جس سے اسے ہم پر شک بھی نہ ہو۔''

مگر انہیں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

☆☆☆

اسی شام انہیں ممتاز شاہ کا خود ہی فون آ گیا تھا۔

''انیقہ بی بی میں ممتاز شاہ بول رہا ہوں۔ آپ ہمارے علاقے میں تشریف لائی ہیں ہماری طرف سے خوش آمدید......'' اس کے لہجے میں جاگیردارانہ طنطنہ موجود تھا۔

''آپ کا بہت شکریہ شاہ صاحب...... ویسے آپ کو میری آمد کا کیسے علم ہوا؟'' انیقہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاہا...... میں نے کہا نا یہ ہمارا علاقہ ہے یہاں پرندہ بھی ہماری مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتا۔ ویسے مذاق سے ہٹ کر کمشنر صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ

جدید کترنیں

☆ تعلیم حاصل کرو چاہے تمہیں اسکول کیوں نہ جانا پڑے۔

☆ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ کے قدموں اور آنکھوں ''تلے جنت 2'' ہے۔

☆ آج کا کام کل پر چھوڑو کیا خبر کہ کل اس کام کو کرنے کے لیے کوئی مشین ایجاد ہو جائے۔

☆ غیبت کرنے والے کبھی اکیلے نہیں ہوتے، ان کے ساتھ پورا محلہ ہوتا ہے۔

☆ بعض خوشیاں بغیر خواہش کے بھی تو مل جاتی ہیں جیسے سگریٹ کی بھری ڈبیا راستے میں مل جائے۔

☆ کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کے لیے کیا خوب کہا۔ ''تم خوب صورت ہو بلا کی اور کسی بلا سے کم نہیں۔''

تباہی

☆ وہ شخص اپنی قوم پر تباہی لاتا ہے جو کبھی بیج نہیں بوتا، نہ کبھی تعمیری اینٹ کو اٹھا کر اینٹ پر رکھتا ہے اور نہ کوئی کپڑا ابنتا ہے لیکن سیاست کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔

☆ سفیر اپنے ملک کی ''آنکھ'' اور ''کان'' ہوتا ہے۔

مرحا گل، درابن کلاں

خضر صاحب کی اہلیہ یہاں آئی ہے، خیال رکھنے کو کہا ہے۔ خضر ہمارا دوست تھا۔ اس حوالے سے آپ بہت محترم ہیں۔''

''تھامت کہیے شاہ صاحب......'' وہ بات کاٹ کر بولی۔

''مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ...... چلیے چھوڑیے اس بات کو...... اللہ کرے ایسا ہی ہو آپ یہ بتایئے کہ آپ کل کس وقت ہمارے غریب خانے پر تشریف لا رہی ہیں؟''

''سفید محل پر......؟'' انیقہ بے اختیار بولی۔

''ارے واہ آپ کو ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''جی ہاں، سفید محل...... یہاں کے لوگ اسے سفید محل ہی کہتے ہیں تو پھر صبح کتنے بجے گاڑی بھیجوں؟''

''گاڑی ہے ہمارے پاس، ہم خود آجائیں گے، آپ بتایئے آپ کس وقت فارغ ہیں؟'' انیقہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''یوں کریں کہ کل لنچ ہمارے ساتھ کریں۔ آپ بہت قابل وکیل ہیں۔ کمشنر صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔''

''یہ تو ان کی کرم فرمائی ہے...... ٹھیک ہے میں اپنے دونوں دوستوں کے ہمراہ کل بارہ تک آپ کی طرف پہنچتی ہوں۔''

''ضرور...... آپ کے دوست ہمارے خاص مہمان ہیں چشم ما روشن دل ماشاد...... یوں بھی ہماری مہمان نوازی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔'' وہ قدرے تکبر سے بولا۔

فون بند ہونے کے بعد انیقہ چند لمحوں تک آنکھیں بند کر کے اس آواز کو یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی جس نے خود کو ہمدرد قرار دیا تھا مگر وہ آواز ممتاز شاہ کی آواز سے یکسر مختلف تھی۔

''تو ہم کل جا رہے ہیں...... یہ اچھا ہوا جو اس کی خود کال آگئی۔'' زرین بولی۔

''ہاں، مگر ایک بات قابلِ غور ہے کمشنر صاحب نے اسے انیقہ کے بارے میں بتایا...... نہ جانے کیوں اس وقت مجھے تمام ہی لوگ مشکوک نظر آ رہے ہیں۔'' غالب نے سر جھٹکا۔

''کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہے۔'' انیقہ بولی۔

''بہرحال جو بھی ہوگا، سامنے آجائے گا۔''

شام تک انہوں نے انسپکٹر کامران سے ملاقات کی۔ تھوڑی دیر کے لیے پارک میں چکر لگایا اور پھر ہوٹل واپس آگئے۔

انسپکٹر کامران بہت اچھے مزاج کا تعاون کرنے والا پولیس افسر تھا۔ اس کا شمار اچھے فرض شناس پولیس افسران میں ہوتا تھا۔ اس نے انہیں نہ صرف اپنے دفتری بلکہ ذاتی نمبر بھی دے دیے تھے اور پورا یقین دلایا تھا کہ دن و رات کے کسی بھی لمحے کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں وہ لمحوں میں ان تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

''خضر ابراہیم کو میں اور مجھ جیسے میرے کئی ساتھی اپنے رہنما کی طرح دیکھتے آئے ہیں' ان جیسے افسر پولیس فورس کی شان ہیں اور ان کے لیے کچھ کر کے مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔''

انیقہ خود کو خاصا تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی اس لیے وہ جلد ہی کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سوتی رہی تھی۔

اس کی آنکھ موبائل کی بیل سے کھلی تھی۔ اسکرین پر ایک نامعلوم نمبر چمک رہا تھا۔ پہلے انیقہ نامعلوم نمبر سے کم ہی فون اٹھایا کرتی تھی۔ اس کے کلائنٹس جانتے تھے کہ کسی ایمرجنسی سے ہٹ کر کال سے پہلے کیا گیا ایس ایم ایس رابطے کے لیے زیادہ کارگر ثابت ہوتا تھا۔ وہ ایس ایم ایس دیکھ کر انہیں خود ہی کال کر لیا کرتی۔ مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔ اب تو وہ کال اس امید سے اٹھاتی تھی کہ شاید خضر کے بارے میں کوئی خبر مل جائے، اس نے کال ریسیو کر لی۔

اس کے ہیلو کے جواب میں دوسری جانب خاموشی رہی تھی پھر کسی کا طویل قہقہہ سنائی دیا تھا۔ اس ہنسی میں اتنی سفاکی تھی کہ ایک لمحے کو انیقہ کا دل لرز سا گیا۔

''کون ہو تم؟ کیوں فون کیا ہے؟'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''میں تمہارا ہمدرد ہوں وکیل صاحبہ......'' بالآخر وہ بولا۔

''ہمدرد اس طرح گمنام نہیں رہا کرتے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں یہاں آگئی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔ ویسے تم جانتی ہو نا کہ اکثر مہمان آتے تو اپنی مرضی سے ہیں مگر واپس اپنی مرضی سے نہیں جا پاتے جیسا کہ تمہارا شوہر خضر بے چارہ......'' وہ تحقیر بھرے انداز میں بولا اور پھر وہی شیطانی ہنسی دوبارہ سنائی دی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم......؟'' انیقہ کا غصہ اس کے خوف پر حاوی ہو گیا تھا۔

”ارے...... رے ناراض مت ہو وکیل صاحب! میں نے تو تمہیں خبردار کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ بہت زیادہ ہوشیار۔“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور پھر لائن بے جان ہو گئی۔ انیقہ نے موبائل نیچے رکھا تو اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔

اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

کیا وہ کسی ٹریپ کا شکار ہو گئی تھی؟

کیا وہ خضر تک پہنچ بھی پائے گی؟

اور سب سے اہم سوال جو اس کا اصل خوف تھا اور جس کے بارے میں گفتگو تو ایک طرف وہ سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی وہ یہ تھا کہ خضر کہاں تھا؟

اور...... وہ تھا بھی کہ نہیں......؟

☆☆☆

سفید محل واقعی کسی محل سے کم نہیں تھا۔ قدیم طرزِ تعمیر کی شاہکار اس حویلی پر کیا گیا سفید رنگ اور پھر سرخ کھپریل نے اسے قابلِ دید بنا دیا تھا۔ فرش ماربل سے بنا تھا یعنی کہ ستونوں تک کو ماربل سے سجایا گیا تھا۔ گیٹ سے اندرونی دروازے تک پہنچنے میں انہیں کئی منٹ لگے تھے۔ اس لمبے سے پورچ وے پر کم از کم پندرہ سے بیس گاڑیاں کھڑی کی جاسکتی تھیں اس کے ساتھ ہی خوب صورت باغ نما لان تھا۔

محل کی اندرونی سجاوٹ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جس ہال نما کمرے میں انہیں پہنچایا گیا تھا، وہ قیمتی اینٹک سجاوٹ اور جدید فیشن کا مکسچر نظر آرہا تھا۔ دیواروں پر مختلف سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں کے ساتھ تصاویر کے گروپس لگے تھے۔

”واقعی یہ گھر کے علاوہ سب کچھ ہے۔“ زرین نے بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”محل، میوزیم، باغ......“

”ہُم......“ غالب مسکرایا۔

انیقہ باریک بینی سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک لمبا اور بھاری جسامت والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔

”خوش آمدید...... معزز مہمانوں کا سفید محل میں سواگت ہے، میں ممتاز شاہ ہوں اور یہ میرا چھوٹا بھائی مکرم شاہ......“ وہ انیقہ اور زرین کے سامنے سر کو ہلکا سا خم کرتے ہوئے بولا۔

وہ خاصی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ سانولی رنگت، موٹی موٹی سیاہ آنکھوں، چہرے پر موجود گھنی داڑھی اور لمبی مونچھوں نے اس کے جاگیردارانہ لُک کو تقویت دی تھی۔

اس کا بھائی مکرم شاہ اپنے بھائی سے بالکل الٹ نظر آرہا تھا۔ اس کی رنگت خاصی صاف تھی۔ ہلکی سی داڑھی، چمکتی ہوئی تیز طرار آنکھیں اور چہرے پر مسکراہٹ موجود تھی۔

”شکریہ، بہت خوب صورت محل ہے آپ کا...... اور بہت بڑا بھی......“ انیقہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں انیقہ خضر ہوں اور یہ زرین اور غالب، میرے قریبی دوست۔“

”بہت بہت خوشی ہوئی کہ آپ لوگ آئے۔ خضر سے میری ملاقات رہتی ہے، بہت قابلِ پولیس افسر......“ وہ کچھ بولتے بولتے رکا شاید اسے انیقہ کی تنبیہ یاد آگئی تھی۔ ”ہے وہ...... بھروسا مند اور ایمان دار...... کمشنر صاحب بہت تعریف کرتے ہیں اس کی...... رب کرے کہ وہ جلد مل جائے۔“

”آمین......“ انیقہ نے جواب دیا۔

ممتاز شاہ نے انہیں بتایا کہ ایک موقع پر خضر نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ اسے نقصان پہنچنے سے بچایا تھا اور وہ اس حوالے سے اس کے احسان مند رہے ہیں اور یہ کہ وہ انیقہ کی ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہیں۔

کھانا بہت پُرتکلف تھا مگر کھانے کے بعد حویلی کی سیر نے سب کچھ ہضم کر دیا تھا۔ حویلی بہت شاندار تھی، سب سے بڑا کمال یہ تھا ممتاز شاہ نے اسے بہت اچھی طرح مین ٹین کر رکھا تھا۔ اس کے بہت سے حصے تو ایسے تھے جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہی نہیں تھا کہ یہ کسی سو سال سے زیادہ قدیم حویلی کا حصہ ہیں۔ ایک خاصے بڑے ہال کو جم کی شکل دی گئی تھی۔ جہاں جدید مشینیں موجود تھیں۔

تین گھنٹوں بعد وہ واپسی کے لیے نکلے۔

”بہت اچھا کیا کہ آپ لوگ حویلی آئے، جب جی چاہے یہاں آئیے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ بلکہ ہمارے اس محل کے ہوتے آپ کو ہوٹل میں ٹھہرنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟“ ممتاز شاہ انہیں رخصت کرتے ہوئے بولا۔

”شکریہ شاہ صاحب، وہ بھی تو آپ کے شہر کا حصہ ہے۔“ انیقہ مسکرائی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ اپنے بائیں کان کی لو مسلتا ہوا بولا۔ ”میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو بس ایک کال کریں کسی تکلف کے بغیر۔“ وہ بولا۔

”بہت مہربانی......“ انیقہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔

مکرم شاہ اس پوری ملاقات میں پس منظر میں رہا تھا مگر واضح طور پر وہ خاصے دوستانہ مزاج کا حامل نظر آرہا تھا۔ ممتاز شاہ کے مقابلے میں وہ خاصا تعلیم یافتہ تھا اور کاروبار کر رہا تھا۔

”کیا کہتی ہو تم اس ممتاز شاہ کے بارے میں؟“ راستے میں غالب نے انیقہ سے پوچھا۔

”خطرناک...... خطرناک آدمی ہے، با اثر ہے، پیسے والا ہے اور شاہانہ مزاج کا شخص ہے۔ ویسا ہی جیسے ہمارے 90 فیصد جاگیردار ہوتے ہیں۔“ انیقہ نے جواب دیا۔ ”وہ جتنا ملنسار اور مہمان نواز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، ویسا ہرگز نہیں ہے۔“

”ہاں...... سچ کہہ رہی ہو، اس کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ صرف حکم دینے کا عادی ہے۔ اس کا بھائی البتہ خاصا مختلف ہے۔“ زرین بولی۔

”مگر وہ بڑے بھائی سے خاصا دبتا ہے۔“

”ظاہر ہے جب بڑا بھائی ڈان ہو تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔“ زرین بولی۔

انیقہ مسکرائی۔ اس نے اب تک ان دونوں کو رات والی فون کال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممتاز شاہ سے ملاقات کے دوران اس نے اسے جتا دیا تھا کہ وہ وہاں خضر کی تلاش میں آئی ہے اور اب جلد ہی اس تک پہنچنے والی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اگر اس سب کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے تو وہ جلد از جلد کوئی قدم اٹھائے۔

”مگر سید پور ہی کیوں؟ آپ کو ایسا کیوں لگا ہے کہ یہاں سے آپ کو خضر کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”کیونکہ...... مجھے کچھ ثبوت ملے ہیں اور ان کی روشنی میں، میں یہاں تک آئی ہوں۔“ اس نے ان جملوں پر اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تھا مگر وہاں وہی بے پروائی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کو اس پورے معاملے کی کوئی خبر نہ ہو یا پھر...... وہ بہت اچھا اداکار تھا۔

بہرحال وہ اپنا کام کر آئی تھی۔ اگر خضر کی گمشدگی کا کوئی تعلق ممتاز شاہ سے تھا تو اس کی ان باتوں کے بعد اس کی توجہ ان پر ہونی چاہیے تھی اور یوں حقیقت کھلنے کی امید کی جاسکتی تھی۔

رات گئے تک اس کے ذہن سے اس فون کال کا تاثر زائل نہیں ہوا تھا۔ وہ شیطانی ہنسی اس کے حواسوں پر سوار تھی۔ اس نے گفتگو کے دوران میں ممتاز شاہ کی آواز اور لہجے پر خاصا دھیان دیا تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ فون اس نے نہیں کیے تھے مگر اس جیسے شخص کے لیے کسی سے فون کروانا کیا مشکل تھا۔

وہ ہمدرد کون تھا؟ اور کیوں اس کے ساتھ چوہے بلّی والا کھیل کھیل رہا تھا؟ اس سب سے اُسے کیا حاصل تھا؟ وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

اگلا روز خاموشی سے گزر گیا۔

انہوں نے کچھ لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ انسپکٹر کامران سے بھی بات ہوئی تھی۔ گزشتہ ایک ماہ میں کسی نے بھی خضر کو سید پور میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ انتظار یونہی بہت مشکل ہوتا ہے پھر ایک ایسا انتظار جس میں کسی بھی بات کے ہونے کا کوئی یقین یا ٹائم فریم یا پلان موجود نہ ہو، اعصاب کو توڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس نے شام میں غالب اور زرین کو بہت اصرار کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے بھیجا تھا۔ وہ تو اسے بھی ساتھ لے جانے پر مُصر تھے مگر وہ درحقیقت تھکن محسوس کر رہی تھی اس لیے اس نے آرام کرنا مناسب سمجھا تھا۔

”تم لوگوں کو گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوٹل میں محفوظ ہوں۔ یوں بھی میں آرام کرنا چاہتی ہوں، تم لوگ جاؤ تھوڑا ریلیکس کرو۔“ وہ ان کے اصرار پر حتمی انداز میں بولی تھی۔

ان کو گئے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا، مختصر سے آرام کے بعد انیقہ خود کو قدرے فریش محسوس کر رہی تھی جب مکرم شاہ کی کال آئی۔

”میڈم...... بھائی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

”شاہ صاحب...... کب......؟“

”ابھی......؟“ مکرم شاہ نے جواب دیا۔

”ابھی...... اسی وقت...... مگر اس وقت تو زرین وغیرہ باہر ہیں، میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم صبح مل لیں؟“

”اصل میں وہ صرف آپ سے ہی ملنا چاہتے ہیں۔“ وہ کچھ ہچکچاتا ہوا بولا۔ ”انہیں شاید خضر صاحب کے حوالے سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے اور وہ چاہ رہے ہیں کہ ابھی وہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہو...... اگر انہیں کل تین چار روز کے لیے شہر سے باہر نہ جانا ہوتا تو میں خود آپ کو کل ہی

کال کرتا۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''اوہ...... اگر ایسی بات ہے تو میں آرہی ہوں۔'' خضر کا نام سن کر انیقہ کھڑی ہوگئی۔

''میں نے آپ کے لیے گاڑی بھیج دی ہے۔ آپ تشریف لے آیئے۔ بھائی صاحب نے کہا ہے کہ فی الحال اس ملاقات کو راز ہی رکھیے گا۔'' مکرم شاہ نے گفتگو مکمل کر کے فون بند کر دیا۔

انیقہ پانچ منٹ میں تیار ہوگئی تھی۔ بالآخر انتظار کے بادل چھٹے تو تھے۔ معاملہ کچھ آگے بڑھا تھا۔ باقی رہا سوال خطرے کا تو وہ تو خطرے کا سامنا کرنے کے لیے ہی یہاں آئی تھی۔

اس نے غالب اور زرین کو کال کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر شاید وہ کسی ایسی جگہ تھے جہاں سگنل کم یا ناپید تھے۔ ریسپشن سے گاڑی آنے کی اطلاع پر اس نے ان دونوں کو اپنا پروگرام ایس ایم ایس کر دیا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی سے پریشان ہو جائیں اور پھر پروگرام پلان دیے بغیر جانا بھی غلط تھا۔

وہ اب خضر کی طرح سوچنے لگی تھی۔ سیکیورٹی ٹپس کے مطابق کسی نہ کسی کو آپ کی نقل و حرکت کا سارا علم ہونا چاہیے۔ اس کے کانوں میں خضر کی آواز گونجی تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

سیاہ چمک دار گاڑی کی آرام دہ نشست پر بیٹھنے تک وہ متضاد سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ صحیح کر رہی تھی یا غلط...... یہ وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے یہ معلوم تھا کہ وہ شاید اپنی منزل کے قریب آرہی تھی۔

☆☆☆

جب وہ سیاہ کار سفید حویلی کے عالی شان گیٹ میں داخل ہوئی، اندھیرا چھا چکا تھا۔ آسمان پر پورا چاند اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔

پورا چاند یا ماہِ کامل جو زمین پر بسنے والوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے کی پُراسرار طاقت رکھتا تھا۔ جوار بھاٹا چاہے سمندروں میں ہو یا انسانی ذہن و دل میں، چاند سے کسی نہ کسی طرح جڑے ہوتے ہیں۔

پورے چاند کی رات سمندر بے قابو ہو جاتے ہیں تو انسان جو خود 70 فیصد پانی سے کشید ہے، اس سے کیسے بچ سکتا ہے مگر انیقہ اس وقت نہ تو چاند کو دیکھ پائی تھی نہ اس کی چمکتی چاندنی کو...... اس کا ذہن مسلسل خضر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس بار اسے ایک قدرے چھوٹے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی مکرم شاہ کمرے میں داخل ہوا۔

''بھائی صاحب بس آرہے ہیں۔'' سلام دعا کے بعد اس نے ادب سے بتایا۔ ''اصل میں ان کے کوئی سیاسی دوست اچانک آگئے ہیں وہ ان کو رخصت کر کے آیا ہی چاہتے ہیں۔ آپ اس دوران چائے لیں گی یا کافی؟''

''کافی ٹھیک رہے گی۔'' انیقہ بولی۔ اسے ممتاز شاہ کا شدت سے انتظار تھا۔ بلی تھیلے سے باہر آنے ہی والی تھی۔ کافی کے دوران میں وہ اور مکرم شاہ اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے تھے۔ مکرم شاہ کئی ممالک کا سفر کر چکا تھا۔ وہ اسی حوالے سے ملک میں تعلیم کی صورتِ حال پر بات کر رہے تھے کہ وہ چونکی...... مکرم شاہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔

''ارے...... آپ کو کیا ہوا؟'' وہ بولی۔

''مکرم صاحب......'' اس بار اس کی اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی سی لگی۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف جانا چاہا مگر کمرا، دروازہ، صوفہ سب اچانک اوپر نیچے ہو گئے تھے۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ انیقہ نے ہاتھ بڑھا کر کسی غیر مرئی چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی اور پھر ناکام ہونے پر لڑکھڑاتی ہوئی قالین پر ڈھیر ہوگئی۔

ماہِ کامل کا جادو چل گیا تھا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو وہ کسی نیم اندھیری جگہ پر ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ ایک لمحے کو تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟ کیوں ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہے کون؟ پھر جیسے ہی کچھ سنبھلی اسے کافی اور پھر مکرم شاہ یاد آیا۔

اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، اس بار وہ اس میں کامیاب رہی مگر اب بھی اس کا سر چکرا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے یہاں تھی۔ اس کا والٹ، فون کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑی۔

وہ مکرم شاہ تھا۔

وہ بھی اسی کمرے میں زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔

''اٹھیے۔'' اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ شاید کوئی بہت زود اثر دوا تھی جو انہیں دی گئی تھی۔ مکرم شاہ اس کے جھنجوڑنے پر اٹھ بیٹھا تھا۔ چند لمحے وہ اسے خالی الذہنی کی

کیفیت میں دیکھتا رہا پھر اچھل پڑا۔

''یہ سب کیا ہے؟ ہم کہاں ہیں؟ یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ بھائی صاحب کہاں ہیں؟'' وہ سوالات پر سوالات داغے جا رہا تھا۔

''یہ تو آپ مجھے بتائیں گے۔ آپ نے مجھے بلایا، وہ کافی بھی آپ کے گھر میں آپ کے لوگوں نے ہی بنائی تھی؟'' انیقہ زہر بھرے لہجے میں بولی۔ ''اور شاید یہ جگہ بھی آپ کی حویلی کا ہی حصہ ہے اور کمال یہ ہے کہ آپ سوالات بھی مجھ سے ہی کر رہے ہیں۔''

''اوہ۔'' مکرم شاہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟ بھائی صاحب آپ سے ملنا چاہتے تھے اور پھر یہ سب...... میں خود نہیں سمجھ پا رہا......''

''میں سمجھاؤں آپ کو......؟'' انیقہ ہلکے سے غرائی۔ ''میرے شوہر خضر کے غائب ہونے میں آپ کے بھائی صاحب یا شاید آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ مجھے یہی شک تھا اسی لیے میں یہاں آئی تھی۔''

''آپ یقین کریں کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا میں تو یوں بھی زیادہ تر ملک سے باہر رہتا ہوں۔ اس سیاست اور گڑبڑ سے دور......'' وہ بولا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس بات پر یقین کر لوں گی؟'' وہ غصے سے بولی۔ ''مگر اب آپ لوگوں کے لیے بچنا آسان نہیں ہوگا، کسی بھی مجرم کے لیے نہیں ہوتا۔ مہلت ضرور ملتی ہے مگر سزا بھی پھر اتنی ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' مکرم شاہ نے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''شاید بھائی صاحب کا کوئی معاملہ ہے...... مگر مجھے کیوں یہاں ڈالا گیا ہے؟ شاید آپ کے معاملے کے ساتھ انہوں نے میرا پتا بھی صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ دکھ سے بولا۔

''آپ کا پتا......؟ آپ کے بھائی ہوتے ہوئے...... اچھی کہانی ہے۔''

''وہ میرے سگے بھائی نہیں ہیں۔ ہم دونوں سوتیلے بھائی ہیں۔ میری اُن کی کبھی نہیں بنی۔ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے اسی لیے میں زیادہ تر ملک سے دور رہتا ہوں مگر وہ دور کی سوچتے ہیں، میری یقین دہانیوں کے باوجود شاید انہیں اعتبار نہیں ہوا کہ مجھے ان کی جائداد کا لالچ نہیں ہے۔''

انیقہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کو یہاں دیکھ کر وہ خود بھی حیران تھی۔ اسے یاد تھا کہ خود بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے مکرم شاہ کو بے ہوش ہوتے دیکھا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے جائداد کے لیے...... وہ آپ کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ان کے بندے کسی مچھر کی طرح بندے کو مار ڈالتے ہیں۔'' وہ گویا لرز کر بولا۔

''کیا آپ خضر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' اس نے امید سے پوچھا۔

''نہیں۔'' مکرم شاہ بولا۔ ''بھائی صاحب ایسے معاملات میں مجھ سے بات نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟''

''وہ آپ کو یہاں لائے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ سے کچھ چاہتے ہیں۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟'' مکرم شاہ کے سوال پر انیقہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس میں موجود وکیل نے کروٹ لی۔

''شاید......'' وہ دھیرے سے بولی۔

''شاید......؟ مگر کیا؟'' مکرم نے قدرے بے صبری سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... مگر کچھ تو ہوگا اس کے دماغ میں...... یہ آپ کا بھی گھر ہے کیا آپ کو کوئی راستہ معلوم ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے باہر نکل سکیں۔'' انیقہ نے پوچھا۔

وہ سخت پریشان تھی۔ اسے ممتاز شاہ پر شک تھا مگر اسے اس طرح کے راست اقدام کی امید نہیں تھی۔ اگرچہ وہ زرین اور غالب کو ایس ایم ایس کر کے آئی تھی جس میں اس نے انہیں تفصیل بتا دی تھی مگر اب...... اس نیم اندھیرے کمرے کی قید میں اسے اپنی یہ پیش بینی کم محسوس ہو رہی تھی۔

کیا ہوگا اگر وہ میسج (پیغام) انہیں نہ مل پائے یا دیر سے ملے۔

اور پھر کیا وہ ایک پیغام کے حوالے سے ممتاز شاہ جیسی مضبوط شخصیت کا کچھ بگاڑ پائیں گے؟

کیا خضر کے بعد وہ بھی دنیا سے غائب ہو جائے گی؟

ذہن میں ابھرتے ڈوبتے سوالات اسے تنگ کر رہے تھے۔

''میں نے یہ کمرا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' مکرم شاہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ویسے یقیناً ہمیں اگر یہاں رکھا گیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی رابطہ ضرور کرے گا۔''

''کوئی ہے۔'' اس نے دروازہ بجایا اور زور سے

آواز دی۔ ''مجھے پانی درکار ہے۔ میڈم پھر بے ہوش ہوگئی ہے۔'' وہ زور زور سے آواز دے رہا تھا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھی۔

پھر چند لمحوں بعد دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی اور کسی نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے؟'' ایک اجڈ سا گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔ ''پینے کا پانی کمرے میں ہے۔'' وہ بولا۔

''ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟'' مکرم شاہ اس کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''صاب...... ہم حکم کا غلام ہے اور ہم کو حکم ہے کہ اگر آپ گڑبڑ کرو تو آپ کو گولی ماردی جائے اس لیے گڑبڑ نہیں کرو۔'' وہ اکھڑ انداز میں بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

انیقہ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔

''یہ معاملہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ بھائی صاحب اگر اس حد تک جارہے ہیں تو یقیناً کوئی بہت اہم چیز ہے جس کے حوالے سے وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں تاکہ ہم کوئی راستہ نکال سکیں۔''

''بالکل...... راستہ نکالنا ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میرے شوہر پولیس افسر ہیں۔ انہوں نے کچھ ایسا جان لیا ہے جو یقیناً آپ کے بھائی صاحب کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے خضر کو خریدا نہیں جا سکتا، یہ آپ کے بھائی صاحب جانتے ہیں اس لیے انہوں نے اسے غائب کروا دیا ہے۔ ان کو لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی دیگر ثبوت ہیں جو میرے پاس ہیں۔''

''اوہ...... یہ معاملہ ہے، آپ کی بات سن کر مجھے یہ لگ رہا ہے کہ آپ کے پاس ثبوت نہیں ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''میں نے یہ کب کہا۔'' اور وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ثبوت ہیں۔''

''کیا......؟ اور کہاں؟'' مکرم شاہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔'' انیقہ نے صفائی سے کہا۔

اسی لمحے باہر سے کسی کے گرنے کی آواز آئی پھر کسی نے دروازہ کھولا۔

''شاہ نواز......'' آنے والے کو دیکھ کر مکرم شاہ کھڑا ہوگیا۔ ''تم یہاں کیسے پہنچے؟''

''مالک...... جیسے ہی خبر پڑی، میں بندے لے کر نیچے اتر گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اب نکلیں جلدی باہر...... ابھی تو ہم نے سب کو قابو کرلیا ہے...... مگر آگے کا کچھ پتا نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''آیئے میڈم۔'' مکرم قدم بڑھاتا ہوا بولا۔

''یہ...... کیا جگہ ہے؟'' انیقہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''حویلی کا تہ خانہ......'' مکرم نے جواب دیا۔ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ پہلے شور اور پھر کئی لوگوں کے بھاگتے قدموں کی آوازوں نے انہیں ہڑبڑا دیا۔

''بھاگیں مالک......'' شاہ نواز بولا۔ ''میں سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

مکرم شاہ اور انیقہ تیزی سے دوڑے تھے۔ انیقہ کو سمت کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ بس تیزی سے بھاگے جارہی تھی۔ چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ اس گڑبڑ میں شاید وہ کسی غلط راہداری میں مڑ گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ مکرم شاہ نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی آواز آرہی تھی۔

خوف گویا اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ تہ خانہ بھی بہت سلیقے سے بنایا گیا تھا۔ ہوٹل کے طرز کی لابی نما راہداری، دیواریں اور پھر دروازے مگر کسی بھی دروازے کو کھولتے ہوئے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ نہ جانے یہاں کون سا پینڈورا بکس کھل جائے۔

انیقہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ لابی کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جہاں سے ہلکی سی روشنی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی کنڈی کو ہاتھ لگایا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھلتا چلا گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں زمین پر ایک جانب بستر لگا ہوا تھا جس کے سرہانے کے پاس پانی کا کولر تھا۔ کمرے میں ایک ٹو سیٹر صوفہ موجود تھا۔

بستر پر کوئی سو رہا تھا۔

انیقہ نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھی۔ وہ بستر کے قریب پہنچی تھی کہ لیٹے ہوئے شخص نے کروٹ لی۔ ''کون ہے......؟'' وہ پکارا۔

انیقہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

آواز میں نیند، تھکن، نقاہت، بیزاری، بے بسی سب کچھ تھا مگر اس سب کے باوجود وہ اس آواز کو لاکھوں میں بھی

پہچان سکتی تھی۔
وہ بستر کی طرف لپکی۔
وہ خضر تھا۔ اس کا خضر......
''خضر......'' وہ اس سے لپٹ گئی۔
''تم......تم ٹھیک ہو......شکر ہے اللہ کا......تم کو ذرا احساس نہیں تھا کہ میں کس قدر پریشان تھی۔'' وہ روتے ہوئے بولے جارہی تھی۔
''انیقہ......'' خضر بھی شاک کی سی حالت میں تھا۔ وہ خاصا کمزور نظر آرہا تھا۔ چہرے پر ایک زخم کا نشان بھی تھا۔
''تم یہاں کیسے آگئیں؟ تم ٹھیک ہو نا......انیقہ میری طرف دیکھو۔''
''ہاں، میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ ہاتھوں سے خضر کا چہرہ، بال ٹٹول رہی تھی۔
''تمہاری تسلی ہوگئی ہو تو اب میری بات کا جواب دو......'' وہ نہ جانے کتنے عرصے بعد مسکرایا تھا۔
''خضر...... یہ سب کیا ہوا ہے؟ انہوں نے تمہیں کیوں یہاں رکھا ہے؟ کیا چاہیے ان کو؟''
''یہ میں بتاؤں تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' دروازے سے آتی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ پھر کسی نے بٹن دبایا اور کمرے کا نیم اندھیرا تیز چمکتی روشنی میں نہا گیا۔
دروازے کے بیچوں بیچ مکرم شاہ کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔
''تم......'' انیقہ بولی۔
''ہاں میں...... بیچارہ چھوٹا بھائی، بڑے سوتیلے ظالم جاگیردار بھائی کے مظالم کا شکار......'' وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔
''مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا۔'' وہ بولی۔
''اور میں سمجھ گیا تھا کہ تم بہت چالاک ہو......تم سے سیدھی بات کرنا ہوگی۔'' وہ جواباً بولا۔
''مگر کیوں؟ تم نے یہ سب کیوں کیا......؟''
''ارے یہ سب اس خضر کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''اس نے میرے کام میں دخل دیا اور پھر دیتا ہی چلا گیا۔''
''کام......؟ تم اسے کام کہتے ہو۔'' خضر غرایا۔ ''چوری چکاری کو بھتا لینے کو......لوگوں کو اغوا کرنے کو اور وہ جو سب سے مکروہ کام جو مجھے تمہاری طرف متوجہ کر گیا، وہ غریب لڑکیوں اور بچوں کو اسمگل کرانا، یہ سب کام ہیں؟''
''دنیا میں مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں مسٹر خضر......تم تو شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ کام کتنے پرافٹ ایبل ہیں۔'' وہ بے شرمی سے بولا۔ ''اگر تم مان جاتے تو جو چاہتے مل سکتا تھا مگر تمہیں چڑھا ہے ایمانداری کا بخار تو اس کا نتیجہ تو یہی ہونا تھا نا۔ میں تو اتنا لمبا چکر پالنے کا عادی ہی نہیں ہوں، اگر تمہارے منہ سے اس یو ایس بی کا معاملہ نہ سن لیتا تو کب کا تمہیں ایکسپورٹ کر چکا ہوتا۔'' وہ ہنسا۔ ''اس ثبوت کے مسئلے نے الجھا دیا سب کچھ...... ڈر یہ تھا کہ پولیس افسر کی بیوی بھی وکیل تھی اس لیے ثبوت کا حصول ضروری تھا۔''
''اس لیے تم نے میرے گھر پر بندہ بھیجا۔ مجھ پر حملہ کرایا؟'' انیقہ نے سرد لہجے میں کہا۔
''حملہ......؟'' خضر نے بے چین ہو کر پوچھا۔
''حملہ، پلان میں نہیں تھا مگر تم غلط وقت پر پہنچ گئیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''خضر تو جانتا ہے کریم کو، اسے چاقو استعمال کرنے کا کتنا شوق ہے جو اس کے چہرے پر دیکھ رہی ہو نا زخم وہ بھی کریم کا دیا ہوا ہے۔''
''اب......تم کیا چاہتے ہو؟'' انیقہ نے پوچھا۔
''واہ......رسی جل گئی بل نہیں گیا اور وہ دوسری مثال کیا ہے کہ رات بھر داستان سنی صبح پوچھا زلیخا مرد تھی یا عورت......ارے وکیل صاحبہ وہ ثبوت درکار ہے مجھے...... سامنے کی بات ہے اب تو میں نے تم دونوں کو ملوا بھی دیا۔ اب تو موت کا بھی زیادہ غم نہیں ہونا چاہیے تم دونوں کو......مگر ہاں اگر مجھے ثبوت مل جائے اور خاموشی کا عہد بھی تو میں تم دونوں کو چھوڑ بھی سکتا ہوں۔ یوں بھی میں یہ ملک چھوڑ کر جارہا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے مجھے وہ یو ایس بی چاہیے۔'' وہ قطعی انداز میں بولا۔
''اور اگر وہ نہ ملے تو......؟'' خضر نے پوچھا۔
''تو تم شاید مجھے سمجھے نہیں ابھی...... مانتا ہوں کہ تم بہت بہادر اور برداشت کرنے والے ہو مگر اگر تھرڈ ڈگری تمہارے بجائے اس نازک وکیل صاحبہ پر ہو اور وہ بھی تمہارے سامنے...... تو کیا تم تب بھی برداشت کر لو گے......'' وہ اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔
''میں تمہاری جان لے لوں گا۔'' خضر زنجیر سے بندھے ہاتھ کا مکا بنا کر غرایا۔
''دیکھو خضر...... میں بتا چکا ہوں فضول باتوں کا وقت نہیں ہے میرے پاس...... جی انیقہ بی بی تو کہاں ہے وہ یو ایس بی...... ویسے جو میں نے ابھی آپ کے ہیرو صاحب سے کہا وہ آپ کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ کریم آپ کی نظروں کے سامنے خضر کے جسم سے بوٹیاں کاٹ سکتا ہے، اسے اس

کام میں بہت لطف آتا ہے۔'' وہ سفاکی سے بولا۔
''نہیں، تم ایسا کچھ نہیں کرو گے...... میں تمہیں وہ یو ایس بی دے دوں گی۔'' انیقہ بولی۔
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو انیقہ...... یہ اس کے بعد بھی ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''
''کہاں ہے وہ یو ایس بی؟'' وہ خضر کو نظر انداز کرتا ہوا انیقہ سے مخاطب ہوا۔
''محفوظ ہے۔ میں خود ہی نکال سکتی ہوں اور میں نے یہاں آنے سے قبل یہ انتظام کر دیا تھا کہ اگر میں دس روز تک واپس نہ آؤں تو وہ یو ایس بی ان لوگوں تک پہنچ جائے گی جنہیں تم اس قید خانے میں بند نہیں کر سکو گے۔'' انیقہ نے سرد لہجے میں کہا۔
''اوکے...... تو پھر تم میرے ساتھ چلو گی اور خضر یہاں کریم کی کسٹڈی میں رہے گا، اگر تم نے ذرا بھی گڑبڑ کی تو کریم......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''نہیں...... یہ ڈیل اس طرح نہیں ہوگی۔'' انیقہ بولی۔ ''وہ یو ایس بی تم کو مل جائے گی، تمہیں خضر کو بھی یہاں سے نکالنا ہوگا ہم تمہارے راستے میں نہیں آئیں گے۔''
''تم یہ کیا کہہ رہی ہو انیقہ؟'' خضر زور سے بولا۔
''بہت چالاک ہو تم، میں تم دونوں کو لے چلوں تاکہ تم مجھے پھنسا سکو۔''
''دیکھو، مکرم شاہ! تم جانتے ہو کہ تمہاری زندگی اور آزادی کے لیے تمہیں وہ یو ایس بی چاہیے اور مجھے خضر چاہیے۔ وہ یو ایس بی اب خضر کے پاس نہیں ہے، میرے پاس ہے اس لیے سودا بھی مجھ سے ہوگا۔'' انیقہ اطمینان سے بولی۔ ''میں جب یہاں آئی تھی تب اس سب کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میرا سامنا تم سے ہوگا یا ممتاز شاہ سے مگر میں واپس نہ ہونے کی صورت میں تمہاری مکمل تباہی کو یقینی بنا کر آئی ہوں، تم جانتے ہو کہ میں غلط نہیں کہہ رہی۔''
مکرم اسے چند لمحے گھورتا رہا۔
''راحیل سچ کہہ رہا تھا کہ تم بہت مکار ہو، تم جانتی ہو جس رات تم نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ تم کو یو ایس بی مل گئی ہے وہ اسی روز تمہیں ٹھکانے کے چکر میں تھا۔ میں نے اسے روکا، غلطی ہوگئی مجھ سے۔'' وہ غرایا۔
''مجھے اسی پر شک تھا۔'' انیقہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔ ''پھر وہ فون کالز آئیں تب مجھے یقین ہوگیا کہ اب میں حقیقت تک پہنچ جاؤں گی۔''
''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ منہ بند رکھے گا...... اور تم اپنی زبان پر قائم رہو گی؟''
''ضمانت ہماری اپنی زندگی ہے، ہم جانتے ہیں کہ ذرا سی بھی غلطی ہماری موت ہوسکتی ہے اور ثبوت تو ہم دے ہی چکے ہوں گے۔'' انیقہ اپنا کیس بڑی مہارت سے لڑ رہی تھی۔
''ٹھیک ہے۔'' وہ چند لمحے بعد بولا۔ ''مجھے وہ یو ایس بی ہر قیمت پر چاہیے مگر تم یاد رکھنا اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تم دونوں کو اڑا دیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔''
''تم سمجھ نہیں رہی ہو انیقہ...... جو کچھ تم کر رہی ہو، وہ غلط ہے۔'' خضر کمزور سے لہجے میں بولا۔
''تو یہاں اس طرح جان دینا بھی خودکشی کے زمرے میں آتا ہے خضر......اور میں زبان دے چکی ہوں۔ اب تم خضر کو کھولو۔'' وہ مکرم سے بولی۔
''کریم۔'' مکرم کی آواز پر جو کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر انیقہ لرز سی گئی تھی۔ یہ وہی حملہ آور تھا جو اسے چاقو مار کر فرار ہوا تھا۔
''خضر کو کھولو اور تیاری کرو۔ ہم لوگ شہر جارہے ہیں۔''
کریم، انیقہ کو کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا خضر کی جانب بڑھا۔ اس نے لوہے کے کڑے کو خضر کے ہاتھوں

سردار جی

کسی چوک میں کچھ آدمی ایک سکھ کو بری طرح پیٹ رہے تھے جبکہ سکھ مسلسل ہنسے جارہا تھا۔ ایک اور آدمی ادھر سے گزرا تو اس نے سکھ سے کہا۔ ''سردار جی! آپ پاگل ہوگئے ہیں یہ لوگ آپ کو مار رہے ہیں اور آپ ہنس رہے ہیں؟'' سکھ نے جواب دیا۔ ''پاگل میں نہیں یہ سارے ہوگئے ہیں کیونکہ جس آدمی کو انہوں نے مارنا تھا وہ میں نہیں ہوں میرا ہم شکل بھائی ہے۔ میں نے ان سب کو بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ جب یہ تھک جائیں گے تو میں انہیں اصل بات بتاؤں گا اور ان کی اماں مرجائے گی۔''

اور پیروں سے نکالا۔

خضر اٹھ کر کھڑا ہوا، زنجیروں سے آزادی کے بعد اس طرح کھڑا ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا دل معبود کے آگے شکر گزاری کے سجدے میں گر پڑا۔ ان چند ہفتوں نے اسے ان نعمتوں کا شدید احساس دلایا جنہیں عام طور پر... فارگرانٹڈ لے لیا جاتا ہے۔

اسی وقت ایک ساتھ کئی چیزیں ہوئی تھیں۔ تہ خانہ یک دم آوازوں سے بھر سا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ وہاں دوڑ رہے ہوں، ان کے ساتھ ساتھ زرین اور غالب کی آواز آرہی تھی جو انیقہ کا نام لے کر پکار رہے تھے۔ ممتاز شاہ کی ہدایات سنائی دے رہی تھیں جو وہ غالباً انیقہ کی تلاش کے لیے دے رہے تھے۔ خضر نے اس ایک لمحے کا فائدہ اٹھا کر کریم کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا تھا۔ اور اس کا ہاتھ مروڑ کر اس کی جیب سے چاقو نکال پھینکا تھا۔

حالات کے یک دم پلٹا کھانے سے مکرم شاہ گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انیقہ درمیان سے ہٹ کر دروازے کے پاس پہنچ گئی تھی مگر اس کے کھولنے سے قبل ہی دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا تھا اور ممتاز شاہ اور غالب ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے زرین، کامران اور پولیس کی نفری تھی۔

ممتاز شاہ نے اندر داخل ہو کر پہلی نظر انیقہ پر اور دوسری خضر پر ڈالی تھی۔ اس کے بعد وہ مکرم شاہ کی طرف بڑھا تھا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔ کامران اور غالب نے اسے وہاں سے ہٹایا۔ اس کا رعب دار چہرہ گہرے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد مکرم شاہ، انسپکٹر کامران کے ساتھ اپنے نئے گھر کی جانب روانہ ہوا اور ممتاز شاہ کی شرمندگی و معافی تلافی کے بعد وہ ہوٹل پہنچے۔ راستے میں خضر نے انہیں پوری داستان سنائی تھی۔ وہ ایک سال سے انسانی اسمگلنگ میں ملوث اس گینگ کے پیچھے تھا۔ تحقیقات کے دوران میں ان کے دیگر غیر قانونی دھندے بھی سامنے آتے چلے گئے تھے۔ بھتا خوری سے لے کر اغوا برائے تاوان تک وہ سب دھندوں میں ملوث تھے۔ اب تک یہ گروہ سیکڑوں لڑکیوں اور بچوں کو ملک سے باہر بیچ چکے تھے۔ خضر کی تحقیقات کا سرا سفید محل سے مل رہا تھا۔ شروع میں وہ بھی اس سب کا ذمے دار ممتاز شاہ کو ہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ یہ سارا سرکس ممتاز شاہ کا سوتیلا پڑھا لکھا، بظاہر نہایت بے ضرر بھائی مکرم شاہ چلا رہا ہے۔

جس روز اسے غائب کیا گیا، اس دن اس کے دفتر کے نمبر پر ایک کال آئی تھی جس میں اسے مکرم شاہ کی نئی ڈیل کی خبر ملی تھی۔ وہ اس کے لیے ہی مخبر سے ملنے سی ویو پہنچا تھا۔ انسپکٹر راحیل اس کے ساتھ تھا۔ رازداری کے پیش نظر اس نے کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ سی ویو پر اس کے سر پر کسی نے بھاری چیز سے وار کیا تھا اور پھر اسے قید خانے میں ہوش آیا تھا۔ جو مخبر اس کے لیے کام کر رہا تھا وہ پکڑا گیا تھا اور بعد میں اس کی ہی لاش کو خضر کی انگوٹھی اور گھڑی پہنا کر سمندر برد کر دیا گیا تھا۔ اگر خضر کے منہ سے مار پیٹ کے دوران یہ نہ نکل جاتا کہ اس کے پاس ان کے سارے جرائم کا ثبوت موجود ہے اور وہ ان کے سارے نیٹ ورک کو برباد کر سکتا ہے تو شاید وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ اس ایک بات نے مکرم کو اسے قید میں رکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ثبوت انہیں ہر حال میں درکار تھے۔ اس وجہ سے ہی اس پر کئی بار بہیمانہ تشدد بھی کیا گیا تھا۔

اگلی صبح بہت ہنگامہ پرور ثابت ہوئی تھی۔ مکرم شاہ کی گرفتاری کے بعد بڑے بڑے برج الٹے تھے۔ انسپکٹر راحیل بھی پکڑا گیا تھا۔ اخبارات ان کی داستانوں سے بھرے پڑے تھے۔ خضر، انیقہ، زرین اور غالب اسی رات واپسی کے لیے نکل گئے تھے۔

”اور تم جو سودا کر رہی تھیں مکرم شاہ سے، تمہیں کچھ علم تھا کہ جو یو ایس بی تم اسے دینے جارہی ہو، اس میں کیا ہے؟“ خضر نے انیقہ کو گھورا۔

”ہاں......“ وہ سادگی سے بولی۔ ”میں نے وہ یو ایس بی تمہارے جوتے سے نکال کر دیکھ لی تھی۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کیس کو جیتنے کے لیے میرا اچار اتھا جس پر گندی مچھلی نے منہ مار دیا تھا۔“ وہ چالاکی سے مسکرائی۔

”اُف یہ چالاک بیوی......“ خضر دُہائی دینے کے انداز میں بولا۔

”کیوں......؟ اس لیے کہ اس نے تمہاری جان بچالی۔“ زرین نے اسے گھورا۔

”نہیں، اس لیے کہ جوتے میں چھپائی گئی چیز تک ڈھونڈ نکالتی ہے یہ جیمز بانڈ 007۔“ وہ مسکرایا۔ انیقہ نے طمانیت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے رحمٰن رب نے اس کی سن لی تھی۔

اسماء الحسنٰی - کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ھیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ھیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ھیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ھیں۔

امیگریشن مل جائے

O ہم لوگ کئی سالوں سے اپنے والدین کی امیگریشن کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے ہیں مگر کوئی نتیجہ نہیں آتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے کوئی بندش کی ہوئی ہے، جبکہ امیگریشن کے قواعد و ضوابط کے عین مطابق پورے اترتے ہیں مگر پھر بھی کوئی بات نہیں بنتی ہے والدین خصوصاً والد صاحب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس آجائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خدمت کی سعادت عطا فرمائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی روحانی رکاوٹ ہے تو وہ بھی دور کر دیجیے۔ سلیم اختر۔ بروکلین امریکا

☆ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ”یارافع یافتاح“ پڑھ کر دعا کر لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کے لیے لوح و نقوش ارسال کیے جارہے ہیں امید ہے کہ اسی سال والدین آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ انشاءاللہ

بیٹے کی آرزو

O آپ سے غائبانہ تعارف آپ کی ویب سائٹ www.khanqahh.com پر ہوا تھا پھر آپ کا فیس بک qadrisarkar@hotmail.com پر آپ کی سرگرمیاں دیکھیں ماشاءاللہ آپ بہت کام کر رہے ہیں، ہمیں بھی اپنی دعاؤں سے نوازیں، میری تین بیٹیاں ہیں بیٹے کی آرزو ہے آپ کے روحانی علاج کا بہت سنا ہے آپ ہمیں بھی اپنی محبت سے کچھ عنایت کریں بہت دعا گو رہیں گے۔ سیما شاہین۔ یوکے

☆ عزیز بیٹی! آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ”یاوارث یاباقی یاقوی“ پڑھ کر دعا کریں روحانی علاج کے لیے نقش علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے حسب ہدایت استعمال کیجیے گا مراد پوری ہوگی۔ انشاءاللہ

جادو کا نتیجہ

O عجیب سے معاملات میں گرفتار ہیں زبان کبھی خشک رہتی ہے کبھی چھالے پڑ جاتے ہیں، چند دن پیٹ ٹھیک رہتا ہے پھر پھول جاتا ہے صبح اٹھتے ہیں تو منہ کا ذائقہ تلخ اور تھوک بے حد زرد رنگ اور گاڑھا ہوتا ہے بعض اوقات منہ کا ذائقہ پھیکا ہو جاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ جگر خراب ہے کوئی کہتا ہے معدے میں السر ہے، ڈاکٹر حکیم سب کا علاج کروالیا مگر چند دنوں بعد دوبارہ مسئلہ ہو جاتا ہے۔ دوائیں کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں، یہ کیفیت گھر کے تمام افراد کی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وجہ کیا ہے، اگر بیماری نہیں تو کیا ہے؟ ہم لوگ وہمی نہیں ہیں مگر اب تو یقین آنے لگا ہے کہ یہ سب جادو کا نتیجہ ہے، آپ اس کے لیے ہمیں روحانی علاج دیجیے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مہینے میں چند دن کراچی بھی تشریف لائیں کیونکہ ہم جیسے بہت سے ضرورت مند ہیں جو کراچی سے لاہور نہیں آسکتے ہیں ان سب کا بھلا ہو جائے گا۔ رخشندہ بتول۔ کراچی

☆ آپ کے معاملے میں فقط صحت خرابی کا مسئلہ نہیں ہیں اس میں بد عملیات بھی شامل ہیں آپ سورۂ مبارکہ ”الممتحنہ“ صبح شام پانی پر دم کر کے پی لیا کریں۔ لوح، نقش زعفرانی ارسال ہیں، حسب ہدایت استعمال کیجیے۔ فی الحال مصروفیات اس قدر ہیں کہ وقت نکالنا مشکل ہے، جونہی مصروفیات نے اجازت دی کراچی کے پروگرام کے متعلق

ان ہی صفحات میں مطلع کر دیا جائے گا۔

ادھاری بزنس

O میرا کنسٹرکشن کا بزنس ہے، مختلف قسم کے ٹھیکے لیتا ہوں، پچھلے دنوں ایک سپروائزر کو گھپلے کے باعث نکال دیا تھا، مجھے تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن مجھے کمپنی کے سٹاف نے بتایا کہ وہ بڑی دھمکیاں وغیرہ دے رہا تھا، میں نے کوئی پروا نہیں کی، مگر جب سے وہ گیا ہے میرا کام متاثر ہو رہا ہے دو تین ایسے ٹینڈر جن کے متعلق مجھے سو فیصد یقین تھا کہ مجھے ہی ملیں گے وہ میرے ہاتھ سے نکل گئے، کنسٹرکشن مشنری میں کوئی نا کوئی مسئلہ نکل آتا ہے اور اچھی خاصی مشین کھڑی ہو جاتی ہے، آپ کے علم میں تو ہے کہ یہاں پر سارا بزنس ادھار پر ہی ہوتا ہے، بنک گاڑیاں، مشینری سب لیز کر دیتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ قسطیں بر وقت ادا ہوتی رہیں، مگر حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہر جگہ پیسا پھنس گیا ہے، لاکھوں کی ٹرانزیکشن، لاکھ سوا لاکھ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے سخت پریشان ہوں اس کا کوئی روحانی تدارک کیجیے آپ اکثر دوبئی، ابوظہبی آتے رہتے ہیں ایک بار میرے لیے آ جائیں جو کہیں گے خدمت کے لیئے حاضر ہیں، بس ایک بار ان چیزوں سے جان چھڑا دیں۔ یوسف نسیم۔ ابوظہبی یو اے ای

☆ عزیزم! مشکل حالات ہماری صلاحیتوں کا امتحان ہوتے ہیں ہر گز نہ گھبرائیں انشاء اللہ سب بہتر ہوگا، ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا رافع یا قوی یا وہاب" پڑھا کریں آپ کے معاملات میں جادو کا عنصر ہے ایک بات یاد رکھئے کہ کبھی کسی کی دل آزاری نا کیجیے کیونکہ دل آزاری کے باعث غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں فرد کوئی بھی قدم اٹھا لیتا ہے، جہاں تک ابوظہبی آنے کا سوال ہے تو آپ رابطے میں رہیں جب بھی پروگرام ہوگا آپ کو بذریعہ فون مطلع کر دیا جائے گا۔ آپ کے لیے لوحِ تسخیر خاص، نقش فتح نامہ نقش زعفران ارسال کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مشکلات آسان فرمائیں۔ (آمین)

مجھے بدل دیں گے؟

O آپ کے اکثر سوال جواب پڑھتا رہتا ہوں، سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھتا تھا یہ سب گھڑے گھڑائے قصے فرضی ہوتے ہیں، لیکن جب اپنے ایک عزیز کو دیکھا کہ وہ چند ہفتے پہلے مرجھایا، اداس اور خاموش رہتا تھا، بالکل بدل گیا، تو اس نے بتایا کہ وہ آپ کے زیر توجہ تھا، پہلے جو کسی چیز کو نہیں مانتا تھا پیری فقیری کو ڈھکوسلا کہتا تھا وہ دن رات آپ کے ہی گن گاتا ہے، آپ کی تصویر ہمہ وقت اس کے پرس میں ہوتی ہے تو بے حد حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص کسی پر اتنا اثر انداز ہو سکتا ہے کہ ہر لمحہ اس کی تعریف کرتا رہے، جبکہ اس کی صرف آپ سے خط کتابت ہے۔ آپ کی تمام ڈاک وہ نہایت عقیدت سے سنبھال کر رکھتا ہے، دنیا میں دلچسپی اور گھریلو کاموں میں حصہ لینے لگا ہے، ہر ایک سے خوش مزاجی سے بات کرنا، پھر والدین کا بے حد ادب کرنا اس نے سیکھ لیا، اگر پیر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں تو مجھے بھی اپنا مرید بنا لیں، دنیا سے اکتایا اور بیزار ہوں، محبت نا ملی، والدین صرف تنخواہ سے علاقہ رکھتے ہیں شادی ہوئی تو بیوی اپنی دنیا میں مگن یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی فالتو شے ہوں کیا آپ مجھے بدل سکتے ہیں؟ عبدالحئی۔ میر پور خاص

☆ عزیزم! پیر شل باپ راہنما اور دوست ہوتے ہیں دکھ، سکھ، محبت، نفرت، بے یقینی، ناکامی، غصہ، بیزاری سب اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں، جب ہی پیروں کے پاس ناکام، نامراد آتے ہیں اور شاد کام واپس جاتے ہیں، وجہ۔؟ وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا و محبوب کے راستے محبت کے مسافر ہوتے ہیں، نرمی، محبت، درگزری، تحمل یہ سنت ہے اور جب اس سنت پر عامل ہو جاتے ہیں تو پھر آپ ایک مقناطیس بن جاتے ہیں، جس کی طرف سب کھنچے چلے آتے ہیں، آپ بھی محبت کو اپنایئے، غصہ، نفرت، حسد، بیزاری کو طلاق دے دیجیے اور رحمت و محبت کو اپنا شعار بنا لیں، ہنستے مسکراتے رہیں، کامیاب ہو جائیں، یقین نا آئے تو بیعت کر کے دیکھ لیجیے۔ دعا گو!

دل بہت بے چین ہے

O میری پہلی منگنی میرے خالہ زاد سے ہوئی تھی، کسی وجہ سے وہ منگنی ختم ہو گئی اور مجھے میرے ماموں نے مانگ لیا، پہلی منگنی کے وقت میری عمر یہی کوئی بارہ چودہ برس تھی جبکہ دوسری منگنی کے وقت میری عمر بائیس سال تھی، اب دسمبر میں شادی ہے مگر نجانے کیا ہوا ہے کہ مجھے اپنا پہلا منگیتر بہت یاد آتا ہے، بچپن میں ہم لوگ ساتھ ہی رہتے تھے، بہت شرارت کرتے تھے، لڑنا، مارنا، ساتھ ساتھ سکول جانا، منگنی ٹوٹ گئی کوئی احساس نا ہوا، مگر جب سے میری شادی کی بات پکی ہو گئی، زندگی بے حد الجھن کا شکار ہو گئی ہے وہ یاد آتا ہے، بے تحاشا یاد آتا ہے، کیا کروں دل چاہتا ہے کہ انکار کر دوں۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ کس وجہ سے کس کے بھروسے پر، پتا نہیں دل بہت بے چین ہے، دنیا میں معجزے بھی ہوتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا وہ مجھے مل جائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے، آپ روحانی حل بتائیں۔ عندلیب گلزار۔ حیدر آباد

☆ زندگی میں ہونی انہونی چلتی رہتی ہے، اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا رافع یا فتاح یا لطیف یا قوی" پڑھ کر دعا کرو۔ لوح تسخیر خاص اور نقوش ارسال کیے جا رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ بیٹی کب مٹھائی کا وعدہ پورا کرتی ہے۔

عورت کی چھٹی حس

O میری شادی کے پہلے چار سال تو بہت پُرسکون گزرے، پھر میرے شوہر کے دفتر میں انتظامیہ نے کچھ تبدیلیاں کر دیں جس میں میرے شوہر کا عہدہ بڑھ گیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایک سیکریٹری کی سہولت میسر آ گئی، بس اس کے چند ہی دنوں کے بعد میری حیثیت ثانوی ہو گئی، ہر بات میں حنا کی مثالیں، وہ کافی ایسے بناتی ہے، وہ چائے ایسے سرو کرتی ہے، گفتگو یہ ہے، کلر ایسے پہنتی ہے، سلیقہ اور آراستگی بس اس پر ختم ہے، آپ تو جانتے ہیں کہ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اب میرے میاں اس سے شادی کے چکر میں ہیں، جبکہ میرا پہلے برس ایک لڑکا ہوا، اب اللہ کے فضل سے پانچواں مہینا ہے، مگر ان کو میری کسی کیفیت کسی تکلیف کی فکر ہی نہیں ہے، پچھلے دنوں یو کے میں ان کی فیلڈ کے حوالے سے ایک کانفرنس ہوئی تو اس میں حنا کو لے کر چلے گئے، میرا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے، میرا گھر تباہ ہو رہا ہے ان مہینوں میں تو سکون کی ضرورت ہوتی ہے مگر میرے لیے جیسے چاروں طرف دوزخ ہی دوزخ ہے، خدا کے لیے اپنے روحانی عمل سے میرا گھر بچا لیجیے۔ یہ ایک بہن ایک بیٹی کی التجا ہے۔ شاہدہ سلمان۔ شارجہ یو اے ای

☆ عزیز بیٹی! سب سے پہلے اپنی صحت کے معاملات پر توجہ دیجیے اور مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔ آپ ہر نماز کے بعد "یا جامع یا قوی" 190 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف، آپ کی فرمائش پر روحانی عمل لوح اور نقوش ارسال ہیں گیارہویں شریف میں آپ کے لیے خصوصی دعا کی گئی ہے، رمضان المبارک میں راشن کی فراہمی کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں۔ 0302-5555967

انکار کے پردے میں

O بڑا بیٹا عمر 36 سال ہو گئی ہے مگر شادی کے لئے بالکل بھی نہیں مانتا، خوش شکل، خوش مزاج، اونچا لمبا قد ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے نوکری بھی بہت اچھی دی ہے، گاڑی بھی ہے مگر شادی کے لئے نہیں مانتا، کہتا ہے کہ باقی لوگوں کی شادی کر دیں میری رہنے دیں وجہ کچھ نہیں ہے، اللہ جانے کیا وجہ ہے کون ہے اس انکار کے پردے میں، ہم تو سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئے ہیں، چھوٹے بیٹے اور بیٹی کی شادی پچھلے برس کر دی، ماشاء اللہ دونوں ہی صاحب اولاد ہو گئے ہیں مگر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بڑے بیٹے کی شادی اور اولاد کا والدین کو کس قدر انتظار ہوتا ہے، اس کا کوئی روحانی علاج کیجیے، رمضان المبارک کے حوالے سے کچھ ہدیہ ارسال ہے آپ اپنے ہاتھوں سے کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا، آپ کے جواب کے شدت سے منتظر ہیں۔ پرویز اختر۔ دمام سعودی عرب

☆ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں، بعض اوقات بچپن کے کچھ تجربات زندگی کے بعض معاملات سے دور کر دیتے ہیں آپ کے صاحبزادے ضرور شادی کریں گے۔ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف لوحِ تسخیر خاص ارسال ہے۔

نادیدہ ہاتھ

O ہم یہاں گزشتہ 15 سالوں سے مقیم ہیں، بیٹا جوان ہو گیا ہے تمام کاغذات مکمل ہیں مگر پھر بھی پیپرز میں پرابلم آ جاتی ہے، میرے ساتھ کی تقریبا تمام ہی فیملیز کو پیپرز مل چکے ہیں مگر میرا مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ میری فائل اٹھا کر پیچھے پھینک دیتا ہے، کبھی کبھی شدید مایوس ہو جاتی ہوں، جی چاہتا ہے کہ سرنڈر کر کے وطن واپس چلی جاؤں پھر سوچتی ہوں اب میرا وہاں پر ہے کون جس کے لئے جاؤں وطن بہت یاد آتا ہے مگر پھر مسائل گھیر لیتے ہیں صبح 8 بجے سے رات 11 بجے تک مسلسل کام کرتی ہوں، طویل ڈرائیونگ سے کمر اور ایڑیوں میں تکلیف رہنے لگی ہے، 38 برس کی عمر میں 70 برس کی لگنے لگی ہوں آپ سے روحانی امداد کی توقع ہے آپ نے میرے کزن کو جو ڈنمارک میں رہتے ہیں لوح بنا کر دی تھی اور اسماء الحسنٰی کی تلقین کی تھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور آپ کی روحانی مدد سے ان کا مسئلہ بہت جلد حل ہو گیا تھا، میری بھی مدد کیجیے۔ سویرا ملک۔ ناروے

☆ عزیز بیٹی! اچھا وقت دور نہیں، آپ گزشتہ 8 برسوں سے ایک نحوست کے دور سے گزر رہی تھیں اب حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھ کر دعا کیا کریں۔ آپ کی فرمائش پر لوح ارسال ہے۔ دعاؤں اور تحفے کا شکریہ

نانا جان کی عنایتیں

O بہت ہی اچھا لگا آپ کے ہاں حاضر ہو کر، خصوصاً یہ اطلاع اور ماجرا بے حد باعث مسرت ہوا کہ حضور سرکار نانا جان کی محبت اور ان کا دستِ کرم آپ کے سر پر ہے، ہمارا پورا خاندان ہی حضور نانا جان کی محبت میں سرشار ہے، اس لیے اپنا قریبی ....

ضروری نوٹ

اپنا مختصر مسئلہ اپنے مکمل نام معہ والدین اور تاریخ پیدائش کے ساتھ ارسال کریں۔ اس کالم میں جواب باری آنے پر دیا جاتا ہے۔ براہِ راست جواب کے لئے اپنا پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجیے۔ فون پر مسئلہ نہیں سنا جاتا ہے، خط لکھیں یا ملاقات کریں۔ بیرونِ شہر سے آنے والے وقت لے کر تشریف لائیں۔ بیرونِ ملک مقیم خواتین و حضرات اپنا مکمل پتا ارسال کریں۔

پیر شاہ محمد قادری 382-A/2، جوہر ٹاؤن،
نزد محمد علی چوک، کالج روڈ۔ لاہور۔ تعطیل بروز جمعۃ المبارک
0302-5555967

جان کرا پنے سلسلے کے حوالے سے ہم پر بھی کرم فرمائیے، میری بیٹی کے سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کیا ہوا ہے، ہر بات میں ہر معاملے میں اس کو بے حد تنگ کرتے ہیں، خصوصاً جب سے بیٹا پیدا ہوا ہے زندگی اور زیادہ پریشانیوں میں گھر گئی ہے، کہتے ہیں کہ بیٹا پیدا کر کے یہ نا سمجھ لینا کہ تم یہاں کی ملکہ بن گئی ہو، جب بھی چاہیں چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کریں گے، حالانکہ اولاد کے بعد تو بہو کو اہمیت مل جاتی ہے، داماد ہے کہ کان دبا کر چپکا رہتا ہے مجال ہے جو پلٹ کر کسی زیادتی پر ساتھ ہی دے سکے، بس خاموش رہتا ہے، بیٹی سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے، عجیب ہی قسم کی پریشانی نے گھیر رکھا ہے۔ کیا اس کے لیے کوئی روحانی عمل عنایت کریں گے، ہمارا تو آپ سے سلسلے کے باعث حق بھی ہے، سلیم الدین تاجی۔ بدین سندھ

☆ یہ سب **اللہ کا فضل اور حضور نانا جان** کا کرم اور عنایت ہے، ان کی محبتیں اور عنایتیں ہیں جو سلسلے والوں کی محبت ہے آپ ہرگز فکر نا کریں ہر نماز کے بعد "سورۂ کوثر" 41 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیں۔ آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص، نقوش اور صاحبزادے کے لیے نظر بد کا تعویز ارسال کیا جارہا ہے۔ محبتوں کا بے حد شکریہ

مقدمہ کردیا دیور نے

O میرے شوہر گذشتہ طویل عرصے سے بیمار ہیں، ہماری جائیداد ہے جس کے کرائے سے گزر بسر ہو جاتی ہے، مگر اب اس جائداد پر دیور نے مقدمہ کر دیا ہے، حالانکہ اٹھارہ سال قبل مرحوم سسر نے سب کو باقاعدہ جائداد میں قانونی طور پر حصہ دے دیا تھا، تاکہ کسی قسم کے اختلافات پیدا نا ہوں، مگر دیور نے تمام کاغذات کو جعلی قرار دے کر مقدمہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی کرائے پر اسٹے آرڈر لے کر کرایا بھی رکوا دیا ہے، اب کرایا کوٹ میں جمع ہو رہا ہے دیور خوشحال کاروباری آدمی ہیں مگر اس کے باوجود لالچ پیچھا نہیں چھوڑتا، جبکہ ہمارے بچے پڑھ رہے ہیں، سارا پیسا بچوں کی تعلیم پر لگا دیا ہے جب سے کرایا رکا ہے مصیبتیں کھڑی ہو گئی ہیں، پچھلے سمسٹر کی فیس اپنا زیور بیچ کر جمع کروائی، دیور سے بات کی تو وہ کہتا ہے کہ آپ بڑی ہیں چونکہ اب کیس کورٹ میں ہے تو جو فیصلہ کورٹ کرے گی وہ ہی بہتر ہوگا، کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا ہے، اچھے بھلے دن گزر رہے تھے۔ بدر النساء۔ ملتان

☆ عزیز بہن! اللہ پاک دنوں کے الٹ پھیر سے ہمیں آزماتے ہیں۔ آپ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۂ لہب پڑھ کر دعا کیا کریں مقدمے میں کامیابی کے لیے نقش فتح نامہ ارسال ہے، مقدمہ آپ کے حق میں ہوگا۔ انشاءاللہ